اقبال اکادمی

اقبال کے آخری دو سال

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

اِقبالؔ

کے آخری دو (۲) سال

از

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

فہرست

حصّہ اوّل

پس منظر

حصّہ دوم

اقبال کے آخری دو سال

اِنتساب

میں اس کتاب کو - اپنے مرحوم و مغفور دوست ملک برکت علی کے نام سے منسوب کرتا ہوں - جن کے انتقال پُرملال پر ۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم نے فرمایا تھا -

"..He was, from the very beginning, a true and loyal member of the Muslim League, and on all occasions he rendered the greatest service to Muslim India. His advice and his staunch support on all critical occasions were of the greatest value to the Legal profession and myself. Muslim India has lost in him a great man, and I have lost in him not only a colleague and collaborator but also a friend."

پہلا حصّہ

پس منظر

مقدّمہ

اپریل ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ میرے دوست مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم روزنامہ امروز کے ایڈیٹر تھے۔ اور اپنے اخبار کا اقبال نمبر نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں۔ انہوں نے مجھ سے بھی مضمون کی فرمائش کی۔ میں نے عرض کیا۔ کہ "اقبال کی شاعری کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہ اب کسی مزید اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کوئی نیا عنوان بتائیں۔ تو شاید میں اس پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں"
حسرت خاموش ہو گئے۔ اور چند منٹ سوچ کر کہنے لگے۔ کہ "اقبال کے آخری دو برسوں کی سرگذشت آپ کیوں نہیں لکھ ڈالتے؟ اُس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور آپ بھی لیگ میں کام کرتے تھے"۔

حسرت کے اِن الفاظ نے اقبال کی زندگی کا ایک ایسا پہلو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو اُس وقت تک، بعض وجوہ سے، لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن گھر آ کر۔ جب میں نے اپنی کتابوں کی الماری میں سے۔ اُس دَور کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یادداشتیں نکالیں۔ اور اُن کو ترتیب وار دیکھنا شروع کیا۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ اِس موضوع پر کسی روزنامے کے لئے، سیر حاصل مضمون لکھنا ممکن نہیں۔ داستان بہت طویل تھی۔ جسے اگر بے حد اختصار سے بیان کیا جاتا۔ تو بھی ایک روزانہ اخبار کی تنگ دامانی۔

اُس کی طوالت وتفصیل کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹیلی فون پر حسرت سے یہ مشکل بیان کی۔ تو اُنہوں نے دوبارہ اصرار کیا۔ کہ خواہ مختصر ہی سہی۔ لیکن مضمون ضرور لکھنا ہو گا۔

بہر حال میں نے تعمیلِ ارشاد میں مضمون لکھدیا۔ جو اپنے اختصار کے باوجود۔ اَمروز کے پورے دو صفحوں پر پھیل گیا۔ چونکہ نیا عنوان تھا۔ اور اس سے قبل کسی نے اِس موضوع پر کچھ لکھا نہیں تھا۔ اِس لئے مضمون بہت دلچسپی سے پڑھا گیا۔ اور اکثر اخبارات و رسائل نے۔ اُسے اپنے ہاں نقل بھی کیا۔

اِس واقعہ کے بعد۔ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آئے کہ میں اقبال کی زندگی کے اِس پہلو کو۔ پوری تفصیل سے۔ ایک کتاب کی صورت میں پیش کر دوں۔ میں کام کی نوعیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہماری قومی جدّوجہد کی تاریخ میں۔ اقبالؔ کے اِن آخری دو برسوں کو۔ بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اِس کے علاوہ۔ مجھے اِس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ اگر اُس دَور کی روئیداد کو۔ ضبطِ تحریر میں لا کر محفوظ نہ کیا گیا۔ تو آئندہ نسلوں تک۔ معتبر و مستند حالات پہنچنے کی قطعاً کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ اِن احساسات کے باوجود۔ میں بعض مجبوریوں کے باعث۔ اِس کام کی تکمیل کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

فروری ۱۹۵۳ء میں انگلستان آ گیا۔ اور یہاں روزمرّہ زندگی کی مصروفیتیں۔ کچھ اِس طرح عناں گیر ہوئیں۔ کہ اِس کتاب کا خاکہ۔ ذہن میں آہستہ آہستہ دُھندلا ہوتا گیا۔ تاہم مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامّل نہیں۔ کہ میں اِس کام سے۔ کلیتہً کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اور اکثر یہ سوچتا تھا۔ کہ جونہی حالات سازگار ہوئے

اِس فرض کی بجاآوری کی کوشش کروں گا۔

اِس دوران میں۔ ایک اہم واقعہ یہ ہوا۔ کہ میرے عزیز دوست اے۔ ڈی اظہر بھی لندن تشریف لے آئے۔ وہ پاکستان ہائی کمیشن میں وزیرِ اقتصادیات تھے۔ لیکن میرے لئے تو اُن کی ذات۔ ایک ایسے ہمدرد و غم خوار مشیر کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کے گراں قدر مشوروں کی۔ مجھے قدم قدم پر ضرورت تھی۔ اظہر صاحب کا علمی وادبی ذوق۔ اُن کی سخن سنجی و سخن فہمی۔ اور سب سے بڑھ کر۔ اُن کی دوست داری و محفل آرائی۔ میرے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جب تک وہ لندن میں رہے۔ اُن کی سدابہار شخصیت کے طفیل۔ مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ میں وطن سے چھ ہزار میل دُور پردیس میں بیٹھا ہوں۔

ہمارے درمیان اکثر اقبالؔ پر گفتگو چھڑ جاتی تھی۔ اور یہ گفتگو بعض اوقات کئی کئی گھنٹے جاری رہتی تھی۔ اِسی قسم کی ایک گفتگو کے دوران میں۔ اظہر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ کہ میں اقبالؔ کے آخری دو برسوں کی سرگزشت کیوں نہیں لکھتا میں نے جواب میں ایک عُذر تو یہ پیش کیا۔ کہ کتاب کے لئے جس قدر مواد درکار ہے۔ وہ یہاں نہیں بلکہ لاہور میں پڑا ہے۔ اور وہاں سے مطبوعہ وغیر مطبوعہ دستاویزوں اور مسودوں کا یہ انبار منگوانا بے حد مشکل ہے۔ دوسرا عُذر یہ تھا۔ کہ جب تک کوئی پبلشر کتاب شائع کرنے کی حامی نہ بھرے۔ میرے لئے قلم اُٹھانا ممکن نہیں۔ اظہر صاحب نے اِن دونوں کاموں کا ذمّہ لے لیا۔ چنانچہ اُن کی ہمّت و مستعدی سے۔ یہ دونوں مشکلیں رفع ہوگئی ہیں۔ کتاب کے مواد کا بیشتر حصّہ بھی لاہور سے

لندن پہونچ گیا۔ اور کتاب کی اشاعت کا بار اُٹھانے کے لئے۔ اقبال اکیڈمی بھی آمادہ ہوگئی۔ اب میرے لئے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ لہٰذا مجھے کتاب کی تحریر و تسوید کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ آج مجھے اِس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تکلف نہیں۔ کہ اگر آزھر صاحب لندن نہ آتے۔ اور اُن کا دوستانہ اِصرار مجھے اِس کام پر آمادہ نہ کرتا۔ تو اِس کتاب کا ایک لفظ بھی نہ لکھا جاتا۔ اور یہ سارا ذخیرہ میرے سینے ہی میں دفن رہتا۔

علّامہ اقبالؔ کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہونے کا شرف مجھے اُس وقت حاصل ہوا تھا۔ جب وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے۔ میں اُس زمانے میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اور مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی چند روز کے لئے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا سے میرا دُہرا رشتہ تھا۔ وہ میرے اُستاد تھے اور دوست بھی تھے۔ مولانا کا قاعدہ تھا۔ کہ وہ جتنے روز لاہور میں قیام فرماتے۔ بلا ناغہ شام کو ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر پہونچتے تھے۔ ایک روز وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اور یوں ڈاکٹر صاحب سے میری نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہوا۔

ڈاکٹر صاحب مولانا اکبر شاہ خاں کے علم و فضل۔ اور اُن کی تاریخ دانی کے بڑے قدردان تھے۔ اور مولانا کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ جب تک ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں موجود رہتے خود بہت کم بولتے تھے۔ صرف ڈاکٹر صاحب کی باتیں سُنتے تھے۔ مولانا کا مشہور تاریخی رسالہ عبرتؔ باقاعدہ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ سے گذرتا تھا۔ اور وہ کبھی کبھی خط لکھ کر۔ مولانا کے کسی مضمون کی داد بھی دیتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"مخدومی۔ السّلام علیکم

امسال عارضۂ نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی۔ اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ امیر خاں[1] پر آپ نے خوب مضمون لکھا۔ خدائے تعالےٰ اُس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے۔ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دست کش ہوجائیں۔ صدیق رضی اللہ عنہٗ پر بھی خوب مضمون لکھا گیا ہے۔ میں نے اُن کی زندگی کے تمام واقعات ایک شعر میں جمع کر دیئے تھے۔

ہمّتِ اُو کِشتِ مِلّت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

محمّد اقبال"

اِدھر مولانا کی یہ کیفیت تھی۔ کہ وہ جب لاہور سے واپس نجیب آباد گئے۔ تو اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے اُنہوں نے عبرت میں لکھا۔

"....بڑا ہی خوش نصیب ہے لاہور۔ کہ اُس میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کا بہترین سمجھ دار اور روشن دماغ شخص اقبال موجود ہے اور بڑا ہی بدنصیب ہے لاہور کہ اُس کے باشندوں نے۔ اقبال کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے۔ اور فیض یاب ہونے کی کماحقہٗ کوشش

---

[1] نواب امیر خاں بانیٔ ریاست ٹونک۔ ہندوستان۔

نہیں کی۔ ایک زمانہ ضرور ایسا آنے والا ہے۔ کہ ہندوستان کی تاریخ میں پنجاب کے موجباتِ عظمت جب لکھے جائیں گے۔ تو اُن میں ڈاکٹر اقبال کا نام نمایاں حروف میں نظر آئے گا۔ اور ہر سیالکوٹی ولاہوری اقبال کا نام سے لے کر فخر کرے گا۔ لیکن اُس کا یہ فخر ندامت وشرمندگی سے تبدیل ہوجائے گا۔ جب اِس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ روہیلکھنڈ کا ایک شخص۔ صرف ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں چند گھنٹے گذارنے۔ اور بعض مسائلِ علمیہ سمجھنے کے لئے۔ گنگا۔ جمنا۔ ستلج۔ بیاس وغیرہ دریاؤں کو عبور کرکے۔ راوی کے کنارے لاہور میں پہونچ سکتا تھا۔ لیکن لاہور میں رہنے والوں کو کبھی برسوں بھی اِس اَمر کی خواہش نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر اقبال سے کچھ سُنیں اور پُوچھیں۔"

میری رائے میں ڈاکٹر صاحب بُنیادی طور پر۔ ایک مفکّر۔ ایک فلسفی اور ایک شاعر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے ہمہ گیر فکر کی پہنائی میں سیاستِ اسلامی کو بھی بڑا نمایاں مقام حاصل تھا۔ خود اُنہوں نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:۔

"میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ۔ اسلام اور اسلامی فقہ وسیاست تہذیب وتمدّن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِس مُسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت، جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی رُوح سے، جیسا کہ مختلف زمانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، رہا ہے

میں نے اِس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے۔ اسلام کی حیثیت کیا ہے۔"

با ایں ہمہ۔ یہ کہنا پڑے گا۔ کہ ڈاکٹر صاحب ایک سیاسی مفکّر تھے۔ عملی سیاست دان نہ تھے۔ کم از کم اُن عام اور مروّجہ معنوں میں سیاست دان نہ تھے جن میں مثلاً مسٹر جناح۔ سر فضلِ حسین اور مولانا محمّد علی تھے۔ عملی سیاسیّات میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے۔ کہ بسا اوقات موقع و محل کا خیال کرتے ہوئے، اور اپنے نظریے میں ترمیم و تغیر کر کے۔ فریقِ مخالف سے مفاہمت کر لینا پڑتی ہے یا پھر جب غنیم طاقت ور ہو۔ تو ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ اور اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کی خاطر اُس سے سمجھوتہ کر لینے میں بھی عار محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کو اِس قسم کی وقتی سیاست سے چنداں واسطہ نہ تھا۔ یُوں کہنا چاہیئے۔ کہ اُنہیں ایک ہنگامی لیڈر یا عملی کارکن کی بجائے۔ ایک مثالیّت پسند یعنی "آئیڈیلیسٹ" کا مرتبہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے برسوں پہلے۔ اپنی بصیرت سے یہ تو محسوس کر لیا تھا۔ کہ برِّ عظیم ہند کے مسلمانوں کی نجات کا راز صرف یہ ہے۔ کہ اِس خِطّۂ ارضی کے اُن علاقوں کو، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، علیحدہ کر کے۔ ایک جُداگانہ مملکت قائم کر دی جائے۔ لیکن جب اِس تصوّر کو معرضِ عمل میں لانے کا وقت آیا۔ تو اُنہوں نے یہ سارا کام مسٹر جناح کے سُپرد کر دیا تھا۔

ایک عملی سیاست دان کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کو دو مختلف موقعوں پر کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پہلا موقع اُس وقت پیش آیا جب وہ ۱۹۲۷ء میں

پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور دوسرا موقع وہ تھا جب اُنہیں سنہ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں مرتبہ بڑی شدّت سے محسوس کر لیا تھا۔ کہ قدرت نے اُن کو اِس قسم کے ادنےٰ اور معمولی کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کونسل کی سہ سالہ میعاد ختم ہوئی۔ تو اُنہوں نے دوبارہ ممبر بننے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور گول میز کانفرنس سے تو وہ اِس قدر برگشتہ خاطر ہوئے تھے۔ کہ استعفےٰ دے کر واپس چلے آئے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں کامیاب ترین آدمی سر فضلِ حسین تھے۔ اور گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں۔ سب سے زیادہ کامیاب آغا خان اور چودہری ظفر اللہ خاں ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؔ اور فضلِ حسین یا اقبالؔ اور آغا خان یا اقبالؔ اور ظفر اللہ خاں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور ایسا ہونا کچھ تعجب انگیز بھی نہ تھا۔

جس شخص کی ساری عمر اس طرح بسر ہوئی ہو۔ کہ ؎

اِسی کش مکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں\
کبھی سوز و سازِ رومیؔ کبھی پیچ و تابِ رازیؔ

اور جس شخص کا اپنے متعلق یہ دعوےٰ ہو کہ ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اُس نے\
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

اُس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت قائم کی ہوئی پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی مضحکہ خیز فضا میں۔ جہاں قبائلی عصبیت کا زور و شور تھا۔

اور جہاں طاقت و اقتدار کا سرچشمہ۔ ایک طرف گورنر اور دوسری طرف دیہات کے چند بڑے بڑے ناخواندہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی انقلاب بر پا کر دے گا۔ گویا جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کرنے۔ اور اپنے نفس کو فریب دینے کے مترادف تھا۔

اقبال کا یہ دعوٰے حرف بحرف صحیح ہے۔ کہ ؎

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمّت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

لیکن اسی اقبال کو۔ جب ہم نے گول میز کا نفرنس میں بھیجا۔ تو ہم یہ پیش پا اُفتادہ حقیقت نظر انداز کر گئے۔ کہ اس قسم کی کانفرنس میں سازش، ریشہ دوانی، خوشامد۔ اور منافقت کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔ وہاں بلا وجہ ہنس ہنس کر بانیں کرنے۔ اور بوقتِ ضرورت جھوٹ بول دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اقبال اُس ماحول میں۔ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ اور مستعفی ہو کر واپس آ گیا۔

اقبال کو ہم نے ترجمانِ حقیقت بھی کہہ کر پکارا۔ اُسے ہم نے حکیم الامّت کا لقب بھی دیا۔ اور اُسے شاعرِ مشرق کے نام سے بھی یاد کیا۔ لیکن یہ ہماری بد قسمتی تھی۔ کہ اقبال جس دَور میں پیدا ہوا۔ اور جس معاشرے میں۔ اُس نے آنکھ کھولی۔ وہاں زندگی کی راہیں اتنی محدود ہو چکی تھیں۔ کہ اُسے محض کسبِ معیشت کے لئے اپنی عُمر کا بیشتر حصّہ۔ عدالتوں کی خاک چھاننے میں گذار دینا پڑا۔ یہ اقبال کا قصُور نہ تھا۔ اُس معاشرے کا قصُور تھا جو ہمارے دورِ زوال میں اجنبی حکومت

نے ہم پر مسلط کر دیا تھا۔ اقبال کے دل میں ہمیشہ یہ کسک رہی۔ کہ جو کام اُسے کرنا چاہیئے تھا۔ وہ نہیں کر سکا۔ اور آخری عمر میں تو یہ احساس بہت قوی ہو گیا تھا۔ کلامِ اقبال کا ایک ذہین طالب علم۔ اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ یہ کسک محسوس کرتا ہے جو بعض اوقات نغمہ و آہنگ کے پردوں کو چیر کر۔ ایک نالۂ دل دوز کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اقبال کے جن آخری دو برسوں کی سرگزشت۔ اس کتاب کا موضوع ہے۔ اُن میں۔ اقبال کا زاویۂ نگاہ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے اندر رہ کر۔ پنجاب کے مسلمانوں کی قبائلی عصبیت کا نقشہ دیکھ چکے تھے۔ خود غرض رہنماؤں نے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو جس بے دردی سے شہری اور دیہاتی طبقوں میں تقسیم کر کے۔ مِلّی مفاد کو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ بھی اقبال کی چشمِ بصیرت کے سامنے تھا۔ اِدھر انگریز کی ہوسِ ملوکیت اور انڈین نیشنل کانگرس کی ہوسِ ملک گیری بھی اقبال کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ اِن حالات میں۔ اقبال کی طبیعت میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ اگرچہ وہ اُس وقت ایک طویل اور خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ لیکن انہوں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ اِس نازک موقع پر۔ قوم کو اُن کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ اِسی جذبے نے۔ اُنہیں مئی ۱۹۳۶ء میں۔ پنجاب مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کیا۔ اور اسی جذبے نے اُنہیں قائدِ اعظم جناح کا ایک "سپاہی" بن جانے پر مجبور کیا [1]

---

[1] اس کتاب کے تیرھویں باب میں اقبال کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا معمولی سپاہی ہوں۔"

پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک۔ تین ادوار میں سے گزری ہے۔ پہلا دور مئی ۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر اقبال کی وفات یعنی اپریل ۱۹۳۸ء میں ختم ہو گیا۔ دوسرا دور اقبال کی وفات کے بعد شروع ہوا اور سر سکندر حیات خاں کے انتقال یعنی دسمبر ۱۹۴۲ء میں ختم ہوا۔ اور تیسرا دور سر سکندر کی وفات سے شروع ہو کر اگست ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ میری پختہ رائے ہے کہ جب تک ان تینوں ادوار کی مفصل تاریخ نہ سمجھ لی جائے۔ ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ قطعاً سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پہلے دور کی تاریخ تو میں نے اپنے ناچیز فہم کے مطابق مرتب کر دی ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی۔ اور معاش کی مجبوریوں نے کچھ عرصے کے لئے مہلت دی۔ تو شاید دوسرے اور تیسرے دور کی تاریخ بھی اسی طرح مرتب ہو جائے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام حکومت کا تھا۔ جس کے لیے اندازہ وسائل ہے۔ گزشتہ بارہ سال سے۔ پاکستان کے بہت سے اہلِ دانش و بینش متمتع ہو رہے ہیں نہ کہ مجھ ایسے فقیر بے نوا کا۔ جسے محض جان و جسم کا رشتہ بحال رکھنے کے لئے انگلستان میں صبح و شام مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اور جو بڑی حد تک فراغت و اطمینان کی دولت سے بھی محروم ہے۔

مدت ہوئی سنا تھا۔ کہ حکومت نے، حصولِ پاکستان کی جدوجہد کی ایک جامع تاریخ لکھنے کے لئے، علماء و فضلاء کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس دوران میں۔ بار بار حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کمیٹی کا کیا حشر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کمیٹی کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور زرخیز ہوں گے۔ اور اس کے راستہ میں۔ وہ مالی دشواریاں بھی

حائل نہیں ہوں گی۔ جن کا شکار تصنیف و تالیف کا شغل رکھنے والے لوگ بالعموم ہوتے ہیں۔ مجھے اُس کمیٹی کے اراکین سے ہمسری کا، حاشا وکلّا، کوئی دعوٰے نہیں۔ اور نہ میں اس قسم کی گستاخی کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ لیکن اتنا عرض کرنا تو شاید سوءِ ادب میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ کہ اب تک اُس کمیٹی کی کوششوں کا کوئی قابلِ ذکر نتیجہ، کم از کم، میری نظر سے نہیں گذرا۔

مجھے اندیشہ ہے۔ کہ شاید اِس کتاب کے نام سے۔ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ کہ میں نے اقبالؔ کی زندگی کے آخری دو برسوں کی تمام جزئیات کا احاطہ کیا ہے۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں۔ کہ اِس قسم کی غلط فہمی کا ابھی ازالہ کر دیا جائے گذارش ہے کہ میں نے اقبالؔ کی بیماری یا اُن کی شاعری یا اُن کی خانگی زندگی کے بارے میں۔ کچھ نہیں لکھا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے آخری دو برسوں میں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو فروغ دینے۔ اور مسٹر جناح کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے۔ جو کچھ کیا تھا۔ اُس کی ایک جامع اور مستند روئیداد مرتّب کر دی جائے۔

مسٹر جناح، جب ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کے لئے۔ لاہور تشریف لائے تھے۔ تو یونینسٹ پارٹی کے رہنماؤں نے۔ اُن کی بات ماننے۔ اور اُن کے ساتھ تعاون کرنے سے۔ انکار کر دیا تھا۔ اِس انکار کے بعد۔ مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر امداد و اعانت کی درخواست کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے ہر ممکن مدد دینے کا بہ طیبِ خاطر وعدہ کیا۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۳۶ء سے لے کر اپنے یوم وفات یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک۔ اقبالؔ

نے اپنی صحت کی واماندگی کے باوجود، جس گرم جوشی، انہاک اور جذبات سے مسٹر جناح کی مدد کی۔ اور جس خلوص و صداقت سے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو فروغ دینے کی سعی فرمائی۔ یہ کتاب اُس جد و جہد کی ایک دلچسپ اور سبق آموز تاریخ ہے۔

۱۹۴۳ء میں۔ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف نے۔ اقبال کے تیرہ خطوں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا تھا۔ یہ خطوط ڈاکٹر صاحب نے ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء تک، مختلف اوقات میں مسٹر جناح کو لکھے تھے۔ اِس مختصر مجموعے کے دیباچے میں، قائدِ اعظم فرماتے ہیں۔ کہ

"...... مسلم لیگ کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ کہ اُس کی قیادت کو مسلمانوں کی اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے قبول کر لیا۔ لیگ کو اِس منزلِ کامرانی تک پہنچنے میں۔ سر محمد اقبال کی کوششوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ گرچہ عوام کو اُس وقت۔ اِن کوششوں کا علم نہیں ہو سکا ...... میرے نزدیک یہ خطوط بے حد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالخصوص وہ خطوط۔ جن میں اقبال نے۔ اسلامی ہند کے مستقبل کے بارے میں۔ اپنے خیالات کا نہایت واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اظہار کیا ہے۔"

میری اِس کتاب کو۔ اقبال کی اُن کوششوں کا، جن کی طرف قائدِ اعظم نے سطورِ بالا میں ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ ایک مفصل اور مبسوط تذکرہ سمجھنا چاہیئے۔ میں نے جب اِس کتاب کا خاکہ مرتب کیا۔ تو مجھے محسوس ہوا۔ کہ اگر اس

داستان کو یک لخت مئی ۱۹۳۶ء سے بیان کرنا شروع کیا۔ تو بحث کے متعدد پہلو تشنہ رہ جائیں گے۔ بہت سے نکتے صاف نہیں ہو سکیں گے۔ اور بہت سی اُلجھنیں جُوں کی تُوں قائم رہیں گی۔ مثلاً اگر ہم ماضی کے اہم گوشوں پر سے نقاب اٹھائے بغیر۔ ایک دم یہ کہنا شروع کر دیں۔ کہ مئی ۱۹۳۶ء میں۔ یونینسٹ پارٹی نے مسٹر جناح سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو لا محالہ دَورِ حاضر کا ایک نوجوان، جو حال ہی میں اپنی تعلیم ختم کر کے کالج سے نکلا ہے سوال کرے گا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کیا چیز تھی؟ یہ جماعت کب اور کیونکر بنی تھی؟ اس پارٹی کے کیا اصُول تھے؟ اس پارٹی نے پنجاب کی سیاسیات میں کیا حصہ لیا تھا؟ یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے سے کس بنا پر انکار کیا تھا؟ اقبال اور جناح کو یونینسٹ پارٹی سے کیا اختلاف تھا؟ غرض اس نوع کے بے شمار شکوک و شبہات ہی نہیں۔ بلکہ اہم سوال دل میں پیدا ہوں گے۔ جن کا تشفی بخش جواب دیئے بغیر ہم اس داستان کو ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

وقت کی رفتار تیزی سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور سیاسی حالات میں جس سُرعت سے تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر کل کی بات آج گویا برسوں کی پُرانی بات معلوم ہونے لگتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جو بچے تھے وہ آج جوانِ رعنا بن چکے ہیں۔ جو لوگ اُس وقت جوان تھے وہ اب پیری کی سرحدوں کو چھو رہے ہیں۔ اور جو کہن سال تھے۔ وہ مدت ہوئی اس رباطِ کہنہ سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج کے نوجوان کو کچھ معلوم نہیں

کہ یونینسٹ پارٹی کیا چیز تھی ۔ کب اور کیونکر بنی تھی ۔ اور مسلم لیگ سے اس کا تصادم کن اسباب کی بنا پر ہوا تھا ۔ اُس نوجوان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تقسیم کس نے پیدا کی تھی ۔ اس تقسیم کا ہماری سیاست پر کیا اثر پڑا تھا ۔ اور انجام کار اس تقسیم کے ہاتھوں ، ہم کن مشکلات کا شکار ہو گئے تھے ۔

ان تمام اُمور کی وضاحت ۔ اور تمام عقدوں کی گرہ کشائی کے لئے ۔ یہ ضروری ہے کہ میں یُونینسٹ پارٹی کی ہئیت تعمیر اور شہری ، دیہاتی تفرقے کی تقسیم کی داستان کو ۔ کسی قدر تفصیل سے بیان کردوں ۔ تاکہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان ۔ جو اقبال کے آخری ۲ دو برسوں کی اس سرگذشت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اُس پس منظر سے بھی کما حقہٗ واقف ہو سکیں ۔ جس نے ان تمام قومی فتنوں کو جنم دیا تھا ۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے ؎

خلق را فتنۂ ایں شہر فراموش شدہ
زخم پنہاں بنمائیم و خبر تازہ کنیم

چنانچہ انہی خیالات و احساسات کے زیر اثر ۔ میں نے اس کتاب کو ۲ دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔ پہلا حصہ ، جس کا عنوان پس منظر ہے ۔ گویا اسباب و علل کی وہ کڑی ہے ۔ جس کے طبعی نتائج آگے چل کر رُونما ہوئے ۔ اور جن نتائج سے ۔ عہدہ برآ ہونے کے لئے ۔ قدرت نے اقبال اور جناح کے درمیان ۔ ذوق و نظر کی یگانگت اور فکر و عمل کی وحدت پیدا کر دی ۔ جب تک اس پس منظر کا بغور مطالعہ نہ کر لیا جائے ۔ آنے والے دَور کی ماہیت یا تفصیل کا سمجھنا محال ہے ۔

اقبال کے اِن آخری دو برسوں میں، جن کا مرقع آپ کو اِس کتاب کے اوراق پر نظر آئے گا۔ جن اصحاب عزم و ہمت نے۔ اقبال کی زیرِ ہدایت۔ ملک و ملت کی خدمات سرانجام دیں۔ اُن میں ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین اور ملک زمان مہدی خاں کے اسمائے گرامی بڑی قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ اِن لوگوں نے حد درجہ نامساعد حالات کے باوجود، پنجاب میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا۔ اور پھر اُس پرچم کو، ایک لمحہ کے لئے بھی، سرنگوں نہ ہونے دیا۔ مجھے ہمیشہ اِس بات پر فخر رہے گا۔ کہ، اپنے علم و عمل کی بے مائگی کے باوجود میں بھی اُس پُرخطر دور میں۔ اِن واجب الاحترام دوستوں کا شریکِ کار تھا۔ میں عمر میں اِن سب سے چھوٹا تھا۔ قابلیت، تجربے اور سیاسی فہم و فراست میں بھی۔ ان سب سے فروتر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اِن دوستوں نے۔ مجھے اپنے برابر مسند پر جگہ دی۔ بڑی سے بڑی ذمہ داری کا کام میرے سپرد کیا۔ اور اکثر موقعوں پر۔ میری رائے کو اپنی رائے پر فوقیت عطا کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اگر آج ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین اور غلام رسول خاں زندہ ہوتے۔ تو یہ کتاب لکھنے کا فائق حق اُنہی کا تھا۔ افسوس کہ اِن لوگوں کے اُٹھ جانے کے بعد۔ اِس فرض کی بجا آوری مجھ ہیچمدان کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ حالی نے یہ کہہ کر شاید میرے ہی جذبات کی ترجمانی کی ہے ؎

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

میں لئے جب ابتدا ہیں۔ غلام رسول خاں کی معیّت میں۔ لیگ کے جائنٹ سکرٹری کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ تو مجھے اُن کے مزاج کی تیزی سے ڈر لگتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ شاید ہم زیادہ دیر تک اکٹھے کام نہیں کر سکیں گے لیکن تھوڑی مدت گذر نے پائی تھی کہ ہم بالکل شیر و شکر ہو گئے۔ غلام رسُول خاں دِل کے صاف۔ زبان کے کھرے اور عمل کے بے لَوث تھے۔ اُنہیں اپنے الفاظ کا بےحد پاس تھا۔ چنانچہ وہ جو کچھ کہتے تھے۔ اُس پر چٹّان کی طرح جم کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اُن کی اِسی ادا نے۔ مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ علّامہ اقبال جب ۱۹۳۳ء میں افغانستان تشریف لے گئے تھے تو غلام رسول خاں اُن کے سکرٹری کی حیثیت سے ساتھ گئے تھے۔

پیر تاجُ الدّین کی باغ و بہار شخصیت۔ تمام دوستوں کے لئے ایک نعمت تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے تو اُن کی بڑی پُرانی یاری تھی۔ اور بے تکلّفی بھی غایت درجہ تھی۔ قائدِ اعظم سے بھری محفل میں مذاق کرنے۔ اور اُن پر فقرہ چُست کرنے کا حوصلہ بھی پیر صاحب ہی کو تھا۔ قائدِ اعظم اُن کے مزاج سے واقف تھے۔ اِسلئے ہمیشہ ایسے موقع پر۔ ہنس کر ٹال جاتے۔

ملک برکت علی کی محبت وشفقت آفریں یاد سے۔ آج بھی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک پیکرِ صدق و صفا اور مجسّمۂ خلوص و محبّت تھے۔ پنجاب کا کیا ذِکر ہے۔ ہندوستان بھر میں اُن کے پائے کے بہت کم آدمی پیدا ہوئے ہیں۔ اُنہیں جنّاح سے عِشق تھا۔ ملک برکت علی کی عظیم الشان شخصیت سے ہٹ کر۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں۔ بلکہ

ناممکن ہے۔ وہ تن تنہا ایک انجمن کا کام کرتے تھے۔ مجھے طبعاً سیاست گردی سے کوئی رغبت نہیں۔ لیکن یہ ملک برکت علی کے اصرار کا نتیجہ تھا۔ کہ میں نے اپنی زندگی کے بہترین دس بارہ سال سیاست کی غوغا آرائیوں کی نذر کر دیئے۔

شروع میں خیال تھا، کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی جائے گی۔ اس طرح سب سے بڑی سہولت یہ پیش نظر تھی۔ کہ کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے جس قدر مواد میسر آ سکا۔ وہ تمام تر انگریزی میں تھا۔ اگر کتاب انگریزی میں لکھی جاتی تو اس سارے مواد کا اردو میں ترجمہ کی زحمت سے بچ جاتا لیکن بعد میں چند دوستوں نے اردو کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور فرمایا۔ کہ اگر ہم لوگوں نے بھی اپنی قومی زبان سے غفلت برتی۔ تو پھر اس ضمن میں۔ اغیار سے کیا توقع کی جا سکتی ہے بہرحال میرا خیال ہے۔ کہ شاید آگے چل کر۔ اس کتاب کا ایک انگریزی ایڈیشن بھی تیار کرنے کی نوبت آئے گی۔

کتاب کا مواد فراہم کرنے میں۔ جس چیز نے زیادہ پریشان کیا۔ وہ لاہور، دہلی، کلکتہ وغیرہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کے۔ بیس پچیس سال قبل کے۔ پرانے پرچے تھے۔ بعض پرچے تو میرے کاغذات میں پہلے سے موجود تھے اور جو موجود نہیں تھے۔ اُن کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ بہرکیف خدا کا شکر ہے۔ کہ جن پرچوں کی ضرورت پیش آئی۔ وہ سعی بسیار کے بعد عین وقت پر مل گئے۔ البتہ اس سلسلے میں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ قائد اعظم کے بعض بے حد اہم خطوط جو انہوں نے ملک برکت علی کو لکھے تھے۔ دستیاب نہ ہو سکے۔

ملک صاحب کا قاعدہ تھا۔ کہ وہ ضروری کاغذات کا ایک ایک پرزہ بڑی

احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے۔ قائد اعظم کے اِن خطوں کو بھی۔ انہوں نے ایک بہت بڑے لفافے میں بند کر کے ۔ اپنی کتابوں کی الماری میں مقفّل کر رکھا تھا میں نے یہ خطوط ملک صاحب کی زندگی میں کئی بار دیکھے تھے۔ اب اِس کتاب کے لکھنے کی نوبت آئی ۔ تو اُن خطوں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں نے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ تمام خطوط ضائع ہو گئے ہیں۔ اِس متاعِ گراں مایہ کے تلف ہو جانے کی۔ جو مختلف روایتیں پیش کی گئی ہیں۔ خدا شاہد ہے۔ مجھے اُن میں سے۔ ایک روایت بھی قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتی۔

غلام رسول خاں کے پاس بھی۔ بعض اہم دستاویزیں موجود تھیں۔ جو اگر آج مل جاتیں تو اِس کتاب کی معنوی حیثیت زیادہ بلند ہو جاتی۔ لیکن افسوس کہ یہ ذخیرہ بھی ۔ اُن کی وفات کے بعد ضائع ہو گیا۔ غلام رسول خاں کا انتقال مارچ ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ میں اُس وقت لاہور سے باہر تھا ۔ جب واپس آیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اُن کی لائبریری کی قانونی کتابیں تو بعض وکلاء نے قیمت ادا کر کے خرید لی ہیں۔ اور کاغذات کے انبار کو۔ بے کار سمجھ کر جلا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اُسی انبار میں۔ بعض ایسے نوادر بھی تھے۔ جو آج میرے لئے چاندی اور سونے سے بڑھ کر قیمتی ثابت ہوتے۔

یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک کتاب کی طباعت و اشاعت کا تعلق ہے۔ اُس کی ذمہ داری اقبال اکیڈمی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس کے ایک ایک لفظ کی صداقت کا میں ذمہ دار ہوں۔

لندن کی مصروف وگرانبار زندگی کے جھمیلوں۔ اور نان ونمک کے دھندوں سے۔ بصد مشکل فرصت کے چند گھنٹے نکالنا۔ اور پھر اُن چند گھنٹوں کو۔ برٹش میوزیم یا انڈیا آفس لائبریری کے ایک گوشے میں بیٹھ کر۔ اس طرح خرچ کرنا کہ کم سے کم وقت میں۔ زیادہ سے زیادہ کتابوں اور اخباروں کو کھنگالا جا سکے۔ ایک ایسا ٹیڑھا کام تھا۔ جس سے خوش اسلوبی کے ساتھ۔ عہدہ برآ ہونے کا سلیقہ مجھے کبھی نہ آیا۔ یُوں بھی، فراغِ خاطر و جمعیتِ قلب کی وہ آسائش۔ جو تصنیفی کام کے لئے سب سے ضروری چیز ہے۔ اس تمام عرصے میں۔ مجھے ایک روز بھی میسّر نہ آسکی۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم؛

خاطر مسلسل است و پریشاں چو زُلفِ یار
عیبم مکُن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ام

عَاشق حُسین بٹالوی

لندن :-

۱۵ رمئی ۱۹۵۹ء

پہلا باب

سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت

سنہ ۱۹۱۹ء کا جلیانوالہ باغ ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا اہم موڑ ہے۔ جس کے بعد اس برِ عظیم کی سیاسیات نے یکسر نیا رُخ اختیار کر لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب سے ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تھی۔ یہاں صحیح معنیٰ میں صرف دو انقلاب آفریں واقعات پیش آئے۔ ایک سنہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم۔ اور دوسرا جلیانوالہ باغ کا حادثہ۔ تو اسے مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ دونوں مرتبہ تاریخ کے دو بالکل نئے باب ہماری آنکھوں کے سامنے لکھے گئے اور دونوں بار ہمیں سیاسیات کے ایسے عقدوں کی گرہ کشائی کرنا پڑی جن کے دُور رس نتائج کا پہلے سے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آزاد و خود مختار ہندوستان کی وہ مدھم سی شمع جو لال قلعہ کے درودیوار پر روشنی ڈال رہی تھی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ اور برطانوی شہنشاہیت کی بنیادیں اس ملک میں مضبوط سے مضبوط تر ہو گئیں اس کے بالکل برعکس باسٹھ ۶۲ سال کے بعد جلیانوالے باغ کے حادثہ نے جس قومی تحریک کو جنم دیا تھا۔ اسی تحریک نے آگے چل کر ہندوستان میں برطانوی

حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اور اسی تحریک نے ایسے برگ و بار پیدا کئے جن کی آب و تاب سے آج برِّعظیم کے دونوں ملک یعنی بھارت اور پاکستان جگمگا رہے ہیں۔

جلّیاں والے باغ کا حادثۂ خونیں کا صرف ایک شخص ذمّہ دار تھا۔ سر مائیکل اوڈوائر۔ جس نے مئی ۱۹۱۳ء سے مئی ۱۹۱۹ء تک پنجاب پر حکومت کی۔ قدرت کی یہ بہت بڑی ستم ظریفی تھی کہ اُس نے سر مائیکل کو بیسویں صدی کے رُبعِ اوّل میں پنجاب کا حکمران بنایا۔ حالانکہ وہ اپنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے اس قدر شوریدہ سر۔ مطلق العنان اور بے لگام شخص تھا کہ اُسے اُنیسویں صدی کے رُبعِ اوّل میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ مائیکل اوڈوائر جب ۱۹۱۳ء میں پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بن کر آیا تو اُس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اِس صوبے کی تعلیم یافتہ جماعت کو ایسا کچل کر رکھدے کہ وہ سر نہ اُٹھا سکے۔ اوڈوائر کا خیال تھا کہ پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ جن میں مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ صبح و شام انگریزی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اخبارات میں انگریزوں کا تختہ اُلٹ دینے والے مضامین چھپتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر۔ سکولوں کے مدرّس۔ عدالتوں کے وکلاء اور جرائد و رسائل کے ایڈیٹر باہم مل کر ایسی انجمنیں بناتے ہیں۔ جن میں برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں۔ اِسی قسم کے بے سر و پا اور دُور از کار اوہام نے بڑھتے بڑھتے اُسے اِس قدر مضطرب اور پریشان کر دیا تھا کہ وہ پنجاب میں کسی معمولی اور بے ضرر سی آئینی تحریک کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ

اُس نے پنجاب میں آنے کے فوراً بعد جو تقریر کی۔ اُس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"مجھے صوبائی حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا کہ میرے پاس بعض لوگوں نے ایسی تجاویز بھیجنا شروع کردی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ اِس صوبے کے نظم و نسق میں کیا کیا اصلاحات ہونی چاہئیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے حصول کے لئے عوام جو اُمیدیں اور آرزوئیں قائم کئے بیٹھے ہیں۔ مجھے اُن کی پذیرائی کیونکر کرنا چاہیئے۔ عدالتی اور انتظامی امُور کو ایک دوسرے سے الگ کردینے کی بھی تحریک ہورہی ہے۔ میں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ اِس قسم کی خیالی اور غیر حقیقی باتیں اپنی جگہ کتنی ہی دلکش اور جاذبِ نظر کیوں نہ ہوں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ اگر یہ مختلف تجویزیں بھیجنے والے لوگ مجھے یہ بتاتے کہ حکومت کو اپنے اِس اصل مقصد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سے بہتر ذرائع اختیار کرنا چاہئیں۔ تو وہ اپنی قوم اور اپنے صُوبے پر زیادہ احسان کرتے۔ نیز میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ حکومت کا یہ بنیادی مقصد (جان و مال کی حفاظت) دیگر تمام امورپر، خواہ اُن کا تعلّق حکومت کے نظم و نسق کی اصلاح یا حکومت خود اختیاری کی تحریک سے ہو، بہر صورت مقدم ہے۔"

نظر بظاہر اوڈوائر کا خیال تھا کہ پنجاب میں انگریزی راج قائم ہونے کے چونسٹھ سال بعد بھی یہاں لوگوں کا جان و مال قطعاً محفوظ نہ تھا۔ اور اُسے اپنی حکومت کے دوران میں جو سب سے بڑا کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ اس صوبے کے لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے۔ اور اُن کا مال بھی اغیار کی دستبرد سے بچ جائے اگر اوڈوائر نے ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں آکر عمالِ حکومت کی بے بسی۔ اور ارباب حلّ و عقد کی نا اہلی کا یہ دِل خراش نظارہ دیکھا تھا کہ یہاں نہ کسی کا مال محفوظ ہے اور نہ کسی کی جان و آبرو محفوظ۔ تو انگریزی حکومت کا جس قدر ماتم کیا جائے تھوڑا ہے۔ کہ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں بھی اپنی مظلوم و مقہور رعایا کو امن و عافیت کی اُس ابتدائی نعمت سے بھی بہرہ ور نہ کرسکی جس کے بغیر روئے زمین پر کوئی حکومت چار دن زندہ رہنے کا استحقاق نہیں رکھتی۔

ہم جان لارنس سے لے کر لوئی ڈین تک اُن متعدد انگریز مدبروں کے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ جو ۱۸۴۹ء سے ۱۹۱۳ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہ چکے تھے؟ کیا یہ سب کے سب اس قدر نا اہل اور بے تدبیر لوگ تھے کہ اس صوبے کے عوام کو جان و مال کی حفاظت کا بھی اطمینان نہ دِلا سکے؟ کیا ان میں سے ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جس پر یہ نکتہ منکشف ہوا ہو کہ حکومت کا اصل مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے؟ ایچیسن لائل، فٹنرسٹرک، ینگ ت ۔ ریواز۔ ابٹسن، لوئی ڈین۔ یہ چند نام پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اور بہت سے لوگ اب بھی ان ناموں کا

احترام کرتے ہیں۔ لیکن سر مائیکل اوڈوائر کا خیال تھا کہ اُس کا کوئی بیٹل رونہ تو حکومت کے حقیقی مقصد سے آگاہ تھا۔ اور نہ عوام کی بنیادی ضروریات ہی سے اس کو واقفیت تھی۔

۱۹۱۳ء میں بھی آئینی اصلاحات کے اعتبار سے پنجاب ہندوستان کے اکثر صوبوں سے پیچھے تھا۔ بعض صوبوں میں لفٹنٹ گورنر کی مدد کے لئے ایگزیکٹو کونسل موجود تھی۔ جس میں اگرچہ نامزدگی کا اصول کارفرما تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں کے مقامی باشندوں کا ایک آدھ نمائندہ صوبہ کے حاکم اعلےٰ کی اعانت کے لئے کام کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں پنجاب میں بھی یہ تحریک اٹھی کہ لفٹنٹ گورنر کو صوبے کا نظم و نسق بہتر طریق پر چلانے کے لئے ایگزیکٹو کونسل قائم کرنا چاہئیے۔ سر مائیکل اوڈوائر اس تحریک پر سخت ناراض ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اوّل تو صوبے کے لوگوں کو حکومت کے کاموں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ دوم اُن کی اپنی ذات پورے پنجاب کے امن و عافیت اور اس کی ترقی و کامرانی کے لئے کافی ہے۔ اوڈوائر سمجھتا تھا کہ اس تحریک کے پیچھے بھی پنجاب کی تعلیم یافتہ آبادی کا وہ عنصر کام کر رہا ہے۔ جو بباطن باغیانہ خیالات رکھتا ہے۔ لیکن بظاہر آئینی اور دستوری تحریکوں کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اُس نے ایگزیکٹو کونسل کے قیام کی تجویز کے جواب میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۴ء کو جو تقریر کی۔ وہ اُس کی ذہنیت کی بڑی حد تک عکاسی کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"مجھے یہ تجویز سُن کر بے حد تعجب ہوا ہے۔ اس صوبے کے لوگ ابتدا سے لفٹنٹ گورنر کو صوبے کا تنہا حاکم اعلےٰ۔ اور یہاں کے نظم و نسق کا

بلا شرکتِ غیرے واحد ذمہ دار سمجھنے کے عادی ہیں۔ اِس نظام کے تحت
پنجاب نے خوب ترقی کی ہے۔ اور میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اِس ضمن
میں پنجاب ہندوستان کے کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہا۔ پھر بتایئے
کہ ایگزیکٹو کونسل کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں اگر آپ یہ ثابت کر سکیں
کہ یہاں کے نظم و نسق میں بعض ایسی خرابیاں ہیں جن کا تدارک
ایگزیکٹو کونسل کے بغیر نہیں ہو سکتا تو میں شاید اس تجویز پہ غور
کر سکوں گا۔"

بنا بریں اوڈوائر کا مطلب یہ تھا کہ "جو کچھ ما بدولت تم کو دیتے ہیں۔ اُسی میں
تمہارا فائدہ ہے۔ جو کچھ سرکار تمہارے لئے سوچتی ہے۔ اُسی میں تمہاری بہتری ہے
اور پنجاب کے حال اور مستقبل کے بارے میں جو تجویز لاٹ صاحب کے ذہن میں
آتی ہے۔ اُسی میں تمہاری خیر و عافیت ہے۔ اِس لئے کسی ایگزیکٹو کونسل یا کسی
ایسی جماعت کی جس میں جمہور کے نمائندے شریک ہو کر نظم و نسق میں حصّہ لے
سکیں قطعًا ضرورت نہیں۔ نہ اِس قسم کی کونسل یا نمائندہ جماعت سے صوبے
کے انتظام و انصرام کو کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔"

اگر اوڈوائر کے اس نظریے کو تسلیم کر لیا جاتا تو ہندوستان میں آئینی اور
دستوری اصلاحات ایک قدم آگے نہ بڑھا سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اوڈوائر
ذہنی طور پہ اُس معمولی اور بے حقیقت سی نمائندہ حکومت کا بھی حامی نہیں
تھا جو منٹو مارلے اصلاحات کے تحت ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں قائم تھی۔ مسلمانوں
کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ اُن کا تعلیم یافتہ شہری طبقہ ترکی اور افغانستان کے ساتھ

مل کر ہندوستان میں شورش بپا کرنا چاہتا ہے۔ اِس سلسلہ میں اُس نے ظفر علی خاں۔ محمد علی۔ انصاری۔ عبید اللہ سندھی اور برکت اللہ بھوپالی وغیرہ کو نام لے لے کر مطعون کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ ترکی۔ افغانستان اور جرمنی سے ہندوستان کے شورش پسند مسلمانوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں۔ اور اس روپے کو برطانیہ کا تختہ اُلٹ دینے کے لئے بے دریغ ہندوستان میں خرچ کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں اور سکھوں کے بارے میں اوڈوائر کی رائے تھی کہ ان کا تعلیم یافتہ شہری طبقہ بھی برطانیہ کے دشمن ممالک سے سازباز کر کے ہندوستان میں باغیانہ خیالات پھیلانے اور مسلح شورش بپا کرنے میں دن رات مصروف رہتا ہے لاجپت رائے۔ پرمانند۔ اجیت سنگھ۔ ہردیال۔ مہندر پرتاپ وغیرہ اِس سازش کے سرغنہ ہیں۔ اور اِن کے توسل سے ہندوستان میں انقلاب برپا کرنے کی تیاریاں بڑی گرم جوشی سے ہو رہی ہیں۔

اوڈوائر نے لفٹننٹ گورنر کی کرسی پر بیٹھتے ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ، جائز و ناجائز، ہر ممکن طریقے سے پنجاب کے تعلیم یافتہ طبقہ کی اِن سازشوں کو، جن کا وجود حقیقتاً اُس کے نہاں خانۂ دماغ سے باہر کہیں نہیں تھا۔ ختم کر کے چین لے گا۔ مصیبت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اکثر و بیشتر انگریز حکام ذہنی طور پر اس قدر خوف زدہ ہو چکے تھے کہ انہیں عوام کے معمولی اور بے ضرر قسم کے سیاسی احتجاجات سے بھی بغاوت اور غدر کی چنگاریاں چھوٹتی نظر آتی تھیں۔ اوڈوائر یقیناً اس قبیلے کا مائوف ذہن رکھنے والا انسان تھا۔

اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے جو تجویز اُسے سب سے آسان اور مفید نظر آئی۔ وہ یہ تھی کہ پنجاب کی دیہاتی آبادی کو کسی نہ کسی طرح شہری آبادی کا حریف بنا دیا جائے تاکہ وہ دیہاتی آبادی کی کثرت اور دیہات میں بسنے والے لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر سیاسی تحریکوں کو کچل سکے۔ اوڈوائر کو نہ تو گاؤں کے لوگوں سے محبت تھی۔ اور نہ شہر کے باشندے اُس کو عزیز تھے۔ وہ تو محض ایک سیاسی چال سوچ رہا تھا۔ جس سے بیک وقت دو فائدے مدّ نظر تھے ایک یہ کہ دیہاتیوں کو ممنونِ احسان بنا کر اُنہیں یقین دلا دیا جائے کہ شہری باشندے اُن کے دشمن ہیں۔ اور حکومتِ خود اختیاری یا آئینی اصلاحات کے لئے شہروں میں جو شور اُٹھ رہا ہے۔ وہ محض مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگوں کی شرارت ہے۔ جس سے وہ خود آگے بڑھنا اور فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ دیہاتی آبادی کو شہر کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بدگمان کرنے کے بعد وہ نہایت آسانی سے آئینی اصلاحات کی تحریکوں کو ختم کر سکے گا۔ اور یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ پنجاب کی اسّی فیصدی آبادی مروّجہ آئین و دستور میں کسی تبدیلی کی خواہاں نہیں۔ لہٰذا کم از کم پنجاب کو مزید اصلاحات سے مستثنیٰ رکھا جائے۔

اوڈوائر کی یہ تجویز بڑی خطرناک تھی۔ اور اُس نے ایک ہوشیار شاطر کی طرح اِس تجویز کو بروئے کار لانے میں شطرنج کے ہر مہرے کو نہایت احتیاط سے حرکت دی۔ لیکن ایک طرف تو اُس کی بدقسمتی سے خود برطانیہ میں لطف اس قسم کے عناصر کارفرما ہونے لگے۔ اور وہاں ایسے افراد برسرِ اقتدار ہو گئے جن کے سامنے اوڈوائر کی پیش نہ چل سکی۔ اور دوسری طرف اُس کا جوش اور غلو

خود اُس کے لئے دو دھاری تلوار ثابت ہوا۔ مسٹر مانٹیگو کے وزیر ہند بننے کے بعد اوڈوائر کی سوچی سمجھی ہوئی تجویزیں اس لئے حسب منشا نتائج پیدا نہ کر سکیں کہ وزیر ہند موصوف اور لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے دونوں ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کے حامی تھے۔ ادھر اُس نے پنجاب میں مارشل لاء جاری کر کے۔ اور جلیانوالہ باغ کی زمین کو محبانِ وطن کے خون سے رنگین کر کے خود اپنے لئے ایک ایسی آزمائش کھڑی کر لی تھی جو انجام کار اُس کی ساعتِ موعودہ اور طامۃ الکبریٰ ثابت ہوئی۔

تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اوڈوائر نے پنجاب میں دیہاتی اور شہری آبادی میں باہمی تفرقے کا جو بیج بویا تھا۔ وہ خُوب رنگ لایا۔ اور اس بیج سے جو خاردار جھاڑیاں اُگیں۔ انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست و معاشرت کو مسلسل تیس سال تک رنج و محن میں مبتلا کئے رکھا۔ اس تفرقے نے مسلمانوں کے قومی مفاد کو سراسر مصنوعی اور غیر حقیقی رخنوں میں تقسیم کر دیا۔ اسی تقسیم کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں کی مجموعی طاقت جس سے مستفید ہونے کے وہ ہر اعتبار سے مستحق تھے۔ کبھی متحد ہو کر غنیم کے مقابلہ میں صف آرا نہ ہو سکی۔ اسی تقسیم کے ہاتھوں سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کا وہ بے کار عنصر داخل ہو گیا جو ہمارے اُس وقت کے برادرانِ وطن کے عنصر کے مقابلے میں بیحد کمزور اور فروتر تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری قوم پر نالائقی اور نااہلی کا دھبہ لگ گیا اور آخر میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسی تقسیم نے وہ گل کھلائے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے پنجاب میں اسلامی وحدت کے بنیادی اور عالمگیر اصولوں کو بے دردی سے قبائلی عصبیت کے بتوں پر قربان ہوتے ہوئے دیکھا۔

جاٹوں کی الگ انجمنیں قائم ہو گئیں۔ راجپوتوں نے اپنی علیحدہ مجلسیں کھڑی کر لیں۔ اعوانوں کے اڈے الگ قائم ہو گئے۔ مغلوں، پٹھانوں اور آرائیوں نے اپنی اپنی الگ ٹولیاں بنا لیں۔ اور ستم یہ ہوا کہ یہ تمام انجمنیں اس غرض سے قائم نہیں کی گئی تھیں کہ مسلمانوں کی مختلف برادریوں کے سرکردہ ارکان اپنے اپنے بھائی بندوں کی تعلیم کا بہتر انتظام کریں۔ یا اپنی معاشرت کی اصلاح فرمائیں یا غیر ضروری اور مسرفانہ رسوم کا ازالہ کر کے قوم کی اقتصادی حالت کو درست کریں۔ ان انجمنوں کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی حقوق کے بٹوارے میں جاٹوں کا کتنا حصہ نکلے گا اور راجپوتوں کے پلے کیا کچھ پڑے گا۔ مجلس قانون ساز میں مغل اور پٹھان کتنی نشستوں پر قبضہ کر سکیں گے۔ اور اعوانوں اور ٹوانوں کو کتنی وزارتیں ملیں گی۔

اس نفسا نفسی میں پڑ کر ہم یہ بھول گئے کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے کے لئے ہندوستان کے پینتیس ۳۵ منتخب مسلمانوں کا وفد شملہ گیا تھا۔ تو اُس وفد کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ مسلمان من حیث القوم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکیں۔ اور اغیار کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں اپنی مجموعی قوت کو منظم کر کے اس ملک میں عزت مندانہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہو جائیں۔ وفد کے اراکین کو شاید خواب میں بھی یہ بات نظر نہ آئی ہو گی کہ اس جداگانہ نیابت کے طفیل پنجاب کے مسلمانوں کو جو مراعات حاصل ہوں گی۔ اُن سے متمتع ہونے کے لئے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ بلکہ جاٹوں۔ راجپوتوں۔ پٹھانوں۔

مغلوں اور اعوانوں کی الگ الگ ٹولیاں بن جائیں گی۔ اور یہ ٹولیاں اپنے اپنے قبیلے کے جھنڈے اٹھا کر۔ اور اپنے اپنے قبیلے کی عزت و ناموس کا واسطہ دے کر اپنے نمائندے منتخب کریں گی۔ مسٹر ہائیکل اوڈوائر پہلا شخص تھا جس نے حد درجہ ہوشیاری اور چالاکی سے پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کو شہری مسلمانوں کا حریف بنا کر اس صوبے میں مسلمانوں کی قومی وحدت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ؎

ایک بات مجھے بہت آگے چل کر کہنی چاہیئے لیکن شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی

؎ مجھے یہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں قائد اعظم لاہور آئے ہوئے تھے اور ملک خضر حیات ٹوانہ سے گفت و شنید شروع تھی۔ ایک روز ملک برکت علی نے قائد اعظم کو اپنے ہاں چائے کی دعوت دی۔ دعوت کا انتظام کوٹھی کے سامنے گھاس کے میدان میں کیا گیا تھا۔ لیکن عین وقت پر بارش آگئی اور تمام سامان کمروں میں آراستہ کرنا پڑا۔ قائد اعظم صوفے پر تشریف فرما تھے اور ملک صاحب ہر دس منٹ کے بعد مہمانوں میں سے کسی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں قائد اعظم کے پاس بٹھا دیتے تھے اور قائد اعظم ازراہ لطف و محبت دو، ایک باتیں کرتے تھے۔ حاضرین میں ملک اللہ دین بیرسٹر بھی تھے۔ انہوں نے قائد اعظم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ملک برکت علی ان کا ہاتھ پکڑ کر قائد اعظم کے پاس لے گئے اور تعارف کرایا۔ ملک اللہ دین پاس بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے "یہ بتایئے پاکستان میں اعوانوں کی کیا حیثیت ہو گی؟" قائد اعظم کو معلوم نہیں تھا کہ پنجاب میں کسی قوم کا نام اعوان بھی ہے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا "اعوان کیا؟" ملک اللہ دین بولے: "اعوان پنجاب میں مسلمانوں کی ایک مشہور قوم ہے"۔

(باقی صفحہ پر)

مصنوعی تقسیم کے مضر اثرات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے۔ اور لارڈ ڈوانیہ کی اُن مذموم کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے جن سے اُس نے اس تفریق کو خوب ہوا دی۔ مجھے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے اقتصادی مفاد کی حفاظت کا سب سے مؤثر، سب سے اہم، سب سے نتیجہ خیز اور سب سے زبردست حربہ جو انگریزی راج میں ایجاد ہوا۔ وہ ایک قانون تھا جسے عرفِ عام میں قانونِ انتقالِ اراضی کہا جاتا ہے۔

اس قانون کی رُو سے پنجاب کے ہر ضلع کی آبادی زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ حصّوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ غیر زراعت پیشہ لوگ زراعت پیشہ قوم کے افراد کی اراضی نہ تو خرید سکتے تھے اور نہ قرض کے بدلے نیلام کرا سکتے تھے۔ یہ قانون لارڈ کرزن کے عہدِ حکومت میں منظور ہوا تھا۔ جس سے بلا امتیاز مذہب و ملت پنجاب کے تمام ہندوؤں۔ مسلمانوں اور سکھوں نے جو زراعت پیشہ قرار دیئے گئے تھے۔ یکساں فائدہ اٹھایا۔ اس قانون کے نافذ ہونے سے پہلے پنجاب کے زراعت پیشہ لوگوں کی زمینیں قرض اور سُود در سُود کے چکر میں پڑ کر دھڑا دھڑ ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں جا رہی تھیں۔ اور اگر یہ قانون عین وقت پر منظور نہ ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب کے تمام کاشتکار اور زمیندار اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اور خود حکومت کو اس قسم کے لاکھوں بے کار اور خانہ بدوش انسانوں

قائداعظم نے فرمایا: "خدا کے لئے اس قسم کی بے کار باتیں نہ کیجئے۔ پاکستان مسلمانوں کا مطالبہ ہے۔ اور یہ ملک تمام مسلمانوں کا قومی وطن ہوگا۔"

کی معاش کا مسئلہ حل کرنا پڑتا۔ جو اپنی زندگی سے تنگ آکر بُرے بھلے ہر قسم کے سیاسی انقلاب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو جاتے۔

قانونِ انتقالِ اراضی کی سب سے بڑی مخالفت ہندو ساہوکاروں نے کی۔ اُن کے بعد اِس قانون کی مخالفت کرنے والوں میں شہروں کے وہ ہندو تھے جنہوں نے تجارت اور صنعت وحرفت سے لاکھوں کروڑوں روپے کمائے تھے۔ اور جنہیں اب اس بات کی ہوس تھی کہ وہ زمیندار کہلائیں اور بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بھی بنیں۔ یہ صحیح ہے کہ وسطی اور مغربی پنجاب میں مسلمان کاشتکاروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور اُن کی معاش کا دارومدار تمام تر زرعی اراضی پر تھا لیکن اگر قرض اور سُود کے چکر میں پڑ کر اُن کی زمینیں فروخت ہونا شروع ہو جاتیں تو سیدھی ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں چلی جاتیں۔ یا شہری ہندوؤں کا وہ تجارت پیشہ طبقہ اُن کا مالک بن جاتا جو صنعت وحرفت کے ذریعہ سے اور متعدد بنک اور بیمہ کمپنیاں قائم کر کے لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ پیدا کر چکا تھا۔ اِس پوری لُوٹ کھسُوٹ، اِس تمام لین دین اور اِس سارے بیع و شراء میں شہری مسلمانوں کا نہ کہیں وجود تھا اور نہ کہیں اُنکا ذکر آسکتا تھا شہری مسلمان جانتے تھے کہ اُن کے اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد حقیقتاً مشترک ہیں۔ شہری مسلمان نسبتاً تعلیم یافتہ تھے۔ اور اُن کی روزی کا انحصار زیادہ تر دفتروں کی ملازمت پر تھا۔ اور جو کسی قدر زیادہ پڑھ لکھ گئے تھے اُن کو مدرسی، ڈاکٹری اور وکالت میں قسمت آزمائی کرنا پڑتی تھی۔ لیکن اِن تمام پیشوں میں اُنہیں ہندوؤں سے مقابلہ درپیش تھا۔ جن کے وسائل و

ذرائع مسلمانوں سے کہیں وسیع اور جن کی جتھہ بندیاں مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر مضبوط تھیں۔ صنعت وحرفت یا تجارت میں تو یُوں کہنا چاہیئے کہ شہری مسلمانوں کو ہندوؤں کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ اِس لئے وہ مسلمان جو غیر زراعت پیشہ تھے۔ اور شہروں میں رہتے تھے اِس حقیقت سے واقف تھے کہ قانونِ انتقالِ اراضی کی حفاظت کے بغیر اُن کے دیہاتی بھائیوں کی زمینیں یقیناً ہندو سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی چنانچہ اِس قانون کے نفاذ سے لے کر ۱۹۴۷ء تک شہری مسلمانوں نے کبھی قانونِ انتقالِ اراضی کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ سر شادی لال نے لاہور ہائی کورٹ کی چیف ججی کے زمانے میں جب بعض ایسے فیصلے صادر کئے جن سے اس قانون کے اثر و نفوذ میں ضعف پیدا ہوتا تھا۔ تو پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے تمام مسلمان ممبروں نے، جن میں دیہاتی اور شہری دونوں شامل تھے، فوراً اِن فیصلوں کے جواب میں قانونِ انتقالِ اراضی کے اُن تمام پہلوؤں کو پہلے سے بھی زیادہ مستحکم کر دیا جن کی کمزوری سے ہائی کورٹ نے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۲۷ء میں لالہ لاجپت رائے کی کوشش سے لاہور میں اگروال کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ تو ایجنڈے پر ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ قانونِ انتقالِ اراضی کو منسوخ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ کانفرنس کے منتظمین نے پنجاب کے تمام شہروں کے ذی اثر مسلمانوں کو، جو اتفاق سے غیر زراعت پیشہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اِس کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ قانونِ انتقالِ اراضی کا معاملہ ایک سراسر اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس کا

اثر صوبے کی تمام غیر زراعت پیشہ آبادی پر یکساں پڑتا ہے۔ جس طرح مجلس قانون ساز کی یونینسٹ پارٹی میں زراعت پیشہ مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہو کر محض اقتصادی اصولوں پر اپنے حقوق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے تمام غیر زراعت پیشہ شہری مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے متحد ہو جانا چاہیئے۔

بات بظاہر بالکل درست معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جن مسلمان اکابر کو دعوتی خطوط بھیجے گئے تھے انہوں نے اپنے مشترکہ دستخطوں سے اعلان شائع کیا کہ انہیں اس مجوزہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں۔ اور وہ ہر صورت اور ہر حال میں قانونِ انتقالِ اراضی کی حمایت کریں گے۔

اندریں حالات دیہاتی مسلمانوں کو بھڑکا دے کر۔ اور غلط قسم کا اشتعال دلا کر شہری مسلمانوں کا حریف بنا دینا ایک ایسی قبیح حرکت تھی جس کو کوئی ذی ہوش اور دردمند انسان معاف نہیں کر سکتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر اوڈوائر کے خیال کے مطابق پنجاب کے مسلمانوں کی شہری آبادی دیہاتی مسلمانوں کی بدخواہ اور حریف تھی۔ اور شہری مسلمان اپنے دیہاتی بھائیوں کے حقوق غصب کر کے خود آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ تو خود اوڈوائر نے بطور لفٹنٹ گورنر کے دیہاتی مسلمانوں کے لئے کیا کیا؟ کیا اس نے پنجاب کے دیہات میں سکول قائم کئے تاکہ وہاں کی بے زبان آبادی اپنے بچوں کو کم از کم ابتدائی تعلیم ہی سے بہرہ ور کر سکے؟ کیا اس نے دیہات میں شفاخانے قائم کئے۔ تاکہ ہر سال ہیضہ، بخار، پیچش اور طاعون سے ہزاروں کی تعداد میں جو خلقت دھور

ڈنگر کی طرح مرتی تھی اُس کے علاج معالجہ کی نہایت ادنےٰ سہولتیں میسّر آجائیں؟ کیا اُس نے دیہات میں مویشیوں کی بیماری کی روک تھام کے لیے ہسپتال قائم کئے تاکہ دیہاتیوں کی یہ سب سے بڑی متاع جس کے سہارے وہ قوتِ لایموت حاصل کرتے تھے موت کے ناگہانی حملوں سے محفوظ ہو سکے؟ کیا اُس نے اُس تشدّد اور اُن مظالم کا سدِّ باب کیا جو آئے دن سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں دیہات کے باشندوں کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔ اور جن کی کہیں بازپرس نہ ہو سکتی تھی؟ کیا اُس نے دیہات کے لوگوں میں اتنا شعور پیدا کیا کہ وہ اپنے ملک کے نظم ونسق کو سمجھ سکیں اور اس بات کا اندازہ کرنے کے قابل ہو جائیں کہ ہندوستان کی بھلائی اور بُرائی کا انحصار کن امُور پر ہے؟۔

اِن تمام سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے اُن چھ برسوں کی رُوداد پر ایک سرسری سی نظر ڈال لینا کافی ہو گا۔ جو پنجاب نے سر مائیکل اوڈوائر کے سایۂ عاطفت میں بسر کئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس نے پنجاب کے ہر ضلع میں سے اپنے حسبِ منشا اور اپنی پسند کے مطابق دو دو، چار چار آدمی منتخب کر لئے تھے۔ اور اُن پر انعام واکرام کی بارشیں شروع کر دی تھیں۔ یہ لوگ اوڈوائر کے نمائندے تھے۔ اوڈوائر کی تجویزوں کے ہر حال میں مؤید اور حامی تھے۔ اور اوڈوائر ہی کی مدح وستائش کے گیت گاتے تھے۔ اوڈوائر نے انھیں خطابات سے سربلند کیا۔ جاگیریں بخشیں۔ نقد انعامات دیئے۔ سرکار دربار میں کرسیاں عطا کیں۔ اور جب کبھی پنجاب میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہوئے۔ یا تعلیم یافتہ جماعت نے سیاسی مراعات کے حصُول کی جدّوجہد کی۔

یا حکومتِ خود اختیاری کی تائید میں تحریک چلی تو اوڈوائر نے بے دریغ اِن دیہاتی آقاؤں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اور اُن سے لمبے چوڑے محضر نامے اور اشتہار جاری کرائے کہ پنجاب بالکل مطمئن اور خوشحال ہے۔ اُسے اِن گنتی کے چند شورش پسندوں سے کوئی تعلق نہیں جو محض اپنی ذاتی منفعت کے لئے حکومتِ خود اختیاری یا ہوم رُول کا شور مچا رہے ہیں۔

چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں ہندوستان بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلسے ہونے لگے۔ اور مذہب و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر ہر طبقے نے اصلاحات کا مطالبہ شروع کیا تو اوڈوائر نے فوراً اِن دیہاتی آقاؤں کے وفد مرتب کئے۔ جنہوں نے لاٹ صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شہروں کے شورش پسندوں کو مطعون کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اور بار بار اعلان کیا کہ اُنھیں مسلم لیگ اور کانگریس کی اِس متحدہ تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو شہری باشندوں نے شروع کر رکھی ہے اور جس سے سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

میں سَر مائیکل اوڈوائر کے شش سالہ عہدِ حکومت کی تفصیلات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ تفصیلات اِس کتاب کا جزو بن سکتی ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی مصنوعی اور غیر حقیقی تقسیم تھی۔ اور از بسکہ اوڈوائر اِس تقسیم کا سب سے بڑا مبلّغ اور خالق تھا۔ اِس لئے جب تک اُس کے اعمال و افعال کا تجزیہ نہ

کر لیا جائے اِس تقسیم کا صحیح خاکہ اور اُس کے اصلی خد و خال سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اِسی تقسیم نے پنجاب کی سیاسیات میں یونینسٹ پارٹی کو جنم دیا۔ اِسی تقسیم نے ۱۹۳۶ء کی نشاۃِ ثانیہ میں جناح اور اقبال کی آواز کو بے اثر بنایا۔ اور اسی تقسیم نے پنجاب کی دیہاتی آبادی کو اِس فریب میں مبتلا کئے رکھا کہ مسلم لیگ شہری لوگوں کی جماعت ہے۔ جس سے دیہاتیوں کو کوئی تعلق نہیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ اور یوں کہنا چاہیئے کہ سر مائیکل اوڈوائر کی فطرت کے اُس حصّہ کو جو بعض وجوہ سے دبا ہوا تھا۔ اُب اُن غیر معمولی حالات نے جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے اُبھرنے کا خوب موقع دیا۔ سب سے پہلے اُس نے شہروں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ جس کے متعلق اُس کا اندیشہ تھا کہ یہ لوگ سیاسی تحریکوں کے پُشت و پناہ ہیں۔ قانونِ تحفّظِ ہند کے اجراء و نفوذ کی سب سے زیادہ خواہش اور کوشش اوڈوائر ہی نے کی تھی۔ اور جب یہ قانون منظور ہوگیا تو اُس کی آڑ میں اُس نے پنجاب کی رائے عامّہ کو جس طرح کُچلا اُس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اُردو اخبارات کو غنانت طلبی اور ضمانت ضبطی کے بارِ گراں کے نیچے لاکر ختم کر دیا گیا۔ چھاپے خانے ضبط کر لئے گئے۔ ہر قسم کے سیاسی جلسوں کا انعقاد روک دیا گیا۔ دوسرے صوبوں سے جو آزاد خیال اخبار پنجاب میں آتے تھے اُن کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ باہر کے لیڈروں کو بھی پنجاب کے حدود میں قدم رکھنے سے منع کر دیا گیا۔ سیاسی ملزموں کی پیروی کے لئے پنجاب کے جو وکلاء عدالتوں میں پیش ہونا چاہتے تھے اُنہیں

ڈرا دھمکا کر اس قدر خوف زدہ کیا گیا کہ اُنہوں نے تنگ آ کر مقدمات کی پیروی سے انکار کر دیا۔

مظالم پنجاب کی تحقیقات کے لئے کانگریس کی قائم کردہ کمیٹی نے اس بارے میں اپنی رپورٹ میں جو لکھا ہے۔ اُس کا ایک اقتباس یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا[1]

---

[1] ۱۹۱۹ء کے مارشل لا میں پنجاب پر جو خوفناک مظالم ہوئے تھے۔ اُن کی تحقیقات کے لئے دو مختلف کمیٹیاں مقرر ہوئی تھیں۔ ایک کمیٹی حکومتِ ہند نے قائم کی تھی جس کے صدر لارڈ ہنٹر تھے۔ جو انگلستان میں سالسٹر جنرل رہ چکے تھے۔ ممبروں میں جسٹس رینکن جج ہائی کورٹ کلکتہ۔ مسٹر رانس ایڈیشنل ہوم سکریٹری حکومتِ ہند۔ میجر جنرل سر جارج برو۔ آفیسر کمانڈنگ پشاور۔ پنڈت جگت نرائن ممبر لیجسلیٹو کونسل یو۔ پی۔ مسٹر ٹامس سمتھ ممبر لیجسلیٹو کونسل یو۔ پی۔ سر چمن لال ستیلواڈ۔ ایڈوکیٹ ہائی کورٹ بمبئی اور صاحبزادہ سلطان احمد خاں بیرسٹرایٹ لا۔ جج عدالتِ عالیہ گوالیار شامل تھے
دوسری کمیٹی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مقرر کی تھی جس کے ابتدا میں پانچ ممبر تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مہاتما گاندھی۔ عباس طیب جی۔ سی آر داس۔ اور مولوی فضلِ حق۔ پنڈت کے سنتانم اس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو جب کانگریس کے اجلاس امرتسر کے صدر منتخب ہو گئے تو ان کی جگہ کسی نئے آدمی کا تقرر نہیں کیا گیا۔ مولوی فضلِ حق بعض ضروری مصروفیتوں کی وجہ سے تحقیقات کے کام میں شریک نہ ہو سکے تو ان کی جگہ بمبئی کے مشہور بیرسٹر ایم۔ آر۔ جیکار کو نامزد کیا گیا تھا۔

" اوڈوائر نے قانونِ تحفّظِ ہند سے ناجائز فائدہ اٹھا کر نہ صرف اور پال ایسے رہنماؤں کو بھی پنجاب میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اُس نے حد درجہ معمولی اور بیش پا اُفتادہ عذر تراش کر سینکڑوں آدمیوں کو جیل میں بند کر دیا۔ اُس نے اُردو اخبارات کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی کمی باقی نہ رکھی۔ اور بیرونِ پنجاب چھپنے والے قوم پرست اخباروں کی پنجاب میں درآمد روک دی گئی۔ مثلاً نیو انڈیا۔ امرت بازار پتریکا اور انڈی پنڈنٹ پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ عجیب یہ ہے کہ اُردو کے وہ اخبار جو چھپنے سے پہلے حکومت کے ہاتھوں باقاعدہ سنسر کئے جاتے تھے۔ اُن کی اشاعت بھی بند کر دی گئی۔ اِس قسم کے حالات پیدا کر کے اوڈوائر نے پنجاب کے باشندوں کو باہمی تبادلۂ خیال۔ اور ایک دوسرے کا رنج و غم معلوم کرنے کے ذرائع سے عملاً محروم کر دیا۔ اب پنجاب میں نہ تقریر کی آزادی باقی تھی۔ اور نہ تحریر کی آزادی کا وجود تھا اِس قسم کا سکوتِ مرگ طاری کر کے۔ اور اس طرح لوگوں کے قلم اور زبان پر پہرے بٹھا دینے کے بعد اوڈوائر نے گویا یہ سمجھ لیا تھا کہ پنجاب کے باشندے اُس کے زیرِ سایہ بالکل مطمئن و خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور یہی تاثرات وہ پنجاب سے باہر ہندوستان کے دوسرے لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

" تنہا یہی نہیں کہ اُس نے ہنگامی قوانین کا ناجائز فائدہ اٹھا کر

پنجاب کی سیاسی سرگرمیوں اور آرزوؤں کو کچل دیا۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے یہ حرکت شروع کی کہ وقتاً فوقتاً صوبے کے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو بلا کر بالمشافہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی جاتی تھی۔ چنانچہ لالہ دُنی چند جو پنجاب کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ہیں اس قسم کے ناروا سلوک کا شکار ہوئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں خود اُنہی کی شہادت کا وہ ضروری حصہ درج کر دیں۔ جو اسی صورتِ حال پر نہایت اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔

(لالہ دُنی چند کی شہادت)

"انڈین ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے اکثر پبلک جلسوں کا اہتمام اور انعقاد کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جلسے کا اعلان کرنے کے بعد ہر بار اور التزاماً مجھے حکومتِ پنجاب کا چیف سکریٹری یا لاہور کا کمشنر اپنے دفتر میں طلب کرتا تھا۔ اور میرے راستے میں ایسی مشکلات کھڑی کی جاتی تھیں۔ اور مجھے خواہ مخواہ اس قدر پریشان کیا جاتا تھا کہ میری جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا۔ تو مدت ہوئی اس کام سے علیحدہ ہو گیا ہوتا۔ چیف سکریٹری اور کمشنر دونوں مجھ کو تنبیہ کیا کرتے تھے کہ میں بیرونِ پنجاب کے لیڈروں میں سے فلاں فلاں شخص کو تقریر کے لئے بلاؤں۔ اور فلاں فلاں کو ہرگز دعوت نامہ نہ بھیجوں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ ہدایات سر مائیکل اوڈوائر ہی کے ایماء سے ہوتی تھیں۔ تنہا یہی نہیں۔ جب پنجاب

کی مجلسِ قانون ساز کے بعض معزز ممبروں نے گذشتہ پراونشل کانفرنس میں۔ جو لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ شرکت کی تو چیف سکرٹری نے انہیں اپنے دفتر میں بلاکر اس بری طرح ڈانٹا کہ آئندہ ان کو بریڈلاہال کے کسی پبلک جلسہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی"

سر فضلِ حسین نے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہنٹر کمیٹی کے سامنے جو شہادت دی تھی۔ اس کے ایک حصّہ کا اقتباس بھی اگر یہاں درج کر دیا جائے تو اِس مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

کمیٹی کے ایک رکن سر چمن لال سیتلواڈ میاں فضلِ حسین سے یوں سوال کرتے ہیں "آپ نے مقامی حکومت کے اس رویّہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اس نے سیاسی تحریکوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق اختیار کر رکھا تھا۔ اِس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ وہ کون سا رویّہ تھا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟"

جواب :- "مثال کے طور پر کانگرس اور مسلم لیگ کی پیش کردہ اصلاحات کو لیجئے۔ جب اِن مجوزہ اصلاحات کی حمایت میں لاہور میں چند جلسے ہوئے۔ تو صوبائی حکومت نے طیش میں آکر فوراً ایک اعلان جاری کیا کہ جن لوگوں نے اِن اصلاحات کا خاکہ تیار کیا ہے وہ اُن باغیوں سے کم نہیں جنہوں نے امریکہ سے واپس آکر قتل وغارت کا بازار گرم کیا ہے۔"

سوال :- یعنی غدر پارٹی؟

جواب :- جی ہاں !

سوال :- یہ واقعہ کب ہوا تھا ؟

جواب :- دسمبر ۱۹۱۶ء کے کانگرس کے اجلاس لکھنؤ کے بعد۔

سوال :- کیا یہ اُس وقت کی بات تو نہیں جب امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے اُنیس ۱۹ ممبروں کا مشہور میمورنڈم شائع ہو چکا تھا سلہ

جواب :- مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میمورنڈم کب شائع ہوا تھا۔

سوال :- ۱۹۱۶ء میں

جواب :- جی ہاں ! پنجاب کی صوبائی حکومت کا اعلان جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ۱۹۱۷ء میں جاری ہوا تھا۔ میمورنڈم پر دسمبر ۱۹۱۶ء میں غور و غوض اور بحث و مباحثہ ہوا تھا۔

سلہ اُس وقت ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ستائیس غیر سرکاری ارکان تھے۔ اِن غیر سرکاری ارکان میں دو اینگلو انڈین تھے اور باقی ہندوستان کی دوسری قوموں کے نمائندے تھے۔ اِن میں سے انیس ممبروں نے مشترکہ دستخطوں سے ۱۹۱۶ء میں وائسرائے کو ایک یادداشت بھیجی تھی۔ جس کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں یہ درج تھا کہ ہندوستان اس عالمگیر نابرعظیم میں اسی جسلو عل (؟) ور تندہی سے حصہ لے رہا ہے جس سے برطانیہ کے لوگ اس جنگ میں شامل ہیں۔ ہندوستان نے جنگی امداد میں کروڑوں روپے دیئے۔ اور لاکھوں جوان فوج میں بھرتی کرانے سے دریغ نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے اختتام پر اگر برطانیہ کو فتح ہو گئی تو

(باقی حاشیہ)

سوال :- جب یہ میمورنڈم شائع ہوا تو کیا اُس کی تائید میں لاہور میں کوئی جلسہ بھی ہوا تھا؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- کیا اِس جلسے کے بعد حکومت نے اپنا اعلان جاری کیا تھا؟

جواب :- جی ہاں۔ اصلاحات کی سکیم اور اُس کی حمایت میں جو جلسے یہاں ہوئے۔ اُن کے بارے میں صوبائی حکومت نے اپنے رویّے کا اظہار نہایت تلخ اور تُند لہجے میں کیا تھا۔ اِسی سکیم کے سلسلے میں یہاں ایک پراونشل کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔

سوال :- یہ پراونشل کانفرنس لاہور میں ہوئی تھی؟

ہندوستانی بجا طور پر اس بات کے متوقع ہوں گے کہ اُن کی سرفروشانہ خدمات کے بدلے میں حکومت اُن کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں مزید اختیارات عطا کرے۔ تاکہ وہ زیادہ خلوص اور عقیدت کے ساتھ برطانیہ سے وابستہ رہیں۔

مذکورہ بالا یادداشت کے دوسرے حصّے میں اُن آئینی اور دستوری اصلاحات کا ایک سرسری سا خاکہ درج کیا گیا تھا جو اُن انیس ممبروں کے خیال میں جنگ کے بعد ہندوستان کو عطا ہونی چاہئیں تھیں۔ یہی یادداشت آئندہ چل کر THE MEMORANDUM OF THE NINETEEN کے نام سے مشہور ہوئی۔

جن اصلاحات کی اِس یادداشت میں درخواست کی گئی تھی۔ کم و بیش اُنہی خطوط پر دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگرس اور مسلم لیگ نے اپنی مشترکہ سکیم تیار کی۔
(باقی ص۳۵ پر)

جواب :- جی ہاں!

سوال :- انیس ممبروں کے میمورنڈم کے بعد؟

جواب :- جی ہاں!

اور کسی قدر ردوبدل کے ساتھ یہی سکیم آگے چل کر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی بنیاد قرار پائی۔ میمورنڈم پر دستخط کرنے والے اصحاب کے نام یہ ہیں۔

(۱) مہندر چندر نندی (راجہ قاسم آباد)۔ (۲) ڈِنشا واچہ (۳) بھوپیندر ناتھ باسو۔ (۴) رائے بشن دت شُکلا (۵) پنڈت مدن موہن مالویہ (۶) کے۔وی۔ رنگا سوامی آئنگر (۷) مسٹر مظہر الحق (۸) وی۔ ایس۔ سری نواس شاستری (۹) ڈاکٹر تیج بہادر سپرو (۱۰) سر ابراہیم رحمت اللہ (۱۱) مسٹر بی۔ این بسرما (۱۲) خان بہادر میر اسد علی (۱۳) راجہ کامنی کمار چند (۱۴) رائے کرشنا سہائے (۱۵) آر۔ این۔ بھنج دیو (۱۶) ایم۔ بی دادا بھائی (۱۷) رائے ستیا ناتھ رائے (۱۸) محمد علی محمد خاں (راجہ محمود آباد)۔ (۱۹) مسٹر محمد علی جناح۔

تعجب ہے کہ سر مائیکل اوڈوائر ان لوگوں کو باغیوں میں شمار کرتا تھا اور میمورنڈم کو بغاوت اور بدامنی پھیلانے کا پروانہ قرار دیتا تھا۔ جن لوگوں کے نام اوپر درج ہیں ان سے زیادہ امن پسند اور عافیت کیش لیڈر ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے۔ یہ لوگ قانون کی حدود سے سرِ مُو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اوڈوائر ان کو پنجاب میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور نہ میمورنڈم ایسی بے ضرر تحریک کی حمایت میں کسی پبلک جلسہ کا انعقاد گوارا کرتا تھا:۔

سوال :- پھر کیا ہوا؟

جواب :- ظاہر ہے کہ کانفرنس کے منتظمین ....

سوال :- کیا آپ منتظمین میں شامل تھے ؟

جواب :- میں کانفرنس کا صدر تھا۔

سوال :- پھر کیا ہوا؟

جواب :- ہندوستان کے متعدد لیڈروں کو دعوت نامے ارسال کئے گئے۔
لیکن حکومت کا اصرار تھا کہ یہ لیڈر ہرگز لاہور نہ آنے پائیں۔
بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ ہماری حکومت کا رویہ کیا تھا۔

سوال :- جب آپ حکومت کے اس رویے کا ذکر کرتے ہیں تو کیا آپکا مطلب
یہ ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت کے کسی رکن سے آپ کی خط و
کتابت ہوئی تھی ؟

جواب :- جی ہاں ۔ میری خط وکتابت ہوئی تھی۔

سوال :- کس سے ؟

جواب :- چیف سکرٹری سے

سوال :- مسٹر ٹامسن سے ؟

جواب :- جی ہاں۔

سوال :- کیا آپ اس کام کے لئے خود ان کے پاس گئے تھے یا انہوں نے
آپ کو طلب کیا تھا ؟

جواب :- انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ اس بات کو ہرگز

گوارا نہیں کرتے کہ باہر کے اِن لیڈروں کو لاہور آنے کی دعوت دی جائے۔

سوال :- اُن کا اِشارہ کن لیڈروں کی طرف تھا ؟

جواب :- راجہ صاحب محمود آباد۔ مسٹر جناح۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو۔ مسٹر شاستری وغیرہ۔ بعد میں مسٹر شاستری کے متعلق انہوں نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا اور اُنہیں یہاں آنے کی اجازت دے دی تھی۔

سوال :- گویا مسٹر شاستری کے علاوہ باقی تمام لیڈروں کے یہاں آنے پر اُنہیں اعتراض تھا؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- پھر کیا ہوا ؟

جواب :- وہ لوگ یہاں نہیں آسکے۔

سوال :- جب آپ نے ہندوستان کے لیڈروں کے بارے میں صوبائی حکومت کے رویّے کا ذکر کیا تھا تو کیا یہی واقعہ اسوقت آپکے ذہن میں تھا ؟

جواب :- یہ صرف ایک مثال میں نے پیش کی ہے۔ اِس کے علاوہ حکومت کے متعدد ایسے احکام ہیں۔ جن کی رُو سے لوگوں کو صوبے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ بہت سے اور واقعات بھی ہیں۔

سر ہائیکل اوڈوائر نے پنجاب میں جو صد درجہ قابلِ اعتراض رویّہ اختیار

کر رکھا تھا۔ اُس کے جواز میں اُس کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی۔ کہ آئینی اصلاحات کا مطالبہ یا چرچا اس لئے بے محل اور غیر ضروری ہے کہ اس سے جنگی کوششوں میں خلل پڑتا ہے۔ اور شہروں کے شورش پسند دیہات کے لوگوں کو بہکا کر فوج میں بھرتی ہونے سے روکتے ہیں۔ یہ اعتراض سراسر لغو اور بے بنیاد تھا بات اصل میں وہی تھی کہ وہ دیہات کی آبادی کو چھوئی موئی کے پودے کی طرح شہر والوں کی ہوا سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے فوجی بھرتی میں دیہاتیوں پر جس طرح جبر و تشدد کیا۔ اور گاؤں کے غریب و بے زبان باشندوں کو جس ظالمانہ طریق سے کھینچ کھینچ کر فوج میں بھرتی کیا۔ اُس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کے سامنے اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ تھا۔ کہ ہندوستان کی دولت اور ہندوستان کے خون سے برطانوی شہنشاہیت کی بنیادیں اُستوار کی جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی پرانا مقصد تھا جو کلائیو۔ وارن ہیسٹنگز اور ولزلی لے کر ہندوستان آئے تھے۔

مارشل لاء کے مظالم کے بعد جب اوڈوائر نے اپنے آپکو جملہ الزامات سے بری الذمہ قرار دینے کے لئے لمبے چوڑے بیان جاری کرنا شروع کئے تھے۔ تو وہ بار بار کہتا تھا کہ اُس نے فوجی بھرتی میں کوئی تشدد نہیں کیا۔ لوگ اپنی خوشی سے بھرتی ہوتے تھے۔ اس ضمن میں کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

"جو شہادت ہم لوگوں نے جمع کی ہے۔ اور جو عدالتی دستاویزیں ہم نے ملاحظہ کی ہیں۔ اُن سے یہ بات غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو جاتی

ہے کہ رنگروٹ بھرتی کرنے ۔ اور جنگی فنڈ کے لئے روپیہ جمع کرنے میں حکومت نے جو ذرائع اختیار کئے تھے ۔ وہ اخلاقی یا معاشرتی دباؤ سے کہیں تجاوز کر گئے تھے ۔ سر مائیکل اوڈوائر کو ان تمام حالات کا علم تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بار بار جبری بھرتی شروع کرنے کی تجویزیں پیش کی جاتی تھیں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ اس نام نہاد رضا کارانہ بھرتی سے تو یقیناً جبری بھرتی بہتر تھی کیونکہ اس نام نہاد رضا کارانہ بھرتی کی آڑ میں لوگوں پر زیادہ تشدد ہوا ہے ۔ اس طرح دیہات کے ذی ثروت اور ذی اثر لوگ تو بچ گئے اور سارا اعتاب بے والی وارث غریبوں پر پڑ گیا ۔"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ شروع ہونے سے لے کر اس کے اختتام تک ہندوستان میں جس قدر فوجی بھرتی ہوئی ہم اس کا ایک نہایت سرسری جائزہ لے لیں تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ یورپ کے اس بین الاقوامی معرکے میں پنجاب کے کتنے نوجوانوں کو آگ میں جھونکا گیا ۔ ۱۹۱۴ء کے آخری چار مہینوں میں ہندوستان بھر میں اٹھائیس ہزار جوان بھرتی کئے گئے جن میں سے چودہ ہزار پنجابی تھے ۔ ۱۹۱۵ء میں ترانوے ہزار رنگروٹ بھرتی ہوئے جن میں سے چھیالیس ہزار پنجابی تھے ۔ ۱۹۱۶ء میں ایک لاکھ چار ہزار جوان بھرتی ہوئے جن میں سے پچاس ہزار پنجابی تھے ۔ گویا ۱۹۱۶ء کے آخر تک ہندوستان میں جتنی بھرتی ہوئی اس کی کل تعداد دو لاکھ پچیس ہزار تھی اور اس میں ایک لاکھ دس ہزار فرزندان پنجاب تھے ۔

مئی ۱۹۱۷ء میں جب جنگ بہت نازک صورت اختیار کر گئی تھی حکومت ہند :

نے فوجی بھرتی کا ایک مرکزی بورڈ بنا کر فیصلہ کیا تھا کہ چار لاکھ اسّی ہزار جوان بھرتی کئے جائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد ۱۹۱۷ء کے سات مہینوں میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار رنگروٹ بھرتی ہوئے۔ جن میں پچانوے ہزار پنجابی تھے۔ اور ۱۹۱۸ء میں تین لاکھ سترہ ہزار جوان بھرتی ہوئے جن میں ایک لاکھ چونتیس ہزار پنجابی تھے۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار دیکھ کر ہر پنجابی کا دل فخر و مباہات کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہو گا کہ اُس کے صوبے کے مَن چلوں اور بہادروں نے معرکۂ کارزار اور عرصۂ پیکار میں پورے ہندوستان سے بازی جیت لی۔ لیکن اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ کیا یہ لاکھوں نوجوان بخوشی بھرتی ہوئے تھے یا بہ جبر و اکراہ۔ کیا مادرِ وطن کے اِن سپوتوں نے بہ طیبِ خاطر آگ اور خون کے سمندر میں کُودنا گوارا کیا تھا۔ یا زبردستی ان کو اس عذاب میں جھونک دیا گیا تھا۔ تو بہت سے امور صاف ہو جاتے ہیں۔ کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مائیکل اوڈوائر جو آئے دن پنجاب کے مظلوم اور بے کس دیہاتیوں کی خیر خواہی میں خون کے آنسو روتا تھا۔ اپنے اس ہمدردی اور خیر خواہی کے دعوے میں کہاں تک سچا تھا۔

اِس ضمن میں بے شمار شہادتیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ اوڈوائر کی تقریریں۔ اعلےٰ عدالتوں کے فیصلے۔ صوبے کے مختلف علاقوں کے معززین کے بیان مجموعی

---

[1] یہ اعداد و سابق حکومت ہند کی سرکاری رپورٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

طور پر یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ فوجی بھرتی میں ہر ممکن تشدد اور ہر نوع کا جبر روا رکھا گیا تھا۔ اوڈوائر اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر یکا یک ایک نادر شاہی حکم جاری کر دیتا تھا کہ فلاں فلاں ضلع یا فلاں فلاں گاؤں سے اتنے جوان فوراً مہیا کئے جائیں۔ یہ حکم صادر ہوتے ہی صوبے کی پوری حکومت کے پرزے حرکت میں آجاتے تھے۔ ضلع کا ڈپٹی کمشنر افسر مال کے سر پر۔ افسر مال تحصیلدار کے سر پر اور تحصیلدار نمبردار کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہو مہیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا جس جوان کی طرف سرکار کی انگلی اٹھ جاتی تھی اسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہ رضاکارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصور ہوتا تھا۔

حکومت کے اِس جابرانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے۔ دیہات کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا بڑے بڑے بلوے ہونا شروع ہو گئے۔ اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں جب بھرتی کے افسروں نے لوگوں پر بہت زیادہ تشدد کیا۔ تو مشتعل ہجوم نے نائب تحصیلدار اور اس کے عملہ پر حملہ کر دیا بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جن میں سے باون ملزموں پر زیر دفعہ ۱۴۷ تعزیرات ہند مقدمہ چلا۔ ابتدائی عدالت نے اُن کو سزا دے دی۔ لیکن سشن جج

مسٹر کولڈسٹریم نے (جو چند سال بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج بن گئے تھے) سب کو بری کر دیا۔ مسٹر کولڈسٹریم نے جو فیصلہ لکھا اُس کے چند فقرے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے :-

"لوگوں کو سرکار کے خلاف سچی اور حقیقی شکایتیں ہیں۔ اور وہ اپنی تکلیفوں کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ضلع مظفر گڑھ کے ماتحت افسروں نے رنگروٹوں کی بھرتی۔ اور جنگی فنڈ کے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں نمبرداروں اور ذیلداروں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا ہے۔ چنانچہ اِن نمبرداروں اور ذیلداروں کو مجبوراً ایسے قابلِ اعتراض طریقے اختیار کرنا پڑے۔ جن سے ضلع کے اکثر مقامات پر فسادات رُونما ہوئے۔ یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ قابلِ اعتراض طریقے جو حد درجہ تشدد آمیز بھی تھے حکومت کے ایما اور منشا کے خلاف تھے۔ تاہم ضلع کے دُور دراز مقامات پر یہ تشدد ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔"

ضلع شاہ پور میں جب فساد برپا ہوا۔ اور گاؤں کی آبادی نے بھرتی کے افسروں پر قاتلانہ حملے شروع کئے۔ تو بے شمار لوگوں پر مقدمات چلائے گئے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں عجیب و غریب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ جب عوام بخوشی بھرتی ہونے سے انکار کر دیتے تھے تو گاؤں کے تمام باشندوں کو گھروں سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا جس کنبے میں تین یا چار بھائی تھے۔ اُن میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا

جاتا تھا۔ عورتوں کو خاوندوں سے جُدا کر کے دُور کسی اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اور جب تک اُن کے خاوند خود بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کرانے پر رضامند نہیں ہوتے تھے۔ عورتوں کو واپس گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

کرنال کے ایک گاؤں میں جب زبردستی بھرتی شروع ہوئی۔ تو ایک شخص نے مجسٹریٹ کی منّتیں کیں کہ اُس کا اِکلوتہ بچّہ ہے اُس پر رحم کیجئے۔ اور بھرتی نہ کیجئے۔ لیکن مجسٹریٹ نہ مانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گاؤں میں سخت فساد ہوا۔ اور بے شمار آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ جن میں سے پانچ کو عدالت نے سزا دی۔ اپیل میں وہ بری ہو گئے۔ عدالتِ اپیل نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ:-

"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے وقتاً فوقتاً جو احکام صادر کئے۔ اُن سے یہ بات قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر یہ اپیل کنندگان اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوج میں بھرتی کرا دیتے۔ یا خود بھرتی ہو جاتے تو اُن سے بآسانی درگذر کی جاتی۔"

اِسی طرح پنجاب کے مختلف اضلاع میں دیہاتیوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اور جبر و تشدّد سے تنگ آئے ہوئے لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے۔ جُونہی خبر اُڑتی کہ بھرتی کا افسر آ رہا ہے۔ گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں اور کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ کئی مرتبہ سرکاری افسر گھروں کو لُوٹ لیتے اور فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔

اِسی سلسلے میں سر مائیکل اوڈوائر کی ایک تقریر کا حوالہ دینے پر مجبور ہوں۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بھرتی کے بارے میں اُس کا اپنا رویّہ کیا تھا۔

۴ر مئی ۱۹۱۸ء کو اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا:-

" پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ درکار ہیں۔ اگر لوگ خوشی سے بھرتی نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے۔ بعض علاقوں میں لوگ بھرتی ہونے سے جی چراتے ہیں۔ ہم اس صورتِ حال کا اچھی طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ہم پنجاب سے رنگروٹوں کی ایک مقررہ تعداد مہیّا کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس وعدے کا ایفا ضروری ہے ...... میں سمجھتا ہوں کہ اب کم ازکم پنجاب میں اکثر لوگ جبری بھرتی کے حامی بنتے جا رہے ہیں مثلاً اگر ہر دس، پندرہ یا بیس جوان آدمیوں میں سے ایک آدمی بھرتی کر لیا جائے۔ تو یہ شرح بُری نہیں ہوگی۔ مرکزی حکومت نے ہندوستان کے ہر صوبے کے ذِمّے رنگروٹوں کی ایک خاص تعداد مقرر کر دی ہے۔ میری رائے ہے کہ اگر یہ تعداد رضاکارانہ بھرتی سے مہیّا نہ ہوئی۔ تو پھر اور قسم کے ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے "

یہ اور قسم کے ذرائع کیا تھے؟ — ان میں سے کچھ تو سطورِ بالا میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ دو، ایک مزید واقعات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ داستان طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اُس شخص کے اعمال کا تجزیہ بے حد ضروری ہے۔ جو اپنے آپ کو دیہاتیوں کا ہمدرد اور خیر خواہ کہتے ہوئے تھکتا نہیں تھا۔ اور جس نے اپنی مذموم کوششوں سے پنجاب کی مسلمان آبادی کو اس طرح دو مخالف حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ اُس کے اثرات نے ربع صدی تک ہمیں

مبتلائے رنج و محن کئے رکھا۔

گوجرانوالہ کے ایک معزز مسلمان زمیندار نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ :-

"بیساکھی کے مہینے میں تحصیلدار ہمارے گاؤں میں آیا۔ اور رات ہی رات میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ صبح تمام لوگ ڈیرے پر حاضر ہوں ایک تو فصلوں کی کٹائی کے دن تھے۔ دوسرے یوں بھی لوگ ڈرتے تھے۔ کہ اُنہیں زبردستی بھرتی کر لیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو بہت کم آدمی ڈیرے پر حاضر ہوئے۔ چنانچہ تحصیلدار سخت ناراض ہوا۔ اور اُس نے ساٹھ ستر آدمیوں کو جرمانہ کر دیا۔ جس کی مجموعی رقم سولہ سَو روپیہ تھی۔ پھر تحصیلدار نے حکم دیا کہ گاؤں کے لوگ ضلع کے صدر مقام گوجرانوالہ میں حاضر ہوں جو ہمارے گاؤں سے اٹھارہ میل دُور ہے جب مقررہ تاریخ کو لوگ وہاں گئے۔ تو سب کو قطار میں کھڑا کر کے سات جوانوں کو فوجی بھرتی کے لئے چُن لیا۔ اور باقی آدمیوں کو مارا اور گالیاں دیں۔ اور کہا کہ بھرتی کے لئے اور جوان لے کر آؤ۔"

اگر ہم پنجاب کے مختلف اضلاع میں فوجی بھرتی کے مدّو جزر کے نقشے کا بغور مطالعہ کریں تو ایک عجیب بات ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں آج بھرتی معمول کے مطابق ہے تو چند مہینوں کے اندر وہاں بھرتی ایک دم اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دیوانہ وار فوج کی طرف لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا۔ اور وہ یہ کہ اگر ضلع کا حاکم ناجائز ذرائع استعمال

کرنے۔ اور جبر و تشدد کو روا رکھنے کا حامی نہ ہوتا تھا تو اوڈوائر اس کو فوراً تبدیل کر کے وہاں کسی ایسے آدمی کو متعین کر دیتا تھا جو اُس کے ایما کے مطابق بھرتی میں بُرے بھلے طریقوں میں امتیاز کرنے کا قائل نہ تھا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۷ء کے آخر میں ضلع ملتان کے رنگروٹوں کی تعداد ۹۷۵ تھی گویا ضلع کی آبادی کے ہر ۵۸۶ مردوں میں سے ایک رنگروٹ بھرتی ہوا لیکن سال بھر کے اندر یعنی نومبر ۱۹۱۸ء میں رنگروٹوں کی کل تعداد ۴۶۳۶ ہو گئی گویا ہر ۹۳ مردوں میں سے ایک رنگروٹ لیا گیا۔ اسی طرح اوڈوائر نے دیکھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے میں تامل کرتے ہیں۔ تو اُس نے اپنے خاص آدمی کرنل او برائن کو وہاں ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء تک تو گوجرانوالہ کے رنگروٹوں کی تعداد ۳۳۸۸ تھی لیکن اگست ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد یکایک ۱۱۷۶۵ تک پہونچ گئی۔ گویا ایک ہی سال میں ساڑھے آٹھ ہزار رنگروٹ بھرتی ہو گئے۔

دیہات کے معززین کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی۔ نمبرداروں اور ذیلداروں پر آئے دن سرکار کا تازیانہ پڑتا تھا کہ اور رنگروٹ لاؤ۔ جن نمبرداروں سے کسی قسم کی معذوری کا اظہار ہوا۔ اُن کی نمبرداریاں ضبط کر لی گئیں پولیس حفظِ امن میں ان لوگوں کا بے دریغ چالان کر دیتی تھی۔ اور مجسٹریٹ ضمانت لینے کی بجائے انہیں فوراً حوالات میں بند کر دیتے تھے۔ اور جب تک وہ بدبخت رنگروٹوں کی بھرتی کا وعدہ نہ کرتے۔ انہیں رہا نہیں کیا جاتا تھا۔

اوڈوائر نے شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک آہنی پردہ ڈال

دینے کی کوشش کی تھی۔ تاکہ دیہات میں جو کچھ ہو رہا تھا اُس کی ہوا شہروں میں نہ پہونچنے پائے۔ لیکن جب دیہاتیوں پر پیہم سختیاں ہونا شروع ہوئیں اور جگہ جگہ فساد پھوٹ پڑے۔ تو صوبے میں ہلچل سی مچ گئی۔ بلوے کے ایک ایک مقدمے میں پولیس نے بیک وقت سو سو، دو دو سو آدمیوں کا چالان کر دیا تھا۔ جب یہ مقدمات ابتدائی عدالتوں میں سے ہوتے ہوئے صوبے کی عدالتِ عالیہ تک پہونچے۔ اور صفائی کی طرف سے قابل وکلا پیش ہوئے تو رازہائے درونِ پردہ کُھلنا شروع ہوئے۔

سر فضلِ حسین نے، جو خود دو مقدموں میں ملزموں کی طرف سے پیش ہوئے تھے، ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا :۔

سوال :۔ "جن مقدمات میں آپ پیش ہوئے تھے، اُن کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی"؟

جواب :۔ "یہ دونوں مقدمات ضلع شاہ پور سے آئے تھے۔ ایک مقدمے میں ملزموں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے جبری بھرتی کی مخالفت کی ہے؟"

سوال :۔ "کیا بلوے کے ایک مقدمے میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان کر دیا گیا تھا؟"

جواب :۔ "جی ہاں!"

سوال :۔ "واقعات کیا تھے؟"

جواب :۔ "مجھے اس وقت گاؤں کا نام یاد نہیں۔ یہ گاؤں ضلع

شاہ پور میں ہے اور غالباً سرگودھا سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔
اِن ڈیڑھ سو ملزموں میں سے ایک بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا
اور جب سے پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے اس گاؤں
کا صرف ایک آدمی سرکاری ملازمت میں گیا ہے۔ ملزموں پر ہر
قسم کا دباؤ ڈالا گیا تھا۔ لیکن وہ بھرتی پر آمادہ نہ ہوئے"

سوال :- "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خود اِن ڈیڑھ سو ملزموں کو بھرتی
ہونے کے لئے کہا گیا تھا؟"

جواب :- "جی نہیں، گاؤں کے تمام باشندوں پر جن کی تعداد ایک ہزار
کے قریب ہے دباؤ ڈالا جا رہا تھا"

سوال :- "کیا رنگروٹوں کی کوئی خاص تعداد طلب کی جا رہی تھی؟"

جواب :- "جی نہیں، کوئی خاص تعداد مقرر نہیں تھی۔ چونکہ اِس گاؤں
سے کوئی آدمی بھرتی نہیں ہوا تھا۔ اور حکومت زبردستی بھرتی
کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ اور لوگ بھرتی سے بار بار انکار کرتے تھے
اِس لئے حکومت نے یہ خیال کیا کہ گاؤں کے لوگوں نے سازش
کر لی ہے۔ چنانچہ حکومت نے قانونِ تحفظِ ہند کے تحت یہ قدم
اُٹھایا۔"

سوال :- "کیا حکومت نے یہ قدم گاؤں کی پوری آبادی کے خلاف اٹھایا تھا؟"

جواب :- "جی نہیں! گاؤں کے چند آدمیوں کے خلاف"

سوال :- "کیا حکومت نے یہ اقدام اِس بنا پر کیا تھا کہ یہ چند آدمی

بھرتی کی مخالفت کر رہے ہیں؟"

جواب :- جی ہاں! اِن چند آدمیوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ لیکن گاؤں والوں نے اُنہیں پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر فوج بھیجی گئی۔ اور جب فوج نے گاؤں میں جا کر اُدھم مچایا تو بلوہ ہو گیا۔"

سوال :- "تو کیا اِس بلوے میں اِن ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان ہوا تھا؟"

جواب :- "جی ہاں"

سوال :- "پھر کیا ہوا؟"

جواب :- "اپیل میں اکثر بری ہو گئے اور چند ایک کو سزا مل گئی۔"

اُنہی دنوں لاہور۔ امرتسر اور جالندھر میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہو رہے تھے جہاں مسلم لیگ اور کانگرس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں قراردادیں منظور کی جاتی تھیں۔ اِن جلسوں میں بعض مقررین نے بھرتی کے تشدد آمیز طریقوں پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ اور دیہاتی آبادی کے تہہ در تہہ مظالم پر سے پردے اُٹھائے۔ اوڈوائر کے لئے یہ صورتِ حال قطعاً ناقابلِ برداشت تھی وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ شہر کے چند تعلیم یافتہ شورش پسند دیہات کے معاملات میں دست درازی کر کے اُس حصارِ خود فریبی میں رخنہ ڈال دیں جو اُس نے صدر درجہ ہوشیاری سے تیار کیا تھا۔ چنانچہ عالمِ سراسیمگی میں اُس سے بعض عجیب و غریب حرکات سرزد ہونا شروع ہوئیں۔

مثلاً دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں ڈاکٹر انصاری

مرحوم نے مجلسِ استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا۔ اُس کا داخلہ بغیر کسی معقول وجہ کے، پنجاب میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پنجاب کے بعض معزز اور ذی اثر زمینداروں کو بلا کر تنبیہہ کی گئی کہ کوئی شخص لیگ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے دہلی نہ جائے۔ دیہات میں مسلم لیگ کی تحریک کو دبانے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ اگر کوئی شخص گاؤں میں مسلم لیگ کا چرچا کرتا ہوا نظر آئے۔ تو فوراً اُسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن اوڈوائر کی اِن تمام کوششوں کے باوجود ظلمت اور تشدد کے بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ رائے عامہ بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں کو سُود و زیاں میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا ہو چکی تھی۔ اور شہروں کی تعلیم یافتہ آبادی کا وہ بے قرار عنصر جس کو وہ شکنجے میں دبا دبا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ایک ہی جست میں زنجیروں کو توڑ کر رہا ہو گیا تھا۔ اوڈوائر کی آنکھوں کے سامنے امرتسر کے ایک بہادر فرزند نے جس کا نام ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس کو ۱۹۱۹ء کے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد کرنے کی دعوت دے دی۔ اور دونوں قومی انجمنوں نے اِس دعوت کو بخوشی منظور کر لیا۔

اب اوڈوائر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ جن مسلم لیگ اور کانگرس کی مجوّزہ اِصلاحات کو وہ بغاوت سے تعبیر کرتا تھا۔ اب اُن کے سالانہ اجلاس اُس کی آنکھوں کے سامنے پنجاب میں منعقد ہوں۔ ہندوستان کے جن چوٹی کے لیڈروں کو وہ پنجاب کے حدود میں قدم رکھنے کا رَوادار نہ تھا۔ اَب وہی لیڈر اُس کے سامنے اپنی آتش بیانیوں کے جوہر دکھائیں

سیاسی بیداری کے بڑھتے ہوئے طوفان سے بچنے کے لئے اُس نے پنجاب کے چاروں طرف جو بند باندھ رکھا تھا۔ اب اُس بند میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اور کوئی دن کی بات تھی کہ عوام کی بیداری کے ایک زبردست ریلے کے سامنے وہ بند اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ اِن یاس انگیز حالات میں اوڈوائر کے دل و دماغ کی کیفیت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل بات نہیں۔ وہ ایک طرف غصّے اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اور اُن لوگوں کو جی کھول کر سزا دینا چاہتا تھا جنہوں نے اُس کی تمام مخالفانہ کوششوں کے باوجود پنجاب میں مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری طرف اُس پر ایک حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔ جو شکست خوردگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اِس عالمِ اضطرار میں اُس نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا۔ اور ۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو مارشل لا کا اعلان کر کے اُس نے پنجاب کو آگ اور خون کے ایک ایسے سیلاب میں غوطہ دیا۔ جس کے سحر آفریں اور انقلاب انگیز اثر سے ایک نیا ملک اور نئی قوم پیدا ہوئی۔

دوسرا باب

میثاقِ لکھنؤ کے بعد

مسٹر جناح کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگرس میں باہمی ربط و ضبط تو ۱۹۱۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اُن کی اتحاد پرور کوششوں کی حقیقی ثمر دسمبر ۱۹۱۶ء میں حاصل ہوا۔ جب کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بیک وقت لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ اور ہندوستان کی ان دو نمائندہ انجمنوں نے مل کر اصلاحات کی ایک سکیم تیار کر کے حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ اس سکیم کی تفصیلات بیان کرنے یا اُس کے معائب و محاسن پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم اجمالی طور پر اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خدشات کو جائز تصور کرتے ہوئے کہ مخلوط انتخاب میں اُن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اُن کے لئے مجالسِ قانون ساز میں جداگانہ نیابت منظور کر لی۔ اور مسلمانوں نے اپنے حقِ نمائندگی سے مطمئن ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد میں ہندوؤں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا وعدہ کر لیا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء کا یہ معاہدہ جسے عرفِ عام میں لکھنؤ پیکٹ یا میثاقِ لکھنؤ کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں

اور مسلمانوں کی باہمی مصالحت کا ایک یادگار واقعہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کی آئینی اور دستوری تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر جناح اس تمام کارروائی میں بطلِ جلیل یعنی ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اسی موقع پر مسز سروجنی نائیڈو نے انہیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

میثاقِ لکھنؤ کی دیگر تفصیلات سے قطع نظر اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ پنجاب اور بنگال کی مجالسِ قانون ساز میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی ملے گی اور اس طرح ان دو صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت کو جو نقصان پہونچے گا۔ اس کے معاوضے میں اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اُن کی آبادی سے زیادہ نمائندگی عطا ہوگی۔ یو، پی۔ بہار۔ مدراس وغیرہ کے مسلمانوں کو اس طریقے سے جو مراعات حاصل ہوئیں۔ اُن کے لئے ایک انگریزی اصطلاح ویٹیج استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ جداگانہ انتخاب کی رُو سے ہندوستان کی صوبائی کونسلوں کے نمائندوں کی جو تعداد مقرر ہوئی اُس کی شرح حسبِ ذیل ہے:۔

پنجاب	منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کا				نصف
بنگال	"	"	"	"	چالیس فیصد
یوپی	"	"	"	"	تیس فیصد
بہار	"	"	"	"	پچیس فیصد
صوبۂ متوسط	"	"	"	"	پندرہ فیصد

مدراس	منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کا	پندرہ فیصد
بمبئی	" " " "	۱/۴

اِس فیصلے کے ساتھ یہ شرط بھی طے ہوئی کہ عام حلقہ ہائے انتخاب میں کوئی مسلمان امیدوار کھڑا نہیں ہوسکے گا اور کوئی مسودۂ قانون یا اُس کا کوئی جزو یا کوئی تجویز جو کسی غیر سرکاری ممبر کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ اگر اُس مسودۂ قانون یا اُس کے کسی جزو یا کسی تجویز کی متعلقہ جماعت کے ۳/۴ ممبر مخالفت کریں گے۔ تو وہ مسودہ یا اُس کا کوئی جزو یا تجویز کونسل میں پیش نہیں ہوسکے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ جس طرح صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کا انتخاب جداگانہ ہوگا۔ اسی طریقے سے مرکزی قانون ساز مجلس میں بھی ہونا چاہیئے۔ اور وہاں منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک تہائی مسلمان ہوں گے۔

میثاقِ لکھنؤ کے بعد پورے ہندوستان میں ایک طرف تو صلح و آشتی کی خوشگوار ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں۔ اور دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں نے باہم مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب کانگرس اور لیگ کے جھنڈے کے نیچے جگہ جگہ جلسے منعقد ہونے چاہئیں۔ تاکہ مجوزہ اصلاحات کی حمایت میں رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔ چنانچہ ہر صوبے میں نہایت پُرامن طریقے سے جلسوں کا انعقاد ہونے لگا۔ اور عوام نے بڑی گرم جوشی سے میثاق لکھنؤ کی حمایت کی۔ جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے۔ مسٹر بکل اوڈوائر اس تحریک کا بدترین مخالف تھا۔ اُس نے میثاقِ لکھنؤ کو بغاوت کا اعلان اور اصلاحات کی سکیم کو بغاوت کی دستاویز قرار دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

بیکن اور ڈ وائز کی بدقسمتی سے اب مسٹر مانٹیگو وزیر ہند تھے۔ جن کی بلند خیالی اور وسیع المشربی کا اُن کے دشمنوں تک کو بھی اعتراف ہے۔ مانٹیگو کا رویّہ ابتدا ہی سے ہمدردانہ تھا۔ اور انہوں نے اپنی دُور اندیشی سے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک اہلِ ہند کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ اختتامِ جنگ کے بعد انہیں اپنے ملک کے نظم و نسق میں برابر کا حصّہ ملے گا، موجودہ بے چینی رفع نہیں ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس بے چینی کا اثر حکومتِ ہند کی اُن تمام کوششوں پر بُری طرح پڑے گا۔ جو رنگروٹوں کی بھرتی اور سامانِ جنگ کی فراہمی کے سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو نے اپنا وہ مشہور اعلان جاری کیا۔ جس کے متعلق بعض سیاسی نقّادوں کی رائے ہے کہ جب سے برّعظیم ہند میں انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی ایسا اہم اور نتیجہ خیز منشور اب تک جاری نہیں ہوا تھا۔

مسٹر مانٹیگو نے صاف الفاظ میں کہا کہ "ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اہلِ ہند کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیئے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے اداروں کو بتدریج ترقی دی جائے تاکہ انجام کار ہندوستان کامل ذمّہ دارانہ حکومت کا مالک بن کر برطانوی سلطنت کا ایک جزو بن سکے۔" آخر میں مسٹر مانٹیگو نے کہا "ملکِ معظّم کی رضامندی سے اُن کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھ کو وائسرائے کی یہ دعوت قبول کر لینا چاہیئے کہ میں ہندوستان جا کر ان معاملات کے متعلق وائسرائے اور حکومتِ ہند سے بالمشافہ گفتگو کروں۔ تاکہ ایک

طرف اس ملک کے وائسرائے اور وہاں کی مقامی حکومتوں کے خیالات معلوم کیے جا سکیں۔ اور دوسری طرف ہندوستان کی نمائندہ جماعتوں کے مشوروں سے بھی ہم مستفید ہو سکیں!"

اس اعلان کے ساتھ ہندوستان میں امیدوں کے چراغ روشن ہونا شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ حالات نامساعد کی پروانہ کرتے ہوئے وزیر ہند خود ہندوستان آ رہے تھے۔ تاکہ اس ملک کے اہل الرائے لیڈروں سے مل کر ذمہ دارانہ حکومت کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اوڈوائر حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ کیا وائسرائے (لارڈ چیمسفورڈ) اور وزیر ہند مانٹیگو دیوانے ہو گئے ہیں کہ عین اس وقت جب یورپ کے محاربہ عظیم میں برطانیہ کی تقدیر ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔ یہ لوگ ہندوستانی اصلاحات ایسے بے کار اور بے مصرف کام میں وقت ضائع کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ بات بھی اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ جن لوگوں کو اس نے باغی اور مفسد قرار دے کر پنجاب کے حدود میں داخل ہونے سے منع کر دیا تھا۔ اب انہی فتنہ پردازوں کے مشورے سے مستفید ہونے کے لئے وزیر ہند یہاں تشریف لا رہے تھے۔

اوڈوائر نے اس صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب[ل] میں جگہ جگہ ایسے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جن میں ایک طرف بغض و عناد اور دوسری

ل "INDIA AS I KNEW IT" BY SIR MICHAEL O'DWYER (1935)

طرف رنج و غم کے علاوہ بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ستمبر ۱۹۱۶ء میں مسز بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کی۔ اِس کے چند ہفتے بعد مرکزی مجلسِ قانون ساز کے ۱۹ انیس ممبروں نے اپنا اعلان شائع کیا۔ جس میں ایسی انقلاب انگیز سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جن سے پوری صورتِ حال کے بدل جانے کا اندیشہ تھا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ نے ایک متحدہ سکیم منظور کی جس میں ہوم رول تحریک کی حمایت کی گئی تھی اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِن مطالبات کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے تھے۔ اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت چونکہ اِس وقت موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اِس لئے اُس سے جو کچھ منوایا جا سکتا ہے ابھی منوایا جائے۔ دوسرا محرک یہ تھا کہ برطانوی حکومت نے امریکی صدر ولسن کے اِس نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ محکوم اور غلام قوموں کو اُن کے حقِ خود ارادیت سے محروم نہیں کیا جائے گا تیسرا محرک یہ تھا کہ خود برطانیہ میں ایسے سیاست والوں کی ایک کافی بڑی تعداد موجود ہے جنہیں حکومت کے نظم و نسق کا نہ علم ہے اور نہ تجربہ۔ لیکن جو محض کتابی مطالعہ کی بنا پر سیاست کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندوستانی لیڈروں کو اِن تخیل پسند لوگوں کی مدد پر پورا بھروسہ تھا۔ تعجب یہ ہے کہ اِس تمام عرصے میں ارباب حکومت

شملہ کی چوٹیوں پہ بیٹھ کر اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے۔ کہ ہندوستان کے ترقی پسند سیاسی رہناؤں کے مطالبات کو تسلیم کرنے کی بہتر صورت کیا ہوسکتی ہے۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اربابِ حکومت یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہندوستان کے یہ چند ترقی پسند سیاست دان ہی گویا سارے عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔"

پھر آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"تقریباً انہی دنوں کے لگ بھگ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو نے جو مسٹر آسٹن چیمبرلین کی جگہ وزیرِ ہند مقرر ہوئے تھے ہندوستانی اصلاحات کے متعلق دارالعوام میں اپنا وہ تاریخی اعلان کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اہلِ ہند کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیئے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں حکومت خود اختیاری کے اداروں کو بتدریج ترقی دی جائے تاکہ انجام کار ہندوستان ایک کامل ذمہ دارانہ حکومت کا مالک بن کر برطانوی سلطنت کا ایک جزو بن سکے

برطانوی اہلِ سیاست کا یہ پیغام جو اصل میں ہندوستانی لیڈروں کے نام بھیجا گیا تھا کسی مخالفانہ تبصرے کا محتاج نہیں ہے بشرطیکہ ایک حقیقت کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔

اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو اِس ملک کی آبادی میں اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی آٹے میں نمک کو ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے لارڈ چیمسفورڈ اور مسٹر مانٹیگو نے اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کی تجاویز پر عمل کرتے وقت اِس بنیادی حقیقت کو آسانی سے نظر انداز کر دیا تھا۔"

اوڈوائر چونکہ فطرتاً شہنشاہیت پسند اور آمرانہ مزاج کا آدمی تھا۔ اِس لئے اُس کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ مسٹر مانٹیگو نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو دارالعوام میں کیوں اعلان کیا۔ اُس کے نزدیک رعیّت کی تالیفِ قلب کرنے کا منصب صرف اعلیٰحضرت ملکِ معظم کو حاصل ہے کہ وہ ازراہِ کرم گستری ایک منشورِ خسروانہ جاری کرکے اپنی ہندوستانی رعایا کے قلوب کو مسخر کرتے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے منشور کی طرح یہ اہم اعلان بھی ملکِ معظم ہی کی ذاتِ شاہانہ کی طرف سے صادر ہونا چاہیئے تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اُس کا رُوئے سخن ہندوستان کے سیاست دانوں کی طرف نہ ہوتا۔ بلکہ ملکہ وکٹوریہ کے منشور کی مانند اُس کی مخاطب ہندوستان کی وفادار و اطاعت گذار رعایا ہوتی۔ "ذمہ دارانہ حکومت"۔ جس کا ذکر مسٹر مانٹیگو نے اپنے اعلان میں کیا تھا۔ ایک ایسا لفظ ہے جو ہندوستان میں شرمندہ معنی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اِس لفظ کا کوئی مترادف ہندوستان کی کسی زبان میں موجود ہے۔

باقی رہے حکومتِ خود اختیاری کے ادارے۔ یہ گورکھ دھندہ بھی
ہندوستانی عوام کے فہم سے بالاتر ہے۔ انہوں نے حکومتِ خود اختیاری
سے جو مطلب اخذ کیا وہ یہ تھا کہ برطانیہ اپنی ذمہ داریوں سے
عہدہ برآ ہوئے بغیر اس ملک سے اپنا بوریا بستر اٹھا رہا ہے۔
ہندوستان کے لوگ بادشاہِ وقت کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو
اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کے عادی ہیں۔ وہ اس غیر مرئی اور
غیر شخصی چیز سے قطعاً واقف نہیں جسے برطانوی حکومت کہا جاتا
ہے۔ اُن کی تمام تر عقیدت و نیاز مندی صرف بادشاہ سلامت
کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ جو اُن کے نزدیک گویا ظلِ سبحانی
ہیں۔ افسوس کہ برطانیہ کے سیاست دانوں نے اپنی کوتاہ بینی
سے اس جذبۂ عقیدت سے فائدہ نہ اٹھایا۔"

نومبر ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگو ہندوستان تشریف لائے اور آئندہ
اصلاحات کے بارے میں انہوں نے کانگرس اور مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں
سے گفت و شنید شروع کی۔ مانٹیگو کا رویہ نہایت ہمدردانہ اور سلوک بے حد
شریفانہ تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ نزاع اور لڑائی جھگڑے کے بجائے
امور کا تصفیہ ہو جائے۔ اور حکومت اور عوام کے درمیان خوش دلی، اعتماد
اور خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے وزیرِ ہند
سے ملاقات کر کے انہیں اپنے قومی حالات سے آگاہ کیا ان میں وہ تمام اکابر
شریک تھے جن کے شانوں پر اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا بارِ گراں نازل ہوا

تھا مثلاً مسٹر جناح - سر محمد شفیع - سر فضل حسین - سر وزیر حسن - سید حسن امام مسٹر مظہر الحق - راجہ محمود آباد - ڈاکٹر انصاری - مولوی فضل الحق وغیرہ - محمد علی اور شوکت علی چونکہ نظر بند تھے - اِس لئے مسٹر مانٹیگو اُن کی ملاقات سے محروم رہے اور ڈونا تمر نے اِس پوری کارروائی کا حال قلم بند کرتے وقت اپنے قلم سے جس طرح بُغض وعناد کا زہر ٹپکایا ہے - اُس سے یہ بات قطعی عیاں ہو جاتی ہے کہ اُسے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے سے سخت دشمنی تھی - لیکن ستم یہ ہے کہ وہ اِس سلسلے میں مانٹیگو اور چیمسفورڈ کو بھی معاف نہیں کرتا - اُس کے خیال میں وزیرِ ہند اور وائسرائے کا یہ قصور ہرگز قابلِ درگزر نہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے اُن لوگوں کو مُنہ لگانا پسند کیا جن کو وہ حدودِ پنجاب میں قدم رکھنے کی بھی اجازت دینے کو تیار نہ تھا - لکھتا ہے :-

" یہ لوگ (وزیرِ ہند اور اُس کے رفقاء) مہینوں دلی میں بیٹھے وائسرائے اور اُس کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبروں سے گفت وشنید کرتے رہے - اُن کے صبر و تحمل کی داد دینا چاہیئے کہ انہوں نے تجویزوں کے اُس پورے انبار کا مطالعہ کیا جو ہندوستان کی مختلف انجمنوں کی طرف سے اُن کو موصول ہوئی تھیں - اور پھر اُنہی تجویزوں کے حق میں لوگوں کے دلائل بھی سُنے - ہندوستان کے سیاست دانوں کو بھلا اپنی زندگی میں اِس سے پہلے کہاں ایسا موقع میسر آیا ہوگا کہ ایک ہمدرد و خیر خواہ وزیرِ ہند اور متحمل و بُردبار وائسرائے کے رُوبرُو پیش ہو کر دفتری حکومت کے نقائص بیان کر سکیں

اور ساتھ ہی یہ بھی بتا سکیں کہ خود اُن کے نزدیک ہندوستان کی وسیع سلطنت کو بہتر نہج پر چلانے کی کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ ایک سکول یا ایک اخبار بھی کامیابی سے نہ چلا سکتے تھے۔ اور جن کو ایک میونسپل کمیٹی کے انتظام کا بھی سلیقہ نہ تھا اب وہ بڑھ بڑھ کر ایک عظیم الشان سلطنت چلانے کی تجویزیں پیش کرنے میں مصروف تھے [1]۔ بعض کو تو اپنی ہمہ گیر حیثیت جتلانے کا اِس قدر شوق تھا کہ ایک روز وہ ہندو سبھا کے نمائندے کے طور پر حاضر ہو کر ایک تجویز پیش کرتے۔ اور دوسرے ہی روز زمینداروں کے وفد کے ممبر بن کر بالکل اُلٹ مشورہ دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اِس تمام کارروائی میں شرکت کرنے کے بعد یہ لوگ اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگ گئے تھے۔ اور خود فریبی

---

[1] ہندوستانی لیڈروں کے متعلق اوڈوائر نے جو رائے ظاہر کی ہے اس کا مقابلہ مسٹر مانٹیگو کی رائے سے کرنا چاہیئے۔ دہلی میں مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے بعد مانٹیگو نے اپنی ڈائری میں جو تاثرات درج کئے تھے۔ اُن میں لکھا ہے "...... اِن لوگوں کے بعد جناح آیا۔ جو ایک رُعب دار شخصیت اور نہایت مہذب اطوار کا مالک ہونے کے علاوہ بحث و تمحیص کے فن کا بہت بڑا ماہر ہے.... چیمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کے سامنے اس کی پیش نہ چل سکی۔ جناح یقیناً بڑا قابل اور ہوشیار آدمی ہے۔ اور یہ کس قدر ظلم ہے کہ ایسے شخص کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دخل حاصل نہیں۔"

اور غلط فہمی کی انتہا یہ ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور اُن کے رفیق بھی اُن کی اہمیت کے قائل ہوتے جاتے تھے

"صوبوں کے لفٹننٹ گورنروں اور گورنروں کو بھی اکثر مشورے کے لئے طلب کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ہم لوگ اِس سیاسی تماشے سے جو دہلی میں ہو رہا تھا کہیں ضروری کاموں میں مصروف تھے۔ ہمارے سامنے اہم ترین مسئلہ فوجی بھرتی کا تھا۔ اور جب ہمیں ایسے ضروری کام کو چھوڑ کر دہلی جانا پڑتا تھا۔ تو ہم لوگ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے کہ برطانوی حکومت کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نازک وقت میں اُس نے اِصلاحات کا ڈھونگ رچا دیا ہے۔

"دہلی میں جو معاملات طے کئے جا رہے تھے۔ اُن کے متعلق دیہاتی عوام سے مشورہ لینے کا نہ وائسرائے کو خیال آیا اور نہ وزیرِ ہند کو۔ اوّل تو وقت اِس قدر قلیل اور مہلت اتنی مختصر تھی کہ مجوّزہ اصلاحات کے بارے میں دیہات کے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ حالانکہ یہ امر بے حد ضروری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے دو تین بار دہلی میں وزیرِ ہند اور اُن کے ساتھیوں سے کہا بھی کہ محض ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے بیانات پر اعتماد کر لینا قرینِ مصلحت نہیں۔ میرے ساتھ کسی اتوار کو پنجاب کے دیہات میں چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ کہ حکومت کا نظم و نسق کس قابلِ رشک خوبی سے چل رہا ہے۔ وہاں لوگوں سے

خود بات چیت کرکے دریافت کر لیجئے کہ آیا اُن کو حکومت سے کوئی شکایت ہے۔ لیکن وزیر ہند کو دہلی میں چاروں طرف سے ہندوستان کے لیڈروں نے گھیر رکھا تھا۔ اُنہیں میرے ساتھ پنجاب کے دیہات میں جانے کی کہاں فرصت تھی۔

"یہ تحقیقاتی کارروائی نومبر ۱۹۱۷ء سے لے کر اپریل ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اور اوّل تا آخر کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ دیہات کے اُن بدنصیب باشندوں سے بھی پُوچھ گچھ کر لی جائے۔ جن کی زندگیاں صرف ہل جوتنے اور فصل بونے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ میں نے جب دو ایک مرتبہ اس قسم کی کوشش کی تو مجھے ہندوستان کے مقبول اور ہردلعزیز قومی لیڈروں کا بدخواہ اور تعلیم یافتہ جماعت کی امنگوں اور آرزوؤں کا دشمن تصور کیا گیا۔

"......... ۱۹۱۹ء میں جب تلک اور اُن کے رفیقوں کو ہندوستان سے باہر جانے کی اجازت مِل گئی۔ تو یہ لوگ بھاگے بھاگے انگلستان پہونچے۔ تاکہ اصلاحات کو اور زیادہ اپنے حسب منشا رنگ دینے کی کوشش کر سکیں۔ لندن میں انڈیا آفس کے دروازے اِن لوگوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ چنانچہ کچھ اپنے اثر و رسوخ اور کچھ لیبر پارٹی کے بعض ممبروں کی اعانت سے اِن لوگوں نے خاصی کامیابی حاصل کر لی اور اصلاحات کی سکیم میں بہت کچھ اپنے منشا کے مطابق اضافہ کرا لیا۔

"یہ لوگ بارسوخ اور منظم تھے۔ روپے کی بھی ان کو کمی نہ تھی۔ پھر طرفہ یہ کہ پراپاگنڈے کے فن کے بھی ماہر تھے۔ اس لئے اپنی اغراض میں کامیابی حاصل کرلینا اُن کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ مصیبت تو بیچارے پنجاب کے دیہاتیوں کے لئے تھی جن کے پاس نہ تنظیم تھی۔ اور نہ سرمایہ اور جو پراپاگنڈے کے طور طریقوں سے بھی واقف نہ تھے۔ اُنہیں وہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ اصلاحات کے اس سارے ڈھونگ میں اُن کے مفاد کو نظر انداز کیا جا رہا ہے چنانچہ انہوں نے حکومت ہند سے درخواست کی کہ اُن کو بھی اپنے نمائندوں کا ایک علیحدہ وفد انگلستان بھیجنے کی اجازت دی جائے جو انڈیا آفس اور پارلیمنٹ کے سامنے اُن کے مطالبات کو بطریقِ احسن پیش کر سکے لیکن حکومت ہند نے انتہائی بے رُخی سے یہ مطالبہ رَد کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے دوبارہ اِلتجا کی کہ اگر ہمارے وفد کو پارلیمنٹ یا انڈیا آفس شرف باریابی بخشنے کو تیار نہیں تو کم از کم اُن فوجی افسروں ہی سے ہمارے سُود و زیاں اور ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے مسائل کی متعلق استفسار کر لیا جائے۔ جو اُس وقت جشنِ فتح کی تقریب کے سلسلے میں انگلستان میں مقیم تھے لیکن حکومت نے اِس گذارش کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

"نتیجہ یہ ہوا کہ اس سارے کھیل کے دوران میں پنجاب کی دیہاتی آبادی کا ایک نمائندہ بھی انڈیا آفس تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

اور نہ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے شہادت دے سکا اسے سیاست دانوں کی شاطرانہ چال یا اُن کی ہوشیاری سے تو بہر حال تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن یہ طرزِ عمل یقیناً برطانوی قوم کی دیانت و امانت کے دامن پر ایک سیاہ دھبے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

میں نے مندرجہ بالا طویل اقتباس اس لئے درج کیا ہے کہ اس سے اوڈوائر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو سکے اور اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں پرورش پانے والی بعض سازشوں کا حال بھی عیاں ہو جائے۔ اوڈوائر کے نزدیک ہندوستان کا وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ اور وزیر ہند مانٹیگو دونوں نہ صرف عقل و ہوش سے عاری اور مصلحت و دور بینی سے محروم تھے بلکہ برطانیہ کے بڑے بدخواہ اور دشمن بھی تھے۔ کیونکہ عین اُس وقت جب ہندوستان کے سامنے اہم ترین مسئلہ فوجی بھرتی کا تھا انہوں نے دہلی میں بیٹھ کر اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی کا ڈھونگ رچا دیا۔

مانٹیگو اور چیمسفورڈ کے علاوہ وہ برطانیہ کی پوری پارلیمنٹ اور کیبنٹ کو بھی موردِ الزام اور لائقِ تعزیر قرار دینے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ حیران ہے کہ انگریزی حکومت کو کیا ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے چند شورش پسند لیڈروں سے مرعوب ہو کر وہ اِس ملک میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام اور حکومت خود اختیاری کے اداروں کو فروغ دینے کے وعدہ وپیمان کر رہی ہے۔ وہ انڈیا آفس کو بھی لعن طعن کرنے سے باز نہیں آتا کہ اس نے اپنے دروازے کیوں ہندوستانی لیڈروں کے لئے کھول رکھے ہیں۔ وہ برطانیہ کی کولیشن وزارت

کو بھی قابلِ الزام گردانتا ہے کہ اُس نے مانٹیگو ایسے شخص کو جو ہندوستان کے حقیقی مسائل سے قطعاً بے خبر ہے کیوں وزیرِ ہند کی کرسی پر بٹھا رکھا ہے۔

غرض ملکۂ معظّم کی ذاتِ والا صفات سے قطع نظر جو اُس کے نزدیک ہندوستانیوں کے لئے ظلِّ سبحانی، جہاں پناہ اور منبعِ جود و سخا تھی۔ وہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم سے لے کر ہندوستان کے وائسرائے تک ہر شخص کو "برٹش امپائر" کا بدخواہ سمجھتا ہے اور اُس کے خیال میں اگر کوئی شخص برطانیہ کا سچا ہمدرد، بہی خواہ، معاون اور خیر اندیش تھا تو وہ خود سر مائیکل اوڈوائر تھا۔

بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جب اصلاحات کے مسودے پر لندن میں غور و خوض شروع ہوا۔ تو اوڈوائر نے اُس وقت بھی اپنی فتنہ انگیز کوششوں کو ترک نہیں کیا۔ اُس نے پنجاب کے چند بڑے بڑے زمینداروں کو جو حقیقتاً اُس کے اپنے آدمی تھے۔ اور جن پر اُس نے دورانِ جنگ میں ہر بہانے سے دولت و حشمت اور انعام و اکرام کی بے دریغ بارش کی تھی۔ اِس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگلستان جا کر پنجاب کی دیہاتی آبادی کی طرف سے اصلاحات کی مخالفت کریں۔ اوڈوائر کس دردمندی سے کہتا ہے کہ "دیہات کے اُن باشندوں سے جن کی زندگیاں صرف ہل جوتنے اور فصل بونے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ کسی نے نہ پوچھا کہ مجوّزہ اصلاحات کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے۔"

اِنہی ہل جوتنے اور فصل بونے والے مظلوم انسانوں کی آڑ لے کر وہ چند ایسے متموّل اور خود غرض زمینداروں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا جن کی ساری

زندگیاں اہلِ دول کی آستاں بوسی، کاسہ لیسی اور تملق و خوشامد میں گذریں تھیں۔ اور جن کے نزدیک لاٹ صاحب کا گوشۂ چشم التفات عقبیٰ کی تمام نعمتوں سے زیادہ قیمتی تھا اور جب وائسرائے نے اس قسم کے وفد کو غیر ضروری اور نقصان رساں سمجھ کر یہ درخواست رد کر دی تو اوڈوائر غم و غصہ کے آنسو بہا بہا کر اپنے دامن اور صفحۂ قرطاس دونوں کو داغدار کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لارڈ چیمسفورڈ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اوڈوائر نے پنجاب میں ہر قسم کی سیاسی تحریکوں کو ختم کرنے کے لئے دیہاتی اور شہری آبادی میں خلاف کا بیج بو رکھا ہے۔ چنانچہ جب اُس نے ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو مرکزی مجلس قانون ساز کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کو بُرا بھلا کہا۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بلا وجہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے۔ تو ایوان میں کھلبلی مچ گئی۔ اور آخر لارڈ چیمسفورڈ کے اصرار پر اوڈوائر کو اپنے الفاظ واپس لینا پڑے اور ایوان کے تمام ممبروں سے معافی بھی مانگنا پڑی۔

جس بات پر یہ جھگڑا ہوا وہ بالکل معمولی تھی۔ سر محمد شفیع نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ صوبہ بہار اُڑیسہ کی طرح پنجاب میں بھی قانون سازی (لیجسلیٹو) اور انتظامی (ایڈمنسٹریٹو) امور کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے بجائے آپس میں ملا دینا چاہیئے۔

اس تجویز پر تقریر کرتے ہوئے بلا وجہ اور بغیر کسی موقع و محل کے اوڈوائر نے کہنا شروع کر دیا کہ :۔

"آج کل یہ عالم ہے کہ چاروں طرف سے سیاسی تقریروں کا

شور سُن سُن کر ہمارے کان بہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور سیاسی دستاویزوں اور یادداشتوں کی بھرمار دیکھ دیکھ ہماری آنکھیں چُندھیائی جا رہی ہیں۔ کیا اِس شور و شغب میں میرا یہ کہنا مناسب نہیں کہ اس طوفانِ بے تمیزی کو ختم کر کے ہمیں اپنے دل و دماغ کو لایعنی تصوّرات اور بے مصرف توہمات سے پاک کر دینا چاہیئے اور لمحہ بھر کے لئے سوچنا چاہیئے کہ آخر اِس ساری سیاسی شعبدہ بازی کا اُن غریب دیہاتیوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ جن کی زندگیاں ہل چلانے، فصلیں بونے اور پھر اُن فصلوں کو آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کے لئے وقف ہو چکی ہیں۔"

اوڈوائر کی یہ تقریر کافی طویل تھی۔ جس کے دوران ہی میں کونسل کے ہندوستانی ممبروں لے جن پر وہ بے طرح برس رہا تھا۔ اُسے بار بار ٹوکا۔ جب وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو مسٹر مظہر الحق۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح ازراہِ احتجاج اُٹھ کر ایوان سے چلے گئے۔ وائسرائے نے خود اوڈوائر کی اِس بدمذاقی کو محسوس کیا۔ اور اُسے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس واقعہ کو بمشکل ایک مہینہ گذرا ہو گا کہ اُس نے ۳۰ اکتوبر کو پنجاب کی صوبائی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے پھر اُنہی خیالات و جذبات کا اعادہ کیا۔

اوڈوائر کے اِس سارے ہذیان اور اُس کی تمام مخالفانہ سازشوں کے باوجود مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور اصلاحات کا ایک خاکہ تیار ہو گیا۔ حکومتِ ہند نے اِن اصلاحات کی حمایت میں ۵ مارچ ۱۹۱۹ء

کو اپنا اعلان شائع کیا۔ تو اُس اعلان کے ساتھ اوڈوائر نے اپنا ایک اختلافی نوٹ بھی لکھ ڈالا۔ یُوں کہنا چاہیئے کہ اختلافی نوٹ اُس کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ واقعات کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اور اب وہ کسی صورت سے حالات کے دھارے کا رخ نہیں بدل سکتا تو اس نے ایک پٹے ہوئے کھلاڑی کی طرح چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دینے۔ اور اس طرح اپنی جسِّ انتقام کو تسکین بخشنے کی کوشش کی۔

اِس اختلافی نوٹ میں اوڈوائر نے نام لے لے کر مسٹر جناح۔ مسز اینی بسنٹ۔ لوکمانیہ تلک۔ پنڈت مالوی اور راجہ محمود آباد کو بُرا بھلا کہا۔ اُس نے اِن لیڈروں کی نیتوں پر حملہ کرکے انہیں خود غرض، شورش انگیز قرار دیا۔ اُس نے تحریک ہوم رُول کی جی کھول کر مذمت کی۔ اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو عوام کا بدخواہ ظاہر کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو اُس نے ایک نہایت غیر نمائندہ جماعت قرار دے کر حکومت کو متنبہ کیا کہ لیگ نے مسلمان عوام کی نمائندگی کا جو دعوے کیا ہے۔ وہ سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ اور آخر میں لکھا کہ:۔

"یہ امر بالکل واضح ہے کہ اصلاحات کا تقاضا ملک کے عوام نے بالکل نہیں کیا۔ حالانکہ عوام ہی کے مفاد کی نگہداشت حکومت کا فرض اوّلیں ہونا چاہیئے۔ یہ مطالبہ ہندوستان کے باشندوں کی ایک نہایت قلیل تعداد کی طرف سے پیش ہوا ہے جو محض اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اقتدار کی خواہاں اور عہدوں کی بھوکی ہے

اگر ہمیں اپنے اُس عہد کا کچھ پاس ہے جو ہم نے ہندوستان کی بے زبان مخلوق کی حفاظت کے لئے کیا تھا۔ تو لاریب ہمارا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ ہم اس بے زبان رعایا کے مفاد کو متقدم درجہ عطا کریں اور سیاسی لیڈروں کے شور وشغب کی کچھ پروا نہ کریں۔ خواہ وہ اس شور سے قیامت ہی کیوں نہ برپا کر دیں۔ میں یہاں ہو کت کے وہ یادگار الفاظ درج کرنے پر مجبور ہوں۔ کہ اگر میدان کے کسی ایک گوشے میں جھاڑی کے نیچے نصف درجن ٹڈے جمع ہو کر اپنی ٹیں ٹیں کے مکروہ شور سے آسمان سر پر اٹھالیں اور اُسی میدان میں شاہ بلوط کے اونچے اونچے سایہ دار درختوں کے نیچے سینکڑوں گائے بھینسیں اطمینان سے بیٹھی جگالی کر رہی ہوں۔ تو ہمیں اس غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہونا چاہئیے کہ میدان میں صرف چیخ و پکار کرنے والے ٹڈے ہی آباد ہیں۔

میں دوبارہ اس امر کی یاددہانی کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے محض یہ مقصد نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے مطالبات کی تسکین کیوں کر کی جائے۔ بلکہ سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس ملک کے عوام کی بھلائی کی صورت کیا ہونی چاہئیے۔ میں عوام کی بھلائی پر بار بار اس لئے زور دے رہا ہوں کہ مجھے حکومتِ ہند کی موجودہ تجاویز میں اُن کی سُود و بہبود کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ غالباً حکومت نے عمداً اس طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ہمیں اپنے اُس عہد کو، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اگر ہم بہ فرضِ محال اُس عہد سے چشم پوشی بھی کرلیں۔ تو اس سارے قضیئے میں سے جو چیز بالکل عیاں اور واضح ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ اِن مجوزہ اصلاحات کا خاکہ تیار کرنے میں ہمارے سامنے صرف تعلیم یافتہ جماعت کے ایک محدود طبقے کی خوشنودی تھی۔ کیا ہمارا یہ فعل کسی اعتبار سے عقلمندی یا دانائی کی دلیل سمجھا جاسکتا ہے؟ تعلیم یافتہ جماعت کا یہ محدود طبقہ، جس کی خوشنودی کو ہم نے ہر حال میں مقدم سمجھ رکھا ہے، دیہات کے عوام کی نمائندگی کا بھی دعویدار ہے۔ حالانکہ یہ دعوےٰ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ گذشتہ چند مہینوں کے واقعات میرے اِس بیان کی تصدیق و تائید کے لئے کافی ہیں۔

میرے اِس قول کی صداقت کو آزمانے کے لئے آپ جو معیار چاہیں استعمال کریں۔ مذہبی فسادات کی روک تھام کا سوال ہو یا فرقہ وارانہ اِختلافات کو مِٹانے کا مسئلہ دَرپیش ہو۔ فوجی بھرتی کے لئے رنگروٹوں کی فراہمی کا معاملہ ہو یا ملک کے دفاع کا سوال پیشِ نظر ہو۔ ہر حال اور ہر صورت میں شہر کے تعلیم یافتہ سیاسی لیڈر آگے آنے کی بجائے گھروں میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ملک و ملت کے لئے مفید اور نفع بخش تحریکوں میں شرکت کرنا یہ لوگ گناہ سمجھتے ہیں۔ ہاں جہاں فتنہ و فساد برپا کرنے یا شر انگیزی کی

آگ بھڑکانے کی گنجائش ہو گی۔ آپ ان کو ہمیشہ ہمیشہ آگے آگے پائیں گے۔"

اوڈوائر کی مندرجہ بالا تحریر پڑھ کر ایک عام حالات سے ناواقف شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر واقعی شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ دیہاتی آبادی کے دشمن اور بدخواہ تھے۔ تو حکومت ہند کو کیا ہو گیا تھا کہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہوئے اس نے ہندوستان کی اصل آبادی کو چند درندوں اور بھیڑیوں کے سامنے پھینک دینے سے دریغ نہ کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوڈوائر کے خیال میں لارڈ چیمسفورڈ اور اُن کی ایگزیکٹو کونسل کے تمام ممبر جن میں صرف ایک ہندوستانی (سرسنکرن نائر) تھا اور باقی چھ انگریز تھے۔ وزیر ہند مانٹیگو اور اُن کی کونسل کے تمام ممبر۔ جن میں صرف دو ہندوستانی (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور بھوپندر ناتھ باسو) تھے اور باقی آٹھ انگریز تھے۔ سب کے سب اس سازش میں شریک اور معاون تھے کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے دو در جن لیڈروں کو خوش کرنے کے لئے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان باشندوں کو قربان کر دینا چاہیئے۔

یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ میں اُن اصلاحات کی وضاحت کر سکوں جن کی مذمت میں اوڈوائر نے تحریر و تقریر کے تمام حربے استعمال کر ڈالے ہیں آئندہ چند صفحات میں چونکہ اس موضوع پر مفصل بحث ہونے والی ہے۔ اسلئے سر دست میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ جن اصلاحات کو اوڈوائر دیہات کے باشندوں کی تباہی و بربادی۔ اور شہر کے شورش پسند لیڈروں کی

نفع اندوزی کی دستاویز سے تعبیر کرتا ہے۔ اُن اصلاحات کی رُو سے جب پنجاب میں پہلی مجلسِ قانون ساز قائم ہوئی تو اُس کے منتخب شدہ مسلمان ارکان کی کل تعداد چونتیس ۳۴ تھی جنمیں سے اُنتیس ۲۹ دیہاتی اور صرف پانچ شہری علقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔

ممکن ہے بعض لوگ اِس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ وزیرِ ہند مانٹیگو اور اُن کے رفقائے کار چونکہ ہندوستان میں نووارد تھے اور انہوں نے اِصلاحات کے متعلق اپنی تحقیقات کا پُورا دَور دہلی میں بیٹھ کر ختم کیا تھا۔ جہاں بقول اوڈوائر" اُن کو چاروں طرف سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں نے گھیر رکھا تھا" اِس لئے اُن تک دیہات کے باشندوں کی آواز نہ پہونچ سکی ہوگی۔ یا دیہاتی آبادی کی تکالیف کی صحیح تصویر وہ ملاحظہ نہ کر سکے ہوں گے۔

آیئے ! اِس بارے میں اُس رپورٹ کا جو ۲۲ر اپریل ۱۹۱۸ء کو وزیرِ ہند اور وائسرائے کے مشترکہ دستخطوں سے شائع ہوئی تھی ایک ٹکڑا مطالعہ کریں۔

" .... سب سے پہلے ہم دیہاتی آبادی کی ضروریات اور تکالیف کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ شہروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جوں جوں لوکل باڈیز کی قسم کے ادارے قائم ہوں گے اور گاؤں کے لوگوں کو اپنے ووٹ سے مقامی معاملات طے کرنے کا موقع ملے گا۔ اُن کی سیاسی تربیت کا گویا آغاز ہو جائے گا۔ جب کسی گاؤں کے باشندے یہ محسوس کریں گے کہ اُن کے بچوں کی تعلیم کے لئے وہاں کوئی سکول نہیں۔ یا شہر کی منڈی تک

جانے کے لئے کوئی سڑک موجود نہیں۔ تو وہ اِن تکلیفوں کے ازالے کے لئے حسب سابق ضلع کے کلکٹر کے پاس عرضداشت لے کر نہیں جائیں گے بلکہ اُس امیدوار کو ووٹ دیں گے جو اس بات کا وعدہ کرے گا کہ وہ سکول کے قیام اور سڑک کی تعمیر میں اُن کی پوری مدد کرے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں۔ اِس کے لئے وقت درکار ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ شروع میں حسب منشاء نتائج برآمد نہ ہوں۔ لیکن صبر اور ہمّت سے کام آسان ہو جائے گا۔

" یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا میں سادہ لوح دیہاتیوں کو بہلا پھسلا کر یا ڈرا دھمکا کر اُن سے ووٹ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن انجام کار اُن پر اس حقیقت کا انکشاف یقیناً ہو کر رہے گا کہ اِس زمانے میں ووٹ بہت بڑی طاقت اور قومی امانت ہے۔ جس کے صحیح استعمال سے اُن کو بے حد فائدہ پہنچنے کا امکان۔ اور جس کے غلط استعمال سے اُن کی مصیبتوں میں اضافہ ہو جانے کا اندیشہ ہے دنیا میں جہاں جہاں دیہاتی آبادی کو ووٹ کا حق عطا ہوا ہے۔ ابتدا میں اِسی قسم کی دشواریاں پیش آئی ہیں۔

جوں جوں ان کی سیاسی تربیت کے ابتدائی مراحل طے ہونگے اور دیہاتی اپنے ووٹ کے صحیح استعمال کی طاقت سے آشنا ہونگے وہ حکومت کی تعمیر و تشکیل پر بھی اثر انداز ہو سکیں گے۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ مالک اراضی یا بڑے بڑے زمیندار اپنے مزارعین

پر تشدد کرتے ہیں۔ یا ساہوکار سود در سود کا چکر چلا کر انہیں ان کی زمینوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ یا تحصیل کے سرکاری کارندے بے جا سختی سے پیش آتے ہیں۔ تو وہ لاٹھی یا کلہاڑی کی ضرب سے اپنے دشمن کا سر کچل دینے کی بجائے اپنے ووٹ سے ایسا آدمی منتخب کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو ان مشکلات کو رفع کرنے میں اُن کی مدد کر سکے۔ وہ آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اگرچہ حکومت کا صدر مقام اُن کے گاؤں سے بہت دُور ہے۔ لیکن حکومت کی مشین جن پرزوں سے چلتی ہے۔ اُن میں سے دو ایک پُرزے وہ خود بھی مہیا کرتے ہیں۔ اِسی طرح اگر تمام اچھے اور کارآمد پُرزے جمع ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ مشین پہلے سے بہتر چلنے لگ جائے گی۔

لیکن اِس ضمن میں یہ کہنا ضروری ہے کہ دیہاتیوں کی ذہنی اور سیاسی تربیت خود بخود نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لئے بعض خارجی عناصر کی مدد درکار ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ سرکاری حکام اور وہ لوگ جو دیہاتیوں کے ووٹ سے نیابتی اداروں میں جانا چاہتے ہیں اِس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب گاؤں کے لوگ دیکھیں گے کہ جو شخص اُن کے ووٹ حاصل کر کے کونسل کا ممبر بنتا اور عزت و

توقیر حاصل کرتا ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ تو وہ یقیناً اپنے بچّوں کی تعلیم کی طرف متوجّہ ہوں گے۔ تاکہ وہ بھی آئندہ اسی قسم کے اعزاز کے مالک بن سکیں۔ آج تک دیہاتیوں نے اپنے بچّوں کو اِس خوف سے تعلیم سے محروم رکھا ہے کہ مبادا وہ پڑھ لکھ کر ہل چلانا اور کاشتکاری کا کام کرنا چھوڑ دیں۔ اور اِس طرح اُنہیں مالی اور اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑے لیکن اب اُن کے سامنے اُنہی کے بھائی بندوں میں سے ایک شخص نے تعلیم کا نیا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ گاؤں ہی کا رہنے والا ہے اور گاؤں کے لوگوں کے ووٹ حاصل کرکے اُنہی کا نمائندہ بن کر صوبے کی کونسل میں جا کر حکمرانی اور قانون سازی کے کاموں میں شریک ہوتا ہے۔ یہ قابلِ تقلید مثال اُنہیں تعلیم کے فوائد سمجھانے اور علم کی خوبیاں ذہن نشین کرانے میں باقی تمام مثالوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔

"ہم یہاں ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی دو ایک باتیں کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کے خلاف بعض لوگوں کی طرف سے یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اُنھوں نے اب تک صرف اپنی اغراض کی پاسداری کی ہے۔ اور دیہاتیوں کے مفاد کو بہت کم درخورِ اعتنا خیال کیا ہے اِس الزام کی صحت یا عدمِ صحت سے بحث نہیں لیکن اب یقیناً اُن کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے پس ماندہ بھائیوں کی مدد کے لئے

آگے بڑھیں۔ دیہات میں کام کرنے کی بے حد گنجائش ہے۔ جہالت اور توہمات کی تاریکی کو دُور کرنا۔ قبیلوں اور برادریوں کی خانہ جنگی کو رَفع کر کے قومیت کا صحیح تصور پیدا کرنا۔ زندگی اور معیشت کی معمولی آسائشیں جو شہروں میں عام ہیں اور دیہات میں عنقا۔ اُنہیں گاؤں کے لوگوں تک پہنچانا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صدیوں کی دَبی ہوئی مخلوق کو عزتِ نفس اور خود اعتمادی کے جوہر سے مالامال کرنا۔ یہ اتنا عظیم الشان اور محنت طلب کام ہے کہ ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگوں کو فوراً اِس طرف توجہ کرنا چاہیئے۔"

اڈورڈ آسز کا خیال تھا کہ جنگ کے دوران میں اصلاحات کا ذکر چھیڑ دینا وزیر ہند اور وائسرائے کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اُس کے نزدیک حکومت کا فرض تھا کہ اصلاحات کا مطالبہ کرنے والوں کو، خواہ وہ کانگرس کے ممبر تھے یا مسلم لیگ کے، فوراً جیل میں بند کر دیا جائے۔ لیکن اِس ضمن میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے اپنی مشترکہ رپورٹ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یکسر مختلف تھے۔ مثلاً

"........ جنگ اور جنگ کی وجہ سے بیدار ہونے والے جذبات نے ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے مسئلہ کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ اہلِ ہند نے جب دیکھا کہ جنگ کی تمام مولناکیوں کے باوجود پارلیمنٹ کو اِس بات کی مہلت مِل سکتی ہے کہ وہ آئرلینڈ کی گتھی کو سلجھا سکے

تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان کو اصلاحات سے محروم رکھنے کے لئے جنگ کو کیوں بہانہ بنایا جا رہا ہے ...... ہم بخوشی یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ہندوستان نے بہرصورت اپنے آپ کو مزید اعتماد اور بہتر طرزِ حکومت کا اہل ثابت کر دکھایا ہے۔ آئندہ ہندوستان کی حکومت میں جو تبدیلیاں کی جائیں گی۔ اُن کو ہندوستان کی جنگی خدمات کا معاوضہ سمجھنا غلطی ہے۔ یہ تبدیلیاں صرف اس لئے کی جائیں گی کہ ہندوستان اب اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اُسے اِن مراعات سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔"

اوڈوائر ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کا دشمن۔ اور تحریکِ ہوم رول کا بدترین مخالف تھا۔ اس نے امپیریل کونسل کے انیس ۱۹ ممبروں کے میمورنڈم کو شورش اور بدامنی کی دستاویز قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کے سامنے جب مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو اپنی مشترکہ رپورٹ مرتب کی۔ تو اُس میں یہ الفاظ بھی موجود تھے۔

"...... زیادہ سے زیادہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ موجودہ جنگ گویا حریت اور استبداد کی جنگ ہے۔ جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طاقت ور قوموں کی طرح کمزور قوموں کو بھی اپنی خود مختاری اور آزادی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف ممالک کے باشندوں کو بھی یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ خود اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے پر قادر ہو سکیں۔

"جب ہم بار بار اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ برطانیہ محض حریت اور آزادی کے اصولوں کو برقرار رکھنے کے لئے اس جنگ میں شامل ہوا ہے تو لامحالہ ہندوستان کے لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو آزادی کی نعمت سے کیوں محروم کر رکھا ہے؟ ...... اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مدراس میں باقاعدہ ہوم رول تحریک کا قیام عمل میں آیا اور مہینہ بھر کے بعد ہندوستان کی مرکزی کونسل کے انیس منتخب شدہ ارکان نے اصلاحات کے بارے میں اپنی تجاویز ایک میمورنڈم کی صورت میں مرتب کر کے حکومت ہند کو ارسال کر دیں۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگرس اور مسلم لیگ نے اپنے یادگار جلسوں کے بعد سیاسی اصلاحات کا ایک مشترکہ خاکہ تیار کیا۔ جو اپنی تجاویز کے اعتبار سے انیس ممبروں کے میمورنڈم کی گویا شرح و تفصیل تھی ....

کانگرس اور لیگ کے اس اشتراک عمل کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور ان دونوں قوموں کے مشترک نصب العین سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کا ہر بہی خواہ اس صورت حال سے خوش ہو کر میثاق لکھنؤ کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہے۔ اور یہ میثاق یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔"

اوڈوائر کی ملازمت کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ آزادی کی جس تڑپ کو مٹانے

کے لئے اُس نے ہر ممکن حربہ استعمال کر ڈالا تھا۔ وہ تڑپ مِٹ نہ سکی۔ اُس نے لوگوں کی آنکھوں پہ مُہریں اور کانوں پہ تالے لگا دینے کی کوشش کی تھی تاکہ حُریت اور آزادی کے جو نئے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ وہ کانوں کی راہ سے دل میں جگہ نہ پا سکیں۔ اور جوشِ عمل کی جو زندۂ جاوید تصویریں فضا میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ آنکھوں کے اندر اُتر کر روح کو مجلّا و منوّر نہ کر دیں۔ اُس نے لاہور قصور، امرتسر، گجرات، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور لائل پور وغیرہ میں مارشل لاء جاری کر کے مظالم کی وہ آگ برسائی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں صرف ۱۸۵۷ء کا کشت و خون ہی پیش کر سکتا ہے۔

اِن مظالم کے ذکر سے سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں چودہ چودہ برس کے بچّوں کو ٹکٹکی میں باندھ کر کوڑوں سے پیٹا گیا۔ کم از کم بیس کوڑوں کی سزا مقرر تھی۔ حالانکہ بڑے سے بڑے سخت جان کی کھال بھی چھ کوڑوں کے بعد اُدھڑ جاتی ہے۔ اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہر محلّے سے چُن چُن کر معززین کو گھروں سے نکالا گیا اور اُنہیں برہنہ سر برہنہ پا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر بازاروں میں پھرایا گیا۔ تاکہ کھُلے بندوں اُن کی تذلیل ہو۔ وہ لوگ جو اپنی قابلیت کی بنا پر آئندہ ہائی کورٹ کے جج اور صوبے کے وزیر بننے والے تھے اُنھیں گورہ فوج کے سپاہیوں سے پٹوا کر پھانسی کے مجرموں کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ مئی کی گرمی میں لاہور کے کالجوں کے طلبہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سروں پر اپنے بستر اُٹھا کر دن میں چار مرتبہ سولہ میل کا فاصلہ طے کر کے آئیں اور یونین جیک کو سلامی دیں۔ لاہور کے تمام باشندوں کو حکم مل گیا کہ وہ اپنی

موٹر کاریں ۔ سائیکلیں ۔ بجلی کے پنکھے اور بجلی کے لیمپ فوج کے حوالے کر دیں۔ سکول کے بچوں کو سرِ روز دھوپ میں کھڑے ہو کر، ایک فوجی افسر کے سامنے، یہ کہنا پڑتا تھا "حضور! ہم نے کوئی قصور نہیں کیا ۔ ہماری توبہ ۔ آئندہ بھی ہم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوگی"۔

ایک پوری برات کو جس میں دولہا بھی شامل تھا بلا وجہ پکڑ کر کوڑوں سے پٹوا ڈالا گیا ۔ ریل گاڑیوں پر آزادانہ سفر کی ممانعت کر دی گئی اور سوائے اُن لوگوں کے جن کو فوجی حکام پاس عنایت کرتے تھے ۔ اور کوئی شخص سفر نہیں کر سکتا تھا ۔ عورتوں کی کھُلے منہ بے حرمتی کی گئی ۔ ایک گلی مقرر کی گئی ۔ جس میں سے ہر شخص کو پیٹ کے بَل رینگتے ہوئے گذرنا پڑتا تھا ۔ اور گورہ فوج کا سپاہی ہاتھ میں بندوق تھام کر کھڑا رہتا تھا ۔ اور اگر رینگنے والا شخص ذرا دم لیتا تو سپاہی بندوق کا کُندا اس کی پُشت پر مارتا تھا ۔ شہر کے بعض معزز اور سر برآوردہ لوگوں کے مکانوں پر مارشل لاء کے احکام کے اشتہار چسپاں کر دیئے جاتے تھے ۔ اور حکم تھا کہ اگر کسی نے اِس اشتہار کو پھاڑ دیا تو مالک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا ۔ چنانچہ صاحب خانہ کو محض اپنی عزّت و ناموس کی حفاظت کے لئے دِن بھر اپنے مکان سے باہر دیوار کے قریب کھڑے رہنا پڑتا تھا ۔ تاکہ کوئی شخص اشتہار کو ہاتھ نہ لگائے ۔ لاہور میں سر فضل حسین خلیفہ شجاع الدین اور پیر تاج الدین جیسے اصحاب کے مکانوں پر بھی اِس قسم کے اشتہار چسپاں کئے جاتے تھے ۔ اور انہیں تمام دن مکان کے باہر کھڑے رہنے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی تھی ۔

وہاں سنگھ کالج کی بیرونی دیوار پر کسی نامعلوم شخص نے ایک اشتہار لگا دیا۔ جس کا مضمون فوجی حکام کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا۔ اِس جرم کی پاداش میں کالج کے پرنسپل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور آخر اُس غریب کو ڈھائی سو روپے جرمانہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنا پڑی۔

حکم صادر ہو گیا کہ جونہی کوئی انگریز نظر آئے۔ مقامی باشندوں کا فرض ہے کہ فوراً تانگے سے اُتر کر کھڑے ہو جائیں۔ اور جھک کر سلام کریں۔ ایک پچیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے کے اندر منی کے مہینے میں پچیس آدمیوں کو بند کر دیا گیا۔ جہاں وہ ہفتہ بھر مقید رہے۔ اور بول و براز کے لئے بھی اُنھیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ قصور میں منادی کر دی گئی کہ جو لوگ ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء سے پہلے یا اس تاریخ کے بعد شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ اگر چار روز کے اندر واپس نہ آئے۔ تو اُن کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی۔

جب فوجی عدالتوں کے سامنے مقدمات پیش ہونے لگے تو صفائی کی طرف سے کسی وکیل کو پیروی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور ملزموں کو پھانسی اور عمر قید کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اور سزا ملتی تھی۔ قصور میں تنائیس آدمیوں کو پھانسی اور تیرہ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ گوجرانوالہ میں محض اس جُرم میں کہ پٹوار خانہ کو آگ لگا دی گئی تھی پانچ آدمیوں کو پھانسی اور دس کو حبسِ دوام کی سزا ہوئی۔ حافظ آباد میں چار کو پھانسی اور پندرہ کو حبسِ دوام کی سزا ملی۔ نظام آباد میں چار کو پھانسی اور آٹھ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ امرتسر میں چونتیس کو پھانسی اور پندرہ کو حبسِ دوام کی سزا ملی۔ اسی طرح لاہور اور

امرتسر ایسے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبات تک میں سزاؤں کی وہ بھرمار ہوئی کہ اس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ ایک شخص کو محض اِس جرم میں کہ اُس نے ایک پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ آؤ ہمارے ساتھ مِل جاؤ"! حبسِ دوام کی سزا ملی۔

یہ سب کچھ مائیکل اوڈوائر کی آنکھوں کے سامنے، اُس کی منظوری اور رضامندی سے ہو رہا۔ چنانچہ جب وہ ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کو لاہور سے رخصت ہوا۔ تو دل ہی دل میں خوش تھا کہ اُس نے پنجاب کی شہری آبادی اور یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ایسا سبق سکھایا ہے۔ جس کو وہ کئی پُشتوں تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔ مارشل لا، جاری کرنے سے صرف چار روز قبل اُس نے لاہور کے منٹگمری ہال میں فوجی جماعتوں کے نمائندوں کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ پنجاب کی دیہاتی اور شہری آبادی میں باہمی منافرت پھیلانے کے لئے اُس کی سب سے آخری اور سب سے خطرناک کوشش تھی۔ اِس تقریر میں اُس نے فوجی جماعتوں کے نمائندوں کو جو تمام تر دیہات سے آئے ہوئے تھے۔ یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُن کے اور شہری باشندوں کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ بلکہ دونوں طبقوں کے مفاد ایک دوسرے سے اِس قدر مختلف ہیں کہ باہمی تصادم کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اِس اشتعال انگیز تقریر کا کچھ حصہ یہاں درج کرنا

لے مظالمِ پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (سنہ ۱۹۲۰ء)

بے محل نہ ہوگا۔

"آپ نے گذشتہ چند ہفتوں کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں کہ ایک ایسے قانون کو جو لوگوں کے جان ومال کی حفاظت کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اور جس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ بدامنی اور بغاوت کے طوفان کا سدِّ باب کیا جائے۔ کیوں کر توڑ مروڑ کر اور مسخ شدہ صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا جارہا ہے تاکہ کذب وافترا کے اِن ہتھکنڈوں سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ سب کچھ ایک ایسے طبقے کے افراد کر رہے ہیں جن کی تعداد بے حد قلیل ہے۔ لیکن جو شور مچانے اور چیخ پکار کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ یہ لوگ اِس قانون کو ایک خطرناک ہَوّا بنا کر عوام کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اِس قانون کا مقصد صرف یہ ہے کہ غیر معمولی حالات میں عوام کے جان ومال کی حفاظت کیونکر کی جا سکے گی۔

آپ میں سے جن لوگوں نے اِس قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ تحریک کس قدر بے معنی اور غلط ہے ۔۔۔۔۔ تحریک چلانے والوں کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے خلاف بد دِلی پھیلائی جائے۔ اور سرکار کے نمک خواروں کو ذلیل کیا جائے۔ حکومت کے وفادار باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اِس شرانگیز تحریک کا مقابلہ کریں۔ لہٰذا میں آپ سے کہتا ہوں کہ عوام کے پاس جائیے۔ اور انھیں حکومت کی

خیر سگالی سے آگاہ کرکے اس قانون کے فوائد ان کے ذہن نشین کیجئے صوبے کا شورش پسند عنصر عوام کو گمراہ کرنے۔ اور شہروں کے غنڈوں کو فساد پہ آمادہ کرنے پہ تُلا ہوا ہے۔ آپ ان کی کوششوں کو ناکام بنا کر دم لیں۔"[1]

"حکومت کی نگاہیں آپ ایسے وفاداروں پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ کے سیاسی خیالات چاہے کچھ ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ حکومت کے دست و بازو بن کر موجودہ تحریک کو کچلنے میں ہماری مدد کریں۔ اس ابتلاء کا مقابلہ کرنے میں حکومت آپ کے اشتراک و تعاون۔ اور آپ کی امداد و اعانت کی اُسی طرح شکر گذار ہوگی۔ جس طرح اُس نے جنگ فتح کرنے میں آپ کی خدمات کو ہمیشہ بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے۔

---

[1] سر مائیکل اوڈوائر نے اس تقریر میں بار بار جس قانون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ رولٹ ایکٹ تھا۔ جس کے خلاف بطور احتجاج ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو پشاور سے لے کر راس کماری تک ایسی مکمل اور زبردست ہڑتال ہوئی تھی کہ اس برِّ عظیم کے باشندوں نے اس کی نظیر پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اوڈوائر کے خیال میں یہ قانون نہایت بے ضرر معقول اور ملک کے امن و عافیت کے لئے ناگزیر تھا۔ اور صرف شہروں کے چند شورش پسند آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

آیئے واقعات پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ یہ قانون ملک بھر کی مخالفت کے باوجود ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو ہندوستان کی (زبانی صفحہ ۱۰۶ پر)

حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، اور فوری اقدام کے محتاج ہیں۔ اب آپ مزید تامل نہ کیجئے۔ اور فوراً کمر ہمّت باندھ لیجئے۔ حکومت نے تو گومگو کی پالیسی ترک کر دی ہے۔ آپ بھی اُٹھ کھڑے ہوں۔ حکومت اِس مہم میں ہر لمحہ آپ کے لئے پشت پناہ ثابت ہوگی۔ حکومت نے قانون کے نفاذ کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۵)

مرکزی مجلس قانون ساز نے منظور کیا۔ اُس وقت مرکزی کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی مجموعی تعداد تئیس تھی۔ جن میں سے ایک سر شنکرن نائر بھی تھے جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ اِس کے مقابل انگریز ممبروں کی تعداد چوبیس تھی جب رولٹ بل پر ایوان میں رائے شماری ہوئی۔ تو سوائے سر شنکرن نائر کے (جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حکومت کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور تھے) بائیس ہندوستانی ممبروں نے بل کے خلاف ووٹ دیئے۔ مسلمان ممبرں میں راجہ محمود آباد۔ میر اسد علی۔ مسٹر جناح۔ سر فضل بھائی کریم بھائی۔ مسٹر مظہر الحق سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خاں شامل تھے۔ حد یہ ہے کہ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خاں ایسے اصحاب نے بھی جو عام طور پر حکومت کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اِس موقع پر بے دریغ حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ مسٹر جناح نے رولٹ بل کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مرکزی کونسل میں کہا تھا:

"...... میرا یہ فرض ہے کہ میں حکومت کو آگاہ کر دوں کہ اگر یہ قانون منظور ہو گیا۔ تو آپ کے اِس فعل سے تمام ملک میں ایک سرے سے

(باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

خواہ اِس کام میں خون کی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس تمام خون خرابے کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ بلکہ اُن لوگوں پر عائد ہو گی جو قانون شکنی کی تلقین کر رہے ہیں۔

آپ لوگوں کو میری یہ آخری نصیحت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہ الفاظ رائیگاں نہیں جائیں گے۔ اور آپ بلا تامل اِس نصیحت کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کریں گے تاکہ رخصت ہونے سے قبل میں پنجاب میں امن و امان کی بحالی کا نظارہ دیکھ لوں موجودہ شورش بلاشبہ خطرناک ہے۔ لیکن شکر ہے کہ صوبے کے طول و عرض میں ابھی نہیں پھیلی۔ اگر آپ نے بروقت مدد کی تو میں اِس فتنے کو بآسانی دبا سکوں گا۔

میں ہمیشہ اِس بات کو فخر سے یاد رکھوں گا کہ عالمگیر جنگ فتح

لے کر دوسرے سرے تک ایسی خطرناک شورش اور بدامنی پھیل جائے گی۔ جس کی مثال آپ نے آج تک نہیں دیکھی اور یقین کیجیے کہ یہ شورش ان خوشگوار تعلقات کو تباہ کر دے گی جو اس وقت حکومت اور عوام کے درمیان قائم ہیں۔"

جب ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو انتہائی مخالفت کے علی الرغم حکومت نے یہ قانون منظور کر دیا۔ تو مسٹر جناح اور مسٹر مظہر الحق نے بطور احتجاج مجلس قانون ساز کی رکنیت سے استعفےٰ دیدیا۔

کرنے میں کیا۔ اور ملک کو اندرونی شورش سے نجات دلانے میں
کیا۔ میں نے جب بھی آپ لوگوں سے امداد و اعانت کی
درخواست کی آپ نے کبھی بُخل نہیں کیا۔ مجھے پختہ امید ہے کہ
آئندہ چند ہفتوں میں آپ جو کچھ کریں گے۔ اُس سے آپ مجھے
اور حکومت کو اور زیادہ ممنونِ احسان بنا دیں گے"[1]

مائیکل اوڈوائر پنجاب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ لیکن اپنے پیچھے
جو چیزیں یادگار چھوڑ گیا۔ اُن میں ایک شہری اور دیہاتی آبادی کی باہمی رقابت
بھی تھی۔ جس نے رُبع صدی سے زیادہ عرصے تک پنجاب کے مسلمانوں کی
سیاست کو نہ صرف قسم قسم کے مخمصوں میں اُلجھائے رکھا۔ بلکہ جس نے مسلمانوں
کی اکثریت کو غیر مسلم اقلیت کے سامنے کبھی سربلند و گردن افراز ہونے کا موقع
نہ دیا۔

سر فضلِ حسین نے ۲۰ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے
ہوئے اِس موضوع پر کہا تھا۔

جواب:- "پنجاب میں اِس سے قبل شہری اور دیہاتی طبقوں کے
درمیان نہ تو کوئی رقابت تھی۔ اور نہ عداوت۔ یہ تفریق
حال ہی کی پیداوار ہے۔ آپ نے اصلاحات کی سکیم میں
ملاحظہ فرمایا ہو گا۔ کہ جہاں تک ہمارے صوبے کا تعلق ہے

---

[1] ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی اخباری رپورٹ مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۱۹ء۔

اس تفریق کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اور اُسے بہت نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔"

سوال :- "میں ٹھیک طرح آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادی میں پہلے کوئی تمیز نہ تھی"؟

جواب :- "میرا مطلب یہ ہے کہ شہری اور دیہاتی باشندوں کے مفاد قطعاً ایک دوسرے سے مخالف یا متصادم نہیں تھے۔ دونوں طبقوں کے درمیان نہ تو کسی قسم کی مخالفت تھی۔ اور نہ ایک طبقہ دوسرے کو اپنا بدخواہ سمجھتا تھا؟"۔

سوال :- "بعد میں کیا ہوا"؟

جواب :- "جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ یہ تفریق گذشتہ تین، چار سال کے دوران میں عمداً پیدا کی گئی ہے۔ آہستہ آہستہ بڑی کوشش سے اس خیال کو تقویت دی گئی ہے کہ دیہاتی آبادی ہی اصل میں حکومت کی توجہ اور سرپرستی کی مستحق ہے۔ اور صرف گاؤں کے لوگ عوام کی نمائندگی کا دعوےٰ کرنے کے مجاز ہیں۔ اِس لئے حکومت کو چاہیئے کہ اُن کے مفاد کو ہر لمحہ پیشِ نظر رکھے نظر بظاہر اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی اصل آبادی دیہات میں بستی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ حکومت نے اپنی اِس حکمتِ عملی پر اس طریقے اور ایسے انداز سے عمل کیا کہ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری باشندوں کو نظر انداز کر کے پیچھے پھینک دیا گیا ہے۔"

سوال :- کیونکر پیچھے پھینک دیا گیا ہے ؟ کیا آپ کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں ؟"

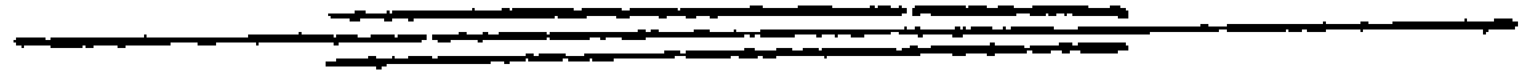
جواب :- مثال کے طور پر صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابی حلقوں کو دیکھ لیجئے۔ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شہر کا کوئی باشندہ دیہاتی حلقے سے امیدوار کھڑا نہیں ہو سکے گا۔"

سوال :- "آپ غالباً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت کی اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ آہستہ آہستہ اس قسم کے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن سے شہری آبادی کی اہمیت ختم ہو جائے۔ کیا یہی مطلب ہے آپ کا ؟"

جواب :- "جی ہاں ! آپ نے بالکل درست فرمایا۔"

سر فضل حسین نے اپنی شہادت میں جس باہمی رقابت کا ذکر کیا ہے۔ اس رقابت کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا تھا - اور یہ تقسیم اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ ملازمتوں اور کونسل کی نشستوں سے نکل کر کانج اند سکول کے کمروں تک میں پہنچ گئی تھی۔ چھ برس کے بچے کو مدرسے میں داخل کراتے وقت چھپی ہوئی درخواست کے ایک خانے میں لکھنا پڑتا تھا کہ بچہ شہری ہے یا دیہاتی زراعت پیشہ ہے یا غیر زراعت پیشہ - غرض مند لوگ اس تقسیم سے فائدہ اٹھانے میں آگے آگے تھے - خود انگریز نے اپنی شہنشاہیت کی گرتی ہوئی دیوار کو پشتہ دینے کے لیے آخر وقت تک اس تقسیم کو برقرار رکھنے کی کوشش

کی۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے خوں چکاں واقعات نے یہ حقیقت اَلم نشرح کر دی کہ دشمن کی تلوار جب مسلمان پہ وار کرتی ہے تو شہری اور دیہاتی میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتی۔ تاہم اس تلخ حقیقت کو پہچاننے۔ اور حقائق کی خار دار وادی میں سے گزر کر تحفّظِ قومی کی منزل تک پہونچنے میں ہمیں اٹھائیس سال لگ گئے۔ اور ستم یہ ہے کہ اِس طویل مدّت میں ہم مسلسل اپنوں اور بیگانوں کی فریب کاریوں کا شکار ہوتے رہے۔



تیسرا باب

اصلاحات کا نفاذ

دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگرس۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوئے۔ ہندوستان کی ان تینوں نمائندہ انجمنوں نے بالاتفاق جدید اصلاحات کو رد کر کے ترکِ موالات کا پروگرام منظور کر لیا۔ اس پروگرام کے نکاتِ پنجگانہ میں یہ چیزیں شامل تھیں۔

کونسلوں کا مقاطعہ

بدیشی کپڑے کا مقاطعہ

سرکاری خطابات کا مقاطعہ

حکومت سے زیر امداد لینے والے سکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ

عدالتوں کا مقاطعہ

کانگرس کا وہ طبقہ جسے عرفِ عام میں اعتدال پسند (ماڈریٹ) کہا جاتا تھا دسمبر ۱۹۱۹ء ہی میں، اجلاسِ امرتسر کے بعد، کانگرس سے قطع تعلق کر چکا تھا

اِس طبقہ میں جو لوگ شامل تھے اُن میں سر تیج بہادر سپرو۔ سی۔ وائی۔ چنتامنی۔ سر چمن لال ستیلواڈ۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ سری نواس شاستری۔ سرندرا ناتھ بنیرجی۔ ڈاکٹر پرنجپے۔ پنڈت جگت نرائن۔ ڈاکٹر جیکر۔ این بی کیلکر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اِن لوگوں نے کانگرس سے علیحدہ ہو کر فوراً لبرل کانفرنس کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کر لیا۔ اِن کا خیال تھا کہ نئی اِصلاحات کو قبول کر کے، جہاں تک ممکن ہو سکے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اور آئندہ ترقی کے لئے آئینی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔

کانگرس کے اجلاسِ ناگپور میں ہندوستان کے تمام حِصّوں سے ۱۴۵۸۲ مندوبین شامل ہوئے۔ جن میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۵۰ تھی۔ ناگپور سے پہلے اور ناگپور کے بعد کانگرس کے کسی اجلاس میں مسلمان مندوبین کی اتنی بڑی تعداد شامل نہیں ہوئی تھی۔ مسئلۂ خلافت نے ہندوستان کے مسلمانوں میں آگ لگا رکھی تھی۔ اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کے اشتراک سے ترکِ موالات کا لائحۂ عمل اِختیار کرنے کا مُصمّم ارادہ کر لیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں اِدھر کانگرس اور خلافت نے ڈنکے پر چوٹ لگائی۔ اور کونسلوں کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ اُدھر حکومت نے ہندوستان کے تمام صوبوں میں انتخابات کرا کے جدید اِصلاحات کے تحت مجالس قانون ساز مرتب کر ڈالیں۔ مسٹر مانٹیگو اِس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے۔ وہ ہندوستان کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ انہوں نے جس جرأت سے برطانیہ کے رجعت پسند عنصر کا مقابلہ کر کے کانگرس اور مسلم لیگ کی متحدہ سکیم کو

قبول کرلیا تھا، وہ اُن کے حسنِ نیّت کا ثبوت تھا۔ مانٹیگو دل سے چاہتے تھے کہ اہلِ ہند کم از کم ایک مرتبہ تو نئی اصلاحات پر عمل کرکے دیکھیں۔ اگر آزمانے کے بعد یہ نظامِ حکومت بے کار ثابت ہوا۔ تو آئندہ اصلاحات کی جو نئی قسط تیار ہوگی اُس میں جملہ نقائص رفع کر دیئے جائیں گے۔ لیکن مانٹیگو کے ان قابلِ تعریف عزائم کے باوجود ہندوستان کا انتہا پسند طبقہ بیک آواز اصلاحات کو مردود و مقہور قرار دے چکا تھا۔

جب مانٹیگو نے دیکھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے وہ اعتدال پسند افراد جو ترکِ موالات کے حامی نہیں تھے۔ اپنی جماعتوں سے کٹ کر کونسلوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور اصلاحات پر عمل کرنے کو آمادہ ہیں تو انہیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ انہوں نے فوراً وائسرائے کو لکھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے صوبائی حکومتوں کی وزارتیں انہی لوگوں کے حوالے کی جائیں۔ اس طرح دو فائدے پیشِ نظر تھے۔ ایک یہ کہ کانگرس کے انتہا پسند طبقہ کو دکھا دیا جائے کہ اصلاحات اس قدر حقیر و بے معنی نہیں ہیں جیسا کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے سے ملک کو بہت کچھ فائدہ بھی پہونچ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ کے رجعت پسند عناصر پر یہ امر واضح ہو جائے کہ خود کانگرس کا ایک طبقہ ایسا ہے جو اصلاحات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا اور اُن سے استفادہ کرنے کا خواہاں ہے۔

مانٹیگو کی اِس خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جن لوگوں کو وزارتوں کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اُن میں

سر ندر اناتھ بنیرجی (بنگال)۔ پنڈت جگت نرائن اور سی۔ وائی چنتا منی (یو۔ پی)۔ سر چمن لال ستیلواڈ اور ڈاکٹر پر بنجپے (بمبئی)۔ سید فخر الدین اور مدھو سدن (بہار)۔ این۔ سی۔ کیلکر (سی۔ پی)۔ میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال (پنجاب) تھے۔

میاں فضل حسین کونسل میں داخل ہونے سے پہلے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری۔ اور پنجاب صوبائی کانگرس کے صدر تھے۔ انہوں نے میثاقِ لکھنؤ پر پنجاب کے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ کانگرس اور لیگ کی متحدہ سکیم کو مقبول بنانے اور پنجاب کی رائے عامہ کو بیدار کرنے میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انہوں نے پنجاب پراونشل کانفرنس کے پانچویں سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا وہ سر مائیکل اوڈوائر کے نزدیک گویا سراسر باغیانہ خیالات سے لبریز تھا۔ قطع نظر اس سیاسی حیثیت سے میاں صاحب انجمن حمایتِ اسلام۔ پنجاب یونیورسٹی اور ہائی کورٹ کے مقتدر ترین ارکان میں شمار ہوتے تھے۔

لالہ ہرکشن لال کیمبرج کے فارغ التحصیل بیرسٹر تھے۔ لیکن چند سال کی پریکٹس کے بعد انہوں نے وکالت ترک کر کے صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اور اب اس پیشے میں وہ ہندوستان کے کامیاب ترین آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے بھارت انشورنس کمپنی کے نام سے ہندوستان میں پہلی بیمہ کمپنی قائم کی۔ پیپلز بنک کے نام سے پنجاب میں پہلا دیسی بنک قائم کیا۔ لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی قائم کر کے لاہور کو پہلی مرتبہ برقی روشنی سے منور کیا

اس کے علاوہ وہ بے شمار کارخانوں، صنعتی اداروں اور اجارہ داریوں کے اور درآمد و برآمد کرنے والی تجارتی فرموں کے مالک تھے۔ سیاسیات میں بھی اُن کا پایا بہت بلند تھا۔ ۱۹۰۹ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو ہرکشن لال مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ انگلستان جانے والے کانگرسی وفد کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ مارشل لاء میں اُن کو حبسِ دوام کی سزا ملی تھی۔ اور اُن کی تمام جائداد جس کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی، ضبط کئے جانے کا حکم صادر ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو نے اُنہیں ترکِ موالات پہ آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن انجام کار انہوں نے کونسل میں داخل ہو کر وزارت قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔

اُس وقت پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلگن تھے۔ جو اپنی عافیت پسند طبیعت اور صلح کیشی کے اعتبار سے اپنے پیش رو سے بالکل مختلف انسان تھے میاں فضلِ حسین اور لالہ ہرکشن لال کو وزارت پر آمادہ کر لینے کے لئے انھیں مستحقِ مبارکباد قرار دیا گیا تھا۔ پنجاب کے یہ دونوں وزیر قابلیت، متقل مزاجی، سیاسی فہم و فراست اور کردار کی مضبوطی کے لحاظ سے صوبے کا بہترین انتخاب تھا۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگرس کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ دونوں نے سراسر ذاتی کوشش اور محنت سے دنیوی عروج حاصل کیا تھا۔ اور دونوں میں یقیناً اتنا حوصلہ تھا کہ وہ آزمائش کے وقت برطانوی حکومت کے دبدبے سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ وزارت کی تشکیل ہوتے ہی پنجاب کے

بعض انگریز افسروں نے فضا کی ناسازگاری کو محسوس کر لیا۔ اور مستعفی ہو کر چلے گئے۔ اِن میں دو آدمی زیادہ نمایاں تھے۔ ایک سر مائیکل اوڈوائر کے زمانے کے پنجاب کے چیف سکرٹری جے۔ پی۔ ٹامسن اور دوسرے ہائی کورٹ کے جج لیزلی جونز۔

پنجاب کی اِس پہلی لیجسلیٹو کونسل میں تئیس سرکاری و غیر سرکاری نامزد ارکان۔ اور اکثر انتخاب شدہ ممبر تھے۔ انتخاب شدہ ممبروں میں پینتیس مسلمان پندرہ سکھ اور اکیس[۲۱] ہندو تھے۔ پینتیس[۳۵] مسلمانوں میں سے پانچ شہری اور تیس[۳۰] دیہاتی حلقوں سے آئے تھے۔ یہ لوگ کسی نوع کی سیاسی جماعت، کسی قسم کے سیاسی نظام یا کسی انداز کے سیاسی پروگرام کے تحت منتخب نہیں ہوئے تھے۔ اِن میں سے ہر شخص صرف اپنی ذات کا ذمہ دار تھا۔ دیہاتی علقوں سے منتخب ہو نے والے ممبر اچھے خوشحال اور بڑے بڑے زمیندار تھے۔ جن کی ذہنی تربیت اُسی ماحول میں ہوئی تھی جو سر مائیکل اوڈوائر کے شش سالہ عہدِ حکومت میں قائم کر دیا تھا۔ یہ لوگ سیاسیات میں رجعت پسند، تعلیم میں پس ماندہ قبائلی عصبیت کی فضا کے پروردہ۔ انگریزی اقتدار کے دل و جان سے حامی اور شہری آبادی کو حریف سمجھ کر اُس سے خائف اور کسی قدر متنفر بھی تھے اگر غور سے دیکھا جائے تو اِس کونسل کی حقیقی طاقت کا سرچشمہ اِن تیس[۳۰] دیہاتی ممبروں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر یہ تیس ممبر متفق ہو کر کسی شخص کو اپنا لیڈر منتخب کر لیتے تو انجام کار وہی پنجاب کا وزیر بننے کا مستحق قرار دیا جاتا۔

۱۹۲۱ء میں پنجاب میں قطعاً کسی قسم کی دستوری یا آئینی روایات

موجود نہیں تھیں۔ کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ وزیر کیونکر مقرر کئے جائیں گے۔ اِصلاحات کے مسودے میں صرف اتنا درج تھا کہ صوبے کے وزیر مجلسِ قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اور صرف اُس شخص کو وزیر مقرر کیا جائے گا جو کونسل کے انتخاب شدہ ارکان کی اکثریت کے اعتماد کا حامل ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جب کونسل میں کوئی معیّن اور واضح پارٹی موجود نہیں تھی تو پھر یہ کیونکر طے کیا جاتا کہ اکثریت کس کو اپنا سربراہ یا لیڈر بنانا چاہتی ہے۔ اس کا آسان طریق یہ تھا کہ پینتیس ۳۵ مسلمان اور اکیس ۲۱ ہندو ممبروں سے کہدیا جاتا کہ وہ علیحدہ علیحدہ جلسہ کرکے اپنا اپنا لیڈر منتخب کرلیں۔ اور گورنر اِن دونوں فرقوں کے انتخاب شدہ لیڈروں کو قلمدانِ وزارت سونپ دے۔

یہ طریقہ سراسر جمہوری اور عین قاعدے کے مطابق ثابت ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پنجاب کا گورنر اپنے دونوں وزیر اِس طرح منتخب کرتا تو کیا میاں فضلِ حسین اور لالہ ہرکشن لال کے وزیر بننے کا کوئی اِمکان تھا؟ آج سینتیس ۳۷ سال گذر جانے کے بعد اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ تاہم میری حتمی رائے ہے کہ لالہ ہرکشن لال تو شاید وزیر بن جاتے۔ لیکن میاں فضلِ حسین کے وزیر بننے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

میاں فضلِ حسین بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد خان بہادر میاں حسین بخش سرکاری ملازمت میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ فضلِ حسین نے ۱۸۹۰ء میں گورداسپور کے ہائی سکول سے میٹرک اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔

بی۔اے میں وہ ڈاکٹر اقبال کے ہم جماعت تھے۔ اور دونوں نے سر ٹامس آرنلڈ اور مولانا محمد حسین آزاد سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں فضل حسین انگلستان چلے گئے۔ جہاں وہ دو مرتبہ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ لیکن ناکام رہے۔ آخر کیمبرج سے بی۔اے کر کے اور لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۱ء میں واپس ہندوستان آ گئے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک انھوں نے سیالکوٹ میں پریکٹس کی۔ اور ۱۹۰۵ء میں لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

اُس زمانے میں پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پبلک زندگی سے رُوشناس کرنے۔ اور اُن میں قومی خدمت کا جذبہ بیدار کرنے کا صرف ایک ادارہ تھا۔ یعنی انجمن حمایتِ اسلام۔ فضلِ حسین نے لاہور پہنچتے ہی انجمن کے کاموں سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اور آہستہ آہستہ انجمن کی جنرل کونسل کے ممبر اور اسلامیہ کالج کمیٹی کے سکریٹری ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور چند سال بعد سنڈیکیٹ کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ اُنھیں یونیورسٹی کی بہت سی تعلیمی اور انتظامی سب کمیٹیوں میں بھی کام کرنے کا موقع ملنے لگا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رُکنیت کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے حلقے سے اُمیدوار کھڑے ہوئے۔ یونیورسٹی کا حلقۂ انتخاب کلیتہً ہندوؤں کے لئے وقف تھا۔ میدانِ انتخاب میں اُس وقت تین اُمیدوار تھے۔ لالہ دُرگا داس۔ راجہ سر ہرنام سنگھ اور میاں فضل حسین۔ راجہ سر ہرنام سنگھ مہاراجہ کپورتھلہ کے بھائی تھے۔ اور مدت سے مسیحی مذہب

اختیار کر چکے تھے۔

اِن تینوں امیدواروں میں سے قابلیت، سیاسی بیداری اور قومی خدمات کے اعتبار سے سر فضل حسین کا پلہ یقیناً بھاری تھا۔ لیکن جب وہ اپنے ہندو دوستوں سے مدد کے خواہاں ہوئے تو سب نے معذوری کا اظہار کیا۔ اور کھلے بندوں اعتراف کیا کہ اگرچہ ذاتی طور پر وہ فضل حسین کو ہر اعتبار سے یونیورسٹی کا بہترین نمائندہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک ہندو امیدوار کے مقابلہ میں کسی مسلمان کو ووٹ دینا وہ قومی غداری خیال کرتے ہیں۔ یہ واقعہ فضل حسین کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوا۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے ایک مرتبہ اِس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

"ایک ہندوستانی مسلمان چاہے کتنا ہی قوم پرست بنے۔ اور فرقہ وارانہ جذبہ سے مبرّا ہونے کا دعوےٰ کرے۔ قول و فعل کے علاوہ تمام دیگر امور میں بھی وہ پکا نیشنلسٹ کیوں نہ بن جائے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اُس کی زندگی کا ایک گوشہ بھی ایسا نہ دکھا سکے۔ جس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہو۔ لیکن جب انتخاب کا موقع آئے گا تو ہندو لیڈر اور ہندو عوام اُس کے خلاف ووٹ دیں گے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ مسلمان کسی قدر قابل اور دلیر بھی واقع ہوا ہے۔"

جب انتخاب کی تاریخ قریب آئی۔ تو ہندو لیڈروں نے محسوس کیا کہ اگر مقابلہ تین امیدواروں کے درمیان ہوا تو عیسائی اور انگریز ، چند ووٹ سر رام سنگھ کو دے دیں گے اور اِس صورت میں ممکن ہے کہ فضل حسین تمام مسلمانوں اور کچھ ہندوؤں کے ووٹ لے کر کامیاب ہو جائیں۔ اِس لئے انہوں نے لالہ درگا داس کو بیٹھ جانے پر مجبور کیا

تاکہ تمام ہندو، عیسائی اور انگریز متحد ہو کر سر سرنام سنگھ کے حق میں ووٹ ڈال سکیں
مقصد صرف یہ تھا کہ ہر حال اور ہر صورت میں فضلِ حسین کو ناکام بنایا جائے لیکن
عین موقع پر میاں فضل حسین کو معلوم ہو گیا کہ راجہ سر سرنام سنگھ برطانوی ہند کے
باشندے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی قومیت بدستور ریاست کپور تھلہ کی ہے۔ جب
کاغذاتِ نامزدگی داخل ہو چکے۔ تو فضل حسین نے اپنے حریف کے خلاف یہ اعتراض
کیا۔ جو سراسر آئینی اور جائز اعتراض تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرنام سنگھ کا نام خارج ہو گیا
اور فضلِ حسین بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

میاں فضلِ حسین ابتداء سے کانگرس اور مسلم لیگ کے ممبر تھے اور انہوں نے لیگ
اور کانگرس کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے۔ اور دونوں جماعتوں کو متحد العمل بنانے
میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ بیرونِ پنجاب سے مسٹر جناح۔ مسٹر مظہر الحق۔ سید حسن امام
اور راجہ محمود آباد اِن کوششوں کے حامی تھے۔ سر محمد شفیع چونکہ اِس نوع کی
ترقی پسند سیاست کے خلاف تھے۔ اِس لئے فضلِ حسین اور شفیع کے درمیان
اختلافات کا رُونما ہونا ایک لازمی امر تھا۔ میاں محمد شفیع پنجاب صوبائی لیگ
کے صدر تھے اور سر مائیکل اوڈوائر نے اِس جھگڑے میں میاں محمد شفیع کا ساتھ دیا
فضلِ حسین نے تہ مقابل بن کر اور خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ پیر
تاج الدین اور غلام رسول خاں کو ساتھ ملا کر پنجاب میں نئی صوبائی لیگ کی
بنیاد رکھدی۔ جب جنگِ عظیم میں شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی
تو شفیع لیگ نے حکومتِ مصلحت آمیز اختیار کر لیا۔ لیکن نئی لیگ نے فضلِ حسین
کے زیرِ صدارت ایک پبلک جلسہ میں شریف حسین کی مذمت کی۔ مائیکل اوڈوائر

کو فضلِ حسین کا یہ فعل کبھی ناگوار گزرا دسمبر ۱۹۱۶ء میں جب کانگرس اور لیگ کے درمیان میثاقِ لکھنؤ مرتب ہوا تو سر محمد شفیع بطور احتجاج لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ اور پنجاب مسلم لیگ کلیۃً میاں فضلِ حسین اور اُن کے رفقا کے قبضے میں چلی گئی۔ اب فضلِ حسین پنجاب کانگرس کے صدر اور پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری تھے اور اس حیثیت سے وہ اپنے صوبے کی سیاسیات میں سب سے اہم اور بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کے سامنے جب کانگرس اور مسلم لیگ کا متحدہ وفد جدید اصلاحات کی تجاویز کا مسودہ لے کر پیش ہوا تو فضلِ حسین اس وفد کے رکن تھے۔ پیشہ وکالت میں بھی اُن کو چوٹی کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اور جب سر محمد شفیع وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن مقرر ہو گئے تو فضلِ حسین کو لاہور ہائی کورٹ بار کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ جنگِ عظیم کے اختتام پر اُنہوں نے ترکوں کی کھلم کھلا حمایت کی۔ اور تحریکِ خلافت کے ابتدائی مراحل میں انہوں نے بعض بڑے بڑے پبلک جلسوں کی صدارت بھی کی۔ اس کے علاوہ وہ رولٹ بل کی مذمت کرنے میں بھی پیش پیش تھے۔

سر مائیکل اوڈوائر کی مذموم کوششوں سے پنجاب کی آبادی میں شہری اور دیہاتی کی جو تقسیم پیدا ہو گئی تھی۔ میاں فضلِ حسین اُس کے سخت خلاف تھے۔ اوڈوائر کی موجودگی ہی میں جب چودھری لال چند نے جو رہتک کے جاٹوں کے ایک متمدر لیڈر تھے، پنجاب کونسل میں یہ قرارداد پیش کی کہ جدید اصلاحات میں شہری اور دیہاتی آبادی کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے قائم کئے جائیں اور شہری اور دیہاتی آبادی کے تناسب ہی سے کونسل میں نشستوں کی تعداد مقرر ہونی چاہئیے۔ تو میاں فضلِ حسین نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ اِس وقت پنجاب کے تمام انتخابی حلقوں کو شہری اور دیہاتی کے نام سے دو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کا یہ نظریہ قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ اِن دونوں حصّوں کے مفاد ایک دوسرے کے مخالف یا متضاد ہیں۔ جب آپ شہری اور دیہاتی کے نام سے پوری آبادی کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں تو معاف فرمائیے گا، آپ اُس تعلیم یافتہ طبقے کو جو اب تک صوبے میں فضیلت و برتری کا مالک خیال کیا جاتا تھا ایک ایسی ادنیٰ بلکہ غلامانہ حیثیت قبول کرنے پہ مجبور کرتے ہیں جس کا وہ عادی نہیں۔ اور جس کا وہ اپنے اثر و رسوخ کے اعتبار سے مستحق کبھی قرار نہیں دیا جا سکتا ...... میرے نزدیک یہ بات ہر پہلو سے مذموم و ناروا ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادیوں میں تفرقے کی دیوار اِس طرح کھڑی کر دی جائے کہ بالآخر گاؤں کے لوگ شہری باشندوں پر غلبہ پا جائیں...... جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جُوں جُوں وقت گذرے گا آپ دیکھ لیں گے کہ شہری اور دیہاتی حلقوں کا یہ باہمی امتیاز مٹتا چلا جائے گا۔"

چودھری لال چند نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی۔ تو دیہات کے انتخابی حلقوں سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ جو قانونِ انتقالِ اراضی کی رُو سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ فضلِ حسین نے اِس قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا :-

"پنجاب کی دیہاتی آبادی ایک کروڑ اسّی لاکھ ہے۔ جس میں سے ایک کروڑ سے کچھ زیادہ زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ وہ لوگ جو بدقسمتی سے زراعت پیشگی کے سنہرے سرٹی فکیٹ سے محروم ہیں۔ اب دیہاتی ہونے کے باوجود بھی دیہاتی حلقے سے نہیں کھڑے ہوسکیں گے۔ یہ کس قدر لایعنی اور ظالمانہ تجویز ہے۔ مانا کہ زراعت پیشہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مان لیا کہ غیرزراعت پیشہ دیہاتی لوگ اراضی کے مالک نہیں ہیں۔ یہ بھی مان لیا کہ انہوں نے فوجی بھرتی میں حصّہ نہیں لیا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ وہ کاشتکاری کا پیشہ نہیں رکھتے۔ لیکن یہ تمام امور تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ بات کیونکر قبول کی جاسکتی ہے کہ اب یہ بدقسمت لوگ دیہاتی ہوتے ہوئے بھی محض اس بنا پر دیہات کی نمائندگی نہیں کرسکتے کہ انہیں زراعت پیشگی کا زرّیں پروانہ حاصل نہیں ہوا۔ اگر یہ تجویز منظور کرلی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زراعت پیشہ اقوام کے لوگ اپنے دیہاتی بھائیوں سے بھی خائف ہیں کہ مبادا میدانِ انتخاب میں ان کے ہاتھوں مات کھا جائیں۔ میری رائے میں یہ تجویز نہ تو عمومی طور پر دیہات کے باشندوں کو فائدہ پہنچائے گی اور نہ زراعت پیشہ اقوام کے لئے مفید ہوگی۔" [1]

آگے چل کر میاں فضلِ حسین نے کہا:-

---

[1] کارروائی پنجاب لیجسلیٹو کونسل نومبر ۱۹۱۸ء

"کونسل کی رکنیت کا اہل بننے کے لئے صرف ایک معیار ہے۔ اور وہ ہے علمی قابلیت اور ذہنی برتری کا معیار۔ جب ایک شخص کونسل کا ممبر منتخب ہوتا ہے۔ تو وہ اِس قابل ہونا چاہیئے کہ ایوان میں آکر باآواز بلند کہہ سکے کہ میں دماغی صلاحیت کے اعتبار سے بہترین شخص ہوں میں نظم ونسق کو خوب جانتا پہچانتا ہوں۔ اِس لئے آپ قواعد و ضوابط اِس ڈھنگ سے وضع کیجئے کہ مجھے کونسل میں داخل ہوکر اپنے ملک کے نظامِ حکومت میں حصّہ لینے کا موقع مل سکے۔"

"اگر آپ دیہاتی ووٹروں کو متعدد اُمّیدواروں میں سے بہترین آدمی منتخب کرنے کا موقع نہیں دیں گے تو ظاہر ہے کونسل اعلےٰ درجے کے ممبروں سے محروم رہ جائے گی۔ ہم بطورِ دلیل مان لیتے ہیں کہ شہری اور دیہاتی حلقے الگ الگ ہیں لیکن اس تقسیم کے باوجود کوشش کرنا چاہیئے کہ اِن حلقوں کو ایسی آزادی اور سہولت میسّر آئے کہ وہ اپنے لیے یہاں سے بہترین اور لائق ترین امیدوار منتخب کر سکیں" [1]

خاندان، وطنیت، طولِ قیام، روزگار، تعلیم وتربیت، بود وباش عادات و اطوار، معیشت ومعاشرت، تعلقات و مراسم غرضکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو سے فضلِ حسین دیہاتی نہیں بلکہ شہری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اور لالہ ہرکشن لال وزیر مقرر ہوئے۔ تو دیہاتیوں کو سخت رنج ہوا کہ پنجاب کے دونوں وزیر

---

[1] کارروائی پنجاب لیجسلیٹو کونسل۔ مارچ ۱۹۲۰ء

شہری طبقے سے کیوں منتخب کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جاٹ برادری کے ایک اخبار جاٹ گزٹ نے اپنی ۱۲ر جنوری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا:

"دونوں وزیر شہری طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں مخصوص انتخابی حلقوں سے منتخب ہو کر آئے ہیں۔ اس کے برعکس نئی کونسل میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو دیہاتی حلقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک اِن وزیروں کو دیہاتی ممبروں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ یہ لوگ سرکاری اور نامزد ارکان کی مجموعی تعداد سے بھی اپنی وزارت کی گدیاں سلامت نہیں رکھ سکیں گے۔ شہر کے دو آدمیوں کو وزارت کے منصب پر فائز کرنا پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں کی کھلم کھلا توہین کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔"

گورنر نے میاں فضلِ حسین کو اِس لئے وزیر منتخب نہیں کیا تھا کہ پنجاب کونسل کے انتخاب شدہ مسلمان ممبروں کی اکثریت اُن کی پشت پر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثریت کو تو اپنا لیڈر منتخب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا تھا۔ منصبِ وزارت کے لئے میاں صاحب کا سب سے بڑا دعوٰے یا استحقاق اُن کی بلند و بالا سیاسی حیثیت تھی۔ وہ پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری۔ صوبائی کانگرس کے صدر۔ ہائی کورٹ بار کے لیڈر۔ یونیورسٹی کے سب سے ذی اثر رکن۔ انجمن حمایتِ اسلام کی کالج کمیٹی کے سکریٹری اور پنجاب کے مسلمانوں کے سب سے باوقار اور ترقی پسند راہنما تھے۔ اِن تمام خوبیوں نے مل کر میاں صاحب کو ایک ایسا جامع حیثیات

شخص بنا دیا تھا کہ گورنر کو، ایسے حالات میں جبکہ ترکِ موالات کی تحریک نے آگ لگا رکھی تھی، عوام کے اشتعال پذیر سیاسی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے فضلِ حسین سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ لاہور کے سب سے بڑے کانگرسی اخبار ٹریبیون نے اپنی ۴ جنوری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا:

"سر ایڈورڈ میکلگن اِس بات پر مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے جدید اصلاحات کے تحت بہترین وزیر منتخب کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سے بہتر انتخاب ممکن ہی نہیں۔"

اُنہی دنوں مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند کے مشورے سے کرنل ویجوڈ ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ کرنل ویجوڈ پارلیمنٹ کی لیبر پارٹی کے مشہور اور ذمہ دار رُکن تھے۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُن کے اِس دورے کا مقصد یہ تھا کہ وہ کانگرس کے ہندو اور مسلمان لیڈروں کو اِس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ ترکِ موالات کی تحریک اختیار کرنے کی بجائے نئی اصلاحات پر عمل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے مہاتما گاندھی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے لیڈر تک ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانے کی جدوجہد کی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں وہ ناگپور جا کر کانگرس کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ چونکہ کرنل ویجوڈ پارلیمنٹ میں ہمیشہ ہندوستان کی حمایت کرتے رہتے تھے اور اہلِ ہند اُن کو اپنا ہمدرد و خیر خواہ سمجھتے تھے۔ اِس لئے کانگرس کی مجلسِ استقبالیہ میں جب ترکِ موالات کی قرارداد پیش ہوئی۔ تو مہاتما گاندھی کے ایما سے کرنل ویجوڈ کو بھی اِس مسئلہ پر اظہارِ خیال کی دعوت

دی گئی۔ ڈیجوڈ نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا :

"آپ آزادیٔ ہند کے مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ جونہی آپ نے خلاف آئین تحریک شروع کی۔ پولیس خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرنا شروع کر دے گی۔ آپ عدالتوں کا مقاطعہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہر وکیل کو پریکٹس کا لائسنس لیتے وقت ملکِ معظم کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ اندریں حالات بتائیے کہ وکلاء کیونکر خلافِ قانون تحریک میں شرکت کر سکیں گے۔ ترکِ موالات اختیار کر کے آپ ہم لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس قسم کے تخریبی کام کی بجائے قومی تعمیر کا پروگرام وضع کریں۔"

کرنل ڈیجوڈ کی تقریر کا لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ جب انہوں نے دوران تقریر میں کہا کہ "آپ ہم لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے"۔ تو حاضرین میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیئے ہندوستان سے باہر ہمارا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔"

ڈیجوڈ نے پنجاب آ کر ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے بھی ملاقات کی۔ ڈاکٹر کچلو جلیانوالہ باغ کے ہیرو۔ اور مارشل لاء کے دور کی ممتاز ترین شخصیت تھے اس لئے کرنل ڈیجوڈ کا خیال تھا کہ اگر وہ انہیں کسی طرح کونسل کی ممبری پر رضامند کر سکیں تو پنجاب کی وزارت کے لئے کچلو سے بہتر آدمی ملنا محال ہے چنانچہ انہوں نے سر انڈرورڈ میکاگن کے مشورے سے ڈاکٹر کچلو کو کونسل کی ممبری پر آمادہ کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس دام میں

پاؤں رکھنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کچلو امرتسر کے رہنے والے تھے۔ اور غیر زراعت پیشہ طبقہ کے آدمی تھے۔ انھیں زراعت پیشہ دیہاتی ممبروں کی رہنمائی کا فخر کیونکر حاصل ہو سکتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں وزیر ہند۔ وائسرائے اور گورنروں کی یہ متفقہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُن لوگوں کو صوبائی وزارتیں دی جائیں جو کانگرسی تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ تاکہ ترکِ موالات کے پُرشور طوفان میں جدید اصلاحات کی ناؤ ڈانواں ڈول نہ ہونے پائے۔

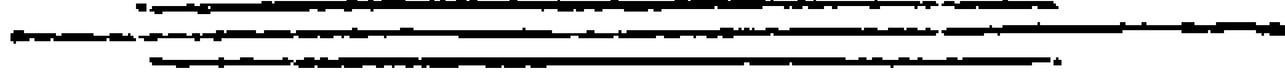
پنجاب کونسل کے تیئس ۲۳ دیہاتی مسلمان ممبروں میں صرف دو آدمی ایسے تھے جو تعلیمی قابلیت اور قانونی صلاحیت کے اعتبار سے میاں فضلِ حسین کے حریف بن سکتے تھے۔ ایک میاں شاہنواز بی۔ اے (کینٹب) بیرسٹر ایٹ لاء۔ اور دوسرے ملک فیروز خاں نون بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ میاں شاہنواز سن و سال میں فضلِ حسین کے برابر تھے۔ وہ باغبانپورہ کے مشہور میاں خاندان کے رُکن۔ ضلع لاہور کے دیہاتی حلقے کے نمائندہ اور سر محمد شفیع کے داماد تھے۔ لیکن اُن میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اُن کے نامۂ اعمال میں سیاسیات کا خانہ بالکل خالی تھا۔ ملک فیروز خاں نون کا اثر و رسوخ میاں شاہنواز سے بھی زیادہ تھا۔ وہ شاہ پور کے متموّل ترین زمیندار گھرانے کے نُورِ نظر تھے۔ اور اگر کبھی رائے شماری کی نوبت آجاتی۔ تو مغربی پنجاب کے دیہاتی ممبر جن کی مجموعی تعداد تیئس ۲۳ تھی فضلِ حسین اور شاہنواز دونوں کو چھوڑ کر فیروز خاں نون کے لئے ہاتھ کھڑے کرتے لیکن فیروز خاں نون کا کمزور ترین پہلو بھی یہی تھا کہ سیاسی دنیا میں کوئی شخص اُن کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ یوں بھی وہ بالکل نوعمر تھے بکندر حیات خاں

جو چند سال بعد میاں فضل حسین کے سب سے بڑے اور سب سے کامیاب حریف ثابت ہونے والے تھے۔ ۱۹۲۱ء کے انتخاب میں ضلع اٹک سے منتخب ہو کر آئے تو تھے۔ لیکن اُن کے خلاف انتخابی عذرداری منظور ہو گئی۔ اور وہ کونسل کی رکنیت سے برطرف کر دیئے گئے۔

پنجاب کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کو اُس وقت یہ راز معلوم نہیں تھا کہ وزارت سازی کی اصل طاقت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اُن میں سے اکثر انگریزی نہیں جانتے تھے۔ سیاسیات میں اُن کا مبلغِ علم بمنزلہ صفر تھا۔ سرکار کا ہوّا اُن کے دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ صوبے کا گورنر تو بہت بڑی چیز ہے۔ ضلع کا ڈپٹی کمشنر اُن کا کعبۂ مقصود و قبلۂ حاجات تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لاٹ صاحب بہادر نے اظہارِ خوشنودی فرما کر میاں فضل حسین کے سر پر تاجِ وزارت رکھ دیا ہے۔ تو انہوں نے بھی پوری عقیدت سے اِس آستانِ عالیہ پر اپنی جبینِ نیاز جھکا دی۔

میاں فضلِ حسین کو اپنی اِس بنیادی کمزوری کا احساس تھا۔ وہ مشرقی پنجاب کے شہری مسلمان تھے۔ درحالیکہ کونسل مغربی پنجاب کے دیہاتی ممبروں سے بھری ہوئی تھی۔ جن کے اور فضلِ حسین کے درمیان سوائے "اسلام" کے اور کوئی چیز وجہ اشتراک نہ بن سکتی تھی۔ سالہا سال کے معاندانہ پراپیگنڈے نے شہری اور دیہاتی کی تمیز اِس قدر راسخ کر دی تھی کہ دیہاتی ممبر اپنی تقدیر کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینے پر کبھی تیار نہ ہو سکتے تھے۔ جو مشرقی پنجاب کے ایک شہر کا رہنے والا۔ اور پیشے کے اعتبار سے بیرسٹر ہو۔ پھر یہی کافی نہیں۔ میاں فضلِ حسین ہمیشہ شہری اور

دیہاتی آبادی کی تفریق کو بُرا سمجھتے آئے تھے۔ انہوں نے سابقہ پنجاب کونسل کے ایوان میں اور ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے بار بار اس تفریق کی مذمت کی تھی۔ اور یُوں بالواسطہ تعلیم یافتہ شہری آبادی کے تفوق کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پنجاب لیجسلٹو کونسل کے دیہاتی ممبروں کو یہ سب حال معلوم تھا۔ لیکن گورنر نے جب فضل حسین کو وزارت کی مسند پر بٹھا دیا تو وفاداری کی قدیم روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام زمیندار ممبروں نے اسی میں عافیت دیکھی کہ اب اپنے نئے آقا کے سامنے گردنیں خم کر دی جائیں۔



چوتھا باب

پہلی وزارت کا دور

میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال پرانے رفیق کار تھے۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگرسی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور اب دونوں کانگرس سے کٹ کر کونسل میں شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے دونوں کو مل جل کر کام کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لالہ ہرکشن لال بڑے دل گردے کے زبردست اور باحوصلہ انسان تھے وزارت کا پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ اُن کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اُن کے گھر کا خرچ دس ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھا۔ میاں فضل حسین بڑے زیرک، معاملہ فہم، دُور اندیش اور باتدبیر آدمی تھے۔ انہوں نے بہت جلد اُن مشکلات پر قابو پا لیا۔ جو نئی اصلاحات کی دوعملی حکومت میں وزراء کے راستے میں حائل ہو سکتی تھیں تاہم اُن پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہو گئی تھی کہ آئندہ پنجاب کی حکومت اس صوبے کے دیہاتی ممبروں کی خوشنودی اور صوابدید کے بغیر نہ چل سکے گی۔

فضل حسین کے پاس تعلیمات اور ہرکشن لال کے پاس زراعت کا قلمدان وزارت تھا۔ کانگرس اگرچہ ترکِ موالات کا پروگرام اختیار کرکے میثاقِ لکھنو،

سے عملاً دستکش ہو چکی تھی۔ لیکن ایک پرانے کانگرسی اور مسلم لیگی کی حیثیت سے میاں فضلِ حسین اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اِس میثاق کی تمام شقوں پر حتی الامکان عمل کیا جائے۔ چنانچہ اس جانب قدم اٹھاتے ہوئے انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ لاہور کے میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبہ کے لئے چالیس فی صد نشستیں مخصوص کر دیں۔ میونسپل کمیٹیوں میں جہاں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں حاصل تھیں۔ اُن کی نمائندگی تناسب آبادی کے مطابق بڑھا دی۔ اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا چالیس فی صد حصّہ مقرر کر دیا۔

ہندوؤں کو یہ تینوں فیصلے سخت ناگوار گذرے۔ ہندو کے نزدیک قوم پرستی کا مفہوم یہ تھا کہ اُس کی ہر قسم کی اجارہ داری میں، خواہ وہ سراسر بے انصافی پر مبنی ہو، خلل نہیں پڑنا چاہئے۔ میاں صاحب کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہندو اخباروں، ہندو انجمنوں اور ہندوؤں کی نجی محفلوں میں فضلِ حسین کو فرقہ پرستی کا بانی، ہندو مسلم اتحاد کا دشمن، ہندوؤں کا قاتل اور ہندوستان کا بدخواہ قرار دیا جانے لگا۔ میاں فضلِ حسین نے بار بار کانگرسی لیڈروں کو پکارا کہ وہ چونکہ میثاقِ لکھنؤ کی ترتیب میں باقاعدہ ایک فریق کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس لئے اُن کا فرض ہے کہ وہ اِس جھگڑے میں حَکم بن کر فیصلہ کریں کہ آیا پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ جو تھوڑا سا انصاف کیا جا رہا ہے وہ میثاق کے مطابق ہے یا مخالف۔ میاں صاحب نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ اگر اس بارے میں کانگرس کا فیصلہ اُن کے خلاف صادر ہوا تو وہ وزارت سے مستعفی

ہو جائیں گے۔ لیکن کانگرسی لیڈروں نے جواب دیا کہ کیا میثاقِ لکھنؤ اور کیا کونسل کی ممبری۔ وہ دونوں پر لعنت بھیج چکے ہیں۔ اب ترکِ موالات کا دَور دَورہ ہے۔ اس لئے اُنھیں آئینی اصلاحات سے کوئی دلچسپی نہیں۔

جہاں تک میڈیکل کالج میں مسلمان طلبہ کے داخلے کا سوال تھا۔ یہ جھگڑا میاں فضلِ حسین کی وزارت سے بہت پہلے سے چلا آرہا تھا۔ ۱۹۱۶ء تک تو یہ کیفیت تھی کہ مسلمان طلبہ کو میڈیکل کالج کے داخلے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ سال بہ سال جتنے مسلمان لڑکے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرکے داخلے کے لئے جاتے۔ کم و بیش سبھی کو جگہ مل جاتی۔ ۱۹۱۷ء میں پہلی بار مسلمان طلبہ کو مایوسی ہوئی۔ اور بہت سے امیدوار جگہ حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ اُسی سال میاں فضلِ حسین نے پنجاب کونسل میں یہ سوال اٹھایا کہ مسلمان طلبہ کی اچھی خاصی تعداد کو میڈیکل کالج میں کیوں داخل نہیں کیا گیا۔

اگلے سال یعنی ۱۹۱۸ء میں خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی اور سید محسن شاہ اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے ایک وفد کی صورت میں ہسپتالوں کے انسپکٹر جنرل کے پاس جاکر یہ شکایت کی کہ مسلمان طلبہ کو میڈیکل کالج کے داخلے میں بہت سی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ اِن مشکلات کا ازالہ کیا جائے۔ ۱۹۱۹ء میں ایک اور وفد نے لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں حاضر ہوکر یہی مسئلہ اٹھایا اور میڈیکل کالج میں مسلمان طلبہ کی ایک معیّن تعداد کے لئے نشستیں محفوظ کردینے کا مطالبہ کیا۔ لفٹنٹ گورنر نے وفد کے دلائل سے اتفاق کرکے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اِس مطالبہ پر غور کرکے نشستوں

کی ایک خاص تعداد معین کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہی حال گورنمنٹ کالج کا تھا۔ وہاں بھی مسلمان طلبہ کی تعداد گویا آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں پنجاب کے مقتدر مسلمانوں نے جن میں کم از کم بیس مختلف انجمنوں کے نمائندے شامل تھے، حکومت سے درخواست کی کہ گورنمنٹ کالج کے داخلہ میں مسلمان طلبہ کو سہولتیں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ مسئلہ حکومت کے سامنے تھا۔ اور مسلمان تقریباً ہر سال اِس مطالبے کی تجدید کرتے تھے۔

باقی رہا سرکاری ملازمتوں کے تناسب کا سوال۔ اِس ضمن میں مسلمانوں کی پسماندگی کا خیال کرتے ہوئے سنہ ۱۹۰۱ء میں حکومتِ پنجاب نے فیصلہ کیا تھا کہ ماتحت ملازمتوں میں کم از کم تیس فیصد اسامیاں مسلمانوں کو ملنی چاہئیں۔ لیکن بدقسمتی سے اِس فیصلے پر کبھی عمل نہ ہو سکا۔ اور سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ مایوس کن حد تک قلیل رہی۔ میاں فضلِ حسین نے ملازمتوں میں چالیس فیصد مسلمانوں۔ چالیس فیصد ہندوؤں اور بیس فیصد سکھوں کا حصّہ مقرر کر دیا۔ لیکن اِس فیصلے پر عملدرآمد کرتے وقت یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ یہ تناسب صرف نئے آدمیوں کا تقرر کرتے وقت ملحوظ رکھا جائے گا۔ پرانی اسامیاں جہاں مسلمانوں کی تعداد بے حد مختصر تھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ میاں فضلِ حسین ایک زوردار وزیر ثابت ہوئے اُن میں یقیناً اتنی جراٗت تھی کہ وہ بوقتِ ضرورت آئی۔ سی۔ ایس کے انگریز

افسروں کو بیک جنبشِ قلم اپنا فیصلہ منوانے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ان دونوں تمام محکموں کے سیکرٹری انگریز تھے۔ جو بالا بالا گورنر کے پاس جا کر وزیروں کے خلاف کان بھرتے تھے۔ میاں فضلِ حسین کو اس صورتِ حال کا علم تھا۔ لیکن انہوں نے ایک باوقار انسان کی طرح ان باتوں سے چشم پوشی ہی نہیں بے اعتنائی برتی تاہم جہاں ان کی طے شدہ پالیسی یا جاری کردہ احکام کی تعمیل کا سوال آتا وہ کسی قسم کی چون و چرا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے فرعون صفت انگریزوں سے اُن کا واسطہ پڑا۔ لیکن انہوں نے ہر فرعون کی اکڑی ہوئی گردن کو جھک جانے پر مجبور کر دیا۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدرلینڈ نے چالیس فیصد مسلمان طلبہ کو اپنے ہاں داخل کرنے میں تامّل کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ وہ اس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ فضلِ حسین نے فوراً انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ گوجرانوالہ میں میاں فضلِ حسین نے ایک دربار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور قسمت لاہور کے کمشنر ایٹ۔ ڈیڈیو۔ کینیڈے کو حکم دیا کہ وہ خود دربار میں حاضر ہوں کینیڈے نے یہ خفّت گوارا نہ کی کہ ایک ہندوستانی وزیر تو دربار کی مسند پر رونق افروز ہو۔ اور وہ خود ایک معمولی ماتحت کی طرح جلسے کا انتظام کرنے پر مامور کئے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ فضلِ حسین نے اس گستاخانہ انداز کی یہ سزا دی کہ کینیڈے سے فوراً استعفےٰ طلب کیا اور انہیں ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔

یہ اُس دَور کی باتیں ہیں جب انگریز کا اقتدار ابرِ محیط کی طرح ہندوستان

پر چھایا ہوا تھا۔ اور جدید اصلاحات نے ہندوستانی وزراء کو بہت ہی محدود و مختصر اختیارات عطا کئے تھے۔ اُس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ خود اِن وزیروں کو اپنے یہ محدود اختیارات استعمال کرنے کا نہ سلیقہ آتا تھا اور نہ حوصلہ تھا۔ اگر ۱۹۲۱ء میں فضلِ حسین کی جگہ کوئی دیہاتی مسلمان وزیر بن جاتا تو صوبے کی روایات یکسر بگڑ جاتیں۔ عزم و حوصلہ کی یہ بے باکی، اور قول و عمل کی یہ بے خوفی، جس کا فضلِ حسین نے بار بار مظاہرہ کیا، کبھی ظہور میں نہ آتی۔ دلیرانہ کردار کی اِن خوبیوں کی بجائے تملّق و خوشامد اور آستان بوسی و ناصیہ فرسائی کا سکہ چل جاتا۔ اور صوبے کا وزیر خود معمولی معمولی باتوں کے لئے گورنر کی بارگاہ میں سر بسجود ہونے سے دریغ نہ کرتا۔

اصلاحات کے نفاذ کے بعد پہلے چار سال تک پنجاب کونسل کا صدر گورنر کا نامزد کیا ہوا ایک آئی۔سی۔ایس انگریز افسر تھا۔ جب یہ چار سال کی میعاد ختم ہو گئی تو کونسل کو آئینی طور پر یہ حق حاصل تھا کہ وہ خود اپنا غیر سرکاری صدر منتخب کرے۔ لیکن گورنر نے سر توڑ کوشش کی کہ وہی انگریز افسر (سر ریٹ کیسن) جس کو پہلے نامزد کیا گیا تھا، اب منتخب کر لیا جائے۔ فضلِ حسین نے گورنر کی اِس کوشش کی کھلے بندوں مخالفت کی اور کونسل کے تمام ممبروں کو اِس بات پر آمادہ کیا کہ خواہ کچھ ہو کسی پنجابی ہی کو منصبِ صدارت کے لئے منتخب کیا جائے گا۔ کونسل کے اکثر ارکان گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر کیسن کو منتخب کر لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن جب فضلِ حسین نے میدان میں اُتر کر گورنر کے ارادوں کی مزاحمت کی۔ تو دیہاتی ممبروں کا حوصلہ بھی بلند ہو گیا اور آخر انھوں نے

سر عبدالقادر کو صدر منتخب کر لیا۔

یہ تمام امور اس بات کی شہادت دینے کے لئے کافی ہیں کہ میاں فضل حسین نے اپنی اس سیاسی تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا جو انھیں کانگرس اور مسلم لیگ ایسی جماعتوں میں کام کرنے سے حاصل ہو چکی تھی۔ فضل حسین کا یہ کمال تھا کہ ایک طرف انہوں نے اپنی رائے کی پختگی اور ارادے کی مضبوطی سے گورنر کو مرعوب کر لیا اور دوسری طرف کونسل کے دیہاتی ممبروں کو عملاً یقین دلا دیا کہ وہ جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔ گورنر اُن کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے دیہاتی زمیندار جنھیں انگریز کی عظمت و جبروت کے سامنے کبھی دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی فضل حسین کے اِن کارناموں سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ کچھ میاں صاحب کے اثر و رسوخ سے مرعوب ہو کر اور کچھ اس خیال سے کہ ایک مسلمان نے پوری قوم کا نام روشن کر دیا ہے۔ تمام دیہاتی مسلمان ممبر دل و جان سے فضل حسین کے حامی بن گئے۔

جُوں جُوں ہندو اخبارات اور ہندو لیڈر فضل حسین کے خلاف شور و غوغا کر رہے تھے وہ مسلمانوں میں روز بروز مقبول ہوتے جاتے تھے۔ میاں صاحب کی پالیسی کی حمایت کے لئے لاہور سے مسلمانوں کا پہلا انگریزی روزنامہ مسلم آؤٹ لُک نکلنا شروع ہوا۔ اسلامی انجمنوں نے قرار دادیں منظور کر کے برملا اُن کی تائید کی۔ مسلمانوں کے متعدد وفود نے گورنر کے پاس جا جا کر اُن کی پالیسی کی اعانت کی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں فضل حسین کی تندرستی اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اپنی قوم میں فضل حسین کی

مقبولیت و محبوبیت کا یہ عالم تھا جب ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء کو راجہ نریندر ناتھ نے پنجاب کونسل میں اُن کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی۔ یہ قرارداد پانچ شقوں پر مشتمل تھی :-

اول ۔ پنچایت ایکٹ میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا گیا۔

دوم ۔ سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی داخل کر دی گئی۔

سوم ۔ میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں طلبار کا داخلہ فرقہ وارانہ اصول پر مقرر کیا گیا ہے۔

چہارم ۔ بعض میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول رائج کر دیا گیا ہے۔

پنجم ۔ گوردوارہ ایکٹ منظور کر کے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تفریق پیدا کی گئی ہے۔

کے ۔ایل ۔ گابا بیرسٹرایٹ لا نے اپنے والد لالہ ہرکشن لال کی سوانحعمری (REBEL MINISTER) میں اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مجھے وہ دن خوب یاد ہے۔ جب پنجاب کونسل میں عدم اعتماد کی اس قرارداد پر بحث جاری تھی۔ تو ترازو کے دونوں پلڑے کس طرح متوازی کھڑے تھے۔ لوگوں میں اس سوال پر بڑی سرگرمی سے لے دے ہو رہی تھی کہ اگر میاں فضلِ حسین کو شکست ہو گئی تو کیا اُن کی صحت اس قابل ہے کہ وہ دوبارہ وکالت جیسا غیر یقینی اور صبر آزما پیشہ اختیار کر کے روزی کما سکیں گے۔ جب تمام دلائل

بے کار ثابت ہوئے تو میاں صاحب نے کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک اور طریقہ اختیار کیا جو بعد میں بہت سی مشکلات کا شافی علاج ثابت ہوا۔ انہوں نے تبادلۂ خیالات کی غرض سے کونسل کے دیہاتی ممبروں کو اپنے مکان پر مدعو کیا اور یہیں اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں پر آئس کریم نہایت اچھے اثرات پیدا کرتی ہے۔ یہ انکشاف اب ایک مجرب نسخہ سمجھ کر اختیار کر لیا گیا ہے۔ میاں صاحب نے اپنی تمام زندگی میں اس سے بہتر کام پر کبھی روپیہ خرچ نہیں کیا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز جب قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو اس کے نتائج نمایاں اور خوشگوار تھے۔"

کے ہیں۔ گاہا کے ان الفاظ کو ہم سخن طرازی سمجھ کر محظوظ ہوں یا انہیں محض پیرایۂ بیان کی ایک ندرت تصور کر کے لطف اٹھائیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ عدم اعتماد کی یہ قرارداد میاں فضلِ حسین کی سیاسی زندگی میں ایک ایسے انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بعد اُن کے غور و فکر نے نئی راہیں اور اُن کی حکمتِ عملی نے نئے زاویے تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ اس قرارداد کی آزمائش میں میاں فضلِ حسین کو یقیناً کامیابی حاصل ہوئی۔ اور اُن کے حریف ناکام و نامراد رہے۔ لیکن اس معرکے میں انہوں نے حالات کی تبدیلی کو جس انداز سے دیکھا تھا۔ اس نے یہ نکتہ اُن کو سمجھا دیا تھا کہ اگر مسندِ وزارت کو محفوظ رکھنا منظور ہے تو اپنی پالیسی میں بعض بنیادی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

راجہ نریندر ناتھ نے قرارداد پیش کرتے وقت بڑی طویل تقریر کی۔ جو

مسلسل کئی گھنٹے جاری رہی۔ انہوں نے میاں فضل حسین کو فرقہ پرستی کا بانی، ہندو مسلم اتحاد کا دشمن اور ہندوؤں کا بدخواہ قرار دیا۔ آخر میں انہوں نے میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"اورنگ زیب مت بنو۔ اکبر بننے کی کوشش کرو۔"

راجہ صاحب کی تقریر کے جواب میں مسلمان ممبروں میں سے میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ ملک فیروز خاں نون اور پیر اکبر علی نے تقریریں کیں۔ سردست احمد یار خاں دولتانہ اور فیروز خاں نون کی تقریروں کے مختصر اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔ اِن دونوں نے آگے چل کر یونینسٹ پارٹی کی تعمیر و تشکیل میں بڑا نمایاں حصّہ لیا۔ ایک تو یونینسٹ پارٹی کے چیف سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور دوسرے مسلسل نو سال تک یونینسٹ پارٹی کے نمائندہ وزیر رہے۔

احمد یار خاں دولتانہ نے اپنی پُرجوش تقریر کو ختم کرتے ہوئے کہا:

"........ راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ بذیر تعلیمات اورنگ زیب کی پالیسی اختیار کر رہے ہیں۔ میں راجہ صاحب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اِس وقت جب کہ بہت سے سیواجی ہمارے مدِمقابل بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں اکبر پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں اورنگ زیب ہی پیدا کرنے چاہئیں۔ مجھے یہ کہنے میں مسرت اور فخر ہے کہ خواہ کتنے ہی سیواجی ہمارے سامنے آجائیں۔ میاں فضلِ حسین تنہا اُن کا مقابلہ کرنے کو کافی ہیں۔ میں انتہائی رنج واندوہ سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہندوؤں

کا تعصب اور اُن کی تنگدلی اب ایک ایسے نقطۂ عروج پہ پہنچ چکی ہے۔ جس سے مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ کیا اِس ایوان کے مسلمان ممبر اور کیا اِس صوبے کے مسلمان باشندے سبھی ہندوؤں کے تعصب سے نالاں ہیں۔ راجہ صاحب نے یہ الفاظ ادا پیش کر کے ہندو مسلم اتحاد کے اُس ناتوان و کمزور قلعہ کو، جو مسلمانوں کے خون اور ہندوؤں کی محنت سے تعمیر ہوا تھا، پاش پاش کر دیا۔ میں خوش ہوں کہ یہ قلعہ گر گیا ہے۔ اور اچھا ہوا کہ ہندوؤں کے ہاتھ سے گرا ہے۔"

ملک فیروز خاں نون نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا :۔

"...... اگر ہماری قوم کے ساتھ پہلے سے کسی نے انصاف کیا ہوتا۔ تو میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نشستیں دینے کے لئے موجودہ سرکلر جاری کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ چونکہ ہمارے ساتھ منصفانہ سلوک کبھی نہیں ہوا اس لئے اس قسم کے سرکلر کا اجرا لازمی اور ضروری تھا۔ جناب والا! میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان کیونکر ظلم اور بے انصافی کا شکار ہو رہے ہیں۔ حالیہ سرکلر کی رُو سے میڈیکل کالج میں چالیس فیصد طلبہ لازماً داخل کئے جانے چاہئیں۔ لیکن ہوا کیا ہے؟ امسال الیف۔ ایس سی کے امتحان میں ممتحنوں کی اکثریت اُسی وسیع القلب اور فراخ دل قوم کے فرزندوں پر

مشتمل تھی جس کے ایک لونہال ہمارے راجہ نریندر ناتھ صاحب ہیں۔ چنانچہ مسلمان طلبہ کو اس کثرت سے فیل کیا گیا ہے کہ اُن غریبوں کی چالیس فیصد تعداد میڈیکل کالج تک پہنچ ہی نہیں سکی۔ کیا یہی انصاف ہے جس کا ہمیں مستحق قرار دیا گیا ہے؟ یونیورسٹی کے نظم و نسق کے بارے میں اور بھی بہت سے افسوسناک واقعات میں یہاں بیان کرسکتا ہوں۔ لیکن اس خیال سے درگذر کرتا ہوں کہ اس داستان سرائی سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجودہ خلیج کے وسیع ہونے کا احتمال ضرور ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ ہندو مسلم نزاع جلد از جلد ختم ہو۔ اور دونوں قومیں متحد ہو کر ملک کی ترقی میں حصہ لیں لیکن بدقسمتی سے فریقِ مقابل کی طرف سے ایسی قرارداد پیش کی گئی ہے۔ جس سے یہ نزاع کم ہونے کی بجائے اور بڑھے گی۔ آنریبل وزیر تعلیمات نے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد کی آگ نہیں بھڑکائی۔ البتہ راجہ صاحب کی یہ قرارداد اس سلگتی ہوئی آگ کو شعلوں میں تبدیل کرکے رہے گی۔"

میاں فضل حسین کی تقریر کافی طویل تھی۔ اُس میں دلائل دیئے گئے تھے۔ اعداد و شمار بھی تھے۔ اور پارلیمنٹری آداب و قواعد کی پوری پابندی ملحوظ رکھی گئی تھی۔ راجہ نریندر ناتھ نے اپنی تقریر میں سرکاری ملازموں کے عزل و نصب اور تغیر و تبدل کے بعض واقعات بھی پیش کئے تھے۔ جن سے وہ

یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وزیر تعلیمات نے ہندو افسروں کو محض اِس لئے برطرف کیا کہ وہ ہندو تھے۔ اور مسلمان افسروں کو صرف اس لئے اچھی جگہوں پر تعینات کیا کہ وہ مسلمان تھے۔ اگر یہ واقعات صحیح ثابت ہو جاتے تو وزیر موصوف کے لئے عافیت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن فضل حسین نے اِن اِتہامات کو پرکاہ کی طرح اُڑا کر رکھ دیا۔ اُنہوں نے عائد کردہ اِلزامات میں سے ایک ایک کو لیا۔ پھر اُن کا تار و پود یُوں بکھیرا جیسے ایک چابکدست دُھنیا روئی کے ڈھیر کو دُھنک کر رکھ دیتا ہے۔ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو ایوان کی فضا بالکل صاف ہو چکی تھی۔ اور شک وشبہ کے بادلوں کا نشان بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اُس تقریر کے ایک حصّے کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"جنابِ والا! میں پوچھتا ہوں کہ اِس قرارداد کے محرّک کس چیز کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں؟ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں راجہ صاحب کو جس چیز پر اعتراض ہے وہ وزیرِ تعلیمات کی فرقہ وارانہ پالیسی ہے۔ وہ اِس بات کو بھی قابلِ مذمّت سمجھتے ہیں کہ وزیرِ تعلیمات نے مختلف امور میں فرقہ وارانہ نیابت مقرر کر دی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ پالیسی کے مفہوم کی وضاحت نہیں فرمائی۔ نہ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ قابلِ اعتراض پالیسی کِن اجزا و عناصر کا مرکّب ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ پالیسی یا فرقہ وارانہ نیابت ایک

ایسا لفظ ہے۔ جس کا کوئی صاف، واضح، غیر مشتبہ اور دو ٹوک مفہوم اب تک متعین نہیں کیا جا سکا۔ اگر اس لفظ سے بُرے معنیٰ لئے جائیں تو فرقہ داری کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسی پالیسی جو مذہبی تعصب اور مذہبی جنون کی بنا پر قائم ہو۔ اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے ہم مذہب افراد کو ترقی دی جائے۔ اور اُنہی پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے۔ اگر قرارداد کے محرّک کے ذہن میں فرقہ داری کا یہ مفہوم ہے۔ اور اُن کا مدّعا یہ ہے کہ میں نے حکومت کے نظم و نسق کے کسی شعبہ میں اِس قسم کی پالیسی پر عمل کیا ہے یا عمل کرنے کی کوشش کی ہے تو میں اس کو سراسر غلط، بے بنیاد اور پادر ہوا بہتان قرار دے کر قطعاً قابلِ پذیرائی یا در خورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس اگر فرقہ دارانہ نیابت یا فرقہ دارانہ پالیسی سے یہ مطلب لیا جائے کہ کسی شخص کی قابلیت کا جائزہ لیتے وقت جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی تعلیمی کیفیت کس درجہ کی ہے۔ اُس کا تجربہ کس پایے کا ہے۔ اُس کا خاندان کس حیثیت کا ہے۔ اس نے حکومتِ وقت کی کہاں تک خدمت کی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اِن امور کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا رَوا ہے کہ آخر وہ شخص کس مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہے۔

" اگر فرقہ دارانہ پالیسی اور فرقہ دارانہ نیابت کی یہی تعریف ہے

جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھ کو اس چیز کا بانی یا موجد قرار دیئے جانے کی راجہ صاحب کے پاس کیا وجوہ ہیں؟ قطع نظر اس سے کہ میں ذاتی طور پر فرقہ وارانہ پالیسی کو اچھا سمجھتا ہوں یا برا۔ قطع نظر اس سے کہ میں نے اس پالیسی پر عمل کیا ہے یا اس پر عمل کرنے سے گریز کیا ہے۔ ایک بات میں پورے وثوق اور کامل ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ہرگز اس پالیسی کا موجد یا بانی نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے وزیر بننے سے بہت پہلے سے یہ پالیسی ہندوستان کے دیگر حصوں ہی میں نہیں، پنجاب میں بھی رائج تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ میں فرقہ وارانہ پالیسی کا بانی ہوں۔ یا میں نے اس پالیسی پر عمل کرکے ہندو مسلم نفاق پیدا کیا ہے۔ میری ذات پر ایک قبیح اتہام ہے۔ جس کے جواز کی کوئی وجہ میرے مخالفین کے پاس نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعوے کرنے کا اہل ہو سکتا ہے کہ اس کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتفاق قائم ہوا تو لاریب وہ شخص میں ہوں۔

" قرارداد کے محرک کو سب سے بڑا رنج یہ ہے کہ پنجاب کے وزیر تعلیمات نے صرف اپنے صوبے ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے میں چند ضروری امور کی طرف آپ کو

متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا اُمر یہ ہے کہ اِس ہندو مسلم کشیدگی کی وجہ کیا ہے؟ ہم میں سے ہر شخص اِس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ۱۹۱۶ء سے پہلے یہ کشیدگی ہمارے ہاں موجود نہ تھی۔ پھر مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اِس کشیدگی کے اسباب کیا تھے؟ اگر کوئی غیر جانب دار شخص ہمارے ملک کی تاریخ کے اس افسوسناک باب کا مطالعہ کرے تو اُس پر یہ حقیقت فوراً منکشف ہو جائے گی کہ اِس کشیدگی کا اوّلین سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی روزمرّہ معاشرت میں اُس مذہبی نفرت و عداوت کو دخیل کر رکھا ہے جو آج ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ دَور کے اکثر سیاسی کارکن اِس نفرت و عداوت کا قلع قمع کرتے رہے ہیں۔ لیکن نفرت و عداوت کا یہ جذبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف کی عمارت کا بنیادی پتھر بن گیا ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اِس عمارت کو منزل بہ منزل اور اونچا کرتے جائیں گے یا اُسے منہدم کر کے پیوندِ زمین کر دینا چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے اِس سوال کا جواب میرے پاس نہیں فریقِ مخالف کے پاس ہے۔

" نفرت و عداوت کا یہ جذبہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، کئی صورتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ ایک صورت چھوت چھات بھی ہے۔ ہندو صرف مسلمانوں ہی سے چھوت چھات نہیں کرتے بلکہ

خود ہندو دھرم کے اندر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو نجس خیال کرتا ہے۔ مثلاً برہمن غیر برہمنوں سے چھو جانا گناہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر صوبہ مدراس کو لیجئے۔ وہاں جس باہمی نفاق نے آگ لگا رکھی ہے کیا اس کا ذمہ دار بھی میں ہوں؟

"حکومت مدراس کے وزراء نے ایک قانون بنا دیا ہے جس کی رو سے کوئی برہمن غیر برہمنوں پر تشدد نہیں کر سکتا۔ اس قانون کے مطابق یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ موجودہ وزارت کے عہد میں کسی برہمن کو سرکاری ملازمت نہیں دی جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی سرکاری ملازم کو جو برہمن ہے اس وقت تک ترقی نہیں مل سکے گی جب تک کہ حکومت کے تمام محکموں میں غیر برہمنوں کو ان کا جائز حصہ عطا نہیں ہو جاتا۔

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس تمام تفرقے کا ذمہ دار بھی میں ہوں؟ یقین فرمائیے کہ اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں بلکہ وہ قوم ذمہ دار ہے جس کی نمائندگی راجہ نرندر ناتھ صاحب کر رہے ہیں۔

"باقی رہا فرقہ وارانہ نیابت کا مسئلہ۔ قطع نظر اس سے کہ میں اس قسم کی نیابت کو اچھا سمجھتا ہوں یا برا۔ سوال صرف یہ ہے کہ بحالات موجودہ فرقہ وارانہ نیابت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ جناب والا! میری ذاتی رائے ہے کہ ایشیا ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام حصوں میں مذہب انسانی زندگی کا ایک ایسا زبردست

عنصر ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ کسی شخص کے لئے یہ بڑ ہانک دینا آسان ہے کہ وہ مذہب کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن اس قول پر عمل کرنا بے حد مشکل ہے۔ ہمارا روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ بڑی شدومد سے اپنے آپ کو مذہبی "تعصبات سے بے نیاز ظاہر کرتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ تنگ نظر بھی نکلتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں وہ نسبتاً زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر ہوتے ہیں۔ میں نے ۱۹۱۶ء میں انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور آج بھی انہی عقائد کا پابند ہوں۔

" لیکن اگر کوئی شخص میرے خلاف یہ الزام عائد کرتا ہے کہ میں نے ز کو محض اس لئے نقصان پہنچایا ہے کہ وہ ہندو تھا اور ب کو خالصتہً اس لئے اونچا درجہ دیا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ یا اگر راجہ صاحب میرے خلاف فرد قرارداد جرم مرتب کرتے وقت یہ فرمائیں کہ میں نے نااہل مسلمانوں کو ملازمت دے کر حکومت کے نظم و نسق کا معیار پست کر دیا ہے۔ تو یقین کیجئے کہ میں اس قسم کے الزام کو بے بنیاد ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کو اس منصب وزارت سے جس پر میں آج فائز ہوں، غداری کے مترادف قرار دیتا ہوں۔

" جناب والا! مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر کسی خاص مذہب و ملت کے افراد کو ملازمت میں جگہ دینے سے نظم و نسق کے معیار کے پست ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے آدمیوں کو ہرگز جگہ

نہ دیجئے۔ بلکہ میں تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر انگریزوں کی بجائے ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے سے حکومت کے نظم ونسق کو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے تو یہ عہدے ہرگز ہندوستانیوں کو نہیں ملنے چاہئیں۔

"آئیے اب اس بات پر بھی کچھ عرض کر دوں کہ گورنمنٹ کالج کے داخلے میں فرقہ وارانہ نیابت کو کیوں رائج کیا گیا ہے۔ راجہ صاحب اس بات پر سخت ناراض ہیں کہ میں نے گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کے لئے چالیس فیصد نشستیں مخصوص کر دی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو میرا یہ فیصلہ قابلِ اعتراض نظر آتا ہے تو آپ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں کے خاص تعداد میں نشستیں محفوظ کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں؟ اگر گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کے لئے نشستوں کا تحفظ آپ کے نزدیک فرقہ داری ہے تو کیا کیمبرج اور آکسفورڈ میں ہندوستانیوں کے لئے نشستوں کا تحفظ مکروہ قسم کی نسلی و قومی عصبیت اور فرقہ پرستی نہیں؟ میں مزید یہ پوچھتا ہوں کہ جب کوئی طالبِ علم گورنمنٹ کالج میں داخل ہونے کے لئے جاتا ہے تو آپ کیوں اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ سفارش کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکتا کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ سفارش بجائے خود ایک ذلیل اور قابلِ اعتراض چیز ہے؟

"گورنمنٹ کالج میں داخلے کے وقت طالب علم کے نمبروں کے علاوہ چار چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ آیا امیدوار کا کوئی رشتہ دار کالج میں اِس وقت پڑھتا ہے یا پہلے پڑھتا رہا ہے۔ دوم یہ کہ آیا امیدوار کا باپ اِس وقت سرکاری ملازمت میں ہے یا پنشن لے چکا ہے۔ سوم یہ کہ آیا امیدوار نے سرکارِ ذالاتبار کی کوئی خدمت کی ہے یا نہیں۔ چہارم آیا امیدوار کسی بڑے آدمی کی سفارش لایا ہے یا نہیں۔

" غور فرمائیے کہ جس درس گاہ میں طلبہ کے داخلے پر اس قسم کی پابندیاں ہوں۔ وہاں مسلمانوں کی خاک شنوائی ہوگی۔ اوّل تو سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ دوسرے مسلمان یوں بھی تعلیم میں بہت پس ماندہ ہیں۔ تیسرے عام مسلمان بے حد غریب ہیں۔ انہیں بڑے آدمیوں تک رسائی ہی ممکن نہیں وہ سفارشیں کیوں کر مہیا کر سکتے ہیں اِن حالات میں جبکہ امیدوار کا باپ سرکاری ملازم بھی نہیں، جبکہ قوم کی عام پسماندگی کے باعث امیدوار کا کوئی قریبی رشتہ دار گورنمنٹ کالج میں تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکا۔ جبکہ نکبت و افلاس کی وجہ سے امیدوار کی بڑے آدمیوں تک رسائی بھی نہیں تو پھر خدارا بتایئے کہ کیا گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبہ کے داخل ہونے کا کوئی اِمکان ہے؟

"میں نے اس مسئلہ پر بہت غور و خوض کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کی شکایات بالکل بجا ہیں۔ اور مسلمان طلبہ کو صوبے کی بہترین درس گاہ سے محروم رکھنا کسی صورت اور کسی حال میں جائز نہیں۔ چاروں طرف شور مچ رہا ہے کہ گورنمنٹ کالج کے داخلہ میں فرقہ پرستی کے اصول کو رائج کر دیا گیا ہے لیکن ذرا غور فرمایئے کہ اس فرقہ پرستی سے کون سا آسمان گر پڑا ہے پچھلے سال جو مسلمان طلبہ داخل ہوئے تھے اُن میں آخری طالب علم کے نمبر تین سو تھے۔ اور جو ہندو امیدوار داخل ہوئے تھے۔ اُن میں آخری طالب علم کے نمبر تین سو تین تھے۔ یعنی دونوں کے صرف تین نمبروں کا فرق ہے جس کے لئے یہ نالہ و بکا اور نوحہ و شیون برپا ہے۔"

جب عدم اعتماد کی اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو تمام مسلمان ممبروں نے فضل حسین کے حق میں اور تمام ہندوؤں اور سکھوں نے فضل حسین کے خلاف ووٹ دیئے۔ ہندوؤں میں رہتک کے جاٹ اور کانگڑے کے راجپوت۔ دیہاتی اور شہری۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ بھی شامل تھے۔ یُوں کہنا چاہیئے کہ ایوان کی یہ تقسیم خالص فرقہ وارانہ تقسیم تھی۔ مسلمان فضل حسین کے ساتھ تھے اور ہندو اُن کے مخالف تھے۔ قرارداد کی ناکامی نے فضل حسین کو مسلمان عوام میں پہلے سے بھی زیادہ مقبول بنا دیا۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود میاں صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگر یہ

اِس وقت مسلمانوں اور سرکاری ممبروں کے تعاون سے انہوں نے یہ معرکہ تو جیت لیا ہے۔ تاہم اگر کل کو مسلمان ممبروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ یا گورنمنٹ سے اختلاف کی بنا پر سرکاری ارکان نے اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ تو پھر کیا ہوگا؟

صوبے بھر میں فرقہ وارانہ کشمکش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ ٹھنڈی ہونے میں نہ آتی تھی۔ خلافت اور ترکِ موالات کے ابتدائی دَور کا اتحاد خواب و خیال ہو چکا تھا۔ پنجاب کے ہندوؤں کے مسلسل اور متواتر پراپاگنڈے سے ہندوستان بھر میں یہ بات عام پھیل گئی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کو جس شخص نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور یُوں بالواسطہ ترکِ موالات کی تحریک کو ختم کرایا ہے وہ فضلِ حسین ہے۔" انڈین اینوئل رجسٹر" سال ۱۹۲۳ء۔ جلد ۲ میں پنجاب کی سیاسی حالت کی تصویر اِن لفظوں میں کھینچی گئی ہے:۔

"...... جیسا کہ پہلے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اب کے بھی فرقہ وارانہ کشمکش کی چنگاری پنجاب سے پھُوٹی۔ ہندو مسلم نفاق کی سب سے زیادہ ذمہ داری جس شخص کے سر تھُوپی جا رہی ہے وہ پنجاب کے وزیرِ تعلیم میاں فضلِ حسین ہیں۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی پچپن فیصد ہے۔ لیکن اکثریت کے باوجود وہ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ اور چونکہ اِس باب میں ہندوؤں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے وہ چاہتے ہیں کہ

اُنھیں بعض ضروری تحفظات عطا کئے جائیں۔ اس کے علاوہ یوں بھی وہ سیاسیات اور مذہب میں بہت پُرجوش واقع ہوئے ہیں اُن کا طبعی رجحان ہندوستانی قومیت کی طرف کم اور عالمگیر اخوتِ اسلامی کی طرف زیادہ ہے۔ ہندوؤں کی آبادی چونتیس[۲۴] فی صد ہے۔ جو بیشتر شہری اور قصباتی ہے۔ تعلیم، دولت، تجارت اور صنعت و حرفت میں ہندو مسلمانوں سے آگے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مذہبی عصبیت سے بہت ڈرتے ہیں۔ سکھ جو صوبے مجموعی آبادی کا گیارہ فیصد عنصر ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن گذشتہ دس بارہ سال سے اُن میں ایک زبردست انقلاب آگیا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن میں اپنی سیاسی اور عسکری اہمیت کا شعور بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اِن تینوں قوموں کی روایات اور مفاد ایک دوسرے سے اِس قدر مختلف ہیں کہ پنجاب مستقل طور پر فرقہ پرستی کا اڈہ بنکر رہ گیا ہے۔ اور یہاں کے باشندوں کا عام رجحان قوم پرستی کی طرف کم اور فرقہ واری کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔

" پنجاب کے وزیرِ تعلیم میاں فضلِ حسین تحریکِ ترکِ موالات سے قبل کانگرس اور مسلم لیگ میں شامل تھے۔ مارشل لا کے ایّام میں یہ بھی حکومت کے تشدّد کا نشانہ بنے تھے۔ بمنصب

وزارت پر فائز ہو کر انہیں لامحالہ ترکِ موالات کی تحریک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی ایک سابق کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈر ہونے کی وجہ سے اُن پر اُس میثاقِ لکھنؤ کی پابندی بھی ہوتی تھی جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور لیگ کے درمیان طے ہوا تھا۔ جہاں تک پنجاب کی صوبائی مجلسِ قانون ساز کی ہئیتِ ترکیبی کا تعلق ہے۔ میثاقِ لکھنؤ کی جملہ شرائط کو کم و بیش جدید اصلاحات میں شامل کرایا گیا تھا۔ یعنی پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور دیگر سرکاری اداروں میں مسلمانوں کو پچاس فیصد نمائندگی عطا ہوگی۔ میاں فضلِ حسین نے اپنی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اِن شرائط کی لفظ بہ لفظ پابندی کی۔ اور جب اُن کے حریفوں نے اُن کے خلاف فرقہ پرستی کا طوفان اٹھایا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف کانگرس اور مسلم لیگ کے میثاقِ لکھنؤ پر عمل کر رہے ہیں اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر رہے۔

"میاں فضلِ حسین کی اِس پالیسی کا ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں ترکِ موالات کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان، خواہ وہ ترکِ موالات کے حامی تھے یا مخالف، یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک پرندہ جو ہاتھ میں آگیا ہے۔ یقیناً اُن دو پرندوں سے بہتر ہے جو ابھی جھاڑی میں چھپے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ مہاتما گاندھی جس مکمل سوراج کا خواب دکھا رہے ہیں

خدا جانے وہ کب آئے گا۔ اور اگر آیا بھی تو نہیں معلوم کہ اُس کی شکل و صورت کیا ہوگی۔ لہٰذا ہم اِس اُدھورے سوراج ہی سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں جو میاں فضل حسین کی کوششوں سے ہمیں مل رہا ہے۔ یہ سب کچھ محسوس کرکے مسلمان من حیث القوم فضل حسین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔"

اپریل سنہ ۱۹۲۳ء میں کانگرس نے سی۔آر۔داس۔ پنڈت موتی لال نہرو مولانا ابوالکلام آزاد اور سروجنی نائیڈو کو پنجاب بھیجا تاکہ ہندو مسلم قضیئے کا حل تلاش کیا جائے۔ یہ وفد تین چار ہفتے پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرتا رہا۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہوگئے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی وفد کی تجویزوں کو کان دھر کر سننے پر تیار نہ تھا۔ آخر سی۔آر۔داس نے جو وفد کے لیڈر تھے، نہایت غصہ کے عالم میں ایک بیان دیا کہ "پنجاب اپنے جھگڑوں میں بے شک اُلجھا رہے۔ سوراج اِن جھگڑوں کا انتظار نہیں کرسکتا۔ ہم اہلِ پنجاب کے باہمی فسادات کا حل تلاش کرنے کو محض تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ پنجاب یونہی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلتا رہے گا۔ ہمیں اِس کی چنداں پرواہ نہیں۔ ہم کو سوراج پارٹی کا پروگرام اپنی تکمیل کے لئے بلا رہا ہے۔ اِس لئے ہم یہاں سے رخصت ہوتے ہیں"۔

بعض لوگوں نے یہ سوچ کر کہ ہندو مسلم فسادات کی جڑ جو نکہ جُدا گانہ انتخاب ہے اِس لئے اگر اس قسم کا انتظام کر لیا جائے کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز میں ہندو، مسلمان اور سکھ نشستوں کی جو موجودہ تعداد ہے۔ وہ

تو محفوظ رہے۔ لیکن انتخاب مخلوط ہو جائے۔ تو فرقہ وارانہ کش مکش کے کم ہو جانے کا بہت امکان ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی کوشش سے ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو پنجاب کونسل میں مخلوط انتخاب کی قرارداد پیش کی گئی۔ میاں فضل حسین اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے قرارداد کے خلاف ایک طویل تقریر کی۔ جس کے ایک حصّہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

"آج کل ہماری سیاسی حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ہر شخص صرف اپنی قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھتا اور ملک کی دوسری قوموں کے مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر ایک فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جداگانہ انتخاب سے اُسے کچھ فائدہ پہونچنے کا امکان ہے۔ تو وہ بے دریغ جداگانہ انتخاب کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ اور اگر یہی طبقہ کل کو یہ محسوس کرتا ہے کہ مخلوط انتخاب سے زیادہ فائدہ پہونچ سکے گا تو فوراً مخلوط انتخاب کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ تمام ہتھکنڈے صرف اپنے اور اپنی قوم کے منافع کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ قوم پرستی کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ محض اپنے اپنے فرقے کا خیال کرنے کے بجائے سب لوگ مجموعی طور پر سارے ملک کی بہتری کا خیال کریں تاکہ اقلیت کو اپنی تقدیر اکثریت کے ہاتھ میں دے دینے سے تامّل نہ ہو۔ اگر ماضی میں اس قسم کے باہمی اعتماد کی خوشگوار فضا موجود ہوتی۔ تو جداگانہ انتخاب کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔

میں اِس ایوان کی توجہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف منعطف کراتا ہوں۔ جہاں انتخاب مخلوط ہے اور انتخابی حلقے بھی مخلوط ہیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ جس حلقہ میں مسلمان ووٹروں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہاں سے مسلمان اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں سے ہندو ممبر منتخب ہوتا ہے۔ یہی حال اُن میونسپل کمیٹیوں کا ہے جہاں مخلوط انتخاب رائج ہے۔ مسلمان ووٹر مسلمان کو اور ہندو ووٹر اپنے ہم قوم ہی کو ووٹ دیتا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ انتخابی حلقے مخلوط ہونے کے باوجود انتخابات کی جنگیں جداگانہ نیابت کے اصولوں پر لڑی جا رہی ہیں۔

"ملک بھر میں فرقہ پرستی کی وبا پھیل رہی ہے۔ اور اِس وبا کے جراثیم ہر بستی اور ہر قریے میں سرایت کر گئے ہیں۔ انتخابات مخلوط رکھیئے تو کیا اور جداگانہ رہے تو کیا۔ جب تک یہ جراثیم موجود ہیں محض انتخابی طور طریقوں کے اَدل بَدل سے مرض کا ازالہ نہیں ہوگا ...... یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جداگانہ انتخاب نے ہندو مسلم کشیدگی پیدا کی ہے۔ ۱۹۲۲ء تک امرتسر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسا زبردست اتحاد تھا کہ سارا ہندوستان اُسے رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد اِس اتفاق و اتحاد کی جگہ نفرت و عداوت نے لے لی ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ جداگانہ انتخاب تو وہاں گزشتہ پچیس[۲۵] سال

سے رائج تھا۔ لیکن اِس کے باوجود ہندو مسلم اتفاق کی لہریں برابر زور و شور سے چلتی رہیں۔ اب پچھلے دو سال سے اِس اتفاق کا شائبہ تک امرتسر میں نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ مرض کی جڑ جداگانہ انتخاب میں نہیں۔ بلکہ کسی اور جگہ چھپی ہوئی ہے۔

" جب تک لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہماری مذہبی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں انقلاب نہیں آ سکتا یہ دعوٰے سراسر غلط ہے کہ مخلوط انتخاب رائج کر دینے سے لوگ صرف موزوں اور قابل امیدواروں کو ووٹ دینگے۔ اور اس بات کا خیال نہیں کریں گے کہ آیا امیدوار اُن کا ہم قوم و ہم مذہب ہے یا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہر طبقہ میں فرقہ پرستی کی بیماری پھیل گئی ہے اور ہر شخص ہر واقعہ کو صرف اِس نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اُس کو اور اُس کے فرقے کو کتنا فائدہ پہونچے گا۔

" اِس بحث کے دوران میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جداگانہ انتخاب کی ترویج سے پہلے فرقہ وارانہ جھگڑے ہمارے ہاں موجود نہیں تھے یہ بات صریحاً غلط ہے۔ جداگانہ انتخاب جاری کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی فرقہ وارانہ نزاع تھی۔ جیسی آج ہے۔ اب اِس فرقہ پرستی کے اظہار اور اُس سے متمتع ہونے کے بہت سے لیے مواقع نکل آئے ہیں جو ماضی میں نہیں تھے۔ ملازمتوں کی کثرت حکومت خود اختیاری کے ادارے۔ کونسل کی ممبری۔ یہ تمام

چیزیں اس شکل میں پہلے موجود نہیں تھیں۔

"یہ صحیح ہے کہ ہمارا انتہائے نظر یہی ہونا چاہیئے کہ ملک میں مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔ لیکن اس منزل تک پہونچنے کے لیئے سب سے زیادہ ضرورت اس چیز کی ہے کہ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو تاکہ وہ اپنے اپنے فرقے اور اپنے اپنے طبقے کی بہتری کے خیال سے بلند ہو کر ملک کے تمام طبقوں کی فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین بنائیں۔ جس وقت یہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔ تو ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر خود بخود اعتماد کرنے لگ جائے گا۔ اور پھر جداگانہ انتخاب کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔"

۱۹۲۳ء کے نومبر میں پنجاب کی پہلی مجلس قانون ساز کی سہ سالہ زندگی ختم ہو گئی۔ اور نئے انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لالہ ہرکشن لال نے اعلان کر دیا کہ وہ دوبارہ انتخابات میں کھڑے نہیں ہوں گے۔ ہندو ہرکشن لال کو طعنہ دیتے تھے کہ کروڑپتی ہونے کے باوجود محض پانچ ہزار روپے مشاہرہ کی خاطر فضل حسین کی "ہندو کش" پالیسی میں شریک ہے۔ کونسل کے ختم ہوتے ہی لالہ ہرکشن لال نے ایک پبلک جلسے میں اپنی دنائی پیش کی۔ انہوں نے میاں فضل حسین کی پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے اس دو عملی حکومت کو بھی برا بھلا کہا جو جدید اصلاحات کا نتیجہ تھی۔ اس طرح پنجاب کی اس پہلی وزارت کا خاتمہ ہوا۔ جس میں دونوں وزیر شہری تھے اور کانگرسی بھی تھے۔ ہرکشن لال تو پنجاب کی سیاسیات سے ہمیشہ کے لیئے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن

فضل حسین نے اس تجربے سے یہ سبق حاصل کر لیا کہ آئندہ کسی کانگرسی اور کسی شہری ہندو کو اپنا رفیق کار نہیں بنائیں گے۔

پانچواں باب

یونینسٹ پارٹی کا قیام

جنوری ۱۹۲۴ء میں پنجاب کی دوسری لیجسلیٹو کونسل مرتب ہوئی۔ اس مرتبہ ایوان میں ممبروں کی تقسیم کسی حد تک جماعت بندی یعنی پارٹی کے اصول پر تھی۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی نے چونکہ کونسلوں کے تعاطعہ کی شرط اٹھا دی تھی۔ اس لئے پنڈت موتی لال نہرو۔ اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی قیادت میں کانگریس کا ایک طاقتور عنصر سوراجیوں کے لقب سے مرکزی اسمبلی کے علاوہ صوبائی کونسلوں میں بھی داخل ہو گیا تھا۔ چنانچہ پنجاب کونسل میں نو سوراجی اور تین خلافتی ارکان آگئے تھے۔ سوراجی سب کے سب ہندو تھے۔ جن کے لیڈر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تھے۔ خلافتی ارکان میں چودھری افضل حق۔ رانا فیروز الدین اور مولوی مظہر علی اظہر شامل تھے۔ اس کے علاوہ پانچ ممبر، جن کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ تھے اپنے آپ کو ہندو سبھا پارٹی کہتے تھے۔ چھ زراعت پیشہ ہندوؤں کا ایک الگ گروہ تھا جس کے لیڈر چودھری لال چند تھے۔ مسلمانوں میں تین خلافتی ممبروں کے علاوہ چھبیس زراعت پیشہ ارکان کا علیحدہ جتھہ تھا۔ سات ممبر اپنے آپ کو

مسلم لیگی کہتے تھے۔ حالانکہ الیکشن میں مسلم لیگ نے بحیثیت سیاسی جماعت کے قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ سکھوں میں گیارہ ممبر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے نمائندے تھے۔ سارے ایوان میں چھ ممبر ایسے بھی تھے۔ جو اپنے آپ کو کسی جماعت سے منسوب نہیں کرتے تھے۔

وزارت سازی کا وقت آیا تو گورنر، سر ایڈورڈ میکلگن نے حسب سابق مسلمانوں میں سے میاں فضلِ حسین کو منتخب کیا۔ میاں فضلِ حسین کا اثر گورنر پر اس حد تک بڑھ چکا تھا۔ کہ انہوں نے وزارت قبول کرنے سے پہلے یہ شرط پیش کی کہ انہیں اپنا پسندیدہ رفیق نامزد کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ اور گورنر اس میں مداخلت نہ کرے۔ سر ایڈورڈ میکلگن نے یہ شرط منظور کر لی۔ میاں فضلِ حسین نے رہتک کے ایک جاٹ چودھری لال چند کو اپنا ساتھی منتخب کیا یہ وہی لال چند تھے جو جدید اصلاحات سے پہلے بھی پنجاب کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ اور شہری اور دیہاتی تفریق کے اس قدر معاون تھے کہ انہی کی کوششوں سے شہری اور دیہاتی آبادی کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے مقرر ہوئے تھے۔ اور انہی کی کوشش سے شہری اور دیہاتی آبادی کے تناسب سے نئی کونسل میں نشستوں کی تعداد بھی مقرر کی گئی تھی۔ اسی سلسلے میں چودھری لال چند نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی۔ تو دیہات کے انتخابی حلقے سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ جو قانونِ انتقالِ اراضی کی رُو سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ میاں فضلِ حسین چونکہ اُن دنوں اِس تفریق و تقسیم کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے لال چند کی ان

تجویزوں اور کوششوں کی سخت مخالفت کی تھی۔ یہ لال چند ہی تھے جنہوں نے تین سال قبل اپنے اخبار جاٹ گزٹ میں یہ اعتراض کیا تھا کہ میاں فضلِ حسین اور لالہ ہرکشن لال کی وزارت "شہری وزارت" ہے۔ جو پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں کے لئے باعث توہین ہے۔

سوال یہ ہے کہ میاں فضلِ حسین کو کس چیز نے اِس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک ایسے شخص کو اپنا رفیقِ کار بنائیں۔ جو سیاست میں کبھی اُن کا ہم نوا نہیں تھا اور جس کے رجعت پسندانہ اور تفرقہ پردازانہ عقائد سے اُنھیں ہمیشہ اختلاف رہا تھا؟ اِس سوال کا جواب تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں۔ گذشتہ تین سال کے تجربے نے فضلِ حسین کو یہ سبق سکھا دیا تھا۔ کہ شہری اور کانگرسی ہندوؤں سے اب انھیں کسی قسم کے اشتراک و تعاون یا کسی نوع کی ہمدردی کی ہرگز امید نہ رکھنی چاہئیے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ میاں فضلِ حسین چونکہ بڑے زیرک ہوشیار آدمی تھے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سوراج پارٹی کے کونسل میں داخل ہونے کے بعد ہوا کا رُخ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کی پارٹی اور سوراجیوں میں کامل اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ اور اِس اتحاد کی وجہ سے حکومت کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ بنگال میں سی۔ آر داس کی کو ہپیکر شخصیت نے مسلمانوں کے تمام خدشوں کو دُور کر کے انھیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور اِس طرح صوبے میں حکومت کا نظام اور وزارت کا قیام ناممکن کر دیا تھا۔ فضلِ حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر کل کو پنجاب میں بھی کوئی موتی لال یا کوئی سی۔ آر۔ داس پیدا ہو گیا۔ جس نے مسلمانوں کے تمام اندیشوں

کو دور کر کے ایک زبردست حزبِ مخالف کی بنا ڈال دی۔ تو اُن کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ اِن خیالات سے متاثر ہو کر انہوں نے کونسل کے ہندو ممبروں میں سے اُس شخص کو اپنا رفیقِ کار منتخب کیا۔ جو شہری آبادی کا سب سے بڑا دشمن اور شہریوں کے تفوق کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ میاں فضلِ حسین کو یقین تھا کہ مسلمان تو بہر حال اُن کے ساتھ رہیں گے۔ خطرہ صرف ہندوؤں سے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اِس خطرہ کے ازالہ کی اِس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ ہندوؤں میں سے ایک گروہ کو کاٹ کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

کونسل میں تین دیہاتی مسلمان ممبر تھے۔ اِدھر چودھری لال چند چھوزراعت پیشہ دیہاتی ہندوؤں کے لیڈر تھے۔ اقتصادی مفاد کے مشترک ہو جانے سے اِن دونوں گروہوں میں یگانگت اور ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ اِس قسم کی یگانگت اِس لئے بھی ضروری تھی کہ مسلمان بجائے خود اکثریت میں نہیں تھے۔ اور ایسی پارٹی بنانے سے معذور تھے جو تنہا حکومت چلانے کی قدرت رکھتی ہو۔ جداگانہ نیابت کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیاسی مسائل و اقتصادی مفاد کے اشتراک پر کونسل میں مخلوط پارٹی بنانا قطعاً معیوب نہیں تھا۔ آخر مطلب برآری کے لئے "سرکاری بلاک" پر کب تک انحصار رہ سکتا اور کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میاں فضلِ حسین نے پچھلے تین برسوں میں "سرکاری بلاک" کی غیر متزلزل اعانت سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ گورنر کی چشمِ کرم کا نتیجہ تھا۔ اور جو لوگ انگریز کی ذہنیت سے واقف تھے اُن کے لئے یہ فیصلہ کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ کہ ممکن ہے یہی چشمِ کرم رات بھر

میں چشمِ قہر و غضب سے بدل جائے۔ یُوں بھی ملک کے ترقی پذیر سیاسی حالات اِس بات کے متقاضی تھے کہ سرکاری اور نامزد ممبروں کی اعانت سے بے نیاز ہو کر وزراء کو اپنی پارٹی پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد میں کوئی باہمی تصادم نہیں تھا۔ شہری مسلمان غیر زراعت پیشہ ہونے کے باوجود قانونِ انتقالِ اراضی کے حامی تھے۔ اور اُنھیں یہ کسی صورت سے گوارا نہیں تھا کہ دیہاتی مسلمان اِس قانون کی حفاظت و صیانت سے محروم ہو جائیں۔ یا اُن کی زمینیں سُود در سُود کے چکر میں پڑ کر ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں چلی جائیں چودھری لال چند کی پارٹی بھی اِسی اصُول کی حامی تھی۔ لہٰذا صوبے کے وسیع مفاد اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میاں فضل حسین کا یہ اقدام ہرگز قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ مقصد بہر حال یہ تھا کہ شہری ہندوؤں کے اُس دولت مند طبقے کے استیلائے، جو مختلف ذرائع آمدنی کے علاوہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو چکا تھا، صوبے کی غریب اور پسماندہ آبادی کو محفوظ رکھا جائے۔

فضل حسین اور لال چند کی اِس مشترک پارٹی کا نام نیشنل یونینسٹ پارٹی رکھا گیا۔ اور کونسل کے شہری مسلمان بطیبِ خاطر اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن سوراجیوں اور ہندو سبھائیوں کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا تھا کہ رہتک کا ایک جاٹ ہندو قوم کا نمائندہ بنکر وزارت کی کرسی پر بیٹھ جائے۔ اُن کے لئے تو گویا یہ منصب صرف اُنہی کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ چنانچہ میاں فضل حسین

کہ اِس فیصلے کے خلاف صوبے بھر کے شہری ہندوؤں میں ایک ہلچل مچ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جب لالہ ہرکشن لال وزیر تھے۔ تو شہری ہندو انھیں بزدلی کا طعنہ دے کر کہتے تھے کہ یہ شخص کروڑ پتی ہونے کے باوجود پانچ ہزار روپے مشاہرہ کی خاطر فضلِ حسین کی "ہندو کُش" پالیسی میں شریک ہے۔ جب لالہ ہرکشن لال رخصت ہو گئے اور وزارت تو کیا انہوں نے کونسل کے دروازہ کی طرف بھی رُخ کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اب یہی شہری ہندو اِس بات پر واویلا کر رہے تھے کہ فضلِ حسین کا رفیقِ کار خود اُن کی جماعت میں سے کیوں نہیں لیا گیا۔ اور یہ اعزاز رُہتک کے ایک زراعت پیشہ دیہاتی کو کیوں عطا ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی اِس ناکامی اور محرومی کا انتقام لینے کے لئے انہوں نے ایک بہت بڑی رقم جمع کر کے چودھری لال چند کے اُس حریف کو دی۔ جو گذشتہ الیکشن میں اُن سے شکست کھا چکا تھا۔ اور اُسے لال چند کے خلاف انتخابی عُذر داری دائر کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اگر یونینسٹ پارٹی ذات پات کی تفریق۔ اور قبائلی عصبیت کے جذبے سے بلند ہو کر۔ صرف اُنہی خطوط پر کام کرتی جو اُس نے اپنے لئے وضع کئے تھے۔ تو کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ لیکن مصیبت یہ آ پڑی کہ چودھری لال چند اور اُن کے رفقاء یہ نقطۂ نگاہ لے کر آئے تھے۔ کہ پنجاب میں اگر کوئی طبقہ مظلوم ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اگر کوئی طبقہ حکومت کی اعانت و سرپرستی کا محتاج ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اگر کسی طبقہ کو ملازمتیں۔ جاگیریں اور عہدے حاصل کرنے کا استحقاق ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اور اگر کوئی طبقہ اغیار کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے اب تک

اپنے جائز حق سے محروم رہا ہے۔ تو وہ صرف جاٹ ہیں۔ چنانچہ اگر پنجاب کونسل کی صرف ۱۹۲۴ء کی کارگذاری پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔ تو یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

یہاں پنجاب کونسل کی صرف فروری ۱۹۲۴ء سے نومبر ۱۹۲۴ء تک کی رُوداد میں سے چند سوال نکال کر درج کئے جاتے ہیں۔ جن کے جواب کونسل کے ممبروں نے وزیروں سے طلب کئے تھے۔

چودھری دُلی چند: (ا) "کیا یہ واقعہ ہے کہ پی۔ ای۔ ایس کی ملازمتوں میں ایک ہندو جاٹ بھی نہیں ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ اس ملازمت میں کتنی اسامیوں پر ہندو جاٹ متعین ہیں؟

(ب) کیا مہربانی کرکے حکومت آئندہ پی۔ ای۔ ایس کی اسامیوں پر براہِ راست تقرر کرتے وقت ہندو جاٹوں کو ترجیح دے گی؟"

چودھری دُلی چند: (ل) "کیا یہ واقعہ ہے کہ پی۔ سی۔ ایس کی جوڈیشل برانچ میں ایک ہندو جاٹ بھی نہیں ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو کیا مہربانی کرکے حکومت بتلائے گی کہ اس ملازمت پر کتنے ہندو جاٹ متعین ہیں؟

"(ب) کیا مہربانی فرماکر حکومت آئندہ پی۔ سی۔ ایس کی جوڈیشل برانچ میں براہِ راست تقرر کرتے وقت ہندو جاٹوں کو ترجیح دے گی؟"۔

چودھری دُلی چند: "(ل) کیا مہربانی کرکے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ مندرجۂ ذیل اسامیوں پر کتنے زراعت

پیشہ و غیر زراعت پیشہ مسلمان ۔ کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ ہندو اور
کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ سکھ متعین ہیں۔

۱:۔ انسپکٹر پولیس
۲:۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس
۳:۔ سب انسپکٹر آبکاری
۴:۔ انسپکٹر آبکاری
۵:۔ اسسٹنٹ جیلر
۶:۔ جیلر
۷:۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
۸:۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
۹:۔ سب جج
۱۰:۔ اکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر جنگلات
۱۱:۔ رینجر جنگلات
۱۲:۔ ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت
۱۳:۔ پنجاب سول سکریٹریٹ کے کلرک

"(ب) کیا مہربانی کرکے حکومت بتلائے گی کہ مذکورہ بالا اسامیوں میں سے ہر
اسامی پر کتنے ہندو جاٹ متعین ہیں؟"

"(ج) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ پے در پے سرکلر جاری کرنے کے باوجود
کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اب تک اُن

کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ؟

"(د) اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت بتائے گی کہ وہ آئندہ سرکاری ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کو اُن کا پورا حصّہ دینے کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟"

چودھری دُلی چند: "(ا) کیا مہربانی کرکے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ ضلع رہتک کے ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس، سول سرجن کے دفاتر میں اور رہتک اور کرنال کی جملہ تحصیلوں کے دفاتر میں کتنے آدمی ملازم ہیں اور وہ ملازم کن اقوام سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"(ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ اِن تمام دفاتر میں ہندو جاٹوں کی تعداد بے حد قلیل ہے؟"

"(ج) اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا حکومت اِن اضلاع کے حکّام کے نام اِس قسم کی ہدایات جاری کرے گی کہ وہ اپنے دفتروں میں ہندو جاٹوں کی تعداد میں اُن کی آبادی کے مطابق اضافہ کریں؟"

چودھری چھوٹو رام: "کیا مہربانی کرکے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ مجموعی طور پر مندرجہ ذیل ملازمتوں میں سے ہر ملازمت کی کتنی اسامیاں اِس وقت صوبے بھر میں موجود ہیں اور ایسی ہر اسامی پر کتنے ہندو جاٹ اور مسلمان جاٹ۔ ہندو راجپوت اور مسلمان راجپوت متعین ہیں؟"

۱:۔ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

۲:۔ سب جج

۳:- تحصیلدار
۴:- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس
۵:- انسپکٹر پولیس
۶:- سب انسپکٹر پولیس
۷:- ڈپٹی کلکٹر انہار
۸:- ضلعدار
۹:- اکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر جنگلات
۱۰:- رینجر جنگلات
۱۱:- ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت
۱۲:- اسسٹنٹ رجسٹرار
۱۳:- ویٹرنری سپرنٹنڈنٹ
۱۴:- ویٹرنری انسپکٹر
۱۵:- ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
۱۶:- اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
۱۷:- انسپکٹر آبکاری
۱۸:- سب انسپکٹر آبکاری

چودھری چھوٹو رام : "کیا مہربانی کرکے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں پنجاب کی نوآبادیات میں سے ہر نوآبادی کے متعلق مندرجہ ذیل امور واضح کئے گئے ہوں؟

"(ا) مربع جات اراضی کی کل تعداد کتنی ہے؟

"(ب) ایسے مربع جات کی تعداد کتنی ہے جن کو ایک معینہ مدت کے لئے متاجری پہ دیا گیا ہے۔ اور وہ معینہ مدت کب ختم ہو رہی ہے؟

"(ج) ایسے مربع جات کی تعداد کتنی ہے جن پہ زراعت پیشہ وغیر زراعت پیشہ مسلمان۔ زراعت پیشہ وغیر زراعت پیشہ سکھ۔ زراعت پیشہ وغیر زراعت پیشہ ہندو اور دیگر اقوام کے لوگ

۱:- مالکانہ حقوق رکھتے ہیں۔ یا

۲:- قابض کاشتکار ہیں۔ یا

۳:۔ غیر قابض کاشتکار ہیں۔ یا

۴:۔ پیشہ دار ہیں؟"

چودھری چھوٹو رام : "کیا مہربانی فرما کر حکومت بتلائے گی کہ قسمت انبالہ میں کتنے مربع جات اراضی سندھ جاٹوں کو عطا کئے گئے ہیں؟"

چودھری چھوٹو رام : "کیا مہربانی فرما کر حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کی گئی ہو؟

"(ا) جب سے حکومت نے ریزولیشن منظور کیا ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں زمینداروں کو ایک خاص معیّنہ تعداد میں ملازمتیں دی جائیں گی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک مندرجہ ذیل اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کل کتنے آدمیوں کا تقرر ہوا ہے۔ اور ان تقرر یافتہ امیدواروں میں سے زمینداروں کی تعداد کتنی ہے؟

۱:۔ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۶:۔ انسپکٹر پولیس
۲:۔ سب جج	۷:۔ سب انسپکٹر پولیس
۳:۔ تحصیلدار	۸:۔ ضلعدار
۴:۔ نائب تحصیلدار	۹:۔ پی۔ ای۔ ایس
۵:۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس	۱۰:۔ جیلر

"(ب) مذکورہ بالا ریزولیشن منظور ہونے سے تین سال پیشتر انہی اسامیوں میں سے ہر ایک اسامی پر کتنے زمیندار امیدواروں کا تقرر ہوا تھا؟"

چودھری چھوٹو رام : "کیا مہربانی کرکے حکومت بتائے گی کہ پنجاب

سول سکریٹریٹ کے کلرکوں میں ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے؟"

چودھری چھوٹو رام: "کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ جب سے یہ ریزولیشن منظور ہوا ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں جاٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ اب تک مندرجہ ذیل اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کتنے امیدواروں کا تقرر ہوا ہے اور اُن تقرر یافتگان میں سے ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے؟

۱:- سب جج
۲:- اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر
۳:- تحصیلدار
۴:- نائب تحصیلدار
۵:- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس
۶:- انسپکٹر پولیس
۷:- سب انسپکٹر پولیس
۸:- ضلعدار
۹:- جیلر
۱۰:- پی - ای - ایس

چودھری چھوٹو رام: "کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ گذشتہ پانچ سال میں حکومت پنجاب نے کتنے آدمیوں کو ڈیرہ دون کے فارسٹ کالج میں اکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر یا رینجر کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے اور اُن میں ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے؟

"(ب) کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ یہ بات صحیح ہے کہ اس کالج میں ہندو جاٹوں کی تعداد بے حد قلیل ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت اس درسگاہ میں ہندو جاٹ طلبہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گی؟"

چودھری چھوٹو رام: "(۱) کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ یہ واقعہ ہے کہ جب حکومت نے مختلف سرکاری محکموں میں اسامیوں کی ایک

خاص تعداد زمینداروں کے لئے مخصوص تھی۔ تو اس ریزولیشن کے ذریعے سے یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ پیشہ ورانہ (پروفیشنل) اور ٹکنیکل درس گاہوں میں زمیندار اُمیدواروں کو داخلے کی خاص سہولتیں بہم پہونچائی جائیں گی؟

"(ب) اگر شق (ل) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی۔ کہ لاہور کے میڈیکل کالج۔ وٹرینری کالج۔ سینٹرل ٹریننگ کالج اور امرتسر کے میڈیکل سکول میں داخلہ کے وقت ذمہ دار افسروں نے یہ تحقیقات کی تھی کہ آیا داخل ہونے والے امیدوار زمیندار ہیں یا غیر زمیندار؟۔

"(ج) اگر اس قسم کی تحقیقات نہیں کی گئی تو کیا حکومت مہربانی کر کے متعلقہ درس گاہوں کے افسروں کے نام احکام جاری کرے گی کہ آئندہ داخلے کے وقت اس قسم کی تحقیقات ضرور کی جائے۔ تاکہ حکومت کے منظور کردہ ریزولیشن پہ لفظاً و معناً عملدرآمد ہو سکے؟

"(د) کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ امسال لاہور کے میڈیکل کالج۔ وٹرینری کالج بسینٹرل ٹریننگ کالج اور امرتسر کے میڈیکل سکول میں کتنے مسلمان ہندو اور سکھ امیدوار داخل کئے گئے ہیں۔ اور ان تینوں فرقوں کے طلبہ میں سے ہر فرقہ کے زمیندار طلبہ کتنے ہیں اور غیر زمیندار کتنے؟

چودھری چھوٹو رام: کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ ۱۹۱۵ء سے لے کر اب تک کتنے سرکاری ملازموں کو اُن کے حسنِ خدمات کے اعتراف میں کتنے مربعجات اراضی عام مروجہ شرائط پر (قیمتاً) عطا کئے جا چکے ہیں اور ان سرکاری ملازموں میں سے زمینداروں کی تعداد کتنی ہے اور غیر زمینداروں کی تعداد کیا ہے؟

چودھری دُلی چند : "(ل) کیا علیحدہ انجینیرنگ کالج کے جملہ مصارف صوبے کے محاصل میں سے ادا کئے جاتے ہیں؟

"(ب) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ صوبے کی آمدنی کا بیشتر حصہ زراعت پیشہ طبقہ کی جیبوں میں سے نکل رہا ہے۔ اور ریلوے کا محکمہ صوبائی محاصل میں ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرتا؟

"(ج) کیا یہ صحیح ہے کہ اس کالج کے داخلے میں زراعت پیشہ طبقہ کے افراد کو کوئی ترجیح نہیں دی جاتی؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ وہ امیدوار جن کو ریلوے کا محکمہ نامزد کرتا ہے۔ اس کالج میں آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں؟

"اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ تو کیا حکومت مہربانی فرما کر داخلے کے قواعد کو فوراً تبدیل کرنے کی کوشش کرے گی؟"

چودھری دُلی چند : "(ل) کیا یہ واقعہ ہے کہ دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اوپر سالانہ آمدنی رکھنے والے اشخاص کے بچوں سے سکولوں میں اوّل گریڈ فیس وصول کی جاتی ہے؟ اور کیا یہ بھی واقعہ ہے، کہ دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اوپر سالانہ آمدنی سے مُراد زرعی آمدنی بھی لی جاتی ہے؟

"(ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت مہربانی کر کے دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اُوپر کی سالانہ زرعی آمدنی کو آمدنی کی اس تعریف سے مستثنیٰ قرار دے گی؟"

چودھری دُلی چند : "کیا یہ واقعہ ہے کہ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر سال فرقہ وارانہ اصول پر مختلف طلبہ کو ۳۲ وظائف دیئے جاتے ہیں؟

کیا یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک اِن وظائف کے عطا کئے جانے کا تعلق ہے زراعت پیشہ ہندو جاٹوں اور زراعت پیشہ ہندو راجپوتوں کو ایک جداگانہ فرقہ تسلیم کیا گیا ہے؟

"کیا مہربانی فرما کر حکومت ہندو گوجروں کو بھی ایک جداگانہ فرقہ تسلیم کرے گی۔ اور اُن وظائف میں سے جو ہندو قوم کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔ ہندو گوجروں کے لئے الگ تعداد مخصوص کر دے گی"؟

چودھری دُلی چند: "کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈیرہ غازی خاں۔ جام پور مظفر گڑھ اور قسمت راولپنڈی کے تمام گورنمنٹ سکولوں کی ثانوی جماعتوں میں زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ سے نصف تعلیمی فیس وصول کی جاتی ہے؟ اگر یہ صحیح ہو تو کیا حکومت مہربانی کر کے کرنال۔ رُہتک۔ گوڑگانوہ اور حصار کے گورنمنٹ سکولوں میں بھی اسی قسم کی رعایت کا نفاذ کرے گی۔ تاکہ وہاں بھی ثانوی جماعتوں میں زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ سے نصف فیس وصول کی جائے"؟

چودھری دُلی چند: "کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی۔ کہ اب تک حکومتِ پنجاب کی سفارش پر۔ کتنے طلبہ کو ڈیرہ دون ملٹری کالج میں بھیجا گیا ہے؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ اِن طلبہ میں ایک بھی ہندو جاٹ نہیں؟ اگر یہ درست ہے تو کیا حکومت آئندہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے گی۔ جس سے کافی تعداد میں ہندو جاٹ طلبہ کو اِس ملٹری کالج میں بھیجا جا سکے۔"؟

چودھری دُلی چند: "کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ گزشتہ دس سال میں حلقہ مشرقی (ایسٹرن رینج) سے کتنے پروبیشنر سب انسپکٹر پولیس

بھرتی کئے گئے ہیں؟ اور ان پمد بشینر سب انسپکٹروں میں کتنے زراعت پیشہ افراد تھے؟ اور ان زراعت پیشہ افراد میں سے کتنے جاٹ تھے؟ -

چودھری ڈُلی چند : کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی جونیئر اینگلو ورنیکلر کلاس - سینیئر اینگلو ورنیکلر کلاس اور بی - ٹی کلاس میں کتنے طلبہ داخل کئے گئے ہیں - اور ان داخل ہونے والے طلبہ میں زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ مسلمانوں - زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ ہندوؤں زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ سکھوں اور دوسری قوموں کی تعداد کتنی ہے؟ نیز حکومت یہ بھی بتائے کہ ان کلاسوں میں داخلے کے لئے کتنے ہندو جاٹوں نے درخواستیں دی تھیں - اور ان میں سے کتنے امیدواروں کو لیا گیا ہے؟

چودھری ڈُلی چند: کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ

(ا) کیا اس وقت انڈین ایگریکلچرل سروس میں کوئی ہندو جاٹ ہے؟

(ب) کیا اس وقت پراونشل ایگریکلچرل سروس میں کوئی ہندو جاٹ ہے؟

(ج) اگر جواب اثبات میں ہے تو ان افسروں کی تعداد کتنی ہے؟

(د) اگر جواب نفی میں ہے تو کیا حکومت کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جس سے ان دونوں ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کی کمی پوری ہو سکے؟

چودھری چھوٹو رام اور چودھری ڈُلی چند نے اس خیال سے کہ آج حسنِ اتفاق سے وزارت کی کرسی لال چند کے قبضہ میں ہے - اور ادھر میاں فضلِ حسین اپنی حکومت کو سلامت رکھنے کے لئے ہندو جاٹوں کے محتاج ہیں یہ نعرہ لگا دیا کہ سکولوں کی فیس معاف کرنے کا سوال ہو - یا کالجوں میں طلبہ کے داخلے کا قضیہ - تو آبادیوں

میں مربعے لینے کا مسئلہ ہو یا ملازمتوں میں حصے بخرے کرنے کا معاملہ۔ ہندو جاٹوں کے سوا اور کسی فرقے کے مفاد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ پنجاب میں جاٹوں کے علاوہ اور قومیں بھی آباد تھیں۔ اور ان میں سے ہر قوم آگے بڑھ کر خوانِ نعمت پہ ہاتھ مارنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ چنانچہ جونہی ہندو جاٹوں نے انا و لاغیری کا نعرہ بلند کیا۔ ہندو راجپوت بھی سینہ تان کر اٹھے۔ اور انہوں نے ہندو راجپوتوں کے حقوق کی تحفظ کی جنگ شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۴ء ہی کے چند مہینوں میں پنجاب کونسل میں حکومت سے جو استفسارات کئے گئے۔ اُن کے دو ایک نمونے درج ذیل کئے جاتے ہیں:

چودھری رام سنگھ:

"کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ ضلع کانگڑہ میں کتنے مربع جات اراضی ہندو راجپوتوں کو عطا کئے گئے ہیں؟ اگر انھیں کوئی اراضی نہیں دی گئی تو کیا حکومت اس کی وجوہ بیان کر سکتی ہے؟"

چودھری رام سنگھ:

"کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ نہر باری دوآب اور دوسری نہری نوآبادیوں میں کتنے مربع جاتِ اراضی ضلع کانگڑہ کے ہندو راجپوتوں کو عطا کئے گئے ہیں؟"

چودھری رام سنگھ:

"(الف) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ اضلاع ہوشیارپور۔ کانگڑہ۔ گورداسپور۔ جہلم اور سیالکوٹ کے ہندو راجپوتوں کی اقتصادی و مالی حالت روز بروز خراب

ہوتی جارہی ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن کی تعداد بھی پہلے سے کم ہوگئی ہے؟"

"(ب) اگر شق (ا) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت مندرجہ ذیل تجاویز کو معرضِ عمل میں لانے کی کوشش کرے گی؟

۱:۔ مذکورہ بالا اضلاع کی تمام سرکاری ملازمتوں میں ہندو راجپوتوں کو زیادہ تعداد میں بھرتی کیا جائے۔

۲:۔ مذکورہ بالا اضلاع میں کوآپ. ہیٹو انسپکٹر اور زراعتی اسسٹنٹ کی اسامیوں پر ہندو راجپوتوں کا تقرر کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے ہم قوموں کو اقتصادی مسائل اور زراعت کے سائنٹیفک طریقوں سے اچھی طرح آگاہ کرسکیں۔"

جب ہندو راجپوت اور ہندو جاٹ بڑھ چڑھ کر اپنی اپنی قوم کا حقِ نمائندگی ادا کررہے تھے۔ تو مسلمان کیونکر خاموش رہتے۔ چنانچہ جونہی یہ چھینا جھپٹی شروع ہوئی۔ چودھری شہاب الدین[1]۔ اور بعض دوسرے لوگ بھی اِس میدان میں کود پڑے۔ اِن لوگوں نے اپنی بصیرت کو کام میں لاکر۔ حکومت سے جس قسم کے استفسارات کرنا شروع کئے۔ اُس کے چند نمونے مشتے از خروارے کے طور پہ درج کئے جاتے ہیں

چودھری شہاب الدین:

"(ا) کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ علی الترتیب سال ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں ایماءِ راست فوجی کمیشن کے لئے حکومت نے کتنے آدمیوں کی

---

[1] بعد میں سر شہاب الدین بنے۔ اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک پنجاب اسمبلی کے سپیکر رہے۔

سفارش کی تھی۔ اور اِن اشخاص میں سے جاٹ اور راجپوت کتنے تھے ؟

"(ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ تین سال کے عرصے میں براہِ راست فوجی کمیشن کے لئے کسی راجپوت یا جاٹ کی سفارش نہیں کی گئی ؟

"(ج) اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت بتائے گی کہ آئندہ وہ راجپوتوں اور جاٹوں کو براہِ راست فوجی کمیشن دلانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟"

چودھری شہاب الدین :

"(ل) کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ آیا اُن سرکاری درس گاہوں میں جو کلیّۃً یا بیشتر صوبائی خزانے سے چلائی جارہی ہیں، تعلیم حاصل کرنے کے لئے زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ کو خاص مراعات یا سہولتیں عطا کی جاتی ہیں یا نہیں؟

"(ب) کیا حکومت کے پیشِ نظر ایسی کوئی سکیم ہے جس سے گورنمنٹ کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے زراعت پیشہ اقوام کے لڑکوں کو خاص مراعات عطا کی جاسکیں ؟"

چودھری شہاب الدین :

"کیا مہربانی فرماکر حکومت بتلائے گی کہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق پنجاب کے ہائی سکولوں۔ مڈل سکولوں اور پرائمری سکولوں میں شہری اور دیہاتی طلبہ کی تعداد کتنی ہے اور اِن تمام طلبہ میں زراعت پیشہ اقوام کے لڑکے کتنے ہیں؟"

چودھری صاحب دادخاں :

"کیا یہ واقعہ ہے کہ حلقۂ مشرقی (ایسٹرن رینج) میں رُہتک و حِصار کے اضلاع کے کسی مسلمان راجپوت کو سب انسپکٹر پولیس بھرتی نہیں کیا گیا ؟ اگر یہ صحیح ہے

تو کیا حکومت ان اضلاع کے مسلمان راجپوتوں کو براہِ راست سب انسپکٹر پولیس بھرتی کرنے کی کوئی تدبیر اختیار کرے گی؟"

چودھری صاحب داد خاں:

"کیا حکومت بتائے گی کہ اِس وقت حلقۂ مشرقی (ایسٹرن رینج) میں اضلاع حصار و رُہتک کے کتنے مسلمان راجپوت ہیڈ کنسٹیبل پولیس کی اسامی پر کام کر رہے ہیں؟

چودھری علی اکبر:

"(الف) کیا یہ واقعہ ہے کہ ضلع گورداسپور کے جاٹوں، ارائیوں اور غیر مسلم راجپوتوں کو نوآبادیات میں اراضی عطا ہوئی ہے؟

(ب) اگر شِق (ا) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ ضلع گورداسپور کے مسلمان راجپوتوں کو اب تک اراضی کیوں عطا نہیں کی گئی؟"

محمد سیف اللہ خاں:

"کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ گذشتہ پانچ سال کے عرصے میں زراعت پیشہ اقوام کے کتنے آدمیوں کو ضلع میانوالی کے سول ہسپتالوں میں کمپاؤنڈر اور ویکسینیٹر کی اسامیاں عطا کی گئی ہیں؟"

میاں فضلِ حسین نے تو ۱۹۲۲ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ گورنمنٹ کالج اور میڈیکل کالج میں چالیس ۴۰ فیصد مسلمان داخل کئے جائیں گے اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نمائندگی حاصل ہو گی۔ لیکن اب چاروں طرف یہ شور اٹھنے لگا تھا کہ اِس چالیس فیصد نیابت میں جاٹوں کا کتنا حصّہ ہے اور راجپوتوں

کا تناسب کتنا ہوگا۔ گوجروں کے پلے کیا پڑے گا۔ اور گکھڑوں کو کیا عطا ہوگا۔ زراعت پیشہ لوگوں کے حصّے میں کیا آئے گا اور دیہاتیوں کو کیا ملے گا۔

یونینسٹ پارٹی کے درخت کا یہ پہلا پھل تھا۔ جس کی سمیّت نے آگے چل کر پوری قوم میں تشتّت و افتراق اور بے اعتمادی و بدگمانی کا ایسا زہر پھیلا دیا جس کا تریاق رُبع صدی کی جدّوجہد کے بعد بھی حاصل نہ ہوسکا۔ ستم یہ ہے کہ یہ سب کچھ میاں فضلِ حسین کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا جنہوں نے دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے سر مائیکل اوڈوائر کی پالیسی پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا۔ کہ اُس نے پنجاب میں دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا کرکے صوبے کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ جنہوں نے ۱۹۲۰ء میں چودھری لال چند کی تجاویز کی محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ اِن تجویزوں پر عمل کرنے سے صوبے کی تعلیم یافتہ آبادی پر دیہاتیوں کا ناروا تفوق قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میاں فضلِ حسین نے حریفوں کے حملوں سے بچنے کے لئے اپنے گرد جو حصارِ عافیت کھڑا کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک زنداں کی صورت اختیار کرنے لگا تھا اور اہلِ نظر محسوس کر رہے تھے کہ چند سال میں میاں فضلِ حسین اِس زنداں میں ایک قیدی کی حیثیت اختیار کریں گے۔

اِس مسموم فضا کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری اور دیہاتی طبقوں کے درمیان روز بروز بداعتمادی بڑھنے لگی۔ دیہاتی سمجھتے تھے کہ صوبے کے محاصل میں شہریوں کا حصّہ کم ہے۔ لیکن وہ فائدہ زیادہ اٹھاتے ہیں۔ شہری مسلمان یہ کہتے تھے کہ ایک طرف تو وہ قانونِ انتقالِ اراضی کی پابندیوں کی وجہ سے زمینداری نہیں کرسکتے

دوسری طرف تجارت اور صنعت و حرفت پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اس لئے اُن کی معاش کا دارومدار لے دے کے سرکاری ملازمت ہی پر ہے۔ اب ملازمتوں کے بٹوارے ہیں بھی دیہاتی و شہری۔ زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ۔ زمیندار و غیر زمیندار کا سوال پیدا کر کے اُن کے لئے روزگار کی تمام راہیں بند کی جا رہی ہیں یہ قبائلی تفریق اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنی خطرناک تھی۔ کہ آگ کی مانند ہوا کے ایک ہی جھونکے سے، اُس کے شعلے دور دور تک پہنچنے لگے۔

پنجاب کونسل میں شہری مسلمان صرف پانچ تھے۔ ظاہر ہے، پورے ایوان میں ان پانچ ممبروں کی آواز کیا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ تاہم یہ لوگ قومی اتحاد کو قائم رکھنے کی غرض سے یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ چودھری شہاب الدین ایسا شخص بھی جس کی تمام عمر لاہور میں بسر ہوئی تھی۔ اور جو لاہور کے شہری مسلمانوں کے ووٹ سے میونسپل کمیٹی کا صدر منتخب ہوا تھا۔ اِس رَو میں بے تکلف بہ گیا ہے۔ اور اب جاٹ اور راجپوت کی قبائلی تقسیم۔ اور شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تفریق کھڑی کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ تو انہوں نے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اِس وبا کی روک تھام کا بظاہر اُن کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اُنہوں نے صرف اتنا کیا کہ جونہی موقع ملا۔ اُنہوں نے شدت سے اِس عصبیت کے خلاف آواز بلند کی۔

نومبر ۱۹۲۴ء میں جب کونسل میں "پنجاب اسٹامپ بل" کی ترمیم پیش ہوئی تو شہری اور دیہاتی رقابت نے، اُس جذبۂ عناد کا حجاب تک سینوں میں پرورش

پاتا آرہا تھا، کھلے بندوں مظاہرہ کیا۔ چودھری شہاب الدین نے شہری ممبروں کو براہِ راست ایڈریس کر کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ شہری باشندے کون کون سے ٹیکس ادا کر رہے ہیں؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ سوائے انکم ٹیکس کے اور کسی قسم کا ٹیکس نہیں دیتے۔ جب فوج میں بھرتی ہونے کا سوال آتا ہے تو شہری نہیں بلکہ دیہاتی لوگوں کو رنگروٹ بھرتی کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے لوگ میونسپل کمیٹی کو کچھ ٹیکس ضرور ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ ٹیکس سراسر اُن کی ذاتی سہولت اور آرام کے لئے ہے۔ جنابِ والا! میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صوبے کے سرکاری محاصل میں زیادہ رقم گاؤں کے باشندوں کی جیب سے نکلتی ہے۔ شہر والوں کی ہمیانیوں سے نہیں آتی۔"

ملک فیروز خاں نون نے فرمایا: "میں شہری باشندوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اُن کے لئے جائز ہے کہ اس ٹیکس کی مخالفت کر کے۔ اس رقم کا بوجھ بھی دیہاتی آبادی کے کندھوں پر پھینک دیں؟ مجھے امید ہے کہ اس ایوان کے شہری ممبر فرض شناسی کا ثبوت دیں گے۔ اور اس ٹیکس کو دیہاتیوں کے سر پر ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

شیخ محمد صادق بیرسٹرایٹ لا۔ جو امرتسر کے شہری حلقے سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ یونینسٹ پارٹی میں شامل تھے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ شہری اور دیہاتی کی تفریق ایک ایسی دودھاری تلوار ہے۔ جس سے اگر ہندوؤں کو نقصان پہونچنے کا امکان ہے۔ تو خود مسلمانوں کے سینے پر بھی اس سے گہرا زخم لگ جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے اس روش کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا:

"جناب والا! اِس ایوان میں پہلے ہی سے کافی اختلاف موجود ہے۔ ایک طرف سندھیوں اور مسلمانوں کا جھگڑا چلا آرہا ہے۔ دوسری طرف اکائیوں زرعیہ کالونیوں کا قضیہ جاری ہے۔ اب شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک اور بنائے فساد قائم کی جارہی ہے۔ جو لوگ دیہاتیوں کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں۔ انہوں نے آبیانے میں تخفیف کرا کے اپنے دیہاتی بھائیوں کے بوجھ کو تو کم کردیا ہے۔ لیکن اب اُنہی کی کوشش سے شہریوں پر اسٹامپ ڈیوٹی نافذ کی جارہی ہے۔ کیا دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود حاصل کرنے کا یہی ڈھنگ ہے؟ اور کیا آپ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر محض اِس لئے مسکراتے رہیں گے۔ کہ چلو چھٹی ہوئی۔ یہ چھ لاکھ کی رقم تو شہریوں کی جیب پر پڑ گئی ہے۔"

مولوی مظہر علی اظہر خلافتی تھے۔ اور پنجاب کے مشرقی و مغربی شہروں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے بھی اِس روش کے خلاف آواز بلند کی۔ اور فرمایا: "ہمیں اِس سوال پر محض شہری اور دیہاتی نقطۂ نگاہ سے غور نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ مجموعی طور سے صوبے کی پوری آبادی پر کیا اثر پڑیگا اگر آپ نے غور و فکر کا یہ انداز اختیار نہ کیا۔ تو وہ خلیج جو سندھ و مسلم نزاع۔ اور زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ کی باہمی چپقلش نے پہلے ہی کافی وسیع کر رکھی ہے اب اُس میں شہری دیہاتی تفریق سے ایک نئے اختلاف کا اضافہ ہو جائے گا اِن باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبے کی آبادی کا ہر طبقہ، حریفانہ جذبے سے متاثر ہو کر، اِس بات کی کوشش کرے گا۔ کہ ٹیکسوں کا بوجھ خود اُس پر نہیں بلکہ دوسرے طبقے پر پڑے۔ اور یوں آہستہ آہستہ روز بروز ٹیکسوں میں

اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا۔"

اِس قسم کی چند متفرق آوازوں کے باوجود شہریوں اور دیہاتیوں کا باہمی اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔ شہری مسلمان ایک عجیب مخمصے میں گرفتار تھے اگر وہ یونینسٹ پارٹی کو چھوڑ دیتے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے کونسل میں مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے قطع تعلق کر لیا۔ یہ انقطاع انھیں گوارا نہیں تھا۔ کونسل کے باہر صوبے کی آبادی میں بھی اِس نزاع کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ملازمتوں میں اگر براہِ راست تقرریا نامزدگی کا سوال آتا تھا تو ایک ایم۔ اے پاس شہری مسلمان پر ایک ایسے دیہاتی مسلمان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جو محض میٹرک یا ایف۔ اے تک تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔

مثلاً اگر مقابلے کے امتحان کے ذریعے پراونشل سول سروس کی دس اسامیوں کو پُر کرنے کا موقع آتا تھا۔ تو حکومت اعلان کر دیتی تھی کہ اِن دس اسامیوں میں سے چار اسامیاں مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ادھر جب امتحان کا نتیجہ نکلتا تھا۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ کامیاب امیدواروں کی فہرست میں جو سب سے پہلے دس امیدوار ہیں۔ اُن میں صرف دو مسلمان آئے ہیں۔ اِس صورت میں بقیہ دو اسامیوں کو پُر کرنے کے لئے۔ حکومت اپنے اختیارِ خاص سے نامزدگی کا طریقہ اختیار کرتی تھی۔ قاعدے کی رُو سے چاہیئے تو یہ تھا کہ کامیاب امیدواروں میں سرِ فہرست جن دس امیدواروں کے نام تھے۔ اُن کے معاً بعد علی الترتیب جن دو مسلمانوں کا نمبر تھا اُنھیں نامزد کر دیا جاتا۔ تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے

پاتی۔ لیکن حکومت اِس قاعدے کو بالائے طاق رکھ کر محض اپنی خوشنودی اور صوابدید سے ایسے لوگوں کو نامزد کردیتی تھی۔ جو تعلیمی قابلیت میں پست ہونے کے باوجود بعض مصلحتوں کی وجہ سے حکومت کے منظورِ نظر ہوتے تھے۔ اِس طرزِ عمل کا ایک بیّن لیکن بے حد تلخ نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا ایسا عنصر داخل ہونا شروع ہو گیا جو ہندو اہل کاروں کے مقابلہ میں بے استعداد کم سواد اور نااہل تھا۔ انجام کار اِس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑا۔ اور اغیار نے قوم کی قوم پر نالائقی کا الزام تھوپ دینے سے دریغ نہ کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پنجاب کونسل، اپنی مذموم کارروائی سے صوبے کی پوری آبادی کو شہری اور دیہاتی۔ جاٹ اور راجپوت۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ حصّوں میں تقسیم کرکے مسلمانوں کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ تو مسلمانوں کے صائب الرائے سیاسی لیڈروں کا طرزِ عمل کیا تھا؟ کیا یہ سیاسی لیڈر، جو اکثر و بیشتر شہری آبادی سے تعلق رکھتے تھے، ردِّ عمل کا شکار ہو کر شہری مسلمانوں کی پشت پناہ بن گئے تھے؟ اور کیا وہ دیہاتیوں کے حریف کی حیثیت سے اُن کے خلاف صف آراء ہونا جائز سمجھتے تھے؟ یا اُن کی نظریں اِن مصنوعی حد بندیوں سے بلند ہو کر قوم کی مجموعی حالت کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں؟

اِس سوال کا جواب دینے کے لئے یہاں صرف دو مثالیں پیش کر دینا کافی ہوگا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء کے آخری ہفتے میں اِنڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس بلگام (احاطہ بمبئی) میں ہوئے۔ کانگرس کے صدر

مہاتما گاندھی اور خلافت کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ ڈاکٹر کچلو نے خلافت کانفرنس کے پنڈال میں جہاں مہاتما گاندھی۔ سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ لالہ لاجپت رائے اور ولبھ بھائی پٹیل کے پایہ کے لوگ موجود تھے۔ اپنے خطبہ صدارت میں علی الاعلان فرمایا:

"..... جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے۔ میں ذاتی طور پر میاں فضل حسین کی اس روش کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ کہ انھوں نے حکومت سے تعاون کرکے ترکِ موالات کے قومی پروگرام کی خلاف ورزی کی ہے۔ با ایں ہمہ مجھے اس مجمع کے روبرو یہ اعلان کردینے میں قطعاً کوئی تامل نہیں۔ کہ میاں فضل حسین کا اس کے سوا اور کوئی قصور نہیں۔ کہ وہ مسلمانوں سے کسی قدر انصاف کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مسٹر چنتامنی اور آخر کار مہاتما گاندھی ایسے بلند پایہ لیڈر میاں فضلِ حسین کے کام کا بغور جائزہ لے چکے ہیں اور ان سب کی متفقہ رائے ہے کہ فضلِ حسین کی پالیسی حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں میاں صاحب کے خلاف پنجاب کے ہندوؤں نے جو شور و غوغا بپا کر رکھا ہے وہ بالکل نامناسب اور خود غرضانہ ہے۔ گزشتہ الیکشن کے بعد پنجاب میں جو سوراج پارٹی بنی تھی۔ اُس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ سراسر ایک ہندو پارٹی ہے۔ پنجاب کی مصیبتوں کا اصل سبب اقتصادی ہے۔ کیونکہ ایک طرف

صوبے کی ساری تجارت پر ہندوؤں کا اجارہ ہے۔ اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کی بیشتر تعداد بھی انہی کے قبضہ میں ہے" [1]

جون ۱۹۲۴ء میں حکومتِ ہند نے اس امر کا محاکمہ کرنے کے لئے کہ صوبوں میں دوعملی حکومت کیونکر کام کر رہی ہے۔ اس نظام میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا برائیاں ہیں۔ اصلاحات کی دوسری قسط صوبوں کو ملنی چاہیئے یا نہیں وزراء اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی۔ جس کے صدر حکومتِ ہند کے ہوم ممبر سر الگزینڈر مڈی مین تھے۔ ممبروں میں سر محمد شفیع۔ مسٹر جناح۔ سر تیج بہادر سپرو۔ مہاراجہ بردوان۔ ڈاکٹر پرنجپے۔ سر آرتھر فروم وغیرہ شامل تھے۔ اس کمیٹی کے اجلاس ہندوستان کے ہر صوبے میں ہوئے۔ اور رائے عامہ کی ترجمانی کرنے والے ذمہ دار افراد نے کمیٹی کے روبرو پیش ہو کر شہادتیں دیں۔ مثلاً بنگال سے مولوی فضل الحق۔ سر عبدالرحیم اور پی۔ سی مِتّر۔ بمبئی سے پرشوتم داس ٹھاکر داس اور سر چمن لال سیتلواڈ۔ صوبجاتِ متوسّط سے مسٹر کیلکر۔ یو۔ پی سے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور مسٹر چنتامنی۔ پنجاب سے لالہ ہرکشن لال اور ملک برکت علی پیش ہوئے۔

حکومتِ ہند کے رجعت پسند عنصر کی خواہش تھی کہ صوبائی حکومتوں کی کمزوری اور خانہ جنگی کو ایسے مبالغہ آمیز طریقے سے بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر (۱۹۲۴ء) جلد ۲۔ شمارہ ۴۔

جس سے صوبوں کے وزیر لامحالہ نااہل اور بے تدبیر ثابت ہوں۔ تاکہ برطانوی حکومت اصلاحات کی نئی قسط دینے سے انکار کردے۔ پنجاب میں ہندوؤں نے یہی روش اختیار کی تاکہ میاں فضل حسین کو زیادہ سے زیادہ بدنام کیا جا سکے۔ لالہ ہرکشن لال نے اپنی شہادت میں فضل حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی شہری اور دیہاتی کی باہمی چپقلش اور فرقہ وارانہ انتخاب کی سخت مذمت کی لیکن جب ملک برکت علی پیش ہوئے تو انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے ہوئے جن باتوں پر زور دیا۔ وہ یہ تھیں۔

۱:۔ پنجاب میں دوعملی حکومت کا نظام ہر صورت کامیاب رہا ہے اور وزیروں نے اپنی کارگزاری سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری نبھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

۲:۔ ہندو مسلم نزاع ایک عارضی چیز ہے۔ جب صوبائی خودمختاری (پراونشل آٹامونی) مل گئی تو دونوں قوموں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائیگا اور وہ آپس کے جھگڑوں کو نمٹا کر بارِ حکومت اٹھانے پر تیار ہو جائیں گی۔

۳:۔ مسلم لیگ گورنر کے اختیارات خصوصی پر قانونی پابندیاں عائد کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتی ہے کہ اس قسم کی دستوری روایات قائم کر دی جائیں۔ جن کے تحت گورنر ا[illegible] وزیروں کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرنے پائے۔ ہاں اگر وزیروں کو مجلس قانون ساز کا اعتماد نہیں ہے۔ تو گورنر ان کی رائے پر عمل کرنے کا بھی

مجاز نہیں ہوگا۔ بلکہ اس صورت میں تو اُس کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مجلسِ قانون ساز کو توڑ کر نئے انتخابات کرائے۔

۴:۔ مسلم لیگ اس بات کی شدّت سے حامی ہے کہ اگر صوبوں میں حکومتِ خود اختیاری کا نظام رائج کیا گیا۔ تو اُس کے ساتھ ہی مرکز میں بھی ذمّہ دارانہ حکومت قائم کر دینی چاہیئے۔

۵:۔ مسلم لیگ کی رائے ہے کہ وزیرِ ہند (لندن) کی کونسل کو توڑ دیا جائے

۶:۔ اصلاحات کی جو قسط آئندہ عطا ہو گی اُس میں تمام محکمے وزیروں کے سپرد کر دینے چاہئیں۔ کونسل میں سرکاری بلاک کو ختم کر دیا جائے۔ پارلیمنٹری انڈر سکریٹری مقرر کئے جائیں اور چھوٹی بڑی تمام ملازمتوں کو وزراء کی تحویل میں دے دیا جائے۔

۷:۔ مسلمان اصلاحات کی ایسی کسی سکیم کو ہرگز قبول نہیں کریں گے جس میں مفصلۂ ذیل امُور کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو:

ا:۔ صوبے کی موجودہ حدود میں ایسا کوئی ردّ و بدل نہ کیا جائے جس سے پنجاب۔ بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو ضعف پہنچنے کا احتمال ہو۔

ب:۔ جداگانہ انتخاب برقرار رکھا جائے۔

ج:۔ مذہبی عبادات و رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے

د:۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

جب ملک برکت علی سے، دورانِ شہادت میں، یہ سوال کیا گیا کہ "کیا لالہ ہرکشن لال اور میاں فضلِ حسین کے تعلقات کشیدہ تھے؟"

تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ قطعاً غلط ہے۔ لالہ ہرکشن لال تین سال تک فضلِ حسین کے شریکِ کار رہے۔ اور اِس عرصے میں انہوں نے ایک بار بھی اُن کی پالیسی سے اختلاف نہیں کیا۔ وزارت قبول کرنے سے پہلے یہ دونوں کانگرس میں اکٹھے کام کرتے تھے"۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی پیدا کی ہوئی قبائلی عصبیت کا زہر پھیل جانے اور مسلمانوں میں شہری دیہاتی کی دیوار کھڑی ہو جانے کے باوجود میاں فضلِ حسین کے پُرانے رفقائے کار اب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اُنہیں اب بھی اعتماد تھا کہ فضلِ حسین سے بہتر آدمی ملنا محال ہے۔ اِس کے علاوہ اُنھیں یقین تھا کہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کا تعلق جن امور سے ہے وہ جاٹوں اور راجپوتوں کے بٹوارے، یا زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ طبقوں کی باہمی رقابت سے کہیں بالاتر ہیں۔ اور اِنہی امور کو اغیار کی دستبرد سے بچانا اُن کا سب سے بڑا قومی فرض تھا۔ پنجاب کے تمام اسلامی اخبار اور اسلامی ادارے فضلِ حسین کی پُشت پر تھے۔ مسلمانوں کی اسی غیر مشروط حمایت کی بنا پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے فضلِ حُسین کو صدارت کا اعزاز بخشا۔

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر (۱۹۲۴ء) جلد ۲ - شمارہ ۳

چھٹا باب

تجاویزِ دہلی

شہری ہندوؤں کی کوشش سے چودھری لال چند کے خلاف جو انتخابی عذرداری دائر کی گئی تھی۔ وہ منظور ہو گئی اور لال چند کو نہ صرف وزارت بلکہ کونسل کی رکنیت سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن یہ واقعہ میاں فضلِ حسین کی پالیسی پر ذرا بھی اثر انداز نہ ہو سکا۔ انہوں نے گورنر سے کہکر نومبر ۱۹۲۴ء میں چودھری چھوٹو رام کو وزارت کے منصب پر فائز کرا دیا۔ چودھری چھوٹو رام ضلع رہتک کے ہندو جاٹ تھے اور رہتک ہی میں ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ وکیل بننے سے پہلے وہ پبلک پراسیکیوٹر کی اسامی کے لئے کوشاں تھے۔ چودھری چھوٹو رام شہری دیہاتی تفریق کے بہت بڑے حامی ہونے کے علاوہ بڑے صاف گو آدمی تھے۔ اُن کی صاف گوئی اعضاء ذرا تلخ کلامی بلکہ دشنام طرازی کی حد تک بھی پہنچ جاتی تھی۔

جون ۱۹۲۴ء میں سر ایڈورڈ میکلگن اپنی میعاد پوری کر کے چلے گئے تو ان کی جگہ پنجاب کے نئے گورنر سر میلکم ہیلی تشریف لائے۔ میلکم ہیلی اپنے پیشرو سے

مختلف آدمی تھے۔ وہ بڑے ٹھسّے اور رعب داب کے حاکم تھے۔ اور دب کر رہنا نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے ابتدا میں میاں فضلِ حسین سے تعرض نہیں کیا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد انہوں نے فضلِ حسین کو پنجاب کا ریونیو ممبر بنا دیا اور جب جنوری ۱۹۲۷ء میں نئی کونسل مرتب ہوئی۔ تو وزارت کی ترتیب میں رد و بدل کر کے مسلمانوں میں سے ملک فیروز خاں نون۔ ہندوؤں میں سے مسٹر منوہر لال اور سکھوں میں سے سردار جوگندر سنگھ کو لے لیا۔ منوہر لال شہری ہندوؤں کے نمائندے تھے۔ جوگندر سنگھ سکھوں کی نمائندگی کے دعویدار تھے لیکن بظاہر کونسل کے سکھ ممبروں کی اکثریت اُن کی پشت پر نہیں تھی۔ فیروز خاں نون کو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان عنصر کے نمائندے کی حیثیت سے لیا گیا تھا۔ وزارت کی تشکیل کرتے وقت میلکم ہیلی کی پالیسی کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ یعنی "سرکاری بلاک" اُن کے ہاتھ میں رہے۔ چنانچہ وہ جب اور جہاں چاہتے اِس بلاک کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے۔ اب یونینسٹ پارٹی کی قیادت چودھری چھوٹو رام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ چھوٹو رام کو وزارت سے محروم ہو جانے کا یقیناً رنج تھا اور وہ اِس محرومی کی وجہ سراسر یہ سمجھتے تھے کہ گورنر نے شہری ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر۔ وزارت کا منصب اُن سے چھین کر ایک شہری ہندو کے حوالے کر دیا ہے۔

میلکم ہیلی کے اِس فعل کو خواہ مخالفانہ رنگ میں دیکھا جائے یا اُس پر ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے۔ ایک بات بہر صورت واضح ہو جاتی ہے

وہ یہ کہ ۱۹۲۱ء کی اصلاحات کے تحت صوبائی وزارت کابینہ کے اصولوں پر ترتیب نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ وزیروں کا تقرر سراسر گورنر کے ایما اور مصلحت سے ہوتا تھا۔ میلکم ہیلی نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ پنجاب کے ہندوؤں کا طاقت ور، دولت مند، ذی اثر اور بلند آہنگ عنصر چھوٹو رام کو اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس بنا پر انہوں نے ہندوؤں کے شہری طبقے کے ایک شخص کو وزارت بخش دی۔ اگر اس طریق کار کو تسلیم کرلیا جائے کہ وزارتوں کی ترتیب و تشکیل فرقہ وارانہ اصول پر ہوتی تھی۔ تو میلکم ہیلی کا طرزِ عمل قابلِ اعتراض نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہندو اور مسلمان ممبر جداگانہ نیابت کے تحت منتخب ہوکر کونسل میں آئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کی اکثریت کو، آئینی نہ سہی، اخلاقی، حق حاصل تھا کہ وہ ایسے شخص کو وزارت کے منصب پر متمکن نہ ہونے دے۔ جو اُس کے سیاسی عقائد کی ترجمانی نہیں کرسکتا تھا۔

ریونیو ممبر بن جانے کے بعد اگرچہ میاں فضلِ حق کا یونینسٹ پارٹی سے کوئی آئینی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ اِس جماعت کی فلاح و بہبود اور اُس کے مستقبل سے کبھی غافل نہ ہوئے تھے۔ باضابطہ نہ سہی بے ضابطہ اُن سے پارٹی کے ہر کام میں مشورہ لیا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ چودہری چھوٹو رام اور ملک فیروز خاں نون ملکر بھی اُس خلا کو پورا نہ کرسکتے تھے۔ جو فضلِ حسین کے نکل جانے سے پیدا ہوگیا تھا۔ چودہری شہاب الدین کونسل کے صدر بن چکے تھے۔ لیکن اُن کے اور فیروز خاں نون کے تعلقات کشیدہ تھے۔ چودہری صاحب خود وزارت کے خواہاں تھے لیکن فضلِ حسین کی

کوشش سے یہ اعزاز فیروز خاں لون کے حصے میں آگیا تھا۔ چودھری چھوٹو رام جس یونینسٹ پارٹی کی قیادت کا دعوےٰ کرتے تھے۔ اُس کے بچانوے فیصد ممبر مسلمان تھے۔ چھوٹو رام کو اپنی اِس بنیادی کمزوری بلکہ مضحکہ انگیز حیثیت کا بخوبی احساس تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتے تھے۔ اِس دُکھ کا مداوا خود اُن کے بس میں بھی نہیں تھا۔ راجہ نریندر ناتھ کی ہندو پارٹی جو اب نیشنل پروگریسو پارٹی کے بلند بانگ نام سے پکاری جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چودھری چھوٹو رام کے ہندو رفقاء ایک ایک کر کے یونینسٹ پارٹی سے کٹ کر نیشنل پروگریسو پارٹی میں شریک ہونا شروع ہوئے۔ چھوٹو رام شہری اور دیہاتی تفریق کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اِس لئے وہ اپنی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے صرف ایک تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ یعنی موقع ہو یا نہ ہو۔ وہ بے دریغ شہری طبقے پر برسنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے غم و غصّہ کا اوّلین ہدف شہری ہندوؤں کا وہ طبقہ تھا جس نے اُن کو وزارت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی آتش بیانی پر اُترتے تو ہندو مسلمان کی کوئی تمیز رَوا نہ رکھتے۔ اور پنجاب کی ساری شہری آبادی کو ایک لاٹھی سے ہانکتے چلے جاتے تھے۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے چودھری چھوٹو رام نے فرمایا:

"...... اِس ایوان کے شہری ممبر آئے دن میری سرگرمیوں اور میرے سیاسی عقائد کا تمسخر اُڑاتے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ طرزِ عمل مجھے

تاریخ ہند کے ایک مشہور واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ وہ واقعہ نادر شاہ کا حملہ ہے۔ جو ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پہ ہوا تھا۔ نادر ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر کے۔ پنجاب کے میدانوں کو روندکر۔ آندھی کی طرح مغلیہ حکومت کے دارالسلطنت دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا محمد شاہ کو اس حادثہ کی اطلاعیں برابر پہنچ رہی تھیں۔ لیکن اس عیش پرست شہنشاہ نے اس سارے واقعہ کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ نادر کرنال پہونچ گیا۔ جہاں سے اُس نے بادشاہِ دہلی کو آخری خط لکھ... در چند شرائط پیش کیں جن کو اگر قبول کر لیا جاتا تو کسی قسم کی خونریزی نہ ہونے پاتی لیکن محمد شاہ نے اس خط کو بھی ایک مذاق یا لطیفہ تصوّر کیا۔ اور عالم سرخوشی میں کاغذ کے اُس ٹکڑے کو یہ کہہ کر شراب کے پیالہ میں پھینک دیا کہ : ع

این دفتر بے معنیٰ غرقِ مئے ناب اولےٰ

میں اپنے حریفوں، مخالفوں اور معترضوں سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ اُن ہولناک نتائج پر ضرور غور کریں جو محمّد شاہ کے مضحکہ خیز طرزِ عمل سے پیدا ہوئے تھے۔ دیہاتیوں کے جائز مطالبات کا تمسخر اُڑا کر میرے مخالفین بھی وہی خطرہ مُول لے رہے ہیں۔ جو محمّد شاہ پر ایک عذاب بنکر نازل ہوا تھا۔ دو ہی دن کے اندر محمّد شاہ کے ہوش و حواس درست ہو گئے تھے۔ اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ نہ تو نادر شاہ کی

یلغار کوئی ہنسی مذاق تھی۔ اور نہ اُن کا تہدیدآمیز خط ہی کوئی لطیفہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس ایوان کے شہری ممبر جو دولت اور دولت سے پیدا ہونے والے پندار کے نشے سے بدمست ہیں (ایک آواز: تمام شہری بدمست نہیں ہیں) آپ کی اِس اصلاح کا شکریہ! اِن بنچوں پر بیٹھنے والے (بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے) لوگ جو زیادہ تر شہری مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جنھیں اپنی دولت کا بڑا گھمنڈ ہے۔ اور جو اپنی اعلیٰ تنظیم و تعلیم کے نشے میں سرشار ہیں دیہاتیوں اور زمینداروں کے مطالبات کو ایک مذاق سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ممکن ہے کچھ مدت کے لئے وہ اپنی اس خیالی دنیا میں غافل و بےہوش رہیں۔ لیکن وہ گھڑی آنے والی ہے جب دیہاتیوں اور زمینداروں کی تحریک پوری قوت سے اُٹھے گی۔ اور اپنی یلغار میں اِن لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گی۔ قبل اِس کے کہ وہ گھڑی آئے۔ میں اِن لوگوں کو اُن کے انجام پر متنبّہ کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

کونسل کے وہ دو چار مسلمان ممبر جو شہری حلقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ سب کچھ سنتے اور دیکھتے تھے۔ لیکن قوم کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ اُنھیں یہی اندیشہ تھا۔ کہ اگر انہوں نے بھی زبان کھولی۔ تو مسلمانوں میں خانہ جنگی کی ایک نئی بنیاد کھڑی ہو جائے گی۔ چودھری چھوٹو رام نے جب پے در پے اپنی آتش بیانی کے جوہر دکھانا شروع کئے۔ اور دائیں بائیں لڑ

آگے پیچھے سے صوبے کی شہری آبادی کو اپنی دشنام طرازی کی لپیٹ میں لے لیا۔ تو شیخ دین محمد[1] نے مجبور ہو کر اپنی ایک تقریر میں کونسل کے مسلمان شہری نمائندوں کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"..... ہماری بدقسمتی ہے کہ اس ایوان میں ہر موضوع پر بحث کرتے ہوئے شہری اور دیہاتی کی تمیز پیدا کر دی جاتی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں ہرگز کوئی تامل یا تکلف نہیں کہ شہریوں کے اور دیہاتیوں کے باہمی مفاد میں قطعاً کسی قسم کا تصادم یا عناد نہیں ہے۔ رنگ ہائے تحسین اگر بعض خود غرض لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ آبادی کے یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے جدا جدا اور الگ الگ ہیں۔ تو میں اس خیال کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا کرنے والے لوگ جو چاہیں سمجھیں۔ اور جو نقطۂ نگاہ چاہیں پسند کریں۔ انہیں اس بات کا اختیار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آبادی کے یہ دونوں طبقے ایک ہی قسم کے قوانین کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دونوں پر ایک ہی قسم کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ اور دونوں ایک ہی قسم کی مجبوریوں اور مصیبتوں سے پریشان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تہذیب جدید کے جملہ فوائد سے

---

[1] شیخ دین محمد اس زمانہ میں گوجرانوالہ میں پریکٹس کرتے تھے۔ بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں باؤنڈری کمیشن کے ممبر بھی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ کے گورنر ہوئے تھے۔ بعد میں معاملات کشمیر میں حکومت پاکستان کے مشیر ہو گئے تھے۔

شہری باشندوں نے نسبتاً جلد متمتع ہونا شروع کر دیا تھا اور یہ فوائد دیہاتی آبادی تک دیر میں پہونچے ہیں۔

"جناب والا! اِس ایوان کے اُن تمام ممبروں نے جو شہری حلقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کم از کم اُن شہری ممبروں نے جو ایوان کی اِس سمت بیٹھتے ہیں قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک دیہاتیوں کے مفاد کی پوری نگہداشت نہ ہو جائے گی۔ وہ اپنے ذاتی مفاد و آرام کو ترک کئے رکھیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ دیہاتیوں کی ترقی ہیں ہماری ترقی کا راز مضمر ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب تک دیہاتیوں کے مصائب رفع نہیں ہوں گے۔ ملک کو نجات نہیں ہو سکتی۔"

شیخ دین محمد غیر زراعت پیشہ تھے۔ شہری حلقے سے منتخب ہو کر آئے تھے اور یونینسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ جو کچھ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا، اُس کے ایک ایک لفظ سے پنجاب کے مسلمان تعلیم یافتہ شہری آبادی کو اتفاق تھا۔ لیکن اِس کے باوجود پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق شدت سے زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اِس تفریق کا سب سے بُرا اثر اُن شہری مسلمانوں پر پڑا۔ جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد محض اِس لئے مارے مارے پھرتے تھے کہ اُن کا خاندان قانون انتقالِ اراضی کے تحت زراعت پیشہ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ اور نہ اُن کی پُشت پر کسی بڑے زمیندار کی سفارش تھی۔ جب ملازمتوں کے بٹوارے میں بھی جاٹ، راجپوت، اعوان اور گکھڑ کی تمیز روا رکھی جانے لگی۔ اور روز روز سے آئے دن اِس موضوع پر جواب طلب کئے جانے لگے۔ تو اِس بدلے ہوئے ماحول میں محض اوّل درجہ کی تعلیمی سند کو

کامیابی کا پروانہ سمجھ لینا حماقت تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں سردار جوگندر سنگھ نے اپنے محکمے کے جو اعداد و شمار پیش کئے اُن میں ملازمتوں کا تناسب یہ تھا:-

پراونشل ایگریکلچرل سروس میں کُل چودہ مسلمان تھے۔ جن میں سے تیرہ زراعت پیشہ دیہاتی اور ایک غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھا۔

ایگریکلچرل اسسٹنٹ کی چونسٹھ اسامیاں مسلمانوں کے پاس تھیں جن میں سے ترسٹھ زراعت پیشہ دیہاتی اور ایک غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھا۔

پراونشل ویٹرنیری سروس میں کل دس مسلمان تھے۔ جن میں سے آٹھ زراعت پیشہ دیہاتی اور دو غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھے۔

اس کے برعکس انہی ملازمتوں میں ہندوؤں کا تناسب حسب ذیل تھا:

پراونشل ایگریکلچرل سروس میں کل گیارہ ہندو تھے۔ جن میں سے چار زراعت پیشہ دیہاتی اور سات غیر زراعت پیشہ شہری ہندو تھے۔

ایگریکلچرل اسسٹنٹ کی چھپّن اسامیاں ہندوؤں کے پاس تھیں جن میں سے انیس زراعت پیشہ دیہاتی اور سینتیس غیر زراعت پیشہ شہری ہندو تھے۔

پراونشل ویٹرنیری سروس میں کل پانچ اسامیاں ہندوؤں کے پاس تھیں اور یہ پانچوں غیر زراعت پیشہ شہری ہندو تھے۔

تجارت۔ صنعت و حرفت اور کاروبار میں شہری مسلمانوں کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ تمام پیشے کلیتہً ہندوؤں کے قبضے میں تھے۔ بیمہ کمپنیوں، بنکوں

اور درآمد و برآمد کے اداروں میں مسلمان ڈھونڈے سے نظر نہیں آتا تھا۔ کاشتکاری اور زمینداری کے دروازے بھی شہری مسلمانوں پر بند ہو چکے تھے۔ ان حالات نامساعد میں لے دے کے صرف سرکاری ملازمت رہ گئی تھی جس سے شہروں کے تعلیم یافتہ مسلمان روٹی کما سکتے تھے۔ لیکن یہاں یونینسٹ پارٹی نے اُن کے راستے میں ایک سنگین دیوار کھڑی کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ شہری مسلمانوں میں بے کاری بڑھنے لگی۔ اور روز افزوں بے کاری کے ساتھ اضطراب۔ انتشار اور پریشانی میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا۔

عین اُس وقت جب پنجاب میں شہری اور دیہاتی کی تفریق آہستہ آہستہ اپنے نقطۂ عروج کی طرف جا رہی تھی۔ ہندوستان کی سیاسیات میں ایک ایسا انقلاب آ رہا تھا۔ جس نے پنجاب کے مسلمانوں کو بالواسطہ متاثر کرنا شروع کیا۔ فضل حسین اور جناح کے تعلقات میں اب تک کوئی کشیدگی نہیں تھی۔ دونوں کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء میں میثاقِ لکھنؤ مرتب ہوا تھا۔ دونوں نے ترکِ موالات کی تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ دونوں آئینی جدّوجہد کے قائل اور آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتے تھے۔ لیکن اب حالات نے ایک ایسی صورت اختیار کرنا شروع کی۔ جس سے فضل حسین اور جناح کے تعلقات کشیدہ ہوئے۔ فضل حسین نے آل انڈیا مسلم لیگ سے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا پروانہ چھین لینے کی پوری کوشش کی۔ اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ فضل حسین کے حیرت انگیز اثر و رسوخ نے جناح کو بے دست و پا بنا کر رکھ دیا۔ اور آخر اس یاس و حرماں اور شکست خوردگی کے احساس ہی نے انھیں وطن ترک کرنے

اور انگلستان میں مستقل اقامت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فضلِ حسین اور جناح کی یہ کشیدگی آخر وقت تک قائم رہی۔ اور اسی کشیدگی کی وجہ سے فضلِ حسین نے ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں جناح اور مسلم لیگ کے پاؤں نہ جمنے دیئے۔ اس تمام عرصے میں فضلِ حسین نے سیاسیات کے ایک بہت بڑے ماہر اور چابکدست شاطر کی طرح پسِ پردہ رہ کر جو کھیل کھیلا۔ اس کو دیکھ کر ان کے حریفوں کو بھی اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ یہ شخص اپنے فن میں یگانۂ روزگار ہے۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں کانگرس کے اجلاس گوہاٹی کے صدر سری نواس آئنگر تھے آئنگر مدراس کے ایک مشہور قانون دان اور مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات سخت خراب ہو چکے تھے اور آئے دن فرقہ وارانہ فساد برپا ہو رہے تھے۔ سری نواس آئنگر چونکہ بڑے دردمند اور نیک نیت آدمی تھے۔ اس لئے انھیں اس صورتِ حال سے سخت رنج پہونچ رہا تھا۔ انہوں نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے پے در پے درخواست کی کہ آپس میں صلح وصفائی سے رہنا چاہیئے سری نواس آئنگر اور مسٹر جناح کے تعلقات آپس میں بہت دوستانہ اور خوشگوار تھے۔ دونوں مرکزی اسمبلی میں پوری یگانگت اور اتفاق سے کام کرتے تھے ۱۹۲۷ء کے اجلاسِ بجٹ کے دوران میں جناح اور آئنگر غیر رسمی طور پر ایک دوسرے سے ملتے اور ملک کے سیاسی حالات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ دونوں اس بات کے دل سے خواہاں تھے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا کوئی مستقل اور پائدار حل تلاش کرنا چاہیئے تاکہ یہ ہر روز کا خون خرابہ ختم ہو۔

آخر ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسٹر جناح کی دعوت پر ہندوستان کے تیس سرآوردہ اور مختلف الخیال مسلمان لیڈر دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں جمع ہوئے تاکہ فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل مفاہمت پیدا کرنے کی کوئی تجویز سوچی جائے۔ اس مجمع میں مسٹر جناح کے علاوہ مہاراجہ محمود آباد، سر محمد شفیع صاحبزادہ سر عبدالقیوم۔ مولانا محمد علی۔ ڈاکٹر انصاری۔ سر محمد یعقوب۔ مولوی شفیع داؤدی۔ نواب اسمٰعیل خاں۔ میاں شاہنواز۔ سر عبدالرحیم۔ سردار محمد نواز خاں عبدالمتین چودھری۔ سر عبدالعزیز۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں۔ ڈاکٹر ایل کے حیدر۔ مولوی سید مرتضٰے۔ امام صاحب جامع مسجد دہلی۔ ڈاکٹر سر عبداللہ المامون سہروردی۔ سید آل نبی۔ شاہ محمد زبیر وغیرہ شامل تھے۔ مسٹر جناح کی صدارت میں اس اجتماع نے سری نواس آئنگر کی اُن تجویزوں پر غور کیا۔ جو انھوں نے باضابطہ مسٹر جناح کو ارسال کی تھیں۔ یہ تجویزیں اس نقطہ نگاہ سے مرتب کی گئی تھیں کہ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ میں ترمیم و تنسیخ کر کے ملک میں مخلوط انتخاب جاری کیا جائے۔

کافی غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد یہ قرار پایا کہ اگر (۱) سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کر کے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے (۲) شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجاتِ ہند کی طرح اصلاحات رائج کر دی جائیں (۳) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایوان کی ۱/۳ تعداد سے کم نہ ہو (۴) پنجاب اور بنگال کی مجالسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی اُن کی آبادی کے تناسب سے مقرر کی جائے (۵) مسلمانوں کی اقلیت کے صوبوں میں اُن کا ویٹج

برقرار رکھا جائے۔ تو مسلمان ہندوستان کے مرکز اور تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار ہیں۔

۲۹ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسٹر جناح نے ان تجاویز کی وضاحت کرتے ہوئے۔ ایک اخباری بیان میں فرمایا کہ:

"معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان تجاویز کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ مجالس قانون ساز میں نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب مسلمان جبھی قبول کریں گے کہ پہلے ہندو ہماری یہ شرطیں تسلیم کر لیں۔ کہ سندھ کو احاطہ بمبئی سے علیحدہ کیا جائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ جب ہندو یہ شرطیں منظور کر لیں گے۔ اور ہمارے مطالبات کی تائید کر دیں گے تو مسلمان اپنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو جو ویٹیج حاصل ہے۔ اس کے بدلے میں سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ہندو اقلیتوں کو ویٹیج دیا جائے گا۔ اس ویٹیج کی صحیح تعداد معین کرنے اور باہمی افہام و تفہیم کے لئے ہندو اور مسلمان اپنی الگ الگ کمیٹیاں بنائیں گے۔ پنجاب اور بنگال میں دونوں قوموں کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی مقرر کی جائے گی۔ یعنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ انتخاب مخلوط ہوگا۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی پورے ایوان کی ⅓ تعداد سے کم نہ ہوگی۔ اور یہاں بھی نشستوں

کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب رائج کیا جائے گا۔ ہماری اِس پیشکش کی تمام شِقیں ایک دوسرے سے مُلحق اور لازم و ملزوم ہیں اگر فریقِ ثانی اس پیشکش کو قبول کرتا ہے تو کلی اور مجموعی حیثیت سے قبول کرے۔ اور اگر رد کرتا ہے تو بھی کلی اور مجموعی حیثیت سے رد کرے

"اِس پیشکش کا جو نتائج کے اعتبار سے بڑی دُور رس ہے، سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ جُداگانہ نیابت سے چھٹکارا پانے کا صرف یہی ایک حل ہے کہ دونوں قومیں اپنے حقوق و واجبات میں سے کچھ حصّہ ترک کرنے پر بخوشی رضامند ہو جائیں۔ اور مجھے امّید ہے کہ اِن تجاویز پر رواداری اور فراخ دلی سے غور کیا جائے گا۔ جہاں تک طریقِ انتخاب کا تعلّق ہے۔ وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں۔ انتخاب جداگانہ ہے تو کیا اور مخلوط ہو تو کیا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی قومی ہستی کے تحفّظ و بقا کا پورا یقین ہو جانا چاہیئے۔ اور انھیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر اُن کے حقوق پامال نہیں کرسکے گی۔ اور اِس بات کا بھی یقین ہو جائے کہ ہندوستان میں مکمل ذمّہ دارانہ قومی حکومت قائم ہونے تک کا جو درمیانی وقفہ ہے۔ اُس میں وہ اکثریت کے جور و استبداد سے بالکل محفوظ رہیں گے اِس لئے اِس سارے قضیے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اقلّیتوں کو اُنکے حفظ و بقا کا کیونکر اطمینان دلایا جائے۔ مذکورہ بالا تجاویز مرتب کرنے

وقت یہی نکتہ ہمارے پیش نظر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جونہی یہ بنیادی مسئلہ حسب خاطر طے ہو گیا۔ باقی تفصیلی اور جزوی معاملات آسانی سے طے کر لئے جائیں گے۔

"میرا ارادہ ہے کہ جب ہندو لیڈروں کی طرف سے اِس پیشکش کا جواب موصول ہو گا۔ تو میں بہت جلد ایک مشترکہ اور نمائندہ اجلاس منعقد کروں گا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی کے اراکین۔ خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء کی مجالس عاملہ کے اراکین۔ کونسل آف سٹیٹ اور مرکزی اسمبلی کے مسلمان اراکین شامل ہوں گے۔ اور پھر اِن تمام نمائندہ حضرات کے مشورے سے ایک منتخب کمیٹی بنائی جائے گی۔ جو اِس بارے میں کانگرس، ہندو سبھا اور ملک کی دوسری سیاسی انجمنوں کے نمائندوں سے گفت و شنید کر سکے گی۔ اِس قسم کے مذاکرات کے بعد جو آخری تجاویز مرتب ہوں گی۔ وہ اُس وقت تک نافذ نہیں ہو سکیں گی جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی جملہ نمائندہ انجمنیں اُن پر اپنی اپنی تصدیق و توثیق کی مُہر ثبت نہ کر دیں گی۔ آخر میں مَیں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ملک جن نازک حالات میں سے اِس وقت گزر رہا ہے۔ اُس کے پیش نظر ہمیں مفاہمت و مصالحت میں قطعاً دیر نہیں کرنا چاہیئے۔"

۱۵ رمئی ۱۹۲۷ء کو سری نواس آئنگر کی صدارت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی

کا اجلاس بمبئی میں ہوا جس میں مسٹر جناح کی تجاویز کو من وعن منظور کر لیا گیا اور سارا ہندوستان تہنیت و مبارک باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔ صدر کانگرس سری نواس آئنگر نے اس صورت حال کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا:

"عرصہ دراز کے بعد یہ موقع پیش آیا ہے کہ ہندوستان کے سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں نے پہلی مرتبہ اس دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں حقیقی اور پائدار بنیادوں پر قومی زندگی استوار کی جائے۔ یہ تجاویز جو اب تجاویز دہلی کے نام سے ہمارے ملک کی تاریخ میں مشہور ہو چکی ہیں۔ ہمارے مسلمان احباب کی اسی خواہش کی آئینہ دار ہیں۔ ان تجاویز پر بعض حلقوں میں نظری اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تجاویز اس وقت ہمارے درمیان ایک نہایت محفوظ اور معقول مفاہمت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ جس پر آگے چل کر مستقبل میں مکمل و مستحکم قومیت کی عمارت کھڑی کی جاسکے گی"۔

پنڈت موتی لال نہرو نے کہا: "ملک میں اس وقت جو افسوسناک فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو چکی ہے اُس کو دور کرنے کے لئے ان تجاویز سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں ہے"۔

ڈاکٹر انصاری نے فرمایا: "چند آدمیوں کو چھوڑ کر مسلمان قوم کی تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی عقیدوں کے رہنماؤں نے گذشتہ ماہ میں جناح کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ یقین کیجئے کہ جن لوگوں نے متحد و متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا اُن کے

سامنے ایک سخت کٹھن منزل تھی۔ یہ فیصلہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور آپ کو اِس اَمر کا احساس ہونا چاہئیے کہ اِس منزل تک پہونچنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئیے۔ یہ فیصلہ ہر اعتبار سے انصاف، حُبّ وطن اور عزت و آبرو پر مبنی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اُس سپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو جنرل کانفرنس میں جاری و ساری تھی۔ وہ سپرٹ یہ تھی کہ ملک کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر ہم میں سے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے حقوق و واجبات میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ترک کرنا چاہئیے۔"

سروجنی نائیڈو نے کہا: "کانگرس نے مسٹر جناح کی، جنھیں مسٹر گوکھلے ہندو مسلم اتحاد کا بہترین سفیر کہا کرتے تھے، تجاویز منظور کرکے ثابت کر دیا ہے کہ یہ جماعت ہندوستان کی نمائندگی کا دعوےٰ کرنے میں بجا اور مخلص ہے۔ میں متحدہ قومیت ہند کی طرف سے کانگرسی لیڈروں کی خدمت میں اُن کے اِس کارنامے پر ہدیۂ تشکر و تہنیت پیش کرتی ہوں۔"

مولانا محمد علی نے فرمایا: "دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں مسلمان رہنماؤں کی جو کانفرنس ہوئی تھی۔ اُس میں ہر نوع کا سیاسی عقیدہ رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ جب آخر تک تصفیہ کی کوئی صورت

نظر نہ آئی۔ تو ہم نمازِ مغرب کے لئے اٹھے۔ اور ہم نے بارگاہِ ایزدی میں خلوصِ دل سے دعا کی۔ کہ اس وقت فرقہ دارانہ کشیدگی سے ملک میں جو تاریکی چھا رہی ہے اُس میں ہمیں منزلِ مقصود کا صحیح راستہ دکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبولِ دُعا کی گھڑی تھی۔ کیونکہ نماز کے فوراً بعد جب ہم دوبارہ جمع ہوئے۔ تو مرکزی اسمبلی کے نائب صدر (سر محمد یعقوب) کی تحریک پر مخلوط انتخاب کی تجویز منظور کرلی گئی۔ اور یوں اس قضیئے کا فیصلہ ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں ہمارے اِس نتیجے پر ہمیشہ فخر کریں گی۔"

عین اُس وقت جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں تجاویزِ دہلی پر خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ سر محمد شفیع نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے اِن تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اعلان کیا کہ وہ جداگانہ انتخاب کو کبھی ترک نہیں کریں گے۔ سر محمد شفیع ۲۰ر مارچ کی جناح کانفرنس میں شریک تھے۔ اور اُس وقت اُنہوں نے اِن تجاویز کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ لاہور واپس پہنچے تو میاں فضلِ حسین نے اُن سے صاف کہدیا کہ وہ مخلوط انتخاب پر رضامند نہیں ہیں۔ سر محمد شفیع کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ تجاویزِ دہلی سے رد گردانی کریں۔

انہی دنوں اِس امر کی تحقیقات کے لئے کہ آیا ہندوستان اصلاحات کی دوسری قسط حاصل کرنے کا مستحق ہے یا نہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ایک

کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ جس کے صدر سر جان سائمن تھے۔ اور اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہ کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں میں سے مسٹر جناح۔ سر عبدالرحیم۔ سر علی امام۔ سر محمد یعقوب اور مہاراجہ محمود آباد ایسے لوگوں نے اس کمشن کا مقاطعہ کرنے کی تجویزیں پیش کرنا شروع کیں۔ لیکن ایک اور طبقہ جس کے لیڈر سر محمد شفیع تھے مقاطعہ کا حامی نہیں تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مسٹر جناح اور اُن کے ساتھی تجاویز دہلی کے موید اور سائمن کمشن کے مقاطعہ کے علم بردار تھے۔ اِدھر سر محمد شفیع اور اُن کے ساتھی تجاویز دہلی سے منحرف اور سائمن کمشن سے تعاون کے حامی تھے۔ میاں فضل حسین نے اپنی زبردست شخصیت کا سارا وزن ترازو کے اُس پلڑے میں ڈال دیا۔ جس میں سر محمد شفیع بیٹھے تھے۔ وہ خود تو حکومت پنجاب کے ریونیو ممبر کی حیثیت سے سیاسیات میں کھلم کھلا حصہ لینے سے معذور تھے۔ لیکن اس کل کے تمام پُرزے اُنہی کے اشاروں سے حرکت میں آ رہے تھے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصے نے، جس کے صدر سر محمد شفیع تھے، دسمبر ۱۹۲۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں اپنا جلسہ منعقد کیا۔ اور دوسرے حصے نے، جس کے کرتا دھرتا مسٹر جناح تھے انہی دنوں سر محمد یعقوب کی صدارت میں اپنا اجلاس کلکتہ میں کیا۔ اجلاس کلکتہ میں شرکت کرنے والوں میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ملک برکت علی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر محمد عالم۔

مولانا ابوالکلام آزاد۔ سر عبدالرحیم۔ سر علی امام۔ مہاراجہ محمود آباد۔ مسٹر ایم۔ سی چھاگلا۔ مولوی فضل الحق وغیرہ شامل تھے۔ اجلاس لاہور میں سر محمد شفیع کے علاوہ جن قابلِ ذکر لوگوں نے شرکت کی۔ اُن میں علامہ اقبال۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں اور مولانا حسرت موہانی موجود تھے۔

لاہور کے اجلاس میں تجاویز دہلی کی مخالفت اور سائمن کمشن سے تعاون کی قراردادیں پاس کی گئیں۔ تجاویز دہلی کی حمایت میں ملک برکت علی نے اور سائمن کمشن سے مقاطعہ کی قرارداد مسٹر چھاگلا[1] نے پیش کی۔ تجاویز دہلی کی حمایت میں جب قرارداد پیش ہوئی تو تائید کرنے والوں میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر جناح شامل تھے۔ مسٹر جناح نے تائید کرتے ہوئے فرمایا:

"...... یہ تجاویز بہت سے دماغوں کی مجموعی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ آپ یہ توقع نہ رکھیے کہ ہر شخص کو اس طویل قرارداد کے ایک ایک لفظ یا ایک ایک جملے سے اتفاق ہوگا۔ لیکن جہاں تک اُس روح کا تعلق ہے جو اس قرارداد میں جاری و ساری ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجویز ہندوستان کی دونوں قوموں کے لئے جائز، معقول اور منصفانہ ہے۔ اس ایوان کی اکثریت ہمارے

---

[1] مسٹر محمد علی کریم چھاگلا بیرسٹرایٹ لاء۔ اُس وقت بمبئی صوبہ مسلم لیگ کے سکریٹری تھے آج کل آپ بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔

ساتھ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم ملک کی اکثریت کو بھی اپنے ساتھ شامل کرسکیں گے؟ اگر قوم کی اکثریت بھی ہماری ہم نوا بن جائے۔ تو مجھ سے بڑھ کر اور کسی کو مسرت نہ ہو گی بہرحال یہ امر بھی تصفیہ طلب ہے۔ اور آئندہ ہمارا فرض ہو گا کہ ہم عوام کو اس قرارداد کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کریں۔ اور انھیں اس کی صداقت کا یقین دلاکر اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں تک غرض وغایت اور مفاد کا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کے لئے اس قرارداد سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہو سکتی۔"

جب کلکتہ اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی دو شاخیں علیحدہ علیحدہ آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں، مدراس میں منعقد ہوا اور وہاں بھی تجاویزِ دہلی کی حمایت میں ایک زبردست قرارداد منظور کی گئی۔ اب اگرچہ مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ بایں ہمہ لیگ کا فریقِ غالب، جو اپنے فریقِ مخالف سے زیادہ طاقت ور، ذی اثر اور فعال تھا، کانگرس کا ہم نوا بن چکا تھا۔ تحریکِ موالات اور خلافت کا زور ختم ہو جانے کے باوجود ملک میں ان مسلمان لیڈروں کا وقار ہنوز قائم تھا۔ جنھوں نے ابھی چند سال قبل ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تحریک چلائی تھی۔ اور جنہوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پہلی بار پشاور سے لے کر راس کماری تک کے مسلمانوں کو

ایک ہی قومی نظام کے تحت لا کھڑا کیا تھا۔ سر محمد شفیع جانتے تھے کہ ایسے لوگوں کے سامنے اُن کا چراغ نہیں جل سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی لاہور تشریف لائے۔ اور اُنہوں نے موچی دروازہ کے باہر ایک جلسے میں سر محمد شفیع کو للکار کر کہا۔ کہ اگر وہ سائمن کمشن سے تعاون کے حامی اور تجاویز دہلی کے مخالف ہیں تو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال سے نکل کر یہاں آئیں تاکہ کھلے میدان میں لوگ اُن کے دلائل سُن سکیں۔ تو سر محمد شفیع کو سرفروش محمد علی کی یہ دعوت مبارزت قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

یُوں بھی سالہاسال اور عرصہ دراز سے مسلم لیگ اور مسٹر جناح ایکدوسرے کے ساتھ اس طرح ملحق و پیوست۔ اور آپس میں اس طرح لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ کہ لیگ کو جناح یا جناح کو لیگ سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ سر محمد شفیع اور سر فضل حسین کی کوشش سے اگرچہ لیگ کی ایک شاخ کا اجلاس حبیبیہ ہال میں ہو چکا تھا۔ لیکن عوام کے نزدیک حقیقی مسلم لیگ وہی تھی جس کے سرگروہ مسٹر جناح تھے۔ مسلم لیگ کا ماضی۔ اُس کی پوری تاریخ اور ساری جدّوجہد اُسی مسلم لیگ سے وابستہ تھی جس کی قیادت جناح کے ہاتھ میں تھی۔ یہ حقیقت عوام و خواص کے علاوہ خود ارکانِ حکومت کو بھی معلوم تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جب سائمن کمشن ہندوستان میں وارد ہوا تو شفیع لیگ نے اُس کا خیر مقدم بھی کیا۔ اُس کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات بھی پیش کئے۔ اور اُسے اپنے اشتراک و تعاون کا یقین بھی دلایا۔ لیکن یہ ایک عارضی چیز تھی۔ جو ہوا کے جھونکے کی طرح اِدھر سے اُدھر نکل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ سائمن کمشن کے رخصت ہوتے ہی اس کی سرگرمیوں پر اوس پڑ گئی۔ اور سر محمد شفیع بسمر گوشۂ عافیت میں جا کر بیٹھ گئے۔ سر محمد شفیع اپنی اعتدال پسندی اور عافیت کیشی کے اقتضا سے طبعاً اس قابل نہ تھے کہ مستقل طور پر مسلم لیگ کے حریف بن سکیں۔ جس کی پشت پر جناح۔ محمد علی۔ شوکت علی۔ ظفر علی خاں۔ کچلو۔ تصدق شروانی اور انصاری جیسی شخصیتیں کارفرما تھیں۔ میاں فضل حسین اس راز سے واقف تھے۔ اس لئے جیبیہ ہال کے جلسے کے بعد ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جناح کے اثر کو زائل کرنے کی سب سے بہتر تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ سائمن کمشن کی تحقیقاتی کارروائی ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے نئے جدید اصلاحات کے خاکہ کی ترتیب و تدوین شروع ہونیوالی تھی۔ اور اس کام میں میاں فضل حسین سراسر اپنی رائے اور صوابدید سے مسلمانوں کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے جب تک جناح اور فضل حسین ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ فضل حسین کو نہ لیگ پر اعتماد ہو سکتا تھا۔ اور نہ وہ جناح کے ہاتھ میں مسلمانوں کا ہاتھ دینے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

چند ہی مہینوں کے اندر حالات میں خود بخود ایک ایسا تغیر آنا شروع ہوا جس سے تدریجاً فضل حسین کا کام آسان ہوتا چلا گیا۔ مئی ۱۹۲۷ء میں جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے تجاویز دہلی کی منظوری کا اعلان کیا تھا۔ تو اس کے ساتھ یہ تحریک بھی شروع ہو گئی تھی کہ ہندوستان کا ایک دستور اساسی وضع کرنا چاہیئے۔ تاکہ وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کا منہ بند کیا جا سکے۔ جو آئے دن یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک کا دستور (کانسٹی ٹیوشن) وضع کرنے سے معذور ہیں۔ یہ تحریک سال بھر چلتی رہی۔ آخر ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو کانگرس کی کوشش سے مبئی

میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اور اس کانفرنس نے دستور وضع کرنے کا کام ایک سب کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ جس کے یہ دس ارکان تھے۔ سر علی امام۔ شعیب قریشی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ ایم ایس اینے۔ ایم آر جیکار۔ جی آر پردھان۔ سردار منگل سنگھ۔ سر تیج بہادر سپرو۔ ایم این جوشی اور سبھاش چندر بوس۔ پنڈت موتی لال نہرو اس کمیٹی کے صدر تھے۔

۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں آل پارٹیز کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ جہاں سب کمیٹی نے اپنے وضع کئے ہوئے دستورِ اساسی کی رپورٹ جسے آئندہ نہرو رپورٹ کا نام دیا جانے والا تھا، پیش کی۔ اس رپورٹ میں تجاویز دہلی سے صریحاً انحراف کیا گیا تھا۔ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے مخصوص کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی بجائے بالغوں کو حق رائے دہندگی عطا کر کے، بلا تخصیص، مخلوط انتخاب رائج کر دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مرکز میں بھی مسلمانوں کو ⅓ نشستیں دینے سے انکار کر کے مخلوط انتخاب کی سفارش کر دی گئی تھی۔ مولانا محمد علی اس وقت بغرضِ علاج یورپ گئے ہوئے تھے۔ مسٹر جناح بھی انگلستان میں تشریف فرما تھے البتہ مولانا شوکت علی اجلاس میں موجود تھے۔ انہوں نے ان تجویزوں کی مخالفت کی۔ لیکن کانفرنس نے اس شرط کے ساتھ منظوری عطا کر دی کہ دسمبر میں جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوگا تو ایک کنونشن منعقد کر کے نہرو رپورٹ پر آخری مہرِ تصدیق ثبت کی جائے گی۔

پنجاب میں میاں فضلِ حسین اور سر محمد شفیع نے اس صورتِ حال سے

پورا فائدہ اٹھایا۔ اور یہ پراپاگنڈہ شروع ہوگیا۔ کہ اگر مسلمان مارچ ۱۹۲۷ء میں تجاویز دہلی پیش کر کے اپنے قومی موقف سے روگردانی اختیار نہ کرتے اور کسی شرط پر بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے کی حامی نہ بھرتے۔ تو آج نہرو رپورٹ مرتب کرنے والوں کو مسلمانوں کے قومی مطالبات کے ساتھ یہ استہزا کرنے کی جرأت نہ ہوتی روزنامہ انقلاب کو لاہور سے جاری ہوئے بمشکل ڈیڑھ سال گذرا تھا۔ لیکن اس پراپگنڈے میں انقلاب پیش پیش تھا۔ اور آئندہ نہرو رپورٹ کو ختم کرنے اور مسلمانوں میں جداگانہ حقوق کا شعور پیدا کرنے میں جس شدت، تواتر اور تسلسل سے انقلاب نے زوردار مقالے لکھے۔ اُس کی نظیر ہندوستان کا اور کوئی اردو اخبار پیش نہیں کر سکا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس پھر کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ اور مہاراجہ محمود آباد کو اُس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ مہاراجہ محمود آباد تجاویز دہلی کے موید تھے اور نہرو رپورٹ کے بھی حامی سمجھے جاتے تھے۔ اِس لئے عام قیاس تھا کہ اُنکی صدارت اور مسٹر جناح کی رہنمائی میں لیگ بہرصورت نہرو رپورٹ کو منظور کر لے گی۔ سر محمد شفیع دوبارہ اپنی لیگ کا علیحدہ اجلاس کرنے سے معذور تھے۔ یوں بھی شفیع لیگ کی نمائندہ حیثیت مہر عنایت سے محل نظر بن گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں نہرو رپورٹ پر منظوری کی مہر ثبت کر دی گئی۔ تو اس فیصلے کو رد کرنے کے لئے مسلمان کیا ذرائع اختیار کریں گے۔ یہاں میاں فضل حسین کے زرخیز دماغ نے ایک ایسی تجویز ڈھونڈ نکالی۔ جو آگے چل کر اپنے نتائج کے اعتبار سے اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ اس سے مسلسل کئی

سال تک مسلم لیگ کو سیاسیاتِ ہند میں سے خارج کئے رکھا۔

فضل حسین کی درپردہ اور سر محمد شفیع کی ظاہرا کوشش سے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا خاکہ تیار کیا گیا۔ جس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کی مختلف قومی جماعتوں میں سے کم از کم چھ سو نمائندے مدعو کئے جائیں۔ یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخہائے کلکتہ و لاہور سے بیس بیس نمائندے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلمائے ہند سے بیس بیس نمائندے۔ ہندوستان کے ہر صوبے کے مسلمانوں کے بیس بیس نمائندے۔ مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے تمام غیر سرکاری مسلمان ممبر۔ اور ہندوستان کے ہر صوبے کی مجلس قانون ساز کے تمام غیر سرکاری مسلمان ممبر۔ یہ لوگ جن کی مجموعی تعداد چھ سو کے لگ بھگ ہو گی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری عشرے میں دہلی میں جمع ہو کر پوری بلند آہنگی سے تجاویز دہلی کی تردید اور نہرو رپورٹ کی مخالفت میں آواز بلند کریں۔ اس اجتماع کی صدارت کے لئے آغا خان کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ آغا خان کو خط و کتابت کے ذریعے اس کام پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ تاہم مزید تشفی اور بالمشافہ گفتگو کے لئے سر محمد شفیع خود یورپ تشریف لے گئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہندوستان کی سیاسیات میں آغا خان کا کوئی عمل دخل باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن برطانیہ کے اونچے طبقے میں انھیں جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی اس کا مقابلہ ہندوستان کا بڑے سے بڑا اور نامور سے نامور آدمی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میاں فضل حسین اور سر محمد شفیع اس راز سے واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ آغا خان کی صدارت میں جو آواز بلند کی جائے گی۔ اس کی

بازگشت اور کہیں سے اُٹھے یا نہ اُٹھے۔ لیکن لندن کے وائٹ ہال میں اس کی گونج ضرور سنائی دے گی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کا آخری ہفتہ اپنے نتائج کے اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مسلم لیگ۔ کانگریس اور آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے۔ مسلم لیگ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نہرو رپورٹ کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ آخر ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ ہوا کہ مسٹر جناح کی قیادت میں تیس نمائندے آل پارٹیز کنونشن میں، جہاں نہرو رپورٹ زیر بحث آنے والی تھی، شامل ہوں۔ اور چند ضروری ترمیمیں پیش کریں۔

ان تیس نمائندوں میں مسٹر جناح کے علاوہ مہاراجہ محمود آباد۔ ڈاکٹر کچلو ایم سی چھاگلا۔ ملک برکت علی۔ ڈاکٹر سید محمود۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سید عبداللہ بریلوی۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ سیٹھ یعقوب حسن۔ تصدق احمد خاں شروانی۔ چودھری خلیق الزماں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ مولوی فضل الحق سر عزیز الحق۔ شاہ محمد زبیر۔ مولوی اکرم خاں وغیرہ موجود تھے۔

انہی دنوں آغا خاں کی صدارت میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد دہلی میں ہو رہا تھا۔ اور کانفرنس کے سکرٹری فضل رحمت اللہ نے مسلم لیگ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ لیکن مسلم لیگ نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مسٹر چھاگلا نے لیگ کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک الگ قرارداد پیش کی۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جنرل سکرٹری نے مسلم لیگ کو

اِس مضمون کی دعوت ارسال کی ہے۔ کہ اِس کانفرنس میں لیگ اپنے نمائندے بھیجے۔ افسوس ہے کہ مسلم لیگ اس دعوت کو قبول کرنے سے معذور ہے۔ کیونکہ مسلم لیگ کی یہ پختہ رائے ہے کہ اگر قومی جدّوجہد کے دوران میں سرنازک موقع پر اِس کانفرنس کی قسم کے ہنگامی اور حریف ادارے قائم کرنے کی رسم چل نکلی۔ تو یہ امر مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے لئے سخت نقصان رساں ثابت ہوگا۔ لیگ کی رائے میں تمام محبّ وطن مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اِس وقت مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر یہ فیصلہ کرتے کہ آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کو کیا رَوِیّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ لیگ کی یہ بھی رائے ہے کہ جو آئینی طرزِ عمل مسلم کانفرنس نے اختیار کیا ہے۔ اور جس کا خاکہ کانفرنس کے سکرٹیری نے اپنے دعوت نامے میں درج کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکے گا۔ اور نہ اِس طرزِ عمل سے کانفرنس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔"

مسٹر چھاگلا نے یہ قرارداد پیش کرتے وقت کہا کہ: "اگر ہم نے مسلم کانفرنس میں اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت قبول کر لی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا ہم خود اپنے ہاتھ سے لیگ کی موت کے محضر پر دستخط کر رہے ہیں۔ یہ کانفرنس سراسر مسلم لیگ کے لئے باعثِ توہین ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت نہیں رہی۔"

مسٹر جناح نے اِس قرار داد کی تائید میں ایک پُر جوش تقریر کی اور فرمایا

"اِس کانفرنس کا انعقاد صرف اِس لئے کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ کو کسی نہ کسی طرح پس پشت پھینک دیا جائے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی دعوت کو قبول کرنا، جو اپنے دعوے کی رُو سے خود اپنے خلاف مصروفِ پیکار ہیں؟ ہماری عزت ہمارے وقار اور ہمارے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ میں کانفرنس کے بانیوں کو متنبہ کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اگر کانفرنس نے اس قسم کا کوئی فیصلہ کیا۔ جس کی زد لیگ یا لیگ کے اصولوں پر پڑی۔ تو آل انڈیا مسلم لیگ، جو مسلمانوں کی تنہا نمائندہ جماعت ہے، اُس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔"

۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کنونشن میں مسلمانوں کے تیس نمائندے شریک ہوئے۔ جن کی ترجمانی کے فرائض مسٹر جناح نے ادا کئے۔ کانفرنس کی فضا نہ تو اُمید افزا، یا سازگار نہ تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو ہندو سبھا کے روز افزوں اثر کے نیچے آ کر اپنا وہ طنطنہ ترک کر بیٹھے تھے۔ جو کسی زمانے میں اُن کا شیوہ خاص سمجھا جاتا تھا۔

۱۹۲۶ء کے انتخابات میں پنڈت مدن موہن مولوی اور لالہ لاجپت رائے کے اتحاد نے کانگرس کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اور سوراجیوں کو ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ کانگرس اگرچہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اجلاس مدراس کے موقع پر ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا مطمح نظر قرار دے چکی تھی۔ لیکن نہرو رپورٹ میں مکمل آزادی کو ترک کر کے درجۂ مستعمرات کو اپنا نصب العین

قرار دے دیا گیا تھا۔

مسٹر جناح کنونشن کی اس بدلی ہوئی فضا کو خوب محسوس کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے ملک وملت کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر صرف تین ترمیمیں پیش کرنے پر اکتفا کیا اور فرمایا کہ اگر یہ ترمیمیں منظور کرلی گئیں تو آل انڈیا مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو قبول کرلینے پر آمادہ ہوجائے گی۔ وہ ترمیمیں ایسی ہرگز نہ تھیں جن کے منظور کرلینے سے کنونشن کے بنیادی اصولوں کو نقصان پہونچنے یا ہندوستان کی آئندہ ترقی کے راستے میں کوئی خلل واقع ہوجانیکا اندیشہ تھا

پہلی ترمیم کا مفہوم یہ تھا کہ مرکزی اسمبلی کے انتخاب شدہ ممبروں میں سے ⅓ مسلمان ہوں گے۔ دوسری ترمیم یہ تھی کہ اگر پنجاب اور بنگال میں بالغوں کو حقِ رائے دہندگی عطا نہ ہوسکا۔ تو مخلوط انتخاب رائج کرکے کم از کم دس سال کے لئے مسلمانوں کی نشستیں اُن کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کی جائیں گی۔ اور دس سال کی میعاد گذر جانے کے بعد مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اِس تجویز پر نظرثانی کرسکیں۔ تیسری ترمیم یہ تھی کہ اختیارات باقی مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے جائیں گے۔

یہ ترمیمیں پیش کرتے وقت مسٹر جناح نے جو تقریر کی، وہ دردمندی، مصالحت آمیزی اور حُبِّ وطن کے جذبات سے لبریز تھی۔ انہوں نے کنونشن کو مخاطب کرکے جس خلوص بے پایاں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ یہ شخص ہر قیمت پر ملک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنیکا خواہاں ہے۔ اُس یادگار تقریر کا کچھ حصہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"...... جب ایک قوم آزادی کی جدّ و جہد میں مصروف ہو۔ اور فرزندانِ وطن حصولِ آزادی کے لئے بدیشی حکومت کے خلاف مصروفِ پیکار ہوں۔ تو اُس وقت آپ کو لا محالہ اقلیتوں کا مسئلہ طے کرنا پڑے گا۔ آپ جس نوع کا دستورِ اساسی چاہیں وضع کرلیں۔ جب تک اقلیتیں یہ محسوس نہیں کریں گی۔ کہ اُن کے حقوق محفوظ ہیں۔ اُس وقت تک وہ اُس دستور کی حمایت کرنے میں ہمیشہ تامّل سے کام لیں گی۔ اِس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ضمن میں اقلیتوں کی حفاظت ہی قوم پرستی کی سب سے بڑی آزمائش ہے .... میں اِس وقت ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ اور میری یہ آرزو ہے کہ میں آزادی کی جدّ و جہد میں لو کروڑ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھوں کیا آپ محض اِس خیال سے مطمئن ہو جائیں گے کہ چند مسلمان آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں؟ کیا آپ صرف اس بات سے مطمئن ہو جائیں گے کہ جناح یہ کہتا ہے کہ "میں آپ کے ساتھ ہوں" کیا آپ جناح کی شرکت کے متمنی ہیں یا پوری مسلمان قوم کے اشتراک کے خواہاں ہیں؟ ..... خدارا یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کو دھمکیاں دے رہا ہوں۔ مجھے یہی اندیشہ ہے کہ کہیں میری باتوں کو غلط معنے نہ پہنائے جائیں۔ اگر اقلیتوں کا یہ مسئلہ آپ نے آج حل نہ کیا۔ تو لازماً کل کو حل کرنا پڑے گا۔ ہم ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہمیں مِل جُل کر اسی

ملک میں زندگی بسر کرنا۔ اور یہیں روزمرہ کا کام کاج کرنا ہے۔ اس لئے اگر ہمارے درمیان باہمی اختلافات ہیں بھی۔ تو ان اختلافات کی وجہ سے دشمنی اور عداوت تو مول نہ لیجئے۔ اگر ہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ تو کم از کم اتنا تو کریں۔ کہ دشمنوں کی مانند ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر نہیں۔ بلکہ دوستوں کی طرح آپس میں مصافحہ کر کے جدا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان کی ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کے راستے میں کسی خیالی منطق، کسی فلسفے اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجئے[1]۔"

مسٹر جناح کی اِن دردمندانہ گذارشات کے باوجود کنونشن نے تینوں ترمیمیں منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی بھی کنونشن میں موجود تھے۔ لیکن وہ مسلم لیگ کے نمائندے بن کر نہیں بلکہ کانگرس کے سابق صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے جب درجۂ مستعمرات کے خلاف تقریر کرنا چاہی تو لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مولانا نے تنگ آ کر کہا "اگر یہ غنڈہ گردی جاری رہی تو میں تقریر نہیں کر سکوں گا۔"

حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا۔ "سب سے بڑے غنڈے تو

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر (۱۹۲۸ء) جلد اوّل۔

آپ خود ہیں"۔

مولانا اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کنونشن کو بے نقط سنائیں اور دل کی بھڑاس نکال کر واپس چلے آئے۔

کنونشن نے بڑے دھوم دھڑکے سے نہرو رپورٹ پر منظوری کی مُہر ثبت کردی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ وہ شخص جو مسلم لیگ کی روح رواں، مسلمانوں کی نیابت کا مستحق ترین دعویدار اور کانگرس سے اتحاد و اتفاق برقرار رکھنے کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اُس کی تینوں نہایت بے ضرر ترمیمیں رَدّ کرکے اُسے یقین دِلا دیا گیا کہ کانگرس کو نہ تو اُس کے تعاون کی ضرورت ہے اور نہ کانگرس اس کی دوستی کی خواہاں ہے۔ اب ایک طرف کانگرس نے تکبّر و رعونت سے سرشار ہوکر اُس ارمغانِ اخوت کو ٹھکرا دیا۔ جو جناح نے پیش کیا تھا۔ اور دوسری طرف دہلی میں خود مسلمانوں کے ایک بہت بڑے اجتماع نے جناح کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اِن حالات میں جناح کے لئے گوشۂ عزلت کے سوا اور کیا چارہ تھا۔

مولانا محمد علی کے مزاج میں انتہا پسندی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب وہ مہاتما گاندھی کی طرف جھکے۔ تو اُنہیں پیغمبری کا مرتبہ دینے سے بھی دریغ نہ کیا اور اب وہاں سے برگشتہ خاطر ہوئے۔ تو اُن کے مزاج میں پھر اشتعال پیدا ہوا اور وہ سیدھے دہلی تشریف لے گئے۔ جہاں مسلم کانفرنس کے اجلاس میں دُھواں دھار تقریر کرتے ہوئے انہوں نے جداگانہ انتخاب کی حمایت کی۔ اور فرمایا کہ "فکر مت کرو۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایک مسلمان ہمیشہ تین کا فردوں پر

غالب رہتا ہے"

مسلم کانفرنس کا انعقاد یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں ہوا۔ آغا خاں بہ نفس نفیس اُس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ کانفرنس کے حامیوں کے اندازے کے مطابق تین ہزار کا مجمع تھا۔ جس میں ذیل کے اصحاب نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ سر عبد الکریم غزنوی۔ ڈاکٹر عبد اللہ المامون سہروردی۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ ملک فیروز خاں نُون۔ نواب سر محمد یوسف۔ نواب اسمٰعیل خاں۔ سر محمد شفیع۔ سر رضا علی۔ صاحبزادہ سلطان احمد خاں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شفیع داؤدی۔ سر محمد یعقوب۔ چوہدری ظفر اللہ خاں۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ اور مفتی کفایت اللہ۔ مرکزی اسمبلی۔ کونسل آف سٹیٹ۔ اور یو۔ پی اور پنجاب کی مجالس قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی اکثریت بھی حاضر تھی۔ اس کے علاوہ بنگال۔ بمبئی اور آسام اور صوبجات متوسط کی کونسلوں کے بعض مسلمان ممبر بھی موجود تھے۔

آغا خاں کے خطبۂ صدارت کے بعد اہم ترین چیزدہ طویل قرارداد تھی جسے سر محمد شفیع نے پیش کیا۔ اس قرارداد میں جن امور پر زور دیا گیا تھا۔ وہ یہ تھے اوّل، مسلمان کسی شرط پر اور کسی صورت میں بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ دوم، سندھ کو احاطۂ بمبئی سے الگ کیا جائے۔ سوم، شمال مغربی صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات ہند کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں۔ چہارم، ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز پر

قائم کی جائے۔ پنجم، اختیاراتِ ماتبقی مرکز کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے جائیں ششم، مرکزی اسمبلی میں ⅓ نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں۔

سر محمد شفیع نے یہ قرارداد پیش کرتے وقت مسٹر جناح، آل انڈیا مسلم لیگ اور آل پارٹیز کنونشن پر پے در پے طعن و تشنیع کے نشتر چلائے۔ پہلے انہوں نے مسلم کانفرنس کی ہمہ گیر اور نمائندہ حیثیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"اِس کانفرنس میں ہر خیال اور ہر نقطۂ نگاہ کے آدمی شریک ہیں۔ خلافت کمیٹی کی روحِ رواں علی برادران ہیں۔ جمعیتہ العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ ہیں۔ مولانا شفیع داؤدی ہیں۔ جنہوں نے ایک زمانے میں ترکِ موالات کر رکھا تھا۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی اور صوبجاتی کونسلوں کے ایک سو سے زیادہ ممبر موجود ہیں۔ پھر ان سب سے بالاتر وہ یکتائے زمانہ ہستی ہے جو اِس وقت کرسئی صدارت پر رونق افروز ہے۔ اور جس کا مقابلہ آج دنیائے اسلام میں کوئی اور شخص نہیں کر سکتا۔ یہ نظارہ دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اِس کانفرنس کو مسلمانانِ ہند کی نمائندہ آواز قرار دینے سے انکار کرتا ہے۔ تو یقیناً وہ غلط اور جھوٹ کہتا ہے۔ جو فیصلے آج ہم کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ پوری مسلمان قوم کی ہمنوائی کا وزن شامل ہے۔ اگر کسی شخص نے اِن فیصلوں کو رَد کرنے کی کوشش کی۔ تو پھر جو نتائج برپا ہونگے ہم اپنے آپ کو اُن کا ذمہ دار قرار نہیں دیں گے ...... ہم نے

مسٹر جناح کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ لیکن اُن کا ارشاد ہے کہ کلکتہ پہونچے۔ کیا مسٹر جناح یہ چاہتے ہیں کہ جو حشر اُن کا اور اُنکے ساتھیوں کا وہاں ہوا ہے۔ وہی حشر ہمارا بھی ہوتا؟ یہ پہلا موقع ہے کہ اغیار نے مسلمانوں کے کسی قومی ادارے کے ساتھ ایسا شرمناک سلوک روا رکھا ہے۔ میں اِس واقعہ کو تنہا مسلم لیگ ہی کی توہین نہیں سمجھتا بلکہ اسے پوری مسلمان قوم کی رُسوائی کے مترادف قرار دیتا ہوں۔ ... کنونشن میں مسٹر جناح کے سوا اور کسی کو بولنے تک نہیں دیا گیا۔ خود مسٹر جناح کی تقریر کے دوران شرم شرم کے نعرے لگتے رہے۔ اور اُن کی ہر درخواست کو ہندوؤں نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اگر ہم کنونشن میں شریک ہوتے۔ تو یقیناً ہمارے ساتھ بھی یہی ذلت آمیز سلوک کیا جاتا۔ کلکتہ جانے اور مفت میں رُسوائی مول لینے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم یہاں جمع ہوکر اپنے مطالبات پیش کریں۔ اگر برطانوی حکومت نے ہمارے اِن مطالبات کو منظور کرنے سے اِنکار کر دیا۔ اور ہماری مرضی کے خلاف ہندوستان پر کوئی آئین مسلط کرنے کی کوشش کی۔ تو ہم اُسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔" [1]

۱۹۲۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت انتشار تفرقی اور انتشار کا

---

[1] انڈین اینول رجسٹر ۱۹۲۸ء۔ جلد دوم

زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کا وہ عنصر جو جذباً وفکراً سر محمد شفیع کی رہنمائی قبول کرتا۔ یا سر فضل حسین کے اشاروں پر کام کرنا عار سمجھتا تھا۔ دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک حصّے نے جس میں تصدق احمد خاں شروانی۔ ڈاکٹر کچلو۔ ڈاکٹر محمد عالم چودہری خلیق الزماں۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سیّد عبداللہ بریلوی۔ ڈاکٹر سید محمود وغیرہ شریک تھے۔ نہرو رپورٹ کی حمایت میں غیر مشروط طور پر کانگرس کی شرکت گوارا کرلی۔ دوسرا طبقہ جو نسبتاً اعتدال پسند تھا مثلاً ایم۔ سی چھاگلا ملک برکت علی۔ مہاراجہ محمود آباد۔ سر عزیز الحق۔ مولوی اکرم خاں۔ مولوی فضل الحق وغیرہ۔ یہ لوگ چپکے سے میدان چھوڑ کر گوشہ نشین ہوگئے۔ مسٹر چھاگلا نے جو اُس وقت مسلمانوں کے قوم پرست حلقے میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ کانگرس کے طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا:

"آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کلکتے کے سامنے مسلم لیگ کی نمائندگی اس لئے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیموں کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کرسکیں۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ اِس امر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اِن مطالبات پر فراخ دلی سے غور کرنے کی بجائے، کنونشن نے ہندو سبھا کے زیر اثر آکر اور اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہوکر، بالکل اُلٹی صورت اختیار کرلی۔ مجھے یہ امر ظاہر کردینے میں کوئی تامّل نہیں کہ مسلم لیگ کے اُن نمائندوں کی، جو کنونشن میں شریک تھے۔ اور جنہوں نے مسلمانوں

کے جائز مطالبات پیش کئے تھے، اکثریت نہرو رپورٹ کی حامی تھی اور یہ وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے نہ صرف اپنی ملّت سے جنگ کی۔ بلکہ جو اپنی جماعت (مسلم لیگ) سے محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے جرم میں موردِ عتاب بھی بنے۔ اگر کنونشن لیگ کے ان تیس منتخب نمائندوں کے ساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی ڈیل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ اگر ان تیس نمائندوں کو فرقہ پرست قرار دے کر ان کے ساتھ یہ رویّہ اختیار کیا گیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہندوستان میں ایک بھی قوم پرست مسلمان موجود نہیں ہے۔" [1]

مسٹر جناح نے ہر چند حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور اسی کوشش کے دوران اپنے مشہور چودہ نکات بھی مرتّب کر ڈالے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالات کی باگ ڈور اور حالات کو حسبِ منشا تشکیل کرنے کی قوّت اُنکے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کانگرس نے ایک ایسے نازک موقع پر مسلمان رہنماؤں کو ذلیل کیا۔ جب وہ محبّت و اخوّت کے جذبات سے سرشار ہو کر ہندوؤں سے گلے ملنے کو بالکل تیار تھے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناح کا نفرنس میں تجاویز دہلی مرتّب ہوئیں۔ اور سری نواس آئنگر کے قول کے مطابق "گویا ہندوستان

---

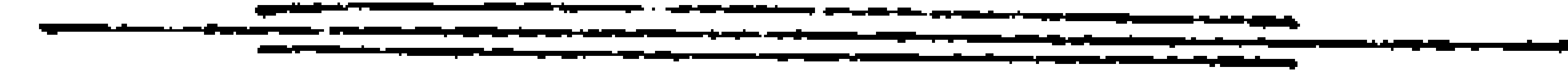
[1] ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کا اخباری بیان۔ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۹ء۔

کے آسمان پر ہندو مسلم اتحاد کا نیا آفتاب طلوع ہوا۔" اِس آفتاب کی پذیرائی میں مدراس کی کانگرس اور کلکتہ کی مسلم لیگ دونوں نے دیدہ و دل فرشِ راہ کئے۔ مسلم لیگ تو آخر وقت تک اِس آفتاب کو خوش آمدید کہتی رہی۔ لیکن موتی لال نہرو کی کوتاہ اندیشی، تنگ نظری اور کج روی نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حتیٰ کہ تجاویزِ دہلی کا وہ سب سے بڑا مداح اور حامی سری نواس آئنگر خود موتی لال کی ضد سے اِس قدر تنگ آیا کہ اُس نے کانگرس کی رکنیت سے مستعفی ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ اور چند سال بعد وہ غریب انتہائی دل شکستگی کے عالم میں اس دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔

موتی لال نے یہ نہ سوچا کہ جس نہرو رپورٹ کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھ کر ایک لفظ بدلنے کو تیار نہ تھے۔ اور جس دستاویز کو وہ گویا دیوتاؤں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مقدس تحریر خیال کر کے تغیر و تبدل سے بالاتر سمجھتے تھے۔ صرف سال بھر کے بعد ایک مردود و متعفن لاش کی مانند دریائے راوی کی لہروں میں بہا دی جانے والی تھی۔ نہرو رپورٹ کو ایک سال سے زیادہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا لیکن یہ بارہ مہینے کا وقفہ اپنے پیچھے منافقتوں، جھگڑوں اور دشنام طرازیوں کی ایک ایسی تلخ یاد چھوڑ گیا۔ جس نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان۔ بلکہ خود مسلمانوں کے اندر عرصہ دراز تک خانہ جنگی کی آگ کو روشن کئے رکھا۔

پنڈت موتی لال نہرو ایک بڑے وطن پرست اور قوم پرور لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے اس پیشِ پا اُفتادہ حقیقت کو نہ

پہچانا کہ مسٹر جناح کو ٹھکرا کر وہ مسلمان قوم کے ساتھ آبرو مندانہ مفاہمت کی
تمام امیدوں کا اپنے ہاتھ سے خون کر رہے ہیں۔ جناح کو رد کر دینے کا مطلب
یہ تھا کہ آئندہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ طے کرنے کے لئے کانگرس کو سر محمد شفیع اور سر
فضلِ حسین سے گفت و شنید کرنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ موتی لال اور شفیع یا
موتی لال اور فضلِ حسین کے درمیان ایک ایسی خوفناک خلیج حائل تھی جسکو
پاٹنا دونوں کے لئے ناممکن تھا، مسلمانوں میں صرف جناح ایک شخص تھا۔ جو
اپنی قوم کو مخلوط انتخاب پر رضامند کر کے ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد
کھڑی کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن جب موتی لال نہرو کی ضد اور
ہٹ دھرمی نے جناح کو گوشۂ عزلت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تو کانگرس کا
دوسرے مسلمان رہنماؤں سے کسی حُسنِ سلوک کی توقع رکھنا محض خیالِ خام تھا
چنانچہ آئندہ فرقہ وارانہ جھگڑوں نے جو شدت نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا
اس کی تمام تر ذمہ داری پنڈت موتی لال نہرو کی اسی روش پر عائد ہونی چاہیئے



ساتواں باب

سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک

اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہو کر دہلی تشریف لے گئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ سیاسی تدوجہد کے اعتبار سے ہندوستان کا بڑا نازک اور پُر خطر دور تھا۔ کانگرس نے اسی زمانہ میں سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کی تحریکیں شروع کیں۔ صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی تنظیم اسی زمانے میں ہوئی۔ پنجاب میں مجلس احرار اسلام کی بنیاد اسی زمانے میں رکھی گئی۔ لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد اسی زمانے میں ہوا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بھی اسی زمانے میں پارلیمنٹ نے منظور کیا۔

سر فضل حسین کے پنجاب سے رخصت ہوتے ہی یونینسٹ پارٹی کی وہ قبائلی عصبیت، جس نے اپنے حفظ و بقا کے لئے شہری دیہاتی کی تفریق کھڑی کی تھی، خود اپنے حربوں کا شکار ہو گئی۔ اس قبائلی عصبیت کی بنیاد محض چند افراد کی جلبِ منفعت کی خواہش تھی۔ فضل حسین کی زوردار شخصیت نے اس

خواہش کو کئی برس تک عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا۔ لیکن جونہی وہ ہمہ گیر شخصیت آنکھوں سے اوجھل ہوئی۔ ذاتی رقابت اور شخصی حرص و آز کے شرمناک مناظر سب کے سامنے آنے لگے۔ چودھری شہاب الدین کی انتہائی خواہش تھی کہ فضل حسین کے جانے کے بعد ریوینیو ممبری کا منصب انہیں ملے اس ضمن میں انھیں اپنے ہم زلف میاں احمد یار خاں دولتانہ کی امداد پر پورا بھروسہ تھا۔ احمد یار خاں دولتانہ کا شمار پنجاب کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ مخلص و وفا شعار دوست تھے۔ اور دوست کی کامیابی پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنا اور شب و روز محنت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ احمد یار خاں دولتانہ سر سکندر حیات خاں کے نہایت عزیز دوست تھے۔ ادھر سر سکندر خود پنجاب کی ریوینیو ممبری کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ چودھری شہاب الدین اور سر سکندر کی اس باہمی کشمکش میں احمد یار خاں دولتانہ نے سر سکندر کا ساتھ دیا۔ اور شہاب الدین کو، کسی نہ کسی طرح، دست بردار ہونے پر رضا مند کر لیا۔ لیکن ناکامی کا یہ داغ چودھری شہاب الدین کے سینہ پر ہمیشہ تازہ رہا۔ اور انہوں نے سر سکندر کو کبھی معاف نہ کیا۔

اگست ۱۹۳۰ء میں جب کونسل کے نئے انتخاب ہوئے۔ تو وزارت کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ چودھری شہاب الدین کی ہر ممکن کوشش تھی کہ ملک فیروز خاں نون دوبارہ وزیر نہ بننے پائیں۔ پہلے انہوں نے کونسل کے مسلمان ممبروں کو اپنے لئے ہموار کرنا چاہا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ انکی

کامیابی کے امکانات چنداں روشن نہیں ۔ تو انہوں نے فوراً چودھری ظفراللہ خاں کو بڑھاوے دے کر آگے کر دیا۔ اب ملک فیروز خاں نون اور چودھری ظفراللہ خاں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ اِس مقابلے میں سر سکندر بھی فیروز خاں نون کے خلاف تھے۔ کم ازکم اُن کی یہ خواہش ضرور تھی کہ زید، بکر، عمرو کوئی وزیر بن جائے۔ لیکن فیروز خاں نون کو دوبارہ وزارت کی کرسی پر بیٹھنا نصیب نہ ہو۔ مصیبت یہ تھی کہ اِس ساری تگ ودو کا حقیقی سبب یہ تھا کہ فیروز خاں نون کی وجہ سے شاہ پور کی ملک برادری کا اثر و رسوخ صُوبے بھر میں پھیل گیا تھا۔ اور اٹک اور ملتان کے زمیندار شاہ پُور کے اِس روزا فزوں اقتدار کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ میاں فضلِ حسین کی ہمدردی ملک فیروز خاں نون کے ساتھ تھی۔ اور اگرچہ اُنکی کوشش سے فیروز خاں نون کو دوبارہ وزارت کا منصب مل گیا۔ لیکن پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں میں سخت پھوٹ پڑ گئی۔ چودھری شہاب الدین سر سکندر حیات خاں۔ ملک فیروز خاں نون۔ چودھری ظفراللہ خاں۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ اِن میں سے ہر شخص اپنی اپنی جنگ میں مصروف تھا۔ اور یُوں وہ ریت کی دیوار، جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا، باہمی رقابت کی باد صرصر کے ایک ہی جھونکے سے ہلنے لگی۔

ہندوؤں میں سے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کو وزیر بنایا گیا جو اپنی ہندو سبھائی ذہنیت کے لئے دور دور تک مشہور تھے۔ سرکاری بلاک سراسر گورنر کے زیرِ اثر تھا۔ شہری مسلمان یوں برگشتہ خاطر تھے کہ

الکیشن کے دوران میں ملک فیروز خاں نون نے شہری مسلمان امیدوار کے مقابلے میں دیہاتی امیدواروں کی مدد کی تھی۔ اِس طرح گویا انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا بڑے سے بڑا رکن بھی اُس زہر آلود عصبیت سے پاک نہیں ہے۔ جس نے شہری مسلمانوں پر ترقی کی تمام راہیں بند کر رکھی تھیں۔ خود یونینسٹ پارٹی کے اندر اس حد تک تفرقہ پھیل گیا تھا۔ کہ کئی بار اِس پارٹی نے رائے شماری کے وقت ملک فیروز خاں نون کے خلاف ووٹ دیا۔ سال بھر کے اندر اندر یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد گھٹتے گھٹتے صرف چونتیس رہ گئی تھی۔ جن میں سے بتیس مسلمان اور صرف دو ہندو تھے۔ اِس طرح اقتصادی بنیادوں پر مخلوط پارٹی بنانے کا جو ڈھونگ کھڑا کیا گیا تھا وہ سر فضل حسین کے دہلی رخصت ہوتے ہی ختم ہو گیا۔

سر سکندر حیات خاں پانچ سال تک پنجاب کے ریونیو ممبر رہے۔ اِس دوران میں انھیں دو مرتبہ قائم مقام گورنر کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ انہیں معلوم تھا کہ سر فضل حسین جب پانچ سال کے بعد حکومت ہند کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر واپس پنجاب آئیں گے۔ تو اِس صوبے کی زمام حکومت ان کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ سر سکندر کو خود اپنا مستقبل بنانے اور اپنی حیثیت مضبوط کرنے کی فکر تھی۔ کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کی ایک معقول تعداد سر سکندر کے ساتھ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میاں احمد یار خاں دولتانہ کی دوستی ہر آڑے وقت میں اُن کی پشت دپناہ بن سکتی تھی۔ ہندوؤں میں راجہ نریندر ناتھ کے ساتھ اُن کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اِن حالات کی

موجودگی اور سر فضل حسین کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر سر سکندر نے اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع کیں۔ پانچ سال تک مسلسل و پیہم میاں فضل حسین کے خلاف یہ پراپگنڈہ جاری رکھا گیا کہ وہ مشرقی پنجاب کے شہری باشندے ہیں۔ دیہاتی نہیں ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے بیرسٹر ہیں۔ زمیندار نہیں ہیں۔ بظاہر انہیں مغربی پنجاب کے زمینداروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ یہ محض زمینداروں کی بے خبری اور سادہ لوحی ہے کہ انہوں نے نو سال تک ایک شہری مسلمان کو اپنا لیڈر بنائے رکھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مغربی پنجاب کے زمیندار بیدار ہوں۔ اور ایک ایسے شخص کو اپنا لیڈر بنائیں جو اُن کا ہم پیشہ ہم وطن ہم مشرب اور ہمدرد ہو۔

سر سکندر نے متواتر پانچ سال تک مغربی پنجاب کے زمینداروں میں یہ خیالات راسخ کرنے کی کوشش کی۔ یوں بھی ریونیو ممبر کی حیثیت سے اُنکا سرکاری اثر و رسوخ مسلّم تھا۔ نواب مظفر خاں کی لاہور میں موجودگی اُن کے لئے بڑی اعانت کا باعث تھی۔ چنانچہ سکندر۔ دولتانہ اور مظفر ان تینوں کی متفقہ کوشش سے میاں فضل حسین کے خلاف شدت سے پراپگنڈہ جاری رکھا گیا۔ یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی تھی کہ شہری دیہاتی کی وہ تفریق جسے میاں فضل حسین نے محض اپنی لیڈری کو برقرار رکھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ خود اُن کے خلاف ایک مؤثر حربے کے طور سے استعمال کی جانے لگی تھی۔ تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو ہتھیار ہم غنیم کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ وہی ہتھیار اُلٹ کر ہمارے خلاف بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ سر فضل حسین کے بارے میں تاریخ

اپنا ہی فیصلہ دُہرا رہی تھی۔ چنانچہ جب پانچ سال کی میعاد ختم کر کے سر سکندر پنجاب سے رخصت ہوئے۔ تو انہیں الوداع کہتے وقت راجہ نریندر ناتھ نے کونسل کے ایوان میں کہا تھا کہ "یہ عارضی جدائی ہے۔ اور دو سال کے بعد آپ پنجاب کے وزیر اعظم بن کر یہاں تشریف لائیں گے۔"

میاں فضل حسین دہلی میں بیٹھے ہوئے سب کچھ سُن رہے تھے۔ پنجاب میں چودھری شہاب الدین۔ ملک فیروز خاں نون اور چودھری چھوٹو رام اُن کے سب سے بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن میاں فضل حسین نے محسوس کر لیا تھا کہ اُن کا مقابلہ ایک ایسے شخص کے ساتھ آپڑا ہے۔ جس نے اندر ہی اندر نہایت ہوشیاری سے اُن کے گھر میں نقب لگا دی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دماغی اور علمی قابلیت کے اعتبار سے سر سکندر میاں فضل حسین سے کمتر تھے۔ لیکن مغربی پنجاب کے زمینداروں میں اُن کی رشتہ داریاں قرابتیں اور خاندانی مراسم اِس قدر وسیع تھے کہ وہ محض اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ایک مضبوط جتھہ کھڑا کر سکتے تھے۔ اِس کے علاوہ سر سکندر ایک زندہ دل۔ محفل آرا۔ متواضع۔ مہمان نواز اور دوست پرور آدمی تھے۔ جب وہ کرتے اور تہمد میں ملبّس اپنے دیہاتی بھائیوں میں انتہائی بے تکلفی سے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ تو اُن کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان کسی غیریت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میاں فضل حسین اِن خصائص سے محروم تھے۔ دائم المرض ہونے کی وجہ سے اُن کے مزاج میں رُکھائی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کم سخن تھے۔ لوگوں سے ملتے جُلتے بھی کم تھے۔ اور زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہ تھے

اُن کا سارا رہن سہن۔ انداز نشست و برخاست اور طرز بود و باند الیا تھا۔ جس میں "دیہاتیت" نام کو نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میاں فضل حسین حکومت ہند سے متعلق ہو کر واپس پنجاب آئے۔ تو یونینسٹ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اور سر سکندر کی قیادت میں اس پارٹی کا ایک طاقتور عنصر فضل حسین کی لیڈری کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی سیاست بھی ایک عجیب و غریب دور سے گذر رہی تھی۔ بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھیوں نے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں بم پھینک کر۔ اور سانڈرس کو گولی کا نشانہ بنا کر۔ اگر ایک طرف حکومت کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ تو دوسری طرف عام تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں میں مرنے مارنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ کانگرس نے اجلاس لاہور کے بعد سول نافرمانی کی قرارداد منظور کر دی تھی۔ ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو جب مہاتما گاندھی سابرمتی آشرم سے پیدل ڈانڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ سمندر کے کنارے پہونچ کر خلاف قانون طریقے سے نمک بنائیں گے گاندھی جی کے اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کے ہر حصے میں کھلم کھلا قانون شکنی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ چند ہی مہینوں کے اندر پورا ہندوستان اس طرح بھڑک اٹھا۔ گویا کسی نے بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھا دی ہے۔ ہندو عورتیں جو اب تک کسی سیاسی تحریک میں شامل نہیں ہوئی تھیں ہزاروں کی تعداد میں گھروں سے نکل آئیں۔ اور بڑے بڑے جلوس مرتب کر کے محلوں اور بازاروں میں گھومنے لگیں۔ طلبہ نے کالجوں کو خیرباد کہہ کر

رضاکاروں کی وردی پہن لی۔ کسانوں اور کاشتکاروں نے مالیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ بدیشی کپڑے اور شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ شروع ہو گیا بعض سرکاری ملازموں نے نوکری کرنے کے بجائے قومی تحریک میں شریک ہونے کو ترجیح دی۔ غرضکہ دیکھتے ہی دیکھتے کانگرس اور حکومت کے درمیان وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ گئی۔ جس میں ہزاروں رضاکار گرفتار ہوئے۔ جگہ جگہ گولی چلی۔ لوگ مرے۔ قیدیوں سے جیل بھر دیئے گئے۔ کہیں ستیہ گرہ کرنے والوں کی جائدادیں بھی ضبط ہوئیں۔ اس ہنگامے میں اگرچہ بہت سے مسلمان بھی شریک تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم سول نافرمانی سے الگ تھلگ رہے بسلسلہ ۱۹۲۱ء کے ترک موالات کی تحریک میں تو مسلمان مقدمۃ الجیش کی طرح آگے آگے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں اُن کی شرکت مختصر و محدود تھی۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ ڈاکٹر کچلو اور وہ گروہ جس نے بعد میں احرار کے نام سے شہرت حاصل کی تھی۔ اس تحریک میں شریک ہو کر قید و بند کا شکار ہوئے۔ لیکن عام مسلمان محض تماشائی کی حیثیت سے اس جنگ کا نظارہ کرتے رہے۔

البتہ صوبہ سرحد میں سول نافرمانی کی تحریک کا بالواسطہ اثر بہت زیادہ ہوا اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد انگریزی عملداری کی ابتدا سے سرزمین بے آئین چلا آ رہا تھا۔ اور وہاں کی آبادی کا تعلیم یافتہ عنصر اپنے آپ کو ہندوستان کے دیگر حصوں کے مقابلہ میں پسماندہ اور فروتر پاکر سخت پریشان رہتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات

پورے ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ لیکن صوبہ سرحد کو محروم رکھا گیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ پورے برِ عظیم میں ہوا۔ لیکن صوبہ سرحد پھر محروم رہا۔ حد یہ ہے کہ پشاور کی میونسپل کمیٹی میں انتخاب کی بجائے حکومت کی خوشنودی سے ممبر نامزد کئے جاتے تھے۔ تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے بھی حکومت نے جان بوجھ کر اس صوبہ کو حددرجہ بدحال اور پسپتی کے عالم میں رکھا ہوا تھا۔ اصلاحِ معاشرت کی بے ضرر سے بے ضرر تحریک کو بھی حکومت جبر و تشدد سے دبا دیتی تھی۔ آخر سنہ ۱۹۲۱ء میں سید قائم شاہ اور عبدالغفار خاں کی کوششوں سے اُتمان زئی میں ایک افغان جرگہ منعقد ہوا۔ جس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے لوگوں میں اصلاحِ معاشرت کی تحریک شروع کی جائے۔ اور انھیں فضول خرچی۔ اسراف۔ مقدمہ بازی اور خانہ جنگی سے باز رکھا جائے۔ جرگے کے تحت خدائی خدمت گاروں کی تنظیم کی گئی۔ جن کا امتیازی نشان سرخ قمیص تھا۔ یہ لوگ ہندوستان بیرونِ ہند کی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان کا مقصد صرف اپنے بھائی بندوں کی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح تھا۔ حکومت نے حددرجہ عاقبت نااندیشی سے اس جماعت کو کچلنا چاہا۔ لیکن حکومت کے اس طرزِ عمل کے جواب میں تحریک روز بروز مقبول ہونے لگی۔ اور رضاکار زیادہ تعداد میں بھرتی ہونے لگے۔

اسی زمانے میں پنجاب میں کانگرس کی سول نافرمانی اپنے عروج پر تھی۔ اور حکومت کو سرگھڑی اندیشہ تھا کہ اگر سول نافرمانی کے جراثیم صوبہ سرحد میں بھی

داخل ہو گئے تو پھر یہاں اِس آگ کو بُجھانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اُس نے خان عبدالغفار خاں۔ میاں احمد شاہ۔ خان علی گل خاں اور سید لال بادشاہ وغیرہ کو گرفتار کر کے تین تین سال کے لئے جیل میں ڈال دیا۔ تحریک کا اخبار پختون ضبط کر لیا گیا۔ اور اُتمان زئی پر چھاپہ مار کر مرکزی دفتر پر قبضہ کر لیا۔ جب حکومت کے اِس جابرانہ سلوک کے خلاف لوگوں نے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں پُرامن مظاہرہ کرنا چاہا۔ تو حکومت نے چھاؤنی سے گورا فوج منگوالی جس نے عین بازار میں ٹینک اور توپیں رکھ کر نہتے آدمیوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ پہلے حملے میں ڈپٹی کمشنر کے حکم سے گولی چلائی گئی۔ جس میں بارہ آدمی مرے۔ جب لوگوں نے اِس کے باوجود منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اور اِس بات پر اصرار کیا کہ شہداء کی لاشیں تجہیز و تکفین کے لئے اُن کے حوالے کی جائیں تو حکومت نے توپوں کے منہ کھول دیئے۔ اور دو سَو کے قریب آدمی شہید ہو گئے۔

عین اُس وقت جب صوبہ سرحد کے باشندوں کے خون سے پشاور کی سرزمین لالہ زار بن رہی تھی۔ ہندوستان بھر میں کوئی اسلامی جماعت۔ کوئی اسلامی انجمن۔ کوئی اسلامی ادارہ ایسا نہیں تھا۔ جو صدائے احتجاج بلند کرتا۔ اور حکومت سے پوچھتا کہ یہ کس جُرم کی پاداش میں مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے مسلم لیگ ختم ہو چکی تھی۔ ابنائے زماں کی ناقدری کے ہاتھوں جناح وطن میں رہنے کے باوجود غریب الوطن کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ محمد علی مرض الموت میں مبتلا اپنی زندگی کا آخری سال پورا کر رہا تھا۔ سر محمد شفیع۔ میاں فضلِ حسین

اور آغا خان کی کوشش سے جو مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی تھی۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں اپنی طویل قرارداد منظور کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کا وہ فعال، گرم جوش اور تہوّر پیشہ عنصر جو کسی صورت میں بھی عافیت کی زندگی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ غیر مشروط طور پر کانگرس میں شریک ہو کر قید و بند کے شدائد برداشت کر رہا تھا۔ حکومت نے صوبہ سرحد میں۔ مارشل لا جاری کر کے۔ اِس صوبے کے چاروں طرف ایک آہنی دیوار کھینچ دی تھی تاکہ توپوں کی گرج اور مرنے والوں کی چیخیں باہر سنائی نہ دے سکیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر پشاور سے لے کر مدراس تک کے مسلمان جاگ اٹھتے۔ اور بیک آواز اپنے بھائیوں کے خون کا قصاص طلب کرتے۔ لیکن وہ قوم جس نے چند سال قبل ترکوں کے مصائب سے بے قرار ہو کر خلافت جیسی ہمہ گیر تحریک چلائی تھی۔ سرحد کے مسلمانوں پر جور و ستم کی بارش دیکھ کر بھی جنبش نہ کر سکی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی بے حسی کا اِس سے دل خراش منظر کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

آخر کار وقت کی نزاکت کا احساس کر کے کانگرس اٹھی۔ اور اس نے وٹھل بھائی پٹیل سابق صدر مرکزی اسمبلی کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ جس نے حکومت کے معاندانہ رویّے کے باوجود پشاور جا کر ان مظالم کی پوری چھان پھٹک کی اور واپس آ کر اپنی مفصّل، جامع اور حقائق کو واشگاف کر دینے والی رپورٹ شائع کی۔

اِس رپورٹ نے حقیقت کے چہرے پر سے نقاب اٹھائی۔ اور لوگوں کو

معلوم ہوا کہ انگریز کس شدت سے پٹھانوں کی بہادر اور شجاع قوم کو مٹا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کانگرس کی اس ہمدردی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرخ پوشوں کی تحریک آگے چل کر کانگرس میں مدغم ہو گئی۔ اور عبدالغفار خاں اور اُن کے رفقاء ۱۹۴۷ء تک کانگرس کے دست و بازو بنے رہے۔ اور ایسا ہونا کچھ تعجب انگیز بھی نہ تھا۔

سوال یہ ہے کہ اِس پُرخطر اور نازک دَور میں ہندوستان کے مسلمان کیا کر رہے تھے۔ اِس کا جواب نہایت آسان ہے۔ مسلم کانفرنس کی باگ ڈور میاں فضلِ حسین کے ہاتھ میں تھی۔ اور اب وہی پس پردہ بیٹھ کر مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کی تشکیل کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر مسلم کانفرنس کے لئے حیدر آباد (دکن) اور آغا خان سے بہت بڑی رقمیں[1] حاصل کیں۔ اور اِس روپے کو نشر و اشاعت پر صرف کیا۔ انگلستان اور ہندوستان میں بعض آدمیوں کو معقول تنخواہ دے کر تحریری پراپاگنڈے پر مامور کیا۔ ہندوستان خصوصاً پنجاب کے چند اردو اور انگریزی اخباروں کے بیش قرار وظائف مقرر کئے۔ اِس کے علاوہ ایک مرکزی بورڈ قائم کر کے نہایت ہوش مندی سے پبلسٹی کا کام شروع کیا گیا۔ بعض لیڈروں کو بھی مالی امداد دی گئی۔ اِس طرح ایک باضابطہ اور مرتب شدہ سکیم کے تحت کانفرنس کی قراردادوں، اُس کے اغراض و مقاصد اور اُس کی سرگرمیوں پر کھلے دل سے روپیہ صرف ہونے لگا۔ ہر چھ مہینے کے بعد ہندوستان کے کسی نہ کسی مقام پر کانفرنس کا ایک

---

[1] سوانح عمری میاں فضلِ حسین (انگریزی) از عظیم حسین ؛

اجلاس بھی منعقد کر دیا جاتا تھا۔

مولانا شوکت علی۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں۔ علامہ اقبال۔ سر محمد یعقوب۔ سیٹھ عبداللہ ہارون۔ سر محمد شفیع۔ نواب اسمٰعیل خاں۔ سر عبدالرحیم وغیرہ کانفرنس کی نمایاں اور ذمہ دار شخصیتیں تھیں۔ کانفرنس کی تمام جزئیات سر فضل حسین کے ایماء اور مشورے سے طے ہوتی تھیں۔ اور جب تک وہ کسی پروگرام کی منظوری نہ دیتے۔ کانفرنس اس کو اختیار نہ کرتی تھی۔ سر فضل حسین کی سیاسی بصیرت کا کمال ہے کہ وہ خود حکومت ہند کے رکن کی حیثیت سے وائسرائے کو بار بار مسلم کانفرنس کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ انہوں نے وائسرائے اور حکومت ہند کے ارکان کو یقین دلا دیا تھا کہ مسلم کانفرنس اسلامیانِ ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے۔ اور اگر آئندہ مسلمانوں کے سیاسی مسائل طے کرنے کی نوبت آئی۔ تو حکومت کو صرف مسلم کانفرنس کے نمائندوں سے گفت و شنید کرنا ہوگی۔

میاں فضل حسین مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ، ہمدرد اور مخلص رہنما تھے۔ ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُن کی تدبیر کی اور ہوشمندی سے انکار نہیں کر سکتا لیکن اُن کا کام کرنے کا انداز جداگانہ تھا۔ انھیں سب سے زیادہ اپنی ذات پہ اعتماد تھا۔ اور یہ خود اعتمادی اس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ وہ کسی اور کی رائے کو حتی الامکان درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ فضل حسین کی اگرچہ ابتدائی سیاسی تربیت کانگرس اور مسلم لیگ کے گہوارہ میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے سنہ ۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کی تحریک میں شامل ہونے کی بجائے وزارت کی

سند قبول کرنے کو ترجیح دی۔ اِس کے بعد جب خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں ناکام ہوئیں۔ اور ردِّ عمل کے طور پر مسلمانوں میں بڑی شدت سے ذہنی اور اقتصادی انتشار پھیلنا شروع ہوا۔ تو میاں فضلِ حسین کو یقین ہو گیا کہ مسلمان کسی قسم کی عوامی تحریک چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس قوم کو اگر تباہی سے بچانا مقصود ہے۔ تو آئندہ اسے ہر نوع کی عوامی تحریک سے محفوظ رکھنا ضروری ہے بسنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک انہوں نے پنجاب میں یہی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ اور مسلمانوں کو ہمیشہ حکومت کے خلاف صف آرا ہونے یا عوامی تحریک چلانے سے روکے رکھا۔ اُن کے اِس سیاسی رویّے کو اگر کسی قدر وضاحت سے بیان کیا جائے۔ تو وہ یہ ہے کہ "عوام کالانعام ہیں۔ اُن کی سیاسی بصیرت ناقص ہے۔ اُن سے کسی سیاسی تحریک میں کام لینا عقلمندی کے خلاف ہے۔ میں مسلمان قوم کی ضروریات سے خوب واقف ہوں۔ اِس لئے مجھ پر اور میری بصیرت پر اعتماد کرو اور تمام کام مجھی پر چھوڑ دو"

اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں جب سر فضلِ حسین دہلی پہنچے تو انہوں نے اپنے انہی قاعدوں کے مطابق کام شروع کر دیا۔ صوبۂ سرحد میں جب انگریز نے بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا۔ تو میاں فضلِ حسین کو سب سے بڑی فکر یہ لاحق ہوئی کہ کہیں اِن خوں چکاں واقعات سے متاثر ہو کر پنجاب کے خلافتی لیڈر مسلمانوں کو منظم کر کے کوئی تحریک شروع نہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً پنجاب کے گورنر سر جیفری ڈی مونٹ مورنسی کو لکھا کہ وہ مسلمانوں میں سے فلاں فلاں شخص کو بلا کر تاکید کریں کہ سرحدی مسلمانوں کی ہمدردی میں

لوگوں کو مشتعل نہ کیا جائے [1]

اسی طرح جب کانگرس کی سول نافرمانی کا اثر دور و نزدیک پھیلنے لگا۔ اور بعض مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی تحریک سے الگ تھلگ رہنا خود اُنکی قوم کے لئے مفید نہیں۔ کیونکہ انگریز اور کانگرس کی اِس جنگ میں مسلمانوں کا محض تماشائی بن کر میلہ دیکھتے رہنے سے قوم میں جُبن اور بزدلی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ تو میاں فضلِ حسین نے فوراً پنجاب میں زمیندارہ لیگیں قائم کرائیں اور اُن لیگوں کے ذریعے سے پنجاب کے دیہات میں کانگرس کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپگنڈہ کیا گیا [2]۔ ہندوستان کے تمام صوبوں کی دیہاتی آبادی سول نافرمانی کی تحریک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل تھی۔ لیکن پنجاب کی دیہاتی آبادی کو چھوئی موئی کے پودے کی مانند اِس طرح محفوظ رکھا گیا تھا کہ اُس پر سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ کا سایہ بھی نہ پڑ سکتا تھا۔ سر مائیکل اوڈوائر کی یہی پالیسی تھی۔ جس پر ایک زمانے میں میاں فضلِ حسین نے شدید نکتہ چینی کی تھی۔ زمانے کی نیرنگی ہے کہ آج وہ خود اُسی پالیسی پر کاربند تھے۔

لیکن اِس پالیسی کا نتیجہ کیا نکلا؟ قوم میں بڑی سُرعت سے جمود۔ بے حسی اور تعطل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ کوئی قوم محض چوٹی کے دو، چار یا پانچ، دس افراد کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ قوم کی اصل زندگی کا راز خود قوم کی زندگی میں مضمر ہے۔ چنانچہ میاں فضلِ حسین ایسے زیرک آدمی سے یہ راز

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۶۷ [2] ایضاً صفحہ ۲۶۷

پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ انہوں نے ۲۹ رجولائی ۱۹۳۱ء کو بڑے اندوہگیں لہجے میں سر محمد یعقوب کو ایک خط میں لکھا:

"......مسلمانوں کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ فکر یہ ہے کہ انہیں یُوں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کی بجائے اپنی اور اپنے ملک کی بہتری کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ بحالاتِ موجودہ وہ محض تماشائی بن کر ہندو سیاست دانوں اور حکومت کی باہمی جنگ کا نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مسلمان لیڈر وقتاً فوقتاً یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو سول نافرمانی کی تحریک سے دور رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ تو محض ایک قسم کا منفی طرزِ عمل ہے وقت کا تقاضا ہے کہ کوئی تعمیری منصوبہ مرتب کیا جائے اور بہتر تنظیم کھڑی کی جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے پروگرام میں یہ چیز بھی شامل ہونی چاہیئے کہ تعمیر و ترقی کی مقامی تحریکوں میں زیادہ قوت پیدا کی جائے۔ ہمیں ان عزائم کو لے کر آگے بڑھنا چاہیئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اس دوڑ میں ہم اپنے ہموطن سے پیچھے رہ جائیں گے"[1]

وہ کون سی تنظیم۔ کون سا منصوبہ۔ اور کون سی مقامی تحریکیں تھیں۔ جن کی طرف میاں فضلِ حسین نے اس مکتوب میں اشارہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم کانفرنس کے سوا اور کوئی تحریک یا تنظیم یا منصوبہ

---

[1] سوانح عمری ص ۲۴۷

میاں فضلِ حسین کے ذہن میں نہیں تھا۔ احرار کی تحریک کو میاں فضلِ حسین نے جس طرح ختم کیا۔ وہ اِس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مسلمانوں میں کسی عوامی تحریک کے وجود کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔

سول نافرمانی میں مسلمانوں کے اُس گروہ نے جو آگے چل کر احرار کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنی استعداد سے بڑھ کر قربانیاں کی تھیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چودہری افضل حق۔ مولوی مظہر علی اظہر۔ مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور اُن کے بیسیوں رفقاء نے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں لیکن مارچ ۱۹۳۱ء میں جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو مہاتما گاندھی کی خواہش تھی کہ پنجاب کے کسی مسلمان کو کانگرس کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) میں لیا جائے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی کہ کسی موزوں آدمی کی سفارش کیجئے۔ مولانا نے مولوی عبدالقادر قصوری سے ذکر کیا۔ اور مولوی عبدالقادر نے جھٹ اپنے دوست ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کر دیا۔ اور یوں ڈاکٹر عالم کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں شامل کر لئے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اُن کے ساتھیوں کو اِس واقعہ سے سخت رنج پہنچا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز چودہری افضل حق کو ملنا چاہئیے تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم کا پنجاب میں قطعی کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ مسلمانوں کا کوئی گروہ اُن کی پُشت پر نہ تھا۔ اور وہ سوائے اپنی ذات کے پنجاب کے کسی قابلِ ذکر ادارے کی نمائندگی کا دعوٰے نہ کر سکتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اُن کے رفقاء نے محسوس کیا کہ کانگرس

نے ان کی قربانیوں کی کوئی قدر نہیں کی اور اُن کی خدمات کو ٹھکرا کر ایک ایسے شخص کو اپنا معتمد بنا لیا ہے۔ جو اعتماد کا اہل نہ تھا۔ اِن خیالات سے متاثر ہو کر اِس پورے گروہ نے کانگرس سے قطع تعلق کر کے اپنی الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ کراچی سے واپس آتے ہی مجلسِ احرارِ اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ اور کانگرس سے اپنا تعلق منقطع کر کے اِس مجلس نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق اور جداگانہ نیابت کا اعلان کر دیا[1]

یہ بڑی مبارک گھڑی تھی کہ مسلمانوں کا سب سے فعال، بلند آہنگ اور ایثار پیشہ عنصر جو اب تک کانگرس سے وابستہ چلا آ رہا تھا۔ اغیار سے کٹ کر دوبارہ اپنوں کے ساتھ آملا تھا۔ اِس واقعہ کو خوش آمدید کہنا اور مجلسِ احرار کے قیام کو فالِ نیک تصوّر کرنا ضروری تھا۔ لیکن میاں فضلِ حسین کو اندیشہ ہوا کہ یہ جماعت مسلمانوں میں کوئی نہ کوئی عوامی تحریک چلائے گی احرار کے تمام لیڈر مسلمانوں کے متوسط یا غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا۔ اُن کا ربط و ضبط۔ اُن کا خطاب و کلام۔ اُن کے تعلقات و مراسم براہِ راست عوام کے ساتھ تھے یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی آواز بلند کی تو اُس کی بازگشت مسلمانوں کے اُس طبقے سے اٹھی۔ جو قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جسے

---

[1] پنڈت جواہر لال نہرو نے افراد و اشخاص کا نام لئے بغیر اس واقعہ کا ذکر اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کیا ہے ص۲۶۹ - طبع ۱۹۳۹ء

نظرانداز کئے بغیر قومی بیداری کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

احرار نے اگست ۱۹۳۱ء میں تحریکِ کشمیر شروع کی۔ کشمیری مسلمانوں کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ اس سے قبل حدودِ ریاست کے اندر اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ لیکن اُس کا اثر محدود تھا۔ اور ریاست کا ڈوگرہ حکمران اس تحریک سے چنداں متأثر و مرعوب نہیں تھا۔ جب احرار نے اس طرف توجہ کی تو پورا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ سیالکوٹ اِس تحریک کا محاذ تھا۔ وہاں سے احراری جتھے جموں کی طرف کُوچ کرتے تھے اور حدودِ ریاست پہ پہنچتے ہی ریاستی حکومت انھیں گرفتار کر لیتی تھی۔ دو مہینے کے اندر اِس تحریک کا یہ عالم تھا کہ سیالکوٹ سے جموں تک پچیس میل کے فاصلے میں گویا کئی بستیاں آباد ہو گئی تھیں۔ جہاں صبح و شام اور دن رات ہزاروں رضاکار کوچ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ پچیس میل کی اِس پوری مسافت میں شروع سے آخر تک جتھوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر یوں ہنستے کھیلتے گرفتار ہونے کے لئے جاتے تھے گویا عید کی نماز پڑھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ اکتوبر کے آخر تک گرفتار ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اور مہاراجہ پر ایک سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ آخر اس نے گڑگڑا کر حکومتِ ہند سے مدد طلب کی۔ اور وائسرائے کو ریاستی معاملات میں مداخلت کرنا پڑی۔ اس طرح گلینسی کمشن کا تقرر ہوا۔ اور دربارِ کشمیر کو طوعاً و کرہاً رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا۔

تحریکِ کشمیر نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی خاکستر میں اب بھی

ایسی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ جو ہوا کے ایک جھونکے سے شعلوں کی طرح لپکنے لگتی ہیں۔ مسلمان جو کانگرس کی سول نافرمانی کے ہنگامے دیکھ دیکھ کر مرعوب ہوئے جا رہے تھے۔ اب مطمئن تھے کہ اُن کے دست و بازو میں بھی اتنی قوت ہے کہ وہ کشمیر کے متکبر و مغرور حکمران کو سرنگوں کر سکتے ہیں۔ اگر میاں فضلِ حسین اُس وقت احرار کی بیخ کنی پہ آمادہ نہ ہو جاتے۔ تو یہ جماعت آئندہ مسلمانوں کے لئے یقیناً بڑی مفید ثابت ہوتی۔ لیکن میاں فضلِ حسین کی سیاست میں احرار کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ احرار کو اِس بات کا فخر تھا کہ اُن کی رسائی عوام تک ہے۔ اور وہ عوام ہی کے سہارے آگے بڑھیں گے۔ میاں فضل حسین سرے سے عوامی تحریکوں کے مخالف تھے۔ وہ صرف اپنی فراست سے بساطِ سیاست کے چند مہروں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر حرکت دے کر بازی جیتنے کے قائل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک کشمیر ختم ہوتے ہی احرار نے اپنی توپوں کا رُخ میاں فضلِ حسین کی طرف پھیر دیا۔ اور جب تک میاں و فضلِ حسین زندہ رہے۔ احرار نے انھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیا۔ قادیانیت کی مخالفت بھی اسی جھگڑے کا ایک شاخسانہ تھی۔

افسوس ہے کہ میاں فضلِ حسین کی قابلِ رشک سیاسی بصیرت اور احرار کی حیرت انگیز قوتِ عمل متحد ہو کر مسلمانوں کی خدمت نہ کر سکی۔ یہ دونوں چیزیں بہت بڑی نعمت تھیں۔ جس طرح بصیرت کے بغیر محض عمل کی قوت اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح عمل کے بغیر محض بصیرت انسان کو مفلوج

کردیتی ہے۔

کانگرس کو یہ دونوں چیزیں میسّر تھیں۔ اِس کے برعکس مسلمانوں کی بہت کم سیاسی تحریکیں ایسی تھیں۔ جن میں اِن دونوں محاسن کا اجتماع ہوا ہو تحریکِ کشمیر کے بعد احرار بعض فروعی اور بے مصرف باتوں میں اُلجھ کر اپنی قوّتِ عمل کو ضائع کرنے لگے۔ قادیانی فتنے کا ڈھونگ بھی صرف میاں فضلِ حسین کی مخالفت کے لئے کھڑا کیا گیا تھا۔ حالانکہ قوم کے بعض بے حد اہم سیاسی امور اور اقتصادی مسائل اُن کی توجہ کے طلب گار تھے۔ احرار نے بار بار مسلم کانفرنس پر حملے کئے۔ میاں فضلِ حسین کو قادیانیت نواز کہہ کہہ کر ہندوستان بھر میں اُن کے خلاف پراپاگنڈہ کیا گیا۔ یہ سب کچھ سراسر محنت اور وقت کا زیاں تھا۔ اگر احرار کے حسبِ منشا، قادیانیت کا استیصال بھی ہو جاتا۔ تو بھی مسلمانوں کے سیاسی مسئلہ کا تشفّی بخش حل ممکن نہ تھا مصیبت یہ تھی کہ احرار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ میاں فضلِ حسین اُن کے راستے میں حائل ہیں۔ اِس لئے اُنہوں نے سب سے پہلے اِس سنگِ گراں کو راہ سے ہٹا دینا ضروری سمجھا۔ ہوش مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ تحریکِ کشمیر سے فارغ ہو کر احرار کوئی سیاسی اور اقتصادی پروگرام مرتب کرتے اور مسلمان عوام کی بے پناہ قوت کو ساتھ لے کر اس پروگرام کی تکمیل کے لئے آگے بڑھتے۔ لیکن انہوں نے زود رنج اور مشتعل ہو کر میاں فضلِ حسین سے جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ کا نتیجہ خود اُن کے لئے اچھا نہ نکلا اور میاں فضلِ حسین کے حربوں نے انہیں ۱۹۳۵ء میں شکست فاش دے کر مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے خارج کر دیا۔

عین اُس وقت جب کانگرس کی سول نافرمانی عروج پر تھی۔ وائسرائے نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کا دستور وضع کرنے کے لئے عنقریب لندن میں ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ جس میں ہندوستان کی تمام قوموں کے نمائندے شریک ہوں گے۔ کانگرس نے وائسرائے کے اِس اعلان کو قطعاً قابلِ اعتنا قرار نہ دیا۔ لیکن ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے اُس طبقے نے جو کانگرس میں شامل نہیں تھا۔ مجوّزہ گول میز کانفرنس کا خیر مقدم کیا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کانفرنس کے ہندوستانی نمائندوں کا انتخاب کس اصول اور کس قاعدے سے ہوگا۔ اِس بارے میں وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندو، مسلمان اور سکھ نمائندوں کا انتخاب خود اپنی مرضی اور صوابدید سے کریں گے۔ لیکن بظاہر اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ہر قابلِ ذکر سیاسی گروہ کو جائز نمائندگی عطا کی جائے۔

میاں فضلِ حسین بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اگر گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے وہ مطالبات تسلیم نہ کئے گئے۔ جن کو مسلم کانفرنس نے مُرتّب کیا تھا۔ تو آئندہ ہندوستان کی دستوری اور آئینی ترقی میں مسلمان اپنی ہمسایہ قوم سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اور اس طرح گذشتہ دس برس کی جدوجہد بالکل رائیگاں جائے گی۔ چنانچہ اُن کی کوشش تھی کہ گول میز کانفرنس میں صرف اُن مسلمانوں کو بھیجا جائے۔ جو مسلم کانفرنس کے ممبر اور میاں فضلِ حسین کی ہدایات کے مطابق کام کرنے کو تیار تھے۔ کانگرس کے

ہم خیال مسلمانوں نے نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کے نام سے اپنا ایک علیحدہ ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور سکرٹری تصدق احمد خاں شروانی تھے۔ اس جماعت میں بعض ایسے لوگ بھی شریک تھے جو کانگرس کے باضابطہ رکن تو نہ تھے۔ لیکن رائے دہندگی بالغاں کی بنا پر مخلوط انتخاب کے شدید حامی تھے۔ مثلاً سر علی امام۔ سید حسن امام۔ مہاراجہ محمود آباد وغیرہ۔ میاں فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر ان لوگوں کو بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع مل گیا۔ تو باہمی اختلاف پیدا ہوگا۔ اور کانفرنس کے بابت ہیں تمام مسلمان اتفاق۔ یگانگت اور یکجہتی سے کام نہیں کر سکیں گے اس طرح مبادا آپس کے تفرقے سے فائدہ اٹھا کر اغیار مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

فضل حسین کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔ اس سے قبل نہرو رپورٹ کے بارے میں کانگرس نے گنتی کے چند مسلمانوں کی آڑ لے کر پوری مسلمان قوم کے احتجاج کو ٹھکرا دیا تھا مہاتما گاندھی ایک طرف مسلمانوں کو کورا چیک پیش کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف یہ بھی کہتے تھے کہ جب تک کانگرسی مسلمان غیر کانگرسی مسلمانوں سے اتفاق رائے نہیں کریں گے وہ مسلمانوں کے جداگانہ مطالبات کو تسلیم کرنے سے معذور رہیں۔

ان حالات میں میاں فضل حسین کی یہ رائے بالکل درست اور صائب تھی کہ گول میز کانفرنس میں جانے والا مسلمان وفد ہم خیال، متحد اور ایک پروگرام کے تحت کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں

نے وائسرائے سے کہہ کر ذیل کے اصحاب کو نامزد کرایا - آغا خاں - مولانا محمد علی -
سر شاہ نواز بھٹو - نواب صاحب چھتاری - راجہ شیر محمد خاں - مولوی فضل الحق
سر عبد الکریم غزنوی - سر غلام حسین ہدایت اللہ - حافظ ہدایت حسین -
مسٹر جناح - سر عبد القیوم - سر سلطان احمد - سر محمد شفیع - ڈاکٹر شفاعت
احمد خاں اور چودھری ظفر اللہ خاں -

اِن افراد میں صرف مسٹر جناح ایک ایسے شخص تھے - جو مسلم کانفرنس
کے ممبر نہ تھے - اور جن کی آزادی فکر سے میاں فضل حسین خائف تھے - اگر
فضل حسین کا بس چلتا تو وہ جناح کو اس وفد سے یقیناً خارج کرا دیتے - لیکن
جناح کی سیاسی عظمت ؛ جس کے سامنے اُن کے بڑے سے بڑے حریف کو بھی
سر خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا - اِس قدر واضح اور نمایاں تھی کہ وائسرائے اُنکو
کسی صورت میں بھی نظر انداز نہ کر سکتے تھے - مسٹر جناح اپنے چودہ نکات مرتب
کر کے عملاً مسلم کانفرنس کے مطالبات کے ہم نوا بن چکے تھے - لیکن اِس کے
باوجود میاں فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ وہ انھیں بوقتِ ضرورت آسانی سے
مرعوب و متاثر نہیں کر سکیں گے - اِس لئے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ
گول میز کانفرنس میں جناح کے اثر کو جس قدر کم کیا جا سکتا ہے کیا جائے
چنانچہ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کو کانفرنس کے لئے نامزد کرنے میں اُن سب کے سامنے سب
سے بڑا مقصد یہ تھا کہ شفاعت احمد مسٹر جناح کو کھری کھری سنا سکیں گے

۱۰ ؍ مئی ۱۹۳۰ء کو یو - پی کے گورنر سر میلکم ہیلی کو ایک خط میں میاں
فضل حسین لکھتے ہیں :

"..... صاف بات یہ ہے کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانفرنس میں صرف جناح تقریریں کرے۔ اور اُسے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر جناح اپنی تقریروں میں ایسے خیالات کا اظہار کرنے لگ جائے۔ جو محض اُس کے ذاتی خیالات ہیں اور جن سے ہندوستانی مسلمان قطعاً متفق نہیں۔ تو پھر کانفرنس میں ایک آدھ ایسا مضبوط اور نڈر آدمی ضرور ہونا چاہیئے۔ جو کھڑا ہو کر جناح کو دُو بدُو جواب دے سکے۔ اور یہ کہہ سکے کہ جناح کے خیالات ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات نہیں ہیں۔ بلا شبہ یہ کام مشکل بھی ہے اور ناگوار بھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اُس نمائندے کی، جس کے خیالات کی تردید منظور ہے، حیثیت بہت بلند ہو۔ مجھے یقین ہے کہ شفاعت احمد ظفر اللہ اس فرض کی بجا آوری سے قطعاً دریغ نہیں کریں گے۔ شفیع کے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اُس نے جناح کی مخالفت میں کچھ کہا تو مبادا اسے ذاتی رقابت پر محمول کیا جائے۔"[1]

سوال یہ ہے کہ جناح کے وہ کون سے ذاتی خیالات تھے۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات سے متضاد تھے۔ اور جن کے اظہار پر فضل حسین انہیں بہرے بٹھا دینا چاہتے تھے۔ صرف یہ کہ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں اس شرط پر

---

[1] سوانح عمری ص ۲۹۱

مخلوط انتخاب قبول کرنے کی حامی سبھری تھی کہ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ حالانکہ جناح کا یہ جرم اس قدر شدید اور ناقابلِ عفو نہ تھا کہ فضلِ حسین اس سے کبھی درگذر نہ کرتے۔

گول میز کانفرنس میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ خود آغا خاں اور سر محمد شفیع فرقہ وارانہ مفاہمت کے لئے مخلوط انتخاب قبول کرنے پر رضامند ہو گئے تھے ۔ سرونیہی نہیں ۔ اس واقعہ کے دو سال بعد خود میاں فضلِ حسین نے ہندوؤں اور سکھوں کو مخلوط انتخاب کی پیشکش کی تھی [1]

گول میز کانفرنس میں مسٹر جناح ایسے حالات میں گھرے ہوئے تھے کہ اپنے اور بیگانے دونوں اُن سے ناخوش تھے ۔ فضلِ حسین نہایت ہوشیاری سے کانفرنس کے تدبیر کو اپنے حسبِ منشاء استعمال کرنے میں مصروف تھے ۔ وہ حکومتِ ہند اور وائسرائے سے پے در پے ایسی یادداشتیں لندن بھجوا رہے تھے ۔ جو اُن کے خیالات کی مؤید اور حامی تھیں ۔ ملک عمر حیات خاں ٹوانہ وزیرِ ہند کی کونسل کے رکن تھے ۔ وہ فضلِ حسین کے ایماء پر وزیرِ ہند کے سامنے برابر انہی خیالات کو پیش کرنے کا فرض ادا کر رہے تھے ۔ جب برطانیہ کے وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے مسلمانوں کے مطالبات سے بے اعتنائی کا اظہار کیا تو فضلِ حسین نے فوراً وائسرائے کے توسل سے وزیرِ ہند کو یہ

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۸۰

شکایت پہونچائی کہ مسلمان نہرو رپورٹ کو رد کر چکے ہیں۔ اور سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ حکومت اب مسلمانوں کی وفاداری کا یہ انعام دے رہی ہے کہ ہم پر وہی آئین مسلّط کیا جا رہا ہے۔ جو ہمیں نہرو رپورٹ نے پیش کیا تھا [1]

دوسری گول میز کانفرنس جو ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی۔ مہاتما گاندھی بھی شریک تھے۔ جب انگلستان میں اُن کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور حکومت بھی اُن سے مرعوب ہوتی نظر آئی۔ تو فضلِ حسین نے شفاعت احمد خاں کو ایک خط میں لکھا:

"...... لندن میں جو گاندھی کی آؤ بھگت ہو رہی ہے اُس کی پرواہ مت کرو۔ اگر کانفرنس کے مسلمان مندوبین نے اپنے پتّے ہوشیاری سے استعمال کئے۔ تو یقین کرو کہ تم دوسری قوموں سے بازی لے جاؤ گے۔ آغا خاں تمہارا لیڈر رہے جسے انگلستان کی معاشرتی زندگی میں بے حد نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہاں کا کوئی باشندہ، انگریز یا ہندوستانی، اِس عظمت میں آغا خاں کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے اگر تم نے متحد ہو کر آغا خاں کی قیادت میں کام کیا تو پھر کوئی نقصان نہ پہونچ سکے گا" [2]

گول میز کانفرنس کی کارروائی دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۵۶ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۲

سارے کھیل میں میاں فضلِ حسین کا ہاتھ پسِ پردہ کام کر رہا تھا۔ اور وہ ایک ایک تفصیل کو اپنے فہم کے مطابق طے کرنے میں مصروف تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فضلِ حسین کی اس پالیسی نے جناح کو بالکل بے دست و پا بنا کر رکھدیا تھا۔ اور وہ کانفرنس میں ایک یکّہ و تنہا شخص کی حیثیت سے موجود تھے جو نہ خود کسی کا لیڈر رہے۔ اور نہ کسی لیڈر کی قیادت میں کام کرنے پر رضامند ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جناح نے لاہور آ کر ایک تقریر کے دوران میں اپنی اس قابلِ رحم حالت کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا تھا :

"میرے دوست پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں گول میز کانفرنس کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں اس کانفرنس میں بالکل یکّہ و تنہا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو ناراض کیا۔ کیونکہ وہ مجھے مخلوط انتخاب کا حامی سمجھتے تھے۔ ہندو مجھ سے الگ ناراض تھے۔ کیونکہ میں چودہ نکات کا موجد تھا۔ میں نے والیانِ ریاست کو بھی ناراض کیا۔ کیونکہ میں اُن کی پسِ پردہ اور خفیہ کارروائیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ اور میں نے اُن کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ بھی مجھ سے ناراض تھی۔ کیونکہ میں نے ابتداء ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ یہ کانفرنس ایک بہت بڑا فریب ہے۔ اور میں کسی شرط پر بھی برطانوی حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہفتے بھی نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ کانفرنس کے مندوبین کے

ہجوم میں میرا ایک بھی حامی اور مددگار نہ رہا"[1]

سر سیموئل ہور (حال لارڈ ٹمپل وُڈ) اُس زمانے میں وزیرِ ہند تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۔۔۔۔ جناح بھی چونکہ ان کے ساتھ (آغا خان اور چودھری ظفر اللہ خاں کے ساتھ) بیٹھتے تھے۔ اس لئے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ

---

[1] فروری ۱۹۳۶ء میں مسجد شہید گنج کا تصفیہ چکانے کے لئے مسٹر جناح لاہور تشریف لائے تھے تو ۲ مارچ کو باشندگانِ لاہور کی طرف سے، جن میں ہندو، مسلمان سکھ، عیسائی بھی شامل تھے۔ مسٹر جناح کو خوش آمدید کہنے کی غرض سے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا جس کے صدر لاہور کے بشپ تھے۔ اس جلسے میں پنڈت نانک چند بیرسٹر ایٹ لائے جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ہندو پارٹی کے لیڈر بھی تھے۔ مسٹر جناح کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "گول میز کانفرنس کے مباحث میں مسٹر جناح نے دوست دشمن کسی کی پروا نہیں کی۔ اور جس رائے کو وہ دیانت و امانت سے صحیح سمجھتے تھے اس پر آخر وقت تک قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں اور بیگانوں دونوں نے انکا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ گویا بے سایہ صحرا بنکر رہ گئے۔ لیکن یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر جناح جس بات کو درست سمجھتے ہیں اس پر چٹان کی طرح جم جاتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی ترغیب و تحریص انہیں اس مقام سے ہٹا نے میں کامیاب نہیں ہو سکتی"۔ پنڈت نانک چند کی اس تقریر کے جواب میں مسٹر جناح نے جو تقریر کی تھی اسکا اقتباس ذیل درج ہے۔ مطبوعہ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء

اپنے وفد کی رہنمائی کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً بحث میں نمایاں حصّہ لیا۔ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اُن کے تغیّر پذیر ذہن کی حرکات سمجھنے سے معذور تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی شخص کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کیا وہ ایک آل انڈیا فیڈریشن کے حامی تھے؟ اس کا تیقّن کے ساتھ جواب دینا ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔ اگرچہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُنہوں نے اُس وقت تقسیم ہند یا قیام پاکستان کی قطعاً کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ کیا وہ مرکز میں ردّ و بدل کئے بغیر صوبائی خود مختاری کے حامی تھے؟ بعض اوقات ان کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صوبائی خود مختاری سے آگے نہیں جانا چاہتے تھے لیکن پھر دوسرے لمحے میں وہ مرکز اور صوبجات دونوں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے لگ جاتے تھے۔ انکی یہی تغیّر پذیر ذہنی کیفیت تھی جو اُن کے ساتھ تعاون کرنے میں ہمارے لئے مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ اور جس کی وجہ سے وہ اپنے مسلمان رفقاء کی اعانت اور صحیح رہنمائی کرنے سے معذور تھے"[۱]

حقیقت یہ ہے کہ لارڈ ٹمپل ووڈ نے اِس ساری کیفیت کا پس منظر سمجھے بغیر اپنی رائے قائم کر دی ہے۔ اصل بات وہی ہے جس کا ذکر جناح نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق اپنے اور بیگانے

---

۱ NINE TROUBLED YEARS, Page 52

دونوں غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں۔ اور کوئی شخص بھی اُس کے خیالات اور عقائد کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ تو غلط تصورات کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں

گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کو جس قدر کامیابی ہوئی۔ اُس کا سہرا میاں فضل حسین کے سر ہے۔ مسلم کانفرنس کے کم و بیش تمام مطالبات منظور کر لئے گئے تھے۔ جداگانہ انتخاب بدستور قائم رہا۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں ویٹج برقرار رکھا گیا۔ صوبۂ سرحد میں مکمل اصلاحات رائج کر دی گئیں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک جداگانہ صوبے کی حیثیت دیدی گئی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت (اگرچہ بہت قلیل) قائم ہو گئی۔ صرف بنگال کے متعلق مسلم کانفرنس کا مطالبہ تسلیم نہ کیا جا سکا۔ وہاں اگرچہ مسلمانوں کی آئینی اکثریت تو قائم نہ ہوئی۔ لیکن یورپین ممبروں کو ویٹج عطا کر کے کانگرس کا زور توڑ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ گورنروں کو اس قسم کی ہدایات جاری کر دی گئی تھیں کہ صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی حصہ ضرور ملنا چاہیئے۔

ان مراعات کے علاوہ میاں فضل حسین کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے آئی۔ سی۔ ایس اور امپیریل سروس کی دوسری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے پچیس فیصد حصہ آئینی طور پر محفوظ کرا دیا۔ ۱۹۳۴ء میں حکومت ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ امپیریل سروس کی ۳۳ فی صد اسامیاں اقلیتوں کے لئے مخصوص کر دی جائیں گی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہیں اس تینتیس فی صد میں سے بمشکل پندرہ فیصد حصہ ملتا تھا۔ اور باقی اسامیاں

مسیحی۔ پارسی اور سکھ لے جاتے تھے۔ حالانکہ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے سبب سے بیشتر اسامیوں کے مستحق مسلمان تھے۔ میاں فضل حسین نے چار سال کی لگاتار کوشش کے بعد ۱۹۳۴ء میں حکومت ہند کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ تینتیس ۳۳ فیصد کے اِس تناسب میں سے پچیس اسامیاں لازماً مسلمانوں کو باقی آٹھ دیگر اقلیتوں کو ملنی چاہئیں۔ اِس کے ساتھ ہی ضمناً یہ بھی تسلیم کرایا کہ اگر ان آٹھ اسامیوں میں سے کسی اسامی کے لیے غیر مسلم اقلیت کا کوئی موزوں امیدوار نہ مل سکا تو وہ اسامی بھی مسلمانوں کے حصّے میں چلی جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ فضل حسین سے پہلے تین مسلمان علی الترتیب وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ سر علی امام۔ سر محمّد شفیع اور سر حبیب اللہ۔ لیکن تدبّر، معاملہ فہمی۔ سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لحاظ سے اِن تینوں میں سے کوئی شخص میاں فضل حسین کے برابر کام نہ کر سکا۔

ایف۔ ڈبلیو۔ ولسن ایک مشہور انگریز اخبار نویس تھے۔ جو پہلے روزنامہ پائنیر (الہ آباد) کے ایڈیٹر تھے۔ پھر انڈین ڈیلی میل کے ایڈیٹر ہو کر بمبئی چلے گئے تھے۔ ولسن کی رسائی وائسرائے سے لے کر ہر چھوٹے بڑے انگریز افسر تک تھی۔ اِس طرح اُنھیں حکومت کے بعض ایسے رازوں کا علم تھا۔ جو عوام تو کیا، خواص کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رہتے تھے۔ ولسن نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا:

"۔۔۔۔ بد قسمتی سے لارڈ اِردن کو اپنی کونسل کے لیے جو ہندوستانی ممبر میسّر آئے وہ بہت ہی معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔ سیاسی

بصیرت سے محروم ہونے کے علاوہ انہیں ہندوستان کی سیاسی ترقی و تبدیلی کا بھی براہِ راست کوئی علم نہ تھا۔ اِن میں سے دو نے تو سائمن کمشن کی تشکیل کے وقت وائسرائے کو صریحاً غلط مشورہ دیکر گمراہ کیا تھا۔ البتہ لارڈ اِروِن کی حکومت کے آخری دَور میں سرفضل حسین نے، جو بلاشبہ ہندوستان کے قابل ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وائسرائے کی کونسل کو اپنی شرکت کا اعزاز بخشا۔ فضل حسین کا رویہ عام ملکی اصلاحات کے بارے میں ہمدردانہ نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وائسرائے کی کونسل میں اُن کی موجودگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفّظ کیا جائے۔ اس کام کے لئے وہ اصلاحات کے نفاذ کو بھی اُس وقت تک ملتوی رکھنے کو تیار ہیں۔ جب تک مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک پونڈ سے بھی زیادہ گوشت کا مطالبہ کرنے کے قابل نہ ہوسکیں۔ ہندوستان میں یہ بات پایۂ یقین تک پہونچ چکی ہے کہ سرفضل حسین اور ہندوستان کی سول سروس کے درمیان ایک واضح مفاہمت قائم ہے۔ جس کا مدّعا یہ ہے کہ سرفضل حسین سول سروس کی بُرے وقت میں مدد کریں۔ اور اُس کے معاوضے میں سول سروس والے مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کریں گے .... لندن کی گول میز کانفرنس میں غیر کانگرسی مسلمانوں نے جس یکجہتی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا۔ اور جس ہوشمندی اور تدبر سے اپنے مطالبات تسلیم کرالے

اسے دیکھ کر ان لوگوں کو، جن کی باگ ڈور براہِ راست فضل حسین کے ہاتھ میں تھی اپنے اختیار مبارکباد کہنے کو جی چاہتا ہے۔ فضل حسین کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان میں اُس وقت تک نئی اصلاحات رائج نہیں ہو سکیں گی۔ جب تک وہ مسلمانوں کو اس قدر مضبوط و منظم نہ کر دیں کہ وہ اپنی شرائط منوانے کے قابل ہو سکیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ سر فضل حسین اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عوامی اور قومی تحریکوں سے دلچسپی رکھتے پھریں۔ میرا یقین ہے کہ وہ ان تحریکوں سے چشم پوشی ضرور کرتے ہیں تاکہ حکومت میں اُن کا وقار روز بروز بڑھتا رہے۔ اور وائسرائے اور وائٹ ہال یہ خیال کر کے اُن کے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی زبردست شخصیت سے مسلمانوں کو حکومت کی وفاداری و خیر خواہی سے منحرف نہیں ہونے دیا۔ سر فضل حسین نے سول سروس سے جو مفاہمت کر رکھی ہے اُس کی ابتدا لاہور میں ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ قوم پرست مسلمانوں کی تحریک کو کچلا جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کو شدّ و مد سے پیش کیا جائے۔ اور آخر کار گول میز کانفرنس میں تہدید و تخویف کے حربوں سے ان مطالبات کو منوایا جائے ظاہر ہے یہ سب کچھ دیکھ کر حکومتِ ہند کے رجعت پسند طبقے کا دل باغ باغ ہو جاتا ہوگا۔" ؎

؎ THE INDIAN CHAOS (Pages 81 and 113)

ولسن نے سول سروس اور سر فضلِ حسین کی جس باہمی مفاہمت کا ذکر کیا ہے۔ اُس کو حسبِ روایت تسلیم کرنے میں مجھے تامّل ہے۔ لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ فضلِ حسین نے قومی تحریکوں کو ہمیشہ کچلا۔ اور مسلمانوں کی جنگ محض اپنی صوابدید۔ اپنی بصیرت اور اپنی عقل کے مطابق لڑنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل ۱۹۳۵ء میں جب وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر واپس لاہور آئے۔ تو انہیں حددرجہ حسرت آمیز لہجے میں کہنا پڑا:

"۔۔۔۔ آج قوم میں کوئی لیڈر نہیں ہے۔ اور اس تہی دامنی کی ذمّہ داری حکومت کی پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت کے کارندے جونہی دیکھتے ہیں کہ کسی ہندوستانی کا اپنی قوم میں اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ تو فوراً اُس کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اب تو یہ حکومت کا مُسلّمہ قاعدہ بن گیا ہے۔ ہندوؤں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کانگرسی ہیں۔ اور حکومت کے خلاف ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ مسلمانوں کے متعلق حکومت نے یہ رویّہ اختیار کر رکھا ہے کہ اُن میں باہمی پھوٹ ڈالنے کے لئے اندر ہی اندر بڑی ہوشیاری سے پراپگنڈا کیا جاتا ہے۔ ذاتی رقابتوں کو زور شور سے ہوا دی جاتی ہے۔ فرقہ واریت اور جماعت سازی کے جذبے کو اُبھارا جاتا ہے۔ اور جب اِن حربوں سے بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ تو پھر قوم کے

ادنےٰ اور غلیظ طبقے سے لیڈروں پر کیچڑ اُچھلوائی جاتی ہے۔ نتیجہ
کیا ہوتا ہے؟ حکومت کو اپنے حسبِ منشا کام کرنے کی کھلی چھٹی
مل جاتی ہے۔ ان حالات میں صوبائی وزیروں کی حیثیت سوائے
اس کے اور کیا رہ جاتی ہے کہ وہ معمولی تحصیلداروں کی طرح
گورنروں کے اشارے پر ناچتے پھریں" لہ

یہ اُس یونینیسٹ پارٹی کے کارناموں پر میاں فضل حسین کا ہلکا سا تبصرہ ہے۔ جسے اُنہوں نے ۱۹۲۳ء میں قائم کیا تھا۔ اور جس کے سپرد اُنہوں نے پنجاب کی تقدیر کر رکھی تھی۔ آج وہ قومی لیڈروں کے فقدان۔ سیاسی زندگی کے افلاس۔ وزیروں کی بےبسی اور حکومت کی خودسری کی بڑی دردمندی سے شکایت کر رہے تھے۔ حالانکہ اگر وہ ذرا غور فرماتے تو انھیں یہ حقیقت معلوم ہو جاتی کہ اس صورتِ حال کی تمام تر ذمہ داری اُنہی پر عائد ہوتی تھی۔

ڈاکٹر اقبال نے اُنہی دنوں، جب میاں فضل حسین حکومتِ ہند کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر لاہور تشریف لائے تھے، انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"....یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا
جو جھگڑا چل رہا ہے اُسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے فضلِ
حسین کو ابتدا میں قیادت کا منصب اس لئے حاصل نہیں ہوا

لہ سوانح عمری صـ ۲۷۲

تھا کہ وہ دیہاتی تھے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ اس طرح اُن کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے نقطۂ اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ اُس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تیسرے درجے کے لوگ، جو اپنے موجودہ عروج کے لئے فضل حسین کے ممنون ہیں، خود اور لئے اصلاحیت کے مالک ہونے کے باعث، فضل حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض نمائندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی۔ کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان تمام اسباب و محرّکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن میں صحیح "لیڈرشپ" مفقود ہو چکی ہے۔ اور سیاسی میدان چند درجہ نالائق مقتدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔"

اس واقعہ سے سال بھر پہلے۔ پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے۔ انجمن حمایتِ اسلام ہی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر۔ خوش آمدید کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے۔ مسلمانوں کے باہمی نفاق پر اظہار افسوس

کیا تھا۔ اور پنجاب کے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی قوم میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔

گورنر کے اِس مشورے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک انگریزی بیان میں۔ جو تبصرہ کیا تھا۔ اُس کی چند سطور کا ترجمہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

" میں گورنر کا ممنون ہوں۔ کہ انہوں نے۔ مسلمانانِ پنجاب کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کی ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ حکومت خود اپنے اعمال و افعال کا بھی محاسبہ کرے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اِس وقت۔ پنجاب کے مسلمانوں میں۔ شہری اور دیہاتی کی جو خوفناک تفریق قائم ہو چکی ہے۔ اور جس تفریق نے۔ اِس صوبے کے مسلمانوں کو۔ دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے وہ کس کی قائم کی ہوئی ہے؟ یہ تفریق صرف شہری اور دیہاتی مسلمانوں تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ اِس نے خود دیہاتی مسلمانوں کو بھی قسم قسم کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو آئے دن ایک دوسری کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

" سر ہربرٹ ایمرسن نے۔ اِس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ کہ پنجاب کے مسلمان۔ کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا نہیں کر سکے۔ کاش سر ہربرٹ ایمرسن کو اِس بات کا احساس ہوتا۔ کہ پنجاب کے شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں۔ جو خوفناک پھوٹ پڑ چکی ہے۔ وہ

سراسر حکومت نے خود پیدا کی ہے۔ اور حکومت ہی اِس پھوٹ کو قائم رکھنے پر منحصر ہے۔ ہماری قومی سیاست۔ ایسے خود غرض اور طالع آزما قسم کے افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ جن کے سامنے۔ صرف جلب منفعت کے ذاتی اغراض ہیں۔ اور جو مسلمانانِ پنجاب میں یک جہتی قائم کرنے کے ہرگز خواہاں نہیں۔ حکومت خود اِن غرض مند افراد کی سرپرستی کرنے میں مصروف ہے۔ اور یوں بالواسطہ شہری دیہاتی جھگڑے کو زور شور سے ہوا دے رہی ہے۔

"نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ مسلمان کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہو چکے ہیں۔ اِس صورتِ حال کو دیکھ کر میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کہ حکومت نے یہ طرزِ عمل غالباً عمداً ہی اِسی واسطے کیا تھا۔ کہ پنجاب میں کوئی حقیقی لیڈر پیدا نہ ہو سکے۔

"سر ہربرٹ ایمرسن نے تو مسلمانوں میں۔ حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ میں اِس کے برعکس۔ اِس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں۔ کہ حکومت نے جان بوجھ کر ایسا طرزِ عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ جس نے اِس صوبے میں۔ اصلی اور پائیدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام اُمیدوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔"

اقبالؔ کا یہ فیصلہ کسی عجلت یا تیز مزاجی یا جلد بازی کا نتیجہ نہ تھا۔

اِس فیصلے کے پیچھے پورے بارہ سال کا عمیق مشاہدہ اور تجربہ کام کر رہا تھا! اقبال اور فضلِ حسین پُرانے دوست تھے۔ دونوں کالج میں ہم جماعت وہم سبق رہ چکے تھے۔ اقبال نے بانگِ درا کی ایک بے مثال نظم فلسفۂ غم فضلِ حسین ہی کی خاطر لکھی تھی۔ اقبال فضلِ حسین کی قائم کی ہوئی مسلم کانفرنس کے بڑے سرگرم رُکن تھے۔ اور آگے چل کر اُس کے صدر بھی بن گئے تھے۔ اقبال کو فضلِ حسین نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا ڈیلی گیٹ بنا کر انگلستان بھیجا تھا۔ اِس لئے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے کسی قسم کی ذاتی رنجش یا عداوت کی بنا، پر سر فضلِ حسین کے خلاف مذکورہ بالا الفاظ کہے ہوں گے۔

اقبال ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب لیجسلٹو کونسل کے رُکن رہے۔ یہ تین سال انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اِس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا۔ شہری دیہاتی چپقلش لیجسلیٹو کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی تھی۔ اور پھر اس چپقلش نے صوبے کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اقبال سے یہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال ایسے بلند پایہ مفکر، فلسفی اور شاعر کو صوبے کی لیجسلٹو کونسل میں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر اقبال کونسل کے اندر بیٹھ کر یونینسٹ پارٹی کے طرزِ عمل کو بچشم خود ملاحظہ نہ کرتے۔ تو شاید اُن کے ہاتھوں وہ کارنامہ سرانجام نہ پا سکتا۔ جو قدرت نے اُن کی زندگی کے آخری دو برسوں میں اُن کے لئے مقدر کر رکھا تھا۔

۱۹۳۵ء میں ملک کی حالت یہ تھی کہ مسلم لیگ ایک تنِ نیم جاں کی طرح پڑی سسک رہی تھی۔ مسلم کانفرنس اپنا ہنگامی کھیل ختم کرکے رُوپوش ہو چکی تھی محمّد علی فوت ہو چکا تھا۔ جناح ساڑھے تین سال کی جلاوطنی کے بعد حال ہی میں واپس ہندوستان آیا تھا۔ اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آئندہ اِس ملک میں اُس کے پاؤں دوبارہ جم سکیں گے یا نہیں۔ پنجاب میں احرار، اُس شمع کی طرح جس کی لَو بجھنے سے پہلے آخری مرتبہ بھڑکتی ہے۔ گویا سنبھالا لینے والے تھے اِن حالات میں میاں فضلِ حسین کا یہ شکوہ بالکل بجا تھا کہ قوم "لیڈر شپ" سے محروم ہو گئی ہے۔ اُن کا یہ خیال بھی درست تھا کہ:

"پنجاب خودداری سے محروم ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں حکّام بالادست نے پنجاب کو اسی چیز سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن اصلاحات کے نفاذ کے بعد پنجاب نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اب کچھ عرصے سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ پنجاب پھر اِس نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔" [1]

پنجاب خودداری سے محروم ہو گیا تھا۔ یا اُس کا وقار زائل ہو گیا تھا۔ یا اُس کی عزتِ نفس مجروح ہو گئی تھی۔ تو اس کی ذمہ داری اُن لوگوں پر تھی جو اس

---

[1] میاں فضلِ حسین نے اپنے انتقال سے چند مہینے قبل انگریزی میں ایک پمفلٹ "پنجاب پالٹکس" کے نام سے لکھا تھا۔ اگرچہ پمفلٹ پر مصنف کا نام "ایک پنجابی" درج تھا۔ لیکن یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی کہ اصلی مصنف میاں فضلِ حسین ہیں۔ یہ اقتباس اسی پمفلٹ کے صفحہ ۲۹ سے لیا گیا ہے۔

صوبے کے حکمران تھے۔ جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی۔ جو سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ اور سرکار بردالانتبار کے دربار میں قوم کی نمائندگی کا دعوےٰ کرتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں نے مسلمانوں کی نمائندگی کے دعویدار بن کر جس قدر دُنیوی و مالی فوائد اُٹھائے۔ اگر اُن کی تفصیل بیان کی جائے تو شاید حیرت سے لوگوں کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ ہزاروں ایکڑ زرخیز اراضی اِن لوگوں نے مفت حاصل کی۔ اپنی اولاد کو بڑے بڑے عہدے دلوائے۔ جاگیریں، انعام اور خطابات حاصل کئے۔

یہ صحیح ہے کہ میاں فضلِ حسین نے اپنے تدبّر سے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی مہم کو منزلِ کامرانی تک پہنچایا تھا۔ انہوں نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے وائسرائے اور حکومتِ ہند کو اِس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے نئی دہلی میں بیٹھ کر لندن کی لباط سیاست پر اپنے مہروں کو اِس طرح حرکت دی کہ خود گاندھی بھی اُن کی چال کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا [1]

---

[1] "INDIAN CHAOS" Page 214 مہاتما گاندھی نے گول میز کانفرنس میں بار بار بات پر اصرار کیا تھا کہ جب تک نیشنلسٹ مسلمانوں کے نمائندے ڈاکٹر انصاری کانفرنس میں شریک نہیں ہونگے وہ مسلمانوں کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ گاندھی جی کی ضد سے حکومت بھی مرعوب ہو گئی تھی۔ اور وائسرائے نے ڈاکٹر انصاری کو لندن بھیجنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن میاں فضلِ حسین جانتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ ڈاکٹر انصاری لندن پہونچ گئے

(باقی صفحہ ۲۷۷ پر)

فضل حسین کی ابتدائی تربیت کانگریس اور مسلم لیگ کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ وہ شروع میں ایک عوامی لیڈر ہی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے تھے اس لئے ہر چند کہ دنیاوی مصلحتوں نے قدم قدم پر اُن کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ وہ دل میں یقیناً سمجھتے تھے کہ جب تک کسی لیڈر کے پیچھے عوام کی مجموعی طاقت نہ ہو اُس کی آواز میں زور پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب پہلی گول میز کانفرنس میں تیسری حکومت کے وزیر اعظم نے مخالفانہ رویّہ کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ اُن کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جائیں گے۔ تو میاں فضلِ حسین نے لکھا کہ :

> اگر جداگانہ انتخاب برقرار نہ رکھا گیا۔ اگر اقلیت کے صوبوں سے دیٹیج چھین لیا گیا۔ اور اگر پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت نہ دی گئی۔ تو میں اس بات پر مجبور ہو جاؤں گا کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے ساتھ لے کر کانگریس میں شامل ہو جاؤں کیونکہ کانگریس کے ذریعے ہندوستان کی جدید تشکیل میں

تو مسلمانوں کا متحدہ محاذ پارہ پارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ اور وائسرائے سے صاف کہہ دیا کہ اگر ڈاکٹر انصاری کو لندن بھیجا گیا تو کانفرنس کے تمام مسلمان مندوبین مستعفی ہو کر واپس آجائیں گے۔ فضلِ حسین کی یہ دھمکی کارگر ہوئی۔ اور ڈاکٹر انصاری لندن نہ جا سکے۔

حِصّہ لینا اِس امر سے بہتر ہے کہ ہم انگریز کے عطا کئے ہوئے آئین
کے تحت آہستہ آہستہ اپنی ہستی کو معدوم کر بیٹھیں"۔[1]

فضلِ حسین کی یہ دھونس (انگریزی میں "بلف" کہنا چاہیئے) ممکن ہے لارڈ اِردن پر چل گئی ہو۔ لیکن اُن کی گذشتہ دس برس کی زندگی اُن کے اِس دعوے کی کھلّم کھلّا تکذیب کر رہی تھی۔ میاں فضلِ حسین نے یقیناً مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب اور ویٹیج لے دیا۔ انہوں نے پنجاب میں مسلم اکثریت بھی قائم کردی۔ انھوں نے سندھ کو جداگانہ صوبہ بھی بنا دیا۔ انہوں نے سرحد میں اصلاحات بھی رائج کرا دیں۔ اور انھوں نے امپیریل سروس میں مسلمانوں کو پچیس ۲۵ فیصد تناسب بھی مقرر کرا دیا۔ لیکن یہ کامیابی محض اُن کی ذاتی کامیابی تھی۔ جسے انھوں نے اپنی ہوشیاری۔ سیاسی مہارت اور شاطرانہ صلاحیت سے حاصل کیا تھا۔ قوم کی اجتماعی قوّت اور عوام کی مجموعی قوّت اِس جدّوجہد میں اُن کے ساتھ نہ تھی۔ بلکہ یُوں کہنا صحیح ہوگا کہ انہوں نے اِس اجتماعی قوّت اور مجموعی طاقت کو مختلف حیلوں سے ہمیشہ دبائے رکھا چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں نیا دستور بن کر آیا۔ تو مسلمانوں کے آئینی حقوق تو بلاشبہ محفوظ تھے لیکن اُن کی اجتماعی زندگی بالکل بے جان، بے حس اور بے رُوح ہو چکی تھی۔ لیڈرشپ کے فقدان کی وجہ سے چاروں طرف ایک افسردگی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اور بعض اوقات یوں معلوم ہوتا تھا کہ قوم کی قوم پر گویا

---

[1] سوانح عمری ص ۲۵۶

سکوتِ مرگ طاری ہے۔

اکبرالہ آبادی نے کہا ہے ؎

سینے میں دلِ آگاہ جو ہے، کچھ غم نہ کرو، ناشاد سہی
بیدار تو ہے مشغول تو ہے، نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولہ مضطر ہے، اک جوش تو اُس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے، بے چین سہی برباد سہی

دلِ آگاہ کی یہی "بیداری و مشغولیت" اور بگولے کا یہی " وجد و رقص" زندگی کی علامت ہے۔ اِس سے بحث نہیں کہ دل ناشاد و نامُراد ہے یا شاد کام و بامراد۔ بگولہ بے چین و برباد ہے یا مضطرب و پریشان ؎

زندگی سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام
فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام
تُو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

(اقبال)

جس دن کوئی فرد یا کوئی قوم اِس سوختنِ ناتمام۔ اِس وجد و رقص۔ اِس بیداری و مشغولیت اور اِس اضطراب والتہاب سے محروم ہوئی اُسی دن اُس پر موت کی خاموشی طاری ہو جائے گی۔ راقم التحریر کو وہ زمانہ یاد ہے جب بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھی مقدمے کی روزمرہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے کمرۂ عدالت میں کھڑے ہو کر رام پرشاد بسمل

کی یہ غزل گایا کرتے تھے[1]

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

توجوش و تہوّر اور ایثار و سرفروشی کی چنگاریاں سنٹرل جیل کی دیواروں کو چیر کر ہندی نوجوانوں کو آتش بجاں اور شعلہ بداماں کر رہی تھیں۔ راقم السطور کو وہ دن بھی یاد ہے۔ جب مہاتما گاندھی عمائے پیری تھام کر سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف پیدل روانہ ہوئے تھے۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین اپنے محور سے ہٹ جائے گی۔ راقم الحروف کو وہ وقت بھی یاد ہے جب سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے پہلے غیر سرکاری صدر وٹھل بھائی پٹیل نے اپنے بلند و بالا منصب پر لات مار کر وائسرائے کو لکھا تھا کہ:

"....میرے ہم وطن اِس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ملک کے سینکڑوں نامور لوگ جیلوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہزاروں اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار بیٹھے ہیں اور لاکھوں ایسے ہیں جو اِس زبردست تحریک کی خاطر زنداں کی کال کوٹھری میں جانے کے لئے بخوشی آمادہ ہیں۔ جہادِ حریت کی تاریخ کے

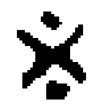
---

[1] رام پرشاد بسمل شاہجہانپور (یو۔پی) کے باشندے۔ اور ہندوستان کے مشہور انقلاب پسند تھے ۱۹۲۶ء میں کاکوری کے ڈاکے میں گرفتار ہوئے۔ اور پھانسی کی سزا پائی۔

> اِس نازک موقع پہ میرا یہ کام نہیں کہ اسمبلی کی کرسیٔ صدارت پہ بیٹھا رہوں۔ بلکہ میرا فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کے پہلو بہ پہلو آزادیٔ وطن کی جنگ میں حصّہ لوں۔"[1]

تو اس انقلاب انگیز بیان کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں ایک ایسی زبردست ہلچل مچ گئی تھی۔ جس کے سامنے انگریزی ملوکیت کا اقتدار ڈانواں ڈول ہوتا نظر آ رہا تھا۔

سر فضلِ حسین نے بلا شُبہ اپنی سیاسی فہم و فراست سے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ لیکن وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ قومیں محض چند بڑے آدمیوں کے "سیاسی ہیر پھیر" سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ قوموں کا سرمایۂ نازش و افتخار عوام کے جذبۂ ایثار اور عوام کا جوشِ عمل ہے۔ فضلِ حسین کی سیاست میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ انہوں نے عوام کو نہ صرف ہمیشہ نظر انداز کئے رکھا بلکہ عمداً ایسی تدبیریں اختیار کرتے رہے جن سے مسلمانوں کی عوامی قوت بیدار ہونے کی بجائے روز بروز غافل و درماندہ ہوتی گئی۔ یہ شرف قدرت نے اقبالؔ اور جناحؒ کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ کہ ایک نوا ہائے قلم کی معجز نگاری اور دوسرا اپنے عمل کی قوت سے قوم میں نئی زندگی کی رُوح پھونک کر اُسے منزلِ مقصود کا راستہ دکھائے ؛



---

[1] انڈین اینول رجسٹر ۱۹۳۰ء۔ جلد اوّل ص ۱۰۳

حِصّہ دُوم

اِقبال کے آخری دو سال

آٹھواں باب

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ، جُوں جُوں نئے آئین کے نفاذ کا وقت قریب آرہا تھا ، ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں ۔ کانگرس نے بڑی رد و کد کے بعد صوبائی اسمبلیوں میں اپنے نمائندے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا اور اِس غرض کے لئے ایک کُل ہند پارلیمنٹری بورڈ بھی وضع کیا گیا تھا ۔ جس کے ذِمّے یہ کام تھا کہ مجالس قانون ساز کے لئے موزوں کانگرسی اُمّیدواروں کا انتخاب کرے ۔ ابتداء میں ڈاکٹر انصاری اِس بورڈ کے صدر تھے ۔ لیکن بعد میں صحت کی خرابی کی وجہ سے مستعفی ہو گئے تھے ۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے دو حصّے تھے ۔ ایک کا تعلّق صوبائی اسمبلیوں سے ۔ اور دوسرے کا تعلّق پورے ہندوستان میں ایک متحدّہ فیڈریشن کے قیام سے تھا ۔ صوبائی اسمبلیوں کی اہمیّت اِس خیال سے اور بھی بڑھ گئی تھی ۔ کہ آئندہ فیڈریشن کی مرکزی اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب صوبوں کی مجالس قانون ساز کے ذِمّے تھا ۔ اِس لئے ظاہر ہے اِن مجالس میں جس جماعت کے ارکان کی

اکثریت ہوگی۔ وہی جماعت فیڈرل اسمبلی میں بھی اپنے نمائندے بھیج سکے گی...
کانگرس کی ہمہ گیر اور زوردار تنظیم کے پیش نظر یہ کہنا چنداں مشکل نہیں تھا کہ
آئندہ صوبائی اسمبلیوں میں کانگرسی ممبروں کی بہت بڑی تعداد داخل ہوگی
اور آئین کو کامیاب یا ناکام بنانے کی ذمہ داری گویا ایک حد تک انہی ممبروں کے
سر عائد ہوگی۔

مسلمانوں میں اس قسم کا کوئی مرکزی اور وسیع الاثر یا ہمہ گیر ادارہ نہیں تھا
جو کانگرس کی مانند ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کی نگرانی کر سکے۔
یا ان اسمبلیوں میں بھیجنے کے لئے موزوں مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرے
مسٹر جناح ۱۹۳۴ء کے آخر میں واپس ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ اور ان
کی کوشش سے مسلم لیگ میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن لیگ نے چونکہ
اپنی گذشتہ اٹھائیس سال کی زندگی میں براہ راست کبھی انتخابات میں حصہ
نہیں لیا تھا۔ اس لئے مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ لیگ کے تحت ایک
پارلیمینٹری بورڈ قائم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی اور
کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو ہندوستان بھر میں اپنا اثر و رسوخ رکھتی ہو۔
۱۹۲۳ء میں خلافت کمیٹی نے سوراج پارٹی کے ساتھ مل کر انتخابات میں
حصہ ضرور لیا تھا۔ لیکن تحریکِ خلافت ختم ہوتے ہی خلافت کمیٹی بھی ختم
ہوگئی تھی۔

آخر جب مختلف خیال رکھنے والے لوگوں نے مسٹر جناح سے بار بار درخواست
کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنے اور انھیں ایک پالیسی کے تحت لانے کے لئے

اس موقع پر مسلم لیگ کا انتخابات میں شریک ہونا ضروری ہے تو ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے چوبیسویں سالانہ اجلاس میں جو سر وزیر حسن کی زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ منجملہ دیگر قراردادوں کے ذیل کی قرارداد بھی منظور کی گئی۔

"۔۔۔۔ ہرگاہ کہ آئین جدید کے نفاذ کے ساتھ اس ملک میں جو پارلیمنٹری نظام حکومت رائج ہوگا۔ اس میں ایسی پارٹیوں کا قیام ضروری فرض کرلیا گیا ہے۔ جو اس قسم کی حکمت عملی اور ایسے لائحہ عمل پر کاربند ہوں۔ کہ رائے دہندوں کی سیاسی تربیت کرسکیں۔ اور اسی نوع کے عزائم و مقاصد رکھنے والی دیگر جماعتوں سے تعاون میں سہولت بہم پہنچا سکیں۔ اور آئین نو سے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کا اہتمام کرسکیں۔

" ہرگاہ کہ مسلمانوں کی وحدت ملی کو تقویت پہنچانے۔ اور صوبائی حکومتوں میں اُن کے لئے مناسب اور مؤثر حصہ حاصل کرنے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ مسلمان ایک ایسی جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔ جو ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہو۔

" لہٰذا قرار دیا جاتا ہے کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں حصہ لینے کیلئے آل انڈیا مسلم لیگ مناسب تدابیر اختیار کرے۔ نیز مسٹر جناح کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صدارت میں ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اس بورڈ کے ارکان کی کم از کم تعداد پینتیس ۳۵ ہو

اور اسے اختیار حاصل ہو کہ ہر صوبے کے مقامی حالات کے پیشِ نظر
مختلف صوبوں میں صوبائی الیکشن بورڈ قائم کر کے مرکزی بورڈ
سے اُن کا الحاق کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے مناسب
تدابیر و ذرائع اختیار کرے۔"

یہ قرارداد راجہ غضنفر علی خاں نے پیش کی۔ جو اس وقت کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے۔ تائید کرنے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی سیکرٹری جمعیّت العلمائے ہند۔ سر سلیمان قاسم مٹھا (بمبئی) سیّد حسین امام (بہار) عبدالحمید خاں (مدراس) نواب زادہ لیاقت علی خاں (یو۔ پی) حاجی رشید احمد (دہلی) اور مولانا محمد عرفان سیکرٹری خلافت کمیٹی شامل تھے۔

عین جس وقت آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے کے لئے مذکورہ بالا پروگرام مرتب کر رہی تھی۔ پنجاب میں میاں فضلِ حسین یونینسٹ پارٹی کو پھر سے زندہ کرنے میں مصروف تھے۔ سر سکندر حیات خاں پنجاب کی ریوینیو ممبری کی پنج سالہ میعاد ختم کر کے ہندوستان کے ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر بن چکے تھے۔ جہاں وہ ساڑھے پانچ ہزار مشاہرہ لیتے تھے۔ اُن کی جگہ نواب مظفر خاں پنجاب کے ریوینیو ممبر بن گئے تھے۔ میاں فضلِ حسین کو معلوم تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک طاقتور عنصر اُن کے خلاف ہے۔ اور سر سکندر اس باغی فریق کے لیڈر ہیں۔ تاہم وہ اس پارٹی کے منتشر عناصر کو یکجا کرنے کی فکر میں شب و روز کام کر رہے تھے۔ پنجاب میں نواب مظفر خاں۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور میر مقبول محمود سر سکندر کے بہت بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سر سکندر کو معلوم تھا کہ میاں فضل حسین سے نبرد آزما ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فضل حسین بیمار تھے۔ اور کام کی شدت جس قسم کی جسمانی طاقت و توانائی اور صحت کی طلب گار تھی۔ وہ انھیں حاصل نہ تھی لیکن فضل حسین کی غیر معمولی قوت ارادی اور ذہانت ایک ایسا حربہ تھا جس کا لوہا اُن کے حریف بھی مانتے تھے۔ اور سر سکندر کو یقین تھا کہ اگر اُن کے اور میاں فضل حسین کے درمیان مقابلہ کی نوبت آئی تو انجام کار یونینسٹ پارٹی فضل حسین ہی کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی۔ اس صورت میں سر سکندر کے سامنے دو راستے کھلے تھے۔ اوّل یہ کہ وہ میاں فضل حسین کے تحت ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا قبول کرلیں۔ دوم یہ کہ وہ یونینسٹ پارٹی سے اپنا رشتہ منقطع کرکے کسی نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالیں سر سکندر بیک وقت ان دونوں راستوں پر گامزن تھے۔

ادھر وقتاً فوقتاً میاں فضل حسین کو اپنے خلوص اور اپنی نیاز مندی کا یقین دلاتے رہتے تھے اور اُدھر میاں فضل حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کی دوڑ دھوپ بھی کرتے رہتے تھے۔ سر سکندر خود تو بنک کی ملازمت کی وجہ سے کلکتہ اور بمبئی میں مقیم تھے لیکن میاں احمد یار خاں دولتانہ اور میر مقبول محمود اُن کے نائب سالار کی حیثیت سے برابر لاہور میں کام کر رہے تھے۔

جونہی سر سکندر کو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ آئندہ انتخابات میں حصّہ لینے کا عزم کر چکی ہے۔ اُنہیں فوراً یہ ڈھارس بندھی کہ شاید لیگ ہی اُن کی پریشانیوں کا مداوا بن سکے۔ اور وہ مسلم لیگ ہی کے توسل سے میاں فضل حسین کے خلاف

اپنی پارٹی مضبوط کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے میاں احمد یار خاں دولتانہ کو لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے بمبئی بھیجا۔ اور ۱۲ اپریل کی مذکورہ بالا قرار داد میاں احمد یار خاں دولتانہ کی موجودگی میں اور اُن کی رضامندی سے منظور ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات کی جنگ لڑی جائے یا نہ لڑی جائے تو سر سکندر نے مسٹر جناح سے مل کر وعدہ کیا تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے نام پر اپنی جماعت منظم کریں گے۔ اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میاں فضل حسین کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیں گے۔

سر سکندر کے راجہ نرندر ناتھ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور راجہ صاحب ہر اُس شخص کی مدد کرنے پر تیار رہتے تھے۔ جو میاں فضل حسین کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکے۔ چنانچہ سر سکندر جب لاہور آتے تو راجہ نرندر ناتھ سے ضرور ملتے تھے اُن کا اندازہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا وہ عنصر جو اُن کا حامی تھا۔ اگر راجہ نرندر ناتھ کی پارٹی سے تعاون کرے۔ تو اس طرح غالباً اُن کی جماعت کے ارکان کی تعداد میاں فضل حسین کے حامیوں سے بڑھ جائے گی۔ میاں فضل حسین سر سکندر کی اِن سازشوں سے سخت پریشان تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ حالات و واقعات پر اُن کی گرفت پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہی۔ ایک خط میں چودھری شہاب الدین کو لکھتے ہیں۔

"دوست، عزیز اور رشتہ دار اِس قدر خود غرض، حاسد اور ناشکرے ہو گئے ہیں کہ اُن کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے"

لیکن کیا کیا جائے ۔ صبر و شکر کرنے اور غداریوں کو برداشت کرنے
کے سوا کیا چارہ ہے ۔ اب تو زندگی کا صرف یہی مقصد رہ گیا ہے ۔ کہ
جو کام شروع کیا تھا اُسے بالخیر انجام تک پہنچایا جائے" ؎۱

میاں فضل حسین اِس بات پر بھی آمادہ ہو گئے تھے ۔ کہ اگر سر سکندر اُن کی قیادت میں کام کرنا نہیں چاہتے ۔ تو وہ بخوشی سیاسیات سے کنارہ کش ہونے اور لیڈری کا منصب سکندر کے حوالے کرنے کو تیار ہیں ۔ چنانچہ ایک خط میں سر سکندر کو لکھتے ہیں :

"...... اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ۔ تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ پبلک زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتہً دستبردار ہونے کو تیار ہوں ۔ آپ بنک سے فوراً مستعفی ہو کر یہاں آ جائیے ۔ اور پارٹی کی زمامِ قیادت سنبھال لیجئے ۔ میں چونکہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو رہا ہوں ۔ اس لئے آپ کو غالباً اس بات پر چنداں اعتراض نہیں ہو گا کہ میں ایک بیان شائع کر کے عوام کو اُن حالات دکوائف سے مطلع کر دوں ۔ جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے ۔ میری تمنا ہے کہ آپ ، آپ کے دوست اور آپ کی پارٹی کو ہر قسم کی کامیابی نصیب ہو" ؎۲

جب کشیدگی یہاں تک پہنچ گئی ۔ تو سر سکندر نے بطور مصلحت خود لاہور آکر

؎۱ سوانح عمری ص ۳۲۳ ؎۲ ایضاً ص ۳۲۱

میاں فضل حسین سے معذرت کی۔ اور اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اُن کے جملہ خدشات کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ احمد یار خاں دولتانہ نے بھی منّت سماجت کر کے فضلِ حسین کو خوش کرنا چاہا۔ آخر میاں فضلِ حسین اس قسم کی نیازمندانہ گذارشات سے مطمئن ہو کر بظاہر پھر کام کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اس معاملے کو ابھی چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک اور شگوفہ کھلا۔

میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل کرنل ہارپر نلسن فضلِ حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خاں چپکے چپکے ہارپر نلسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضلِ حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ہارپر نلسن نے ایک ذمّہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خاں کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ لیکن انہوں نے میاں فضلِ حسین کو اس بات سے فوراً آگاہ کر دیا کہ اُن کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔ فضلِ حسین کو نواب مظفر خاں کی اس حرکت سے اس قدر صدمہ پہونچا۔ کہ انہوں نے رنج و الم کی اس شدّت میں خودکشی کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ اور آخر ایک کرب انگیز ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس مذموم ارادے سے باز آئے [1]

حالات کی یہ روش سخت افسوسناک اور عبرت انگیز تھی۔ وہ شخص جس کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نے پنجاب ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی سیاست کا رُخ پلٹ دیا تھا۔ اب اُن لوگوں کی سازشوں سے جن کو خود اُس

---

[1] سوانح عمری ص ۳۲۴

نے ایک مٹی کے بت کی طرح اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ پریشانی کے عالم میں اپنی جان لینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ تاہم جب یاس و نا امیدی کے یہ بادل چھٹ گئے اور فضل حسین کی طبیعت کو کسی قدر سکون حاصل ہوا تو انھوں نے پھر گرم جوشی سے یونینسٹ پارٹی کی تشکیل کی طرف توجہ کی۔

جب تعمیر و تشکیل کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔ تو ۱۹ راپریل کو نواب شاہ نواز خاں دائے ممدوٹ کے مکان واقع ڈیوس روڈ۔ لاہور پر ایک پر تکلف تقریب منعقد ہوئی۔ جہاں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کے دور جدید کا باضابطہ افتتاح کیا۔ ۱۹۲۳ء سے لے کر اب تک یونینسٹ پارٹی کی ہیئت ترکیبی یہ رہی تھی۔ کہ لوگ اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے منتخب ہو کر پنجاب کونسل میں آتے تھے اور ایوان کے اندر باہمی افہام و تفہیم سے ایک پارٹی بنا لیتے تھے۔ کونسل سے باہر یونینسٹ پارٹی کا قطعاً کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ کبھی اس پارٹی نے آئینی و دستوری معاملات میں ہندوؤں یا مسلمانوں یا سکھوں کی رہنمائی کی۔ اور کبھی عوام میں کوئی شخص اس پارٹی کا ممبر بنا۔ میاں فضل حسین نے اب پہلی مرتبہ یونینسٹ پارٹی کو ایک عوامی ادارے کا رنگ دیکر اس کے نام پر الیکشن کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ طریق انتخاب جداگانہ تھا۔ اور ہندو امیدوار ہندو عوام سے اور مسلمان امیدوار مسلمان عوام سے ووٹ مانگتے تھے۔ ان حالات میں میاں فضل حسین کا یہ اقدام کہ ایک نام نہاد اقتصادی پروگرام کی بنا پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی کسی مخلوط پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا جائے

ایک ایسا معنوی تضاد تھا۔ جس کو جداگانہ انتخاب کے اصول کے ساتھ کسی طرح منطبق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ ہندو، مسلمان اور سکھ کونسل کے اندر جا کر کام چلانے کے لئے بعض اصولوں پر متفق ہو جائیں۔ اور پھر انہی اصولوں کی روشنی میں وضعِ آئین و قوانین میں حصّہ لیں۔ لیکن ایک طرف اس شدت سے جداگانہ انتخاب کی پابندی کا دعوےٰ کرنا کہ ۱۹۲۸ء میں جب مسلم لیگ نے پنجاب و بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کئے جانے کی شرط پر مخلوط انتخاب کی حمایت کی تھی۔ تو لیگ کو مسلمانوں کی بدخواہ اور غیر نمائندہ جماعت قرار دے کر اُس کے جواب میں مسلم کانفرنس کا وجود کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اور دوسری طرف یہ کہ اب جو ہندوستان میں پہلی مرتبہ پارلیمنٹری نظامِ حکومت کے مطابق وزارتیں مرتب کرنے کا وقت آیا۔ تو اسی متاعِ عزیز کو جس کا نام جداگانہ انتخاب تھا۔ ایک مخلوط انتخابی جماعت کے قیام سے عملاً مجروح اور بےکار کر کے رکھ دیا۔

۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا افتتاح کرتے وقت میاں فضلِ حسین نے ایک طویل تقریر کی۔ جس میں ملک فیروز خاں نون۔ سر سکندر حیات چودھری شہاب الدین۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور چودھری چھوٹو رام کی دل کھول کر تعریف کی۔ اور ۱۹۲۱ء سے لے کر اب تک پنجاب کو جو عروج نصیب ہوا تھا۔ اُسے سراسر ان پانچ آدمیوں کی کوششوں کا ثمر قرار دیا۔ محمد دت ولا کو یونینسٹ پارٹی کا صدر دفتر قرار دیا گیا تھا اور اُسی جلسے میں پچاس ہزار روپیہ چندہ جمع ہو گیا۔ سیّد مراتب علی۔ نواب کالا باغ۔ اور سردار محمد نواز خاں ٹمن کوٹ

نے پانچ پانچ ہزار روپے دیئے ۔ سر فضل حسین ۔ چودہری ظفر اللہ خاں ۔ نواب اللہ بخش ٹوانہ ۔ نواب محمد دٹ ۔ سر عمر حیات خاں ٹوانہ ۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ سر سکندر حیات ۔ چودہری شہاب الدین ۔ ملک فیروز خاں نون اور چودہری چھوٹو رام نے تین تین ہزار روپے عطا کئے ۔ ان کے علاوہ سردار حبیب اللہ مولوی غلام محی الدین قصوری ۔ میاں امیر الدین ۔ سید افضال علی حسنی اور میر مقبول محمود نے ایک ایک ہزار دیا ۔ ان تمام عطیوں سے بالاتر بیس ہزار کی رقم ایک ایسے شخص نے دینے کا وعدہ کیا جسے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا ۔ یعنی ہز ہائینس آغا خان ۔ دس ہزار کی پہلی قسط بھیجتے وقت آغا خاں نے فضل حسین کو لکھا :

"...... میرے گماشتوں نے دس ہزار کی پہلی قسط آپ کو بھیج دی ہے ۔ دوسری قسط انشاء اللہ اگست کے آخر یا ستمبر کے شروع میں بھجوا دوں گا ۔ ڈربی کی دوڑ میں اب کی میرا گھوڑا محمود اوّل آیا ہے ۔ اور اس طرح میں آپ کو یہ روپیہ بھجوانے کے قابل ہو سکا ہوں ۔ ورنہ میری مالی حالت ایسی نہیں کہ میں آپ کی مدد کر سکوں ۔" [1]

سوال یہ ہے کہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے آغا خاں کو کیا دلچسپی تھی ؟ اس کا جواب چنداں مشکل نہیں ۔ جن لوگوں نے آغا خاں کی خود نوشت

---

[1] سوانح عمری صـ۳۱۲

سوانح عمری پڑھی ہے۔ اُنہیں اِس سوال کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے میں کچھ دِقّت پیش نہیں آئے گی بسنہ ۱۹۱۲ء سے ہندوستان کی سیاسیات میں آغاخاں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اور اُنہوں نے مستقل طور پر یورپ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پہلی جنگ یوروپ اور پھر تحریک عدم تعاون کے دوران میں آغاخاں کا نام کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جب میاں فضلِ حسین نے جناح کا زور توڑنے۔ اور مسلم لیگ سے مسلمانوں کی نمائندگی کا پروانہ چھیننے کے لئے دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کرائی۔ تو اُس کی صدارت کے لئے آغاخاں کو انگلستان سے بُلایا۔ اور یوں پورے سولہ سال کی گمنامی کے بعد آغاخاں کو پھر مسلمانوں کی قیادت کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہ اپنی اِس عزّت افزائی کے لئے کلیتہً فضلِ حسین کے ممنون تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب گول میز کانفرنس کے اجلاس شروع ہوئے۔ تو وہاں بھی فضلِ حسین کی کوشش سے مسلمانوں کے وفد کی رہنمائی آغاخاں کے سپرد ہوئی۔ گول میز کانفرنس نے حکومتِ برطانیہ کے ارباب حل و عقد کو یہ احساس کرا دیا کہ آغاخاں صرف گھوڑ دوڑ ہی کے شوقین نہیں بلکہ عرصۂ سیاست کے بھی بہت بڑے شہسوار ہیں۔ چنانچہ آغاخاں نے اپنی سوانح حیات میں بار بار اِس طرف اِشارہ کیا ہے۔ کہ گول میز کانفرنس کے بعد برطانیہ کے دفترِ خارجہ۔ وزیرِ ہند اور وائسرائے کا رویّہ اُن کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا۔ اور ان لوگوں نے آغاخاں کی سیاسی قابلیت سے بھی فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ رویّے کی اِس خوشگوار تبدیلی کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آغاخاں کو جمعیتِ اقوام

لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کا نمائندہ مقرر کیا گیا اور پھر وہ اس لیگ کے صدر بھی بنا دیئے گئے۔ اندریں حالات اگر آغا خاں نے فضل حسین کی درخواست پر یونینسٹ پارٹی کو بیس ہزار روپے عطا کئے۔ تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ بیس ہزار کی رقم گویا فضل حسین کے احسانات کا حقیر معاوضہ تھی۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ کو یونینسٹ پارٹی کا چیف سکریٹری اور نواب مظفر کو خزانچی مقرر کیا گیا۔ ان کی مدد کے لئے ایک بہت بڑا سکرٹریٹ بھی قائم ہوا۔ جس میں سردار حبیب اللہ۔ مولوی غلام محی الدین قصوری۔ سید افضال علی حسنی۔ سید امجد علی۔ میاں امیرالدین۔ میر مقبول محمود اور نواب زادہ خورشید علی خاں کو مختلف فرائض سپرد کئے گئے۔

میاں فضل حسین ۱۹۲۱ء سے مسلسل حکومت سے وابستہ چلے آرہے تھے وہ بلاشبہ بڑے ذہین اور حالات زمانہ سے واقف شخص تھے۔ لیکن پندرہ سال تک حکومت کے اعلےٰ مناصب پر فائز رہنے کے بعد اُن کا عوام سے براہ راست کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ وہ یہ حقیقت سمجھنے سے معذور تھے کہ عدم تعاون اور سول نافرمانی کی وسیع تحریکوں نے ہندوستان کی نئی نسل کے ذہن و فکر کو کس طرح نئے راستوں پر ڈال دیا تھا۔ کانگرس کا روز افزوں اثر ایک سیلاب کی طرح اپنی لہروں پر ہندو نوجوانوں کو آگے بڑھائے لئے جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان سیاسی شعور کے اعتبار سے پس ماندہ تھے۔ لیکن اس پس ماندگی کے باوجود انھیں یونینسٹ پارٹی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اِس پارٹی نے ۱۹۲۴ء سے کر اب تک مسلمانوں کے لئے کیا کیا تھا کہ اب انھیں دوبارہ اسی

دام میں قدم رکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔

زیادہ سے زیادہ یہ دعوٰے کیا جا سکتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی نے سرکاری ملازمتوں کے حصول میں مسلمانوں کی بہت مدد کی۔ آئیے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے۔ اس بات پر ایک نگاہ ڈالیں کہ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے سرکاری محکموں کی تمام چھوٹی بڑی اسامیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا کیا تناسب تھا۔ اس طرح ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے کہ بارہ سال کے دور اقتدار میں یونینسٹ پارٹی نے کہاں تک مسلمانوں کو اُن کا جائز حق دلانے کی کوشش کی۔

پنجاب سول سروس (ایگزیکٹیو برانچ) میں مسلمانوں کا تناسب ۴۰ فی صد اور جوڈیشل برانچ میں ۳۴ فیصد تھا۔ پولیس کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ یہ محکمہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ لیکن یہاں انسپکٹر کی اسامیوں میں مسلمان ۳۸ فیصد تھے۔ البتہ سب انسپکٹری میں اُنھیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں حاصل تھیں اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور ہیڈ کنسٹیبل کے درجے میں انہیں آبادی کے تناسب سے زیادہ حصہ ملا ہوا تھا۔

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی (محکمۂ انہار) کی پراونشل انجینئرنگ سروس میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد ۶۶ تھی اور اس کے مقابلے میں مسلمان صرف ۱۸ تھے۔ سب انجینئرنگ کے درجے میں مسلمان ۱۲ فیصد اور ہندو ۸۷ فیصد تھے۔ سبارڈی نیٹ انجینئرنگ سروس میں مسلمان ۳۰ فیصد اور ہندو اور سکھ ۷۰ فیصد تھے۔ کلرک اور ہیڈ کلرک کی اسامیوں پر مسلمانوں کا تناسب ۳۶ فیصد اور ہندوؤں اور

سکھوں کا حصّہ ۶۶ فیصد تھا۔ پٹواریوں میں مسلمان صرف ۳۸ فی صد تھے واضح رہے کہ یہ محکمہ گذشتہ دس سال سے ایک مسلمان ممبر کے تحت چلا آرہا تھا۔

محکمہ جنگلات کی پراونشل سروس میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر کے عہدہ پر مسلمانوں کا تناسب ۱۷ فیصد تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب ۸۳ فیصد تھا۔ محکمۂ مال کے پٹواریوں میں البتہ مسلمان ۵۰ فیصد کے قریب تھے۔

محکمۂ قانون میں مسلمانوں کی نیابت ۲۵ سے زیادہ نہ تھی۔ جیل کے محکمہ کی اعلےٰ اسامیوں پر مسلمانوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ لیکن وارڈر اور ہیڈ وارڈر کی ادنےٰ ملازمتوں مسلمانوں کا حصّہ اُن کی آبادی کے تناسب سے زیادہ تھا۔ ہائی کورٹ کے کلرکوں میں مسلمانوں کا حصّہ ۳۷ فی صد کے قریب تھا۔ لیکن پنجاب سول سکرٹریٹ میں، جو تمام صوبے کے نظم ونسق کا مرکزی ادارہ سمجھا جاتا تھا، مسلمان کلرکوں کی تعداد صرف ۳۷ فی صد تھی۔ فنانشل کمشنر کے دفتر میں مسلمان صرف ۳۷ فیصد تھے۔ حالانکہ ۱۹۲۶ء سے اب تک ریوینیو ممبری کا منصب مسلمان کے پاس چلا آرہا تھا۔

اب آئیے ان محکموں کی طرف جنہیں محکمہ جات منتقلہ کہا جاتا ہے۔ اور جو وزراء کی تحویل میں تھے۔ زراعت کے محکمے کی پراونشل سروس کے درجۂ اوّل میں ایک مسلمان بھی نہیں تھا۔ اور ایگریکلچرل اسسٹنٹ کے عہدے پر مسلمانوں کا تناسب صرف ۳۳ فی صد تھا۔ وٹرنری میں اُن کا تناسب ۴۰ فی صد کے قریب۔ اور کوآپریٹو سوسائٹی کے محکمے میں ماتحت ملازمتوں میں اُنھیں آبادی کے تناسب کے

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی پراونشل سروس میں مسلمان ۱۱ فیصد تھے اور سپیشل گریڈ میں اُن کا حصہ صرف ۷ فیصد تھا۔ سب انجینیر کی اسامی پراُن کا تناسب ۱۶ فیصد کے قریب تھا اور کلرکوں میں وہ صرف ۳۶ فیصد تھے۔

محکمۂ تعلیمات کے سپیشل گریڈ میں مسلمان گیارہ فی صد تھے۔ پراونشل گریڈ کے درجۂ دوم کی ایک سو گیارہ اسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس صرف ۳۶ فیصد حصہ تھا۔ اور ۷۵ فیصد حصہ ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں۔ سبارڈینیٹ سروس کی ۸۸۹-۱ اسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس ۳۹ فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کے پاس ۶۱ فیصد حصہ تھا۔ واضح رہے کہ گیارہ سال سے محکمۂ تعلیمات کی مسندِ وزارت پر مسلمان متمکن چلے آرہے تھے۔

میڈیکل سروس کے اعداد و شمار یہ ہیں۔ سول سرجن کی اسامیوں میں سے مسلمانوں کا تناسب ۲۲ فیصد، اسسٹنٹ سرجن ۲۷ فیصد اور سب اسسٹنٹ سرجن میں ۲۲ فیصد تھا۔ ڈسپنسروں کی معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمان صرف ۳۲ فیصد تھے۔

پبلک ہیلتھ کے محکموں میں مسلمانوں کا مجموعی حصہ ۳۰ فیصد تھا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ اور رجسٹریشن کے محکمہ میں بھی مسلمانوں کا یہی کچھ حال تھا[1] یونینسٹ پارٹی کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں

---

[1] یہ تمام اعداد و شمار میاں فضل حسین کے ایک انگریزی پمفلٹ "پنجاب پالٹیکس" سے حاصل کئے گئے ہیں۔

میں ان کا جائز حق نہ مل سکا۔ حالانکہ تعلیم یافتہ مسلمان مارے مارے بیکار پھرتے تھے۔ سیاسی بیداری کا صوبے بھر میں نام و نشان نہیں تھا۔ عوام میں جب کبھی کسی سیاسی تحریک کے برگ و بار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے گورنر سے مل کر اُس تحریک کو اُبھرنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ یونینسٹ پارٹی صوبے کے چند بڑے بڑے زمینداروں کا ایک اجارہ تھا۔ اور اِس اجارہ سے فائدہ اٹھا کر اِن لوگوں نے ایک طرف تو تملّق و خوشامد کی روایات کو فروغ دیا۔ اور دوسری طرف عوام کی نمائندگی کے دعوے دار بن کر۔ اور ہر قسم کا مال و دولت سمیٹ کر اپنے گھر بھرنا شروع کر دیئے۔ پھر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق کو اِس درجہ راسخ کر دیا کہ اب یہ دونوں طبقے خواہ مخواہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میاں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا افتتاح کرتے وقت بعض ایسے لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ جو کسی زمانے میں اُنکے شریک و سہیم رہ چکے تھے۔ لیکن اب بعض وجوہ سے اُن کے راستے کٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ اِن لوگوں میں ملک برکت علی بھی شامل تھے۔ ملک صاحب نے اُس دعوت کا جو جواب دیا۔ وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس لئے اُس جواب کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا ضروری ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں خودداری کا فقدان ہو گیا ہے۔ اور قوم کارکنوں کے سامنے سب سے مقدم اور ضروری کام یہ ہے۔ کہ زائل شدہ خودداری کو کیونکر بحال کیا جائے۔ خدا آپکو

خوشش رکھے۔ اِس خوبصورت حقیقت کو اِس سے بہتر پیرایہ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو میں یہ عرض کرونگا کہ خود داری کے اِس فقدان کی ذمہ داری سراسر اُس یونینسٹ پارٹی کے سر عائد ہوتی ہے۔ جسے آپ پنجاب کے سیاہ وسپید کا مالک بنا کر خود دہلی تشریف لے گئے تھے۔ یہی پارٹی آپ کی غیر حاضری میں برسرِ اقتدار رہی۔ اور اِسی پارٹی نے صوبے کی خود داری کو بیچ کھایا ہے۔ ستم ہے کہ اب آپ نے پھر اُسی پارٹی کو منظورِ نظر قرار دے کر اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کر دیا ہے۔ ممکن ہے آپ حالات پر قابو پا سکیں۔ لیکن کب تک؟ سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد یہ کام کون کر سکے گا؟۔ کیا نون اور سکندر یہ کام کریں گے؟ ہمیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ وہ لوگ جن کو خود آپ نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اب آپ کو گرانے کے لئے سندروں کے ساتھ سازباز کر رہے ہیں۔ ایسٹرن ٹائمز کہتا ہے کہ سر سکندر نے آپ کی قیادت قبول کر لی ہے۔ لیکن ٹریبون کا بیان اِس کے بالکل برعکس ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ سر سکندر ہے کون؟ میاں صاحب! خدارا آنکھیں کھولیئے۔ اور صوبے کے لائق اور قابل افراد کو اپنے گرد جمع کیجیے۔ اُن افراد کو جنہیں آپ نے دھتکار کر پرے پھینک دیا ہے۔ اور جو گمنامی میں پڑے ہوئے اپنا وقت کاٹ رہے ہیں۔ صوبے کے یہی لائق اور قابل افراد شہنشاہیت پسند گورنر

کا مقابلہ کر سکیں گے۔ آپ بھی تو اسی طبقے کے افراد سے تعلق رکھتے تھے۔ جب آپ یہاں حکمراں تھے۔ تو پنجاب میں یقیناً خودداری کا جذبہ موجود تھا۔ لیکن آپ کے جانشینوں نے جو کچھ حال کر دیا ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔ تعجب ہے کہ آپ پھر بھی اُن کے عظیم الشان کارناموں کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

"ہم آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ پھر سے قابل افراد کو میدان میں لے آئیں گے۔ سچ پوچھئے تو ان سکندروں اور نونوں کو بعجلت تمام ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور جس قدر جلد یہ لوگ اپنے اصل مقام پر واپس چلے جائیں اُتنا ہی بہتر ہے۔ موجودہ صورت حال کے ذمہ دار آپ اور صرف آپ ہیں۔ یہ سکندر اور یہ نون اور یہ انگریز کے اشارے پر ناچنے والے بڑے بڑے زمیندار تو ایک منٹ میں صاف کئے جا سکتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کی پشت پناہ اور ان کا ملجا و ماویٰ آپ ہیں۔

"مسلمانوں کو آپ سے یہی شکایت ہے۔ کیا آپ اس سے باخبر ہیں؟ اگر باخبر نہیں ہیں تو میں نے جرأت کر کے سارا حال آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ تاکہ کل کوئی یہ بات نہ کہہ سکے کہ آپ کے کسی دوست نے اپنا سینہ چیر کر آپ کو دل کی بات نہیں بتائی۔ ہمارے دل میں اب بھی آپ کی عزت اور آپ کا احترام موجود ہے۔ لیکن ہم نے مجبور اور تنگ آ کر قومی خدمت کے میدان سے کنارہ کشی اختیار

کرلی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سا درد مند دل ہے جو اِس افسوسناک صورتِ حال پر آٹھ آٹھ آنسو نہیں روتا۔ جسے آپ کی لیڈرشپ نے پیدا کر دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہم لوگ صوبے کی خدمت اور اُس کے وقار کو بلند کرنے کی تمام کوششوں سے محروم ہو گئے ہیں؟

"اقبال ختم ہو چکا ہے۔ بچارا شاہ نواز اپنا وقت پورا کر چکا ہے اور شجاع بھی گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ باقی رہ گئے۔ سکندر۔ فیروز اور سر شہاب۔ اب انہی لوگوں کا بول بالا ہو گا۔ اس وقت جو ماحول طاری ہے اور جو موانع حائل ہیں۔ اُن کی موجودگی میں اِن لوگوں کے سوا اور کون ترقی کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی اُس یونینسٹ پارٹی کی مہربانی سے ہوا ہے۔ جن کے بلند بانگ دعاوی کا ڈھنڈورا آپ بدستور پیٹ رہے ہیں"۔ [1]

۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح لاہور تشریف لائے۔ اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ دو مہینے پہلے جب وہ مسجد شہید گنج کا تصفیہ چکانے کے لئے لاہور آئے تھے۔ تو بھی احمد یار خاں دولتانہ ہی کے مکان واقع جیل روڈ پہ ٹھہرے تھے۔ مسٹر جناح کی تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد بمبئی کے مطابق پنجاب میں بھی ایک پارلیمنٹری

---

[1] اصل خط انگریزی میں تھا جو ۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا تھا۔

بورڈ قائم کیا جائے۔

یکم مئی کو مسٹر جناح سر فضل حسین سے اُن کے مکان پر جا کر ملے۔ اُسی مکان میں جہاں آج کل ریڈیو اسٹیشن قائم ہے۔ مسٹر جناح کی ساتھ ملک لال دین قیصر مرحوم بھی تھے۔ جناح اور فضل حسین کی گفتگو دیر تک جاری رہی۔ دونوں اپنے اپنے سیاسی عقیدے کے مطابق اپنی اپنی جگہ چٹان کی طرح کھڑے تھے۔ مسٹر جناح چاہتے تھے کہ مسلمان امیدواروں کو لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصّہ لینا چاہیئے۔ اور اسمبلی کے اندر اپنے ہم خیال وہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ تعاون کر کے وزارت مرتب کرنا چاہیئے۔ میاں فضل حسین کا جواب یہ تھا کہ پورے ایوان میں مسلمان صرف اکیاون فی صد ہیں۔ اور جب تک انھیں غیر مسلموں کے کسی قابلِ اعتماد فریق کا تعاون حاصل نہ ہو۔ وہ وزارت نہیں بنا سکتے اس لئے انہوں نے اسمبلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی چودھری چھوٹو رام کے ساتھ مل کر ایک غیر فرقہ وارانہ اور مخلوط جماعت یعنی یونینسٹ پارٹی بنالی ہے اور اب اسی پارٹی کے نام پر الیکشن لڑی جائے گی۔

مسٹر جناح ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی اِس بنیادی کمزوری سے واقف تھے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو چونکہ اُن کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی نہیں ملی۔ اِس لئے انھیں لامحالہ کسی غیر مسلم گروہ کے ساتھ مل کر وزارت بنانا پڑے گی۔ چنانچہ انہوں نے میاں فضل حسین سے یہاں تک کہہ دیا کہ:

"آپ بے شک اسمبلی کے ایوان میں چودھری چھوٹو رام سے اشتراک و تعاون کیجئے۔ لیکن اسمبلی کے باہر کسی مخلوط پارٹی کے

نام پر نہیں بلکہ مسلم لیگ کے نام پر الیکشن لڑنی چاہیئے۔ تاکہ اسمبلی
کے اندر مسلمانوں کا وجود ایک جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے برقرار
رہے۔ جب تک طریقِ انتخاب جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ
پارٹی بنانے کے بغیر چارہ نہیں۔ اور اگر آپ مخلوط پارٹی کے نام پر
الیکشن لڑنے کے قائل ہیں تو پھر مخلوط انتخاب رائج کئے جانے پر
آپکو کیا اعتراض ہے علاوہ ازیں یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی
بجائے۔ مسلمان کانگرس میں کیوں نہ شامل ہو جائیں۔ جو یقیناً
یونینسٹ پارٹی سے زیادہ ترقی پسندانہ جماعت ہے۔"

اِس بحث و مباحثہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ میاں فضلِ حسین کا جواب بہر صورت یہی تھا کہ اِس بات کا انتظار کرنا کہ اسمبلی کے اندر جا کر کسی ہم خیال جماعت کا تعاون حاصل کیا جائے۔ صرف بے سُود ہی نہیں بلکہ سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا ہم یونینسٹ پارٹی کو توڑ کر مسلم لیگ پارٹی نہیں بنا سکتے۔

یہ صورتِ حال تھی جب مسٹر جناح علّامہ اقبالؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اُن دنوں کافی پریشان تھے۔ اُن کی صحت خراب تھی۔ اور وہ بیماری جس نے بعد ازاں مرض الموت کی صورت اختیار کر لی شروع ہو چکی تھی۔ سال بھر پہلے اُن کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اور دونوں بچّوں کی نگہداشت کا سارا بوجھ تنہا اُن پر آ پڑا تھا۔ پریکٹس بند ہو جانے کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع بھی مسدود ہو چکے تھے۔

جب اِن دونوں عظیم المرتبت انسانوں کی ملاقات ہوئی۔ تو میرے مرحوم دوست فضلِ کریم دُرّانی وہاں موجود تھے۔ درّانی انگریزی کے بڑے فاضل انشاء پرداز تھے۔ اور اُن دنوں ایک ہفتہ وار اخبار "ٹروتھ" نکالتے تھے۔ درّانی مرحوم نے ایک مرتبہ اُس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا تھا۔ کہنے لگے۔ "مسٹر جناح اپنی روایتی جامہ زیبی۔ اور خوش پوشاکی کا ایک دلآویز مرقع بنے ہوئے تشریف لائے۔ اعلےٰ درجہ کی ولایتی دوکان کا سِلا ہوا بیش قیمت سُوٹ پہن رکھا تھا۔ اور چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ اِدھر ڈاکٹر صاحب کی درویشی اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جسم پہ سوائے بنیان اور دھوتی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا پورا وعدہ کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔"

دُرّانی مرحوم کی روایت ہے کہ یہ بات سنکر مسٹر جناح کرسی سے دو انچ اُوپر اُٹھے۔ اور بڑے جوش سے کہنے لگے۔ "مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔"

جہاں تک میری ناچیز معلومات کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر جناح کے درمیان، اِس سے قبل، کبھی گہرا ربط و ضبط قائم نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۶ء تک سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے ہمیشہ گریزاں رہے یہاں تک کہ تحریکِ عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی

نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قربِ مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے۔ تو ڈاکٹر صاحب جناح لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سیکرٹری بھی بن گئے تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی۔ تو ڈاکٹر صاحب اِس کانفرنس کے بڑے سرگرم رُکن تھے۔ پہلے وہ اُس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر۔ اور پھر اُس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم التحریر کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۲۸-۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے انھوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ :

"جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے اُن تینوں ترمیموں کو بے دردی سے رُد کر دیا۔ جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آ چکا تھا۔ اِدھر کانگرس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں مَیں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا۔ تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت

پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویّے پر سخت نکتہ چینی کی۔ اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو اُلجھن پیدا کر دی ہے۔ جب تک وہ اُس پر ندامت کا اظہار کر کے۔ آئندہ اِس سے کلیّتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں گے مصالحت نہیں ہو سکتی۔"

ستمبر ۱۹۳۰ء میں مسٹر جناح گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے انگلستان چلے گئے۔ اور پھر وہیں مستقل اقامت کے ارادے سے ٹھہر گئے۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے اور اِس طرح غالباً برسوں کے بعد اُنھیں مسٹر جناح سے بالمشافہ ملاقات کا موقع ملا۔

مجھے لندن میں بعض ایسے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جو گزشتہ تیس، پینتیس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ کہ جب ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے تھے۔ تو چند اصحاب کی کوششوں سے ایک اقبال ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی۔ جس نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد کی تھی۔ جہاں گول میز کانفرنس کے مندوبین کے علاوہ بہت سے اہلِ قلم انگریز بھی شریک ہوئے تھے۔ اِس دعوت میں مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب کی مدح و ستائش میں ایک فصیح تقریر کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے

بھی انگلستان تشریف لائے تھے۔ مسٹر جناح کو حکومت نے ایک "بے مصرف آدمی" سمجھ کر مدعو نہیں کیا تھا۔ اور اِس دوران میں خود مسٹر جناح ہندوستان کی سیاسیات سے اِس قدر بددل ہوگئے تھے۔ کہ انہوں نے ترکِ وطن کر کے لندن ہی میں اپنا مکان خرید لیا تھا۔ اِس مرتبہ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر جناح کے درمیان پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور جب ڈاکٹر صاحب گول میز کانفرنس کی کارروائی سے اِس قدر برگشتہ خاطر ہوئے کہ انھوں نے کانفرنس سے مستعفی ہو کر واپسی کا رختِ سفر باندھ لیا۔ تو اُن کے اور مسٹر جناح کے درمیان پھر ملاقات ہوئی۔ اور اِن دونوں میں کم از کم اِس بات پر ضرور اتفاق ہو گیا تھا کہ گول میز کانفرنس کے ڈھونگ سے مسلمانوں کو اُتنا فائدہ نہیں پہونچ سکا۔ جتنا اُس کا ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا تھا۔

مئی ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر جا کر اُن سے ملے۔ تو ۱۹۲۸ء کی غلط فہمیاں رفع ہو چکی تھیں اور کچھ لندن کی ملاقاتوں کی وجہ سے۔ اور کچھ بعد کے واقعات کی نوعیت کے باعث اُن کے درمیان اچھی خاصی یگانگت پیدا ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اِس لئے جب مسٹر جناح نے پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کی درخواست کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فوراً اِس تجویز کی حمایت کی۔ اور امداد و اعانت کا پورا وعدہ کیا۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ کے مکان پر دو یا تین روز قیام کرنے کے بعد مسٹر جناح ہوٹل میں اُٹھ آئے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ احمد یار خاں دولتانہ یونینسٹ

پارٹی کے چیف سکرٹری تھے۔ اور اب کہ سر فضل حسین سے کھلم کھلا ٹھن جانے کا احتمال پیدا ہو گیا تھا۔ مسٹر جناح نے اُن کے چیف سکرٹری کے ہاں ٹھہرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔

اتحادِ ملت اور مجلسِ احرار کے لیڈروں نے بھی مسٹر جناح سے ملاقات کی احرار مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہونے کو تیار تھے۔ لیکن شرط یہ تھی کہ اوّل تو کسی قادیانی کو لیگ میں شریک نہ کیا جائے۔ دوم مسلم لیگ کا نصب العین درجہ نو آبادیات کے بجائے مکمل آزادی ہونا چاہیئے۔

نصب العین کی تبدیلی کے بارے میں مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اِس کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ہوگا۔ قادیانیوں کی شرکت یا عدم شرکت کے متعلق اُنہوں نے کوئی وعدہ نہ کیا۔ تاہم مجلسِ احرار اور اتحادِ ملت کے رہنماؤں نے پارلیمنٹری بورڈ میں شامل ہونے کی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۸ مئی ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال۔ ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین غلام رسول خاں اور پیر تاج الدین کے مشترکہ دستخطوں سے ذیل کا بیان ایسوسی ایٹڈ پریس کی معرفت تمام اخباروں میں شائع ہوا۔

"مسٹر جناح کی بے نفسی اور دور اندیشی کی داد دینا چاہیئے کہ انہوں نے ایسے موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نئے انتخابات کا وقت قریب آ رہا ہے۔ مسٹر جناح کے اِس اقدام سے اُن غرض

پرست اور رجعت پسند حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے جو اب تک مسلمانانِ ہند کی قیادت کا غلط دعوے کر کے اپنی مطلب براری کرتے رہے ہیں۔ یہ کھلبلی، یہ اضطراب اور یہ پریشانی ہمارے نزدیک کچھ غیر متوقع نہیں ہے۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تنظیم کا جو بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی اِن مطلب پرست لیڈروں کے ہوائی قلعہ کا پاش پاش ہوجانا یقینی ہے۔ کیونکہ اب مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کے صحیح نمائندے جائیں گے۔

"اندریں حالات ہمیں یہ دیکھ کر قطعاً تعجب نہیں ہوا کہ بعض اخباروں نے مسٹر جناح کی ناکامی کی فرضی اور بے بنیاد داستانیں وضع کر کے سائع کرنا شروع کر دی ہیں۔ ان اخباروں کا یہ بیان کہ پنجاب میں سوائے احرار لیڈروں کے اور کسی جماعت نے مسٹر جناح کا ساتھ دینا گوارا نہ کیا۔ ایک صریح جھوٹ ہے۔

"ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مذکورہ بالا اخباروں کے اِس قسم کے بیان صرف غلط ہی نہیں۔ بلکہ گمراہ کُن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم کو مسٹر جناح کی دیانت وامانت اور سیاسی بصیرت پر ایسا پختہ اعتماد ہے کہ مسلمانانِ پنجاب کے تمام طبقوں نے بیک آواز مسٹر جناح کی تجویز کو لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ پنجاب کے مسلمان مسٹر جناح کی اِس تجویز کے دل سے حامی ہیں کہ آئندہ صوبے کی اسمبلی میں ایسے خوددار، خود اعتماد اور محبِ وطن نمائندے

کو بھیجا جائے۔ جو اگر ایک طرف مسلمان قوم کے حقوق کا خاطر خواہ تحفظ کریں تو دوسری طرف ایوان کے دیگر ترقی پسند ممبروں کے ساتھ مل کر رائے عامہ کا وقار بھی قائم کر سکیں۔

"ہمیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ مسٹر جناح کی یہ تجویز جداگانہ انتخاب کا لازمی نتیجہ اور تتمہ ہے۔ اس لئے ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ جس اہم کام کی ابتدا انہوں نے کی ہے ہم اس کو تکمیل تک پہونچانے میں دل و جان سے اُن کے ساتھی ہیں" [1]

اس بیان کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ یونینسٹ پارٹی نے لاہور کے متعدد اخباروں کو مالی وظائف دینا شروع کر دیئے تھے۔ اور یہ اخبار یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر کا اشارہ پا کر بھڑوں کے چھتے کی طرح مسٹر جناح پر پل پڑے تھے۔ لاہور سے اُن دنوں مسلمانوں کا صرف ایک انگریزی روزنامہ ایسٹرن ٹائمز نکلتا تھا جو کلیۃً یونینسٹ پارٹی کے پراپگنڈے کے لئے وقف تھا۔ اس کے علاوہ سول ملٹری گزٹ کے صفحات پر ایک صاحب "مسلم کارسپانڈنٹ" کے نام سے ہر ہفتے یونینسٹ پارٹی کی قصیدہ خوانی اور مسٹر جناح کی مذمت میں اپنا زورِ قلم صرف کرتے تھے اردو روزناموں میں انقلاب یونینسٹ پارٹی کا سب سے بڑا اور سب سے مبتذل نقیب تھا۔

انہی دنوں ایک روز ملک برکت علی میرے ہاں تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ

---

[1] روزنامہ سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۶ء۔

غلام رسول خاں بھی تھے۔ جن سے ملاقات کا شرف اس سے قبل مجھے حاصل نہیں ہوا تھا۔ ملک صاحب نے کہا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید ہونے والی ہے لیکن کام کرنے والوں کی سخت کمی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

مجھے ملک صاحب کے اس ارشاد کی تعمیل میں بے حد تامل تھا۔ اور اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ مجھے سیاسیات میں عملی حصّہ لینے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ اس زمانے میں سیاسیات سے میری دلچسپی صرف اس حد تک محدود تھی کہ روزانہ اخبار پڑھ لیا۔ مہینے میں سیاسیات پر دو ایک تازہ کتابیں نظر سے گذر گئیں۔ اور یا پھر کبھی دوستوں کی محفل میں کسی سیاسی موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ تو اس میں حصّہ لے لیا۔ اس سے آگے بڑھنا مجھے منظور نہیں تھا۔ تامل کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے خود اپنے سیاسی عقائد پر اعتماد نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں مخلوط انتخاب کا حامی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ کانگرس کے ذریعے سے پنجاب کے مسلمانوں کے سیاسی جمود کو رفع کیا جائے۔ لیکن ملک صاحب سے میری دوستی اور نیازمندی ایسی معمولی چیز نہ تھی کہ وہ میرے ایک دفعہ کے انکار سے خاموش ہو جاتے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ " کام کرنے والوں کا سخت قحط ہے۔ لیگ کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں کہ تنخواہ دار آدمی رکھ لئے جائیں اِدھر یونینسٹ پارٹی نے صرف پراپگنڈے کے لئے ایک لاکھ روپے جمع کر لئے ہیں۔ تمہارا لکھنا پڑھنا اگر آج قوم کے کام نہ آیا۔ تو پھر کب کام آئے گا"

میں نے آخر ملک صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ چنانچہ ۱۲ رمئی کو

میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا کے مکان بیرون یکی دروازہ پر جب مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ تو مجھے بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ جلسے کی صدارت کے لئے علامہ اقبال بہ نفسِ نفیس تشریف لائے تھے اور انہی کی صدارت میں چار قرار دادیں منظور ہوئیں۔

پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور اصحاب ذیل کو صوبہ لیگ کے عہدیدار مقرر کیا جائے۔ صدر: علامہ اقبال۔ نائب صدر ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین۔ سکرٹری۔ غلام رسول بیرسٹر ایٹ لا۔ جائنٹ سکرٹری: میاں عبدالمجید بیرسٹر ایٹ لا اور عاشق حسین بٹالوی۔

دوسری قرارداد یہ تھی کہ مسٹر جناح کی اِس اسکیم کا خیر مقدم کیا جاتا ہے جس کی رُو سے آل انڈیا مسلم لیگ ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کے انتخابات کی نگرانی کرے گی۔ نیز ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اِس اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کریں

تیسری قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ جون کے وسط میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے جو اجلاس لاہور میں ہونے والے ہیں۔ اُن کے جملہ انتظامات اور باہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرنے کے لئے ایک مجلسِ استقبالیہ قائم کی جائے۔

چوتھی قرارداد فلسطین کے متعلق تھی۔ جس میں برطانیہ کی عرب دشمنی کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔

مسٹر جناح ایک ہفتہ لاہور میں ٹھہر کر راولپنڈی تشریف لے گئے۔ اور وہاں

چند روز قیام کے بعد کشمیر چلے گئے۔ سری نگر سے ۱۲ مئی کو انہوں نے مرکزی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ بورڈ کے تمام ممبروں کی تعداد ۵۶ تھی۔ جن میں ہندوستان کے ہر صوبے کے آدمی شامل تھے۔ پنجاب سے ذیل کے گیارہ اصحاب نامزد کئے گئے تھے۔

علامہ اقبال۔ مولانا ظفر علی خاں (اتحادِ ملت) مولانا محمد اسحٰق مانسہروی۔ (اتحادِ ملت) سید زین العابدین شاہ گیلانی (اتحادِ ملت)۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ شیخ حسام الدین (احرار) چودھری افضل حق (احرار) چودھری عبدالعزیز بیگووال (احرار) خواجہ غلام حسین ایڈوکیٹ (احرار)

اس طرح گویا چار نشستیں احرار اور تین نشستیں اتحادِ ملت کو حاصل ہوئیں اتحادِ ملت والے بڑے ذکی الحس تھے۔ انہوں نے دبے لفظوں میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ روزنامہ زمیندار اتحادِ ملت کا اخبار تھا۔ اور مولانا ظفر علی خاں اتحادِ ملت کے صدر تھے۔ اس لئے زمیندار میں پے درپے ایسے مقالے شائع ہونے شروع ہوئے جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتحادِ ملت کے رہنما غالباً مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ ۲۳ مئی کو علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو لکھا۔

"..... مجھے امید ہے کہ پنجاب کی تمام جماعتیں بالخصوص احرار اور اتحادِ ملت کسی قدر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں گی۔ اتحاد کے ایک بڑے گرم جوش اور سرگرم ممبر نے چند روز

ہوئے مجھ کو یہی بتایا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے متعلق خود اتحادِ ملت والے ذوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کدھر کا رُخ کریں گے۔ تاہم ابھی بہت وقت ہے۔ اور ہمیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ عوام اتحاد کے نمائندوں کو اسمبلی میں بھیجنے کے کہاں تک شوقین ہیں"۔[1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اتحادِ ملت کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے کہ یہ جماعت کب بنی، کیونکر بنی۔ اور اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے۔ ۱۹۳۵ء کے اوائل تک احرار پنجاب پر چھائے ہوئے تھے۔ اُن کے شاندار جلسے اور دھوم دھامی جلوس دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ پنجاب کی سیاست میں یہ جماعت ایک فیصلہ کُن حصہ لے گی۔ احرار کے حریف منتشر اور غیر منظم تھے۔ تاہم وہ موقع کے منتظر تھے کہ کب احرار کے مقابلے میں اپنا جھنڈا بلند کریں۔ ایسا موقع جولائی ۱۹۳۵ء میں آ گیا۔ جب سکھوں نے مسجد شہید گنج کو مسمار کر کے مسلمانانِ پنجاب کے دلوں پر ایسا چرکا لگایا۔ جس کا گھاؤ مدت تک مندمل نہ ہو سکا۔

عوام کا خیال تھا کہ احرار، جو ہر مصیبت کے وقت سینہ تان کر آگے کھڑے ہو جاتے تھے، شہید گنج کے حادثۂ خونیں پر بھی مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ احرار نے اس موقع پر بالکل سکوت اختیار کر لیا۔ لوگ پریشان تھے اور رہنمائی کے محتاج۔ جب احرار نے کوئی قدم نہ اٹھایا تو مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب، ملک لال خاں، سید زین العابدین شاہ، میاں فیروز الدین احمد، ملک لال دین قیصر، ڈاکٹر محمد عالم وغیرہ آگے بڑھے۔ اور ان لوگوں نے اپنے فہم و فراست کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دینے کی کوشش کی

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

حکومت نے سوائے ڈاکٹر عالم کے باقی تمام اصحاب کو گرفتار کر کے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ فروری ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کی کوشش سے یہ لوگ رہا ہوئے۔ اور انہوں نے مل کر مجلس اتحادِ ملّت کی بنیاد رکھی۔ جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسجد شہید گنج کو سکھوں سے واپس لیا جائے۔ اس واقعہ کے بعد پنجاب میں احرار اور اتحادِ ملّت دو حریف جماعتیں بن گئیں۔ جن کے درمیان عرصۂ دراز تک مخالفت کی آگ بھڑکتی رہی۔

۲۸ مئی کو علامہ اقبال نے اپنے دولت کدہ پر مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے پنجابی اراکین کے علاوہ ذیل کے اصحاب بھی شریک ہوئے۔ خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ سیّد محمد علی جعفری۔ ملک نور الٰہی مالک روزنامہ احسان۔ پیر تاج الدین بیرسٹر ایٹ لا۔ ملک نور احمد۔ غلام رسول خاں بیرسٹر ایٹ لا۔ شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ۔ میاں عبدالمجید بیرسٹر ایٹ لا۔ عاشق حسین بٹالوی۔

اس جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ اور دو قرار دادیں منظور ہوئیں۔ پہلی قرار داد یہ تھی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے ایک صوبہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے اور دوسری قرار داد کا مفہوم یہ تھا کہ مجوزہ پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط مرتب کر کے انھیں علامہ اقبال کے نام نامی سے پنجاب بھر میں تقسیم کیا جائے۔

۸ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس لاہور میں ہونے والے تھے اور ۶ جون کو مسٹر جناح کشمیر سے واپس لاہور پہنچ

رہے تھے۔ یہ زمانہ سخت مصروفیت کا تھا۔ علامہ اقبالؔ اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود سارے کام کی ایک ایک تفصیل کو بغور ملاحظہ فرماتے تھے۔ انہی دنوں بڑے زور سے یہ افواہ اڑنے لگی کہ مسٹر جناح کی آمد پر یونینسٹ پارٹی سیاہ جھنڈیوں سے مظاہرہ کرے گی۔ جب ہم لوگوں نے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کا واقعی یہ ارادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا۔ تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ اس لئے کہ عین اس وقت جب مسلمانانِ ہند کے نمائندوں کا اجتماع لاہور میں ہونے والا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کی اس قبیح حرکت سے اہلِ لاہور کے دامن پر ایک شرمناک دھبہ لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک لال دین قیصر سے کہا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے فلاں فلاں ممبر کے پاس جاکر یہ پیغام پہنچا دیں۔ کہ اگر انہوں نے سیاہ جھنڈیوں کا پروگرام ترک نہ کیا۔ تو اسکے نتائج خود یونینسٹ پارٹی کے لئے سخت خطرناک ثابت ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس پارٹی کے بعض ہوشمند آدمیوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اور سیاہ جھنڈیوں کا مذموم ارادہ فسخ کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے پرانے اور ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کو سیاہ جھنڈیوں کے پروگرام کا علم نہیں تھا۔ یہ ساری کارروائی دو تین ایسے نوجوانوں کی تھی۔ جن کی متاعِ علم و عمل ہر قابلِ تحسین چیز سے خالی تھی۔ لیکن جو اپنی ہستی کا ثبوت دینے کے لئے ہر قسم کی شرارت اور فتنہ پردازی پر ہمہ اوقات تیار رہتے تھے۔

اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ۸ رجون کو مسلم لیگ کونسل اور پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس کس جگہ ہوں گے۔ لاہور میں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس لئے خیال تھا

کہ اگر اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں یہ اجلاس منعقد ہو جائیں۔ تو کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ بجلی کے پنکھے مہیا ہو جائیں گے۔ نواب مظفر خاں انجمن حمایتِ اسلام کے صدر تھے۔ اِس کام کے لئے اُن کی اجازت درکار تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نواب مظفر خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔ لیکن انہوں نے حبیبیہ ہال دینے سے انکار کر دیا۔ نواب مظفر خاں یونینسٹ پارٹی کے بہت بڑے رُکن تھے۔ اِس لئے اُن سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ مسلم لیگ کو حبیبیہ ہال استعمال کرنے کی اجازت دیں گے۔"

لیکن یہ امر یقیناً موجبِ حیرت ہے کہ جس انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں کی کامیابی کا دارومدار ہمیشہ اقبال کی نظم پر رہا ہو۔ آج اُسی انجمن کا صدر اقبال کی درخواست کو ٹھکرا کر حبیبیہ ہال میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مجبوراً برکت علی اسلامیہ ہال میں لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے۔ جہاں مسلم لیگ کا الیکشن مینی فسٹو باضابطہ منظور کیا گیا۔ اور پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی مولانا ظفر علی خاں اور اُن کے دونوں ساتھی پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہو گئے استعفٰے کی وجہ مولانا نے یہ بیان کی کہ اتحادِ ملت چونکہ مکمل آزادی کی حامل ہے اور مسلم لیگ کا نصب العین درجۂ نوآبادیات ہے۔ اِس لئے اِن دونوں جماعتوں میں اشتراک و تعاون نہیں ہو سکتا۔ مولانا کا یہ عذر محض عذرِ لنگ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد عالم مولانا پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ انھوں نے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا دیوانی دعوٰے بھی دائر کر رکھا تھا۔ اسلئے وہ اتحادِ ملت

کا علیحدہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے شہید گنج کے نام پر الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آگے چل کر من و عن یہی کچھ ہوا۔ اور ڈاکٹر عالم نے نہایت ہوشیاری سے اتحاد ملت۔ زمیندار مولانا ظفر علی خاں اور شہید گنج کو سراسر اپنی الیکشن کے لئے استعمال کیا۔

جب پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو سر فضل حسین نے ۷ مئی کو ایک خط میں سر سکندر کو لکھا:

"جناح نے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے میں سخت غلطی کی ہے اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ جناح نے ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے میں کوئی دقیقہ نہیں رکھا۔ لیکن جن اخبارات نے اس کا پیرا پاگنڈہ کیا ہے۔ وہی اس خبر کے بھی ذمہ دار ہیں۔ کہ جناح کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نے اس کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ اتحاد ملت نے بھی انکار کر دیا۔ باقی رہ گئے احرار۔ وہ شامل ہوں یا نہ ہوں۔ ان کا رویہ ہمارے متعلق یکساں رہے گا۔ البتہ اقبال۔ شجاع۔ تاج الدین۔ برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے اس بورڈ سے کچھ ثمرات کی آرزو میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں"[1]

میاں فضل حسین نے اقبال۔ شجاع۔ تاج الدین۔ اور برکت علی کا ذکر اپنے انداز میں کیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک یہ "چند متفرق شہری باشندے" انہوں

---

[1] سوانح عمری ص ۳۰۹

کی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں پنجاب کی سیاسیات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ تعجب ہے کہ وہ شخص جس نے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک اپنی لیڈری کی عمارت انہی "چند متفرق شہری باشندوں" کے کندھوں پر سوار ہو کر استوار کی تھی۔ وہ شخص جس کو سیاسی جدوجہد کے اس پُرخطر زمانے میں استاد پور کے ٹوانے اور نون۔ اٹک کے کھٹڑ اور ملک۔ جہلم کے راجے اور چودھری حکومت کا معتوب سمجھ کر اپنے قریب بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آج خود حکومت کے قصرِ رفیع الشان میں داخل ہو کر اپنے اُنہی پرانے رفیقوں کا ذکر اس حقارت سے کرتا ہے۔ گویا اقبال۔ شجاع۔ تاج الدین۔ برکت علی اس قابل بھی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکیں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

جون کے آخر میں میاں فضل حسین ایک خط میں آغا خاں کو لکھتے ہیں:

"... جناح کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا کہ اس بورڈ سے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اب مولانا ظفر علی خاں اور اتحادِ ملت کے فیصلے نے تو گویا اس بورڈ کی کمر ہی توڑ دی ہے۔ صرف احرار باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا احرار لیگ میں شامل ہو کر اپنی جداگانہ ہستی کو معدوم کر ڈالیں گے؟ غالباً

نہیں؛ بہرحال جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا وجود باقی نہیں رہا" [1]

میاں فضل حسین اگرچہ سر سکندر کو خطوط لکھ کر یونینسٹ پارٹی کی کامیابی اور جناح کی ناکامی کا فرد دستاویز ہے تھے۔ لیکن سر سکندر بدستور اپنی دوڑ دھوپ چالوں میں مصروف تھے۔ وہ ۲۰ر جون کو بمبئی سے لاہور پہنچے۔ اور ایک طرف راجہ نرندر ناتھ سے ملے۔ اور دوسری طرف علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ راجہ نرندر ناتھ سے اُن کی جو گفتگو ہوئی اُس کی اطلاع کسی طرح سول ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کو بھی مل گئی۔ اور ۲۲ر کو سول میں چھپ گیا کہ سر سکندر اور راجہ نرندر ناتھ کے درمیان اِس امر کے متعلق تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ کہ سر فضل حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی کو ختم کر کے پنجاب کی سیاسی جماعتوں میں کیونکر اتحاد قائم ہونا چاہیئے۔ میاں فضل حسین اُس وقت ڈلہوزی میں تھے۔ انہوں نے فوراً وہاں سے چودھری شہاب الدین کو لکھا :

"۔۔۔۔۔ لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ سکندر، احمد یار اور نرندر ناتھ کے درمیان پیچ گفت و شنید اور مشورے ہو رہے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ جو احسان میں نے احمد یار اور سکندر پر کئے ہیں۔ کیا یہ لوگ اُن احسانات کے مستحق تھے؟ اور پھر جس طرح میں ان دونوں کی مدد کرتا رہا ہوں۔ کیا اُس سے پنجاب یا مسلمانانِ پنجاب

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۳۱۱

یا ہماری پارٹی کو کچھ بھی فائدہ پہونچ سکا ہے ؟ میں یہ باتیں آپ سے
پوچھتا ہوں۔ کیونکہ اِن دونوں کے متعلق میں نے جو کچھ کیا۔ آپ
ہی کی سفارش پہ کیا"[1]

اِدھر ۲۱ رجون کو علامہ اقبال اپنے ایک خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں :

"..... دو ایک روز ہوئے سر سکندر لاہور سے رُخصت ہوگئے ہیں
میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی پہونچ کر آپ سے ملیں گے۔ اور بعض امور
کے متعلق گفتگو کریں گے ..... اِس گفتگو کے نتیجے سے مجھے ضرور
مطلع فرمائیے گا۔ اگر آپ اُن کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوگئے
تو بہت ممکن ہے کہ وہ ہمارے ساتھ آملیں گے"[2]

میری ناچیز رائے میں ڈاکٹر صاحب کو سر سکندر کے متعلق محض خوش فہمی
تھی۔ سر سکندر نہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر تیار تھے۔ نہ وہ راجہ نرندر ناتھ سے
مل کر علیحدہ پارٹی بنانے پر آمادہ تھے۔ وہ صرف ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے بلکہ یوں کہنا
صحیح ہوگا کہ وہ میاں فضل حسین کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ علامہ اقبال
اپنے اِسی ۲۵ رجون کے مکتوب میں مسٹر جناح کو یہ بھی لکھتے ہیں

"..... دولتانہ کل مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی
کے مسلمان ممبر اس قسم کا ایک اعلان کرنے پہ تیار ہیں۔ کہ مسلمانوں
سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا مسائل میں یونینسٹ پارٹی کے مسلمان

---

[1] سوانح عمری ص۳۳۲ - [2] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

ممبر مسلم لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے۔ اور ان مسائل کے متعلق وہ صوبائی اسمبلی کے کسی غیر مسلم فریق کے ساتھ علیحدہ سمجھوتہ نہیں کریں گے بشرطیکہ پنجاب مسلم لیگ بھی اس امر کا ایک اعلان کر دے۔ کہ جو لوگ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر پنجاب اسمبلی میں داخل ہوں گے وہ صرف اس پارٹی کے ساتھ تعاون کریں گے۔ جس میں سب سے زیادہ مسلمان شریک ہوں۔ از راہِ کرم اس تجویز کے متعلق اپنی رائے سے مجھے فوراً مطلع فرمایئے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ احمد یار خاں دولتانہ ۲۴ر جون کو ڈاکٹر صاحب سے اُن کے دولت کدے پر جا کر ملے۔ ادھر ۲۴ر جون ہی کو ڈلہوزی سے میاں فضل حسین نے چودھری شہاب الدین کو وہ غم و غصّہ سے بھرا ہوا خط لکھا جس میں انہوں نے احمد یار خاں دولتانہ اور سر سکندر کو احسان فراموش۔ سازشی اور الطاف و اکرام کا نااہل قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں دولتانہ کی یہ تجویز میاں فضل حسین کی تجویز تو ہو نہیں سکتی۔ پھر لطف یہ ہے کہ ۲۰ر جون کو سر سکندر لاہور آئے اور ۲۳ر یا ۲۴ر کو واپس بمبئی تشریف لے گئے۔ ان چار یا پانچ دنوں میں احمد یار خاں دولتانہ برابر اُن کے ساتھ رہے۔ اور انھیں ڈلہوزی جانے اور میاں فضل حسین سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خود میاں فضل حسین ۹ر جون کو ڈلہوزی سے واپس لاہور پہنچے۔ پھر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تجویز میاں فضل حسین نے احمد یار خاں دولتانہ کے توسل سے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ لاہور پہنچنے سے

قبل میاں فضلِ حسین نے آغا خاں کو وہ خط لکھا تھا جس کا اقتباس درج کیا جا چکا ہے اور جس میں انہوں نے بڑے اطمینان سے آغا خاں کو یہ خبر سنائی تھی کہ "جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا وجود باقی نہیں رہا" ظاہر ہے جس جماعت کا وجود ہی میاں فضلِ حسین کے نزدیک باقی نہیں رہا۔ اُس جماعت کے ساتھ مفاہمت کرنے پر وہ کیوں کر آمادہ ہو سکتے تھے۔ میری ناچیز رائے ہے کہ یہ تجویز دولتانہ اور سکندر کے باہمی مشورے کا نتیجہ تھی۔ فضلِ حسین اس سے بالکل بے خبر تھے۔ دولتانہ اور سکندر غالباً یہ چاہتے تھے کہ اقبال کے بیان سے فضلِ حسین کو پریشان کیا جائے۔ اور جب فضلِ حسین اِس تجویز کی مخالفت کریں۔ تو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو یہ کہہ کر اُن سے بدگمان و برگشتہ کیا جائے۔ کہ یہ شخص (فضلِ حسین) مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہونے دیتا۔

یونینسٹ پارٹی کے اندر اس قسم کی خفیہ سازشیں اور باہمی رقابتیں جاری تھیں۔ کہ ۹ رجولائی کو میاں فضلِ حسین کا لاہور میں انتقال ہو گیا اور راتوں رات پنجاب کی سیاسی فضا یکسر بدل گئی۔ سر سکندر کو اُن کے دوستوں نے اُسی وقت فون پر اطلاع دے دی کہ اب میدان صاف ہے۔ فوراً لاہور پہنچو۔ میاں فضلِ حسین مسلسل سولہ سال پنجاب کی سیاست پر حاوی رہے۔ اور پانچ سال انہوں نے پورے ہندوستان کی سیاست کو اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق چلایا۔ اُن کے بڑے بڑے حریف بھی اُن کی چال کے سامنے مات کھا جاتے تھے۔ اُن کے جسم کو اگرچہ مختلف امراض نے عدد درجہ نحیف و نزار بنا رکھا تھا

لیکن اس کے باوجود اُن کے ذہن و فکر کی حلاوت ایک لمحہ کے لئے بھی کم نہ ہوئی۔ مہاتما گاندھی نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے لیڈی فضلِ حسین کو لکھا "سیاسیات سے قطع نظر۔ میرے دل میں تو اُن خوشگوار ملاقاتوں کی مسرت بخش یاد باقی ہے۔ جو مجھے آپ کے نامور شوہر کے ساتھ میسّر آئی تھیں"۔

سروجنی نیڈو نے لکھا۔ "جن لوگوں کو فضلِ حسین سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ وہ اُن کی تیز و طرار ذہانت اور مغلوب کُن بصیرت سے مختلف تاثرات لے کر واپس آتے تھے۔ مثلاً خوف۔ مدح و ستائش۔ ناپسندیدگی۔ بے اعتمادی خلوص و محبت۔ لیکن اِن مختلف و متضاد تاثرات کے باوجود ایک چیز یقینی تھی۔ اور وہ یہ کہ جو شخص بھی فضلِ حسین سے ملتا تھا۔ وہ اُنکی زبردست شخصیت اور قوت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا"۔

علامہ اقبالؔ۔ ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز نے ایک مشترکہ بیان میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا:

"سر فضل کی وفات حسرت آیات سے ہمارا صوبہ ایک حقیقی محب وطن کی خدمات سے محروم ہوگیا ہے۔ پنجاب کی پبلک زندگی سے اُن کا تعلّق بہت گہرا ہے۔ اور اِس تمام عرصے میں ہر مرحلے پر فتح و کامرانی نے اُن کے قدم چُومے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے مدرکے سر کئے۔ لیکن یہ امر بے حد المناک ہے۔ کہ عین جس وقت وہ اصلاحاتِ جدیدہ کے تحت اپنا مستقبل مرتّب کرنے کی تجویزیں سوچ رہے تھے۔ موت نے اُن کا رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔ ہم اس سانحہ عظیم

میں اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ہم سے ایک ایسا عظیم الشان لیڈر جُدا ہو گیا ہے جس کو قدرت نے سیاسیات کا صحیح شعور عطا کیا تھا۔ اور جو پارلیمنٹری قابلیت کے علاوہ تدبّر و معاملہ فہمی و تعمیری کام کرنے کی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا"۔[1]

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۳۶ء

نواں باب

۱۹۳۷ء کا انتخاب

سر سکندر ۲۲ جولائی کو چند روز کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اور یونینسٹ پارٹی کے ایک رسمی جلسے میں اُن کو پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ اسی رسمی جلسے میں سر سکندر نے اعلان کیا کہ وہ حتی الامکان بہت جلد بنک کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور آ نے۔ اور مستقل طور پر پارٹی کی زمام قیادت سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔ اب چونکہ یونینسٹ پارٹی کے اندر وہ باہمی چپقلش ختم ہو چکی تھی۔ جو مدت سے سر سکندر اور فضل حسین کے درمیان چلی آ رہی تھی اس لئے سر سکندر کو مسلم لیگ سے ربط و ضبط بڑھانے۔ یا میاں فضل حسین کے حریفوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

میاں فضل حسین کے انتقال کے بعد یونینسٹ پارٹی کے ایک نہایت وقیع اور بلند پایہ رُکن، ملک زمان مہدی خاں اس پارٹی سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے۔ زمان مہدی علیگڑھ کے دور اوّل کے بہترین تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور طالب علمی کے زمانے

میں محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ کے ہم عصر رہ چکے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے تھے۔ اور ۱۹۳۴ء میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ پنشن کے بعد وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو گئے تھے۔ میاں فضل حسین سے اُن کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے چلے آرہے تھے۔ جب میاں صاحب سیالکوٹ میں پریکٹس کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے اور زمان مہدی وہاں بہ سلسلۂ ملازمت تعینات تھے۔

زمان مہدی نے اپنی پوری ملازمت کے دوران میں قومی خدمت کے اس جذبہ کا بار بار مظاہرہ کیا۔ جو کسی زمانے میں علیگڈھ کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ منٹگمری اور روہتک کے اضلاع میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ تو انہوں نے محض اپنی ذاتی کوشش سے اِن دونوں شہروں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے عظیم الشان اجلاس منعقد کرائے۔ اور ہندوستان کے دُور دُراز گوشوں سے مسلمان لیڈروں کو مدعو کیا۔ منٹگمری میں تنہا اُن کی کوشش سے نادار اور کم استطاعت مسلمان طلبہ کی مدد کے لئے ایک بہت بڑا ٹرسٹ قائم کیا گیا جس سے ہزاروں نوجوان فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے موقع پر اُنہوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی پابندیوں کے باوجود ترکوں کے لئے چندہ جمع کر کے ہندوستان کی مرکزی انجمن کے پاس روانہ کیا۔

میرے محترم دوست اور اُردو کے نامور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جب شاہنامۂ اسلام لکھا۔ تو زمان مہدی گوجرانوالہ میں ڈپٹی کمشنر تھے حفیظ گوجرانوالہ گئے۔ تو زمان مہدی نے شاہنامہ کی فروخت میں اِس گرم جوشی

سے حصہ لیا۔ گویا وہ ڈپٹی کمشنر نہ تھے۔ بلکہ ایک قومی رضاکار تھے۔ انہوں نے شاہنامہ کی ایک ایک جلد پانچ پانچ سو روپے میں فروخت کرائی۔ اس کے علاوہ وہ ہر سال انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس پر بہت بڑی رقم فراہم کر کے انجمن کو بھیجا کرتے تھے[1]

زمان مہدی کے لیگ میں شامل ہونے پر ہم لوگ بہت خوش ہوئے۔ لیکن علامہ اقبال کو خصوصیت سے بہت مسرت ہوئی۔ وہ زمان مہدی کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت چونکہ خراب تھی۔ اور انھیں پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے بورڈ کے ہر جلسے میں شریک ہونے کی زحمت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ زمان مہدی خان کو اُن کی جگہ پارلیمنٹری بورڈ کا صدر منتخب کر لیا جائے۔ لیکن بورڈ کے تمام

---

[1] میرے والد مرحوم، مغفور سر فضلِ حسین کے بڑے مداح اور معاون تھے چنانچہ میاں صاحب کے انتقال سے چند روز قبل وہ ان کی عیادت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ خدا آپ کو تندرستی عطا فرمائے اور آپ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے عرصہ دراز تک سلامت رہیں۔ لیکن چونکہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے ہمیں بتا دیجئے کہ آپ کے بعد ہم کس کو اپنا لیڈر سمجھیں۔ میاں صاحب نے جواب دیا۔ خدا جس کو چاہے گا لیڈری کے منصب پر کھڑا کر دے گا۔ اس میں میرا کوئی اختیار نہیں۔ والد مرحوم نے پوچھا کہ سر سکندر کے متعلق کیا رائے ہے؟ تو میاں صاحب نے جواب میں صرف اتنا کہا "ہاں اچھے آدمی ہیں"۔ پھر والد مرحوم نے پوچھا "اور زمان مہدی؟" اس پر میاں صاحب نے فرمایا۔ "وہ بہت آدمی ہے۔"

ممبروں نے اِس تجویز سے اختلاف کیا۔ اور عرض کیا کہ اِس مرحلہ پر ڈاکٹر صاحب کا پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے مستعفی ہو جانا۔ بورڈ کے وقار کو بہت کم کر دیگا البتہ زمان مہدی خاں کو بورڈ کا ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب کر لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زمان مہدی کی تنظیمی قابلیت پر بڑا اعتماد تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے بورڈ کے ممبروں کی متفقہ عرضداشت کے باوجود یہی فیصلہ کیا کہ اُنھیں صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیئے تاکہ زمان مہدی کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

بالآخر اُنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بورڈ کی رکنیت ترک نہیں کریں گے اور جب کسی موقع پر مشورے کی ضرورت پیش آئے گی۔ وہ ہر ممکن مدد دینے کو تیار رہیں گے۔ آخر کار بورڈ کو اِس خواہش کے سامنے مجبوراً سر جھکا دینا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا استعفیٰ لکھ کر غلام رسول خاں کے حوالے کر دیا۔ تاکہ ۱۳راگست کو بورڈ کے اجلاس میں پیش کر دیا جائے۔

جب غلام رسول خاں نے ۱۲راگست کے جلسے کا ایجنڈا جاری کیا۔ تو اُس میں ڈاکٹر صاحب کے مجوزہ استعفےٰ کی شق بھی تھی۔ یہ خبر اُڑتی اُڑتی یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر مہرولٹ ولا میں بھی جا پہنچ گئی۔ چنانچہ وہاں فوراً مسرت و کامرانی کے شادیانے بجنے لگے۔ "لو اقبال نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفےٰ دے دیا ہے۔ اب مسلم لیگ کا ڈھونگ بھی ختم سمجھو۔ سید نور احمد اس زمانے میں سول ملٹری گزٹ کے نامہ نگار تھے اور اُن کا قلم یونینسٹ پارٹی کی حمایت کے لئے وقف ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے جونہی یہ خبر سنی۔ فوراً ایک جلی عنوان جما کر

سول میں مضمون لکھ دیا۔ کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے حالات ناگفتہ بہ ہو چکے ہیں۔ اندرونی خلفشار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ باہمی رقابتیں زوروں پر ہیں۔ کام کرنے کے لئے آدمی نہیں ملتے۔ روپے کی سخت کمی ہے۔ آخرکار اس صورتِ حال سے تنگ آ کر علامہ اقبال نے بورڈ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

سول کا یہ پرچہ ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ سے گزرا۔ تو انھیں سخت غصّہ آیا۔ کہ ہمارے حریف کیسے اوچھے وار کرنے اور ہمیں کس کس طریقے سے بدنام کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے فوراً غلام رسول خاں کو بُلا کر زبانی حکم دیا۔ کہ اُن کا استعفیٰ ۱۳ اگست کے اجلاس میں پیش نہ کیا جائے۔ پھر اس مضمون کی ایک باضابطہ تحریری اطلاع بھی سکرٹری کو بھیج دی۔ کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب نے پنجاب کے ساٹھ نمایاں اور سربرآوردہ اصحاب کی ایک فہرست تیار کر کے غلام رسول خاں کے حوالے کی۔ اور فرمایا کہ خود اُن کی طرف سے بورڈ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ اِن ساٹھ آدمیوں کو بورڈ میں شامل کر لیا جائے۔

۱۳ اگست کو برکت علی اسلامیہ ہال میں بورڈ کا اجلاس ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ اس لئے ملک برکت علی نے صدارت فرمائی۔ جلسے میں چالیس آدمی موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا استعفیٰ پیش نہ ہوا۔ اور ملک زمان مہدی خاں کو بورڈ کا ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ نشر و اشاعت اور پراپگنڈے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے سپرد یہ کام بھی کیا گیا کہ اس علمت نامے کا مسودہ

تیار کرے جس پر اسمبلی کے مسلم لیگی اُمیدواروں کو اپنے دستخط ثبت کرنا ہونگے۔

ابتداء میں اِس سب کمیٹی کے پانچ ممبر تھے۔ یعنی علامہ اقبال۔ ملک زمان مہدی غلام رسول خاں۔ چودھری افضل حق اور مولوی مظہر علی اظہر۔ لیکن چند روز بعد چار نئے آدمیوں کا اضافہ کیا گیا۔ جن میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ میاں عبدالمجید۔ ملک برکت علی اور عاشق حسین بٹالوی شامل تھے۔

۳۰ ستمبر کو سر سکندر حیات خاں ریزرو بنک سے مستعفی ہو کر واپس لاہور پہونچ گئے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ عام آدمیوں کی طرح بے کار رہتے۔ اِس لئے منصوبہ یہ تیار کیا گیا۔ کہ نواب مظفر خاں بیماری کا عُذر پیش کر کے چار مہینے کی رخصت پر چلے جائیں۔ اور اُن کی جگہ سر سکندر کو ریوینیو ممبر بنا دیا جائے۔ اِس منصوبے کی تیاری میں سب سے بڑا ہاتھ خود پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کا تھا۔ نواب مظفر خاں بالکل تندرست و توانا۔ اور اچھے بھلے تھے۔ یہ خود ساختہ بیماری صرف اِس لئے ظہور میں آئی۔ کہ گورنر کو اندیشہ تھا۔ کہ جب تک سر سکندر حیات خود حکومت کے اعلےٰ منصب پر بیٹھ کر الیکشن کی جنگ نہیں لڑیں گے۔ یونینسٹ پارٹی کی سو فیصد کامیابی محال تھی۔ اب ایک طرف تو سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور دوسری طرف گورنر کے بعد پنجاب کے سب سے بڑے حاکم بھی وہی تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی اِس دوگانہ حیثیت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جس جس حلقے میں یونینسٹ اُمیدوار کا پلڑا اکثر ہلکا نظر آتا تھا۔ وہاں سر سکندر نے اپنے سرکاری عہدے کا پورا وزن ڈال کر اُس پلڑے کو برابر کر دیا۔ آگے چل کر یہ بات واضح کر دی جائے گی۔ کہ

اِس سازش میں گورنر۔ سرسکندر اور پنجاب کے تمام بڑے بڑے سرکاری اہل کار شریک تھے۔ اور اِن لوگوں نے تحریص و ترغیب اور تہدید و تخویف کے تمام حربوں سے مسلح ہو کر۔ ہر اُس شخص کا سر کچلنے کی کوشش کی۔ جس نے یونینسٹ اُمیدوار کی مخالفت کی تھی۔

احراری یوں تو مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اُنہوں نے اِس بورڈ سے جو توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ بظاہر پوری نہیں ہوئیں۔ اُنھیں سب سے بڑی غلط فہمی یہ تھی کہ جناح نے بمبئی کے تاجروں اور اُودھ کے تعلقہ داروں سے کئی لاکھ روپے جمع کئے ہیں جو آئندہ الیکشن میں لیگی امیدواروں کے کام آئیں گے۔ اِس مغالطے میں مبتلا ہو کر چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ یہ سمجھے بیٹھے تھے۔ کہ اِس فنڈ سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ پنجاب کے حصے میں ضرور آئے گا اور یہ ایک لاکھ روپے کی رقم جلسے، جلوسوں کے علاوہ اخباری پراپگنڈے پر خرچ ہو گی۔

احرار کا یہ بھی خیال تھا کہ ملک برکت علی، غلام رسول خاں، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ معروف آدمی ہیں۔ اُنھیں ہائی کورٹ کی پریکٹس سے فرصت ہی کب ہے۔ کہ وہ پنجاب کا دورہ کریں۔ اور شہر بہ شہر دھوم دھام [illegible] دھواں دھار تقریروں کا جادو بکھیریں۔ اِدھر احرار اِس فن میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اور سالہا سال سے اُن کی زندگیاں اِنہی ہنگاموں کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ اِس لئے اُن کا اندازہ تھا کہ جنگ کے فنڈ میں سے پنجاب کو جو

ایک لاکھ روپیہ ملے گا۔ اُس کا بیشتر حصّہ اُنہی کی مرضی اور صوابدید سے خرچ ہو گا۔

عجیب بات ہے کہ سر فضل حسین ایسا سمجھدار آدمی بھی اِس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ کہ جناح نے پارلیمنٹری بورڈ کے لئے کئی لاکھ روپے جمع کر لئے ہیں چنانچہ جب اُنہوں نے آغا خاں سے یونینسٹ پارٹی کے لئے مالی امداد طلب کی۔ تو اپنے خط میں یہ بھی لکھا:

"...... جناح کہتا پھرتا ہے۔ کہ اُس نے بمبئی کے کروڑ پتی تاجروں اور راجہ محمود آباد سے اِس بورڈ کے لئے کئی لاکھ روپے حاصل کر لئے ہیں جناح کی اِن باتوں نے ہماری مشکلات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں کے اخباروں، بالخصوص اُردو اخباروں کی مالی حالت چونکہ ہمیشہ مخدوش رہتی ہے۔ اِس لئے وہ آنے والے الیکشن سے مالی فوائد حاصل کرنے کے لئے ابھی سے منہ کھولے بیٹھے ہیں ...... اِن غیر معمولی حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کہ میں آپ سے اعانت کی درخواست کروں۔"

تعجب ہے کہ سر فضل حسین نے یہ بات کہاں سے سنی تھی۔ کہ بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں اور راجہ محمود آباد نے جناح کو لاکھوں روپے عطا کئے ہیں۔ راقم التحریر کو اچھی طرح یاد ہے کہ مسٹر جناح نے اپنی کسی تقریر یا اپنے کسی بیان میں اشارۃً

ص۱ سوانح عمری ص۳۱۱

کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے پاس لاکھوں کا سرمایہ موجود ہے۔ لاکھوں کا کیا ذکر اُن کے پاس تو چند ہزار کی رقم بھی نہ تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کو اپنی اپنی الیکشن کے مصارف خود برداشت کرنا ہوں گے۔

بہرحال جب احرار کو پتہ چلا کہ پارلیمنٹری بورڈ کے پاس کوئی رقم نہیں ہے تو انہوں نے سوچا کہ اپنے اپنے الیکشن پر اپنی ہی جیب سے خرچ کرنا پڑا تو پھر وہ آئندہ انتخابات میں جناح کا توسّل کیوں اختیار کریں۔ کیا احرار اتنے گئے گذرے ہیں۔ اور کیا پنجاب میں اُن کی اتنی ساکھ بھی باقی نہیں کہ وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ کے بغیر الیکشن کی جنگ بھی نہ جیت سکیں گے؟ ان خیالات سے متاثر ہو کر چودھری افضل حق۔ مولوی مظہر علی اظہر اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ اور اس نتیجے پر پہونچے کہ انہیں خود بخود مسلم لیگ سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کس مسئلہ کو مابہ النزاع قرار دے کر ہم سے علیحدگی اختیار کریں گے۔

جب اسمبلی میں جانے والے مسلم لیگی امیدواروں کا حلف نامہ تیار کرنے کے لئے مقررہ سب کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ تو غلام رسول خاں نے حسب ذیل مسودہ منظوری کے لئے پیش کیا:

"بخدمت آنریری سکریٹری صاحب!

پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ۔ لاہور۔

(ا) میں اپنے آپ کو آئندہ اسمبلی کے انتخاب کے لئے حلقہ .... سے

بطور امیدوار پیش کرتا ہوں۔

(ب) میں مبلغ پچاس روپے (بصورت خواتین امیدوار پچیس روپے) بذریعہ منی آرڈر یا چیک یا نقد اس درخواست کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

(ج) میں اقرار صالح کرتا ہوں۔ کہ میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کا اپنی نامزدگی کے متعلق پابند رہوں گا۔

(د) میں حلفاً اقرار کرتا ہوں۔ کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے پروگرام کو منظور کرتا ہوں۔ اور ہر ممکن طریقے سے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا۔

(ہ) میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے آئندہ اسمبلی کے لئے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا۔ تو میں کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یا اپنے طور پر اسمبلی کے انتخاب کا خواہاں نہیں ہوں گا۔

(و) میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ میں اپنی حیثیت میں اسلامی اوقاف کی حفاظت حسب منشائے شریعت کروں گا۔

(ز) میں اقرار صالح کرتا ہوں۔ کہ میں ہر ممکن طریقے سے مسجد شہید گنج کی واگذاری کے لئے کوشاں ہوں گا۔ اور اس مقدس اور قدیم مسجد کی مسماری۔ اور اُسے غیر اسلامی طور پر استعمال کرنے کی جو مذموم اور قبیح حرکت کی گئی ہے اُس کے تدارک کی پوری کوشش کروں گا۔"

سب کمیٹی کے احرار ممبروں کو مذکورہ بالا مسودہ کی شق (ہ) منظور نہیں تھی لیکن اس شق کی معقولیت اس قدر نمایاں اور بدیہی تھی۔ کہ انہیں اختلاف کی

جرأت نہ ہو سکی۔ تاہم جب غلام رسول خاں نے مسجد شہید گنج کے بارے میں شق (ز) پڑھی تو مولانا حبیب الرحمٰن چیخ کر بولے۔ "یہ شق احرار کو پریشان کرنے کے لئے رکھی گئی ہے۔"

اُن دنوں احرار کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ مسجد شہید گنج کے نام سے بدکتے تھے۔ اور عام مسلمانوں میں اُن کی ہوا بگڑ جانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ جب جولائی ۱۹۳۵ء میں یہ مسجد مسمار کی گئی۔ تو احرار نے کسی قسم کا قدم اُٹھانے کی بجائے سکوتِ مصلحت آمیز اختیار کر لیا تھا۔ گذشتہ ایک سال سے پنجاب کے مسلمانوں میں سب سے بڑا ہنگامی مسئلہ یہی تھا۔ کہ شہید گنج کو کیونکر واگذار کرایا جائے۔ اسی غرض کے لئے سول نافرمانی شروع کی گئی۔ اور تحریک کے بڑے بڑے کارکن جیلوں میں چلے گئے اسی غرض کے لئے مسٹر جناح کو لاہور آ کر حکومت سے عارضی طور پر مصالحت کرانا پڑی۔ اور اسی غرض کے لئے عدالت میں قانونی چارہ جوئی کی گئی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ مسلم لیگ ایسے اہم مسئلے سے چشم پوشی اختیار کرتی۔ درآں حالیکہ مسلمان اپنی تمام قومی جماعتوں سے توقع رکھتی تھی۔ کہ جب تک وہ مسجد کی بازیابی کے لئے کوئی حتمی جدوجہد نہ کریں گی۔ انھیں الیکشن میں مسلمانوں سے ووٹ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

غلام رسول خاں نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ "مسجد شہید گنج کی بازیابی پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے اس مطالبہ کو ہم کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کل الیکشن کے موقع پر کسی جلسہ میں مسلمان ہم سے یہ پوچھتے ہیں کہ آیا مسلم لیگ نے مسجد کو واگذار کرا لیا

کی جا تی ہے یا نہیں۔ تو کیا ہم اِس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیں گے؟"

مولانا حبیب الرحمٰن فوراً بولے "بہت اچھا۔ مجھے اِس شق پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اِس کے ساتھ یہ شق بھی بڑھا دیجئے۔ کہ مسلم لیگی امیدواروں کو اقرار نامہ لکھنا چاہیئے کہ وہ اسمبلی میں جا کر مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔"

سچی بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے یہ نئی شق پیش کر کے ہمیں حیران ہی نہیں بلکہ پریشان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی شخص مرزائیت یا غیر مرزائیت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مسلم لیگ جیسی قومی اور سیاسی جماعت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مرزائیت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کرے۔ ایک لایعنی بات تھی۔

زماں مہدی خان اُس وقت جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ اُنہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن سے کہا کہ "بے سود جھگڑا نہ کیجئے۔ یہ نئی شق پیش کرنے کا یہاں کیا موقع محل ہے؟"

مولانا نے جھک کر فرمایا "جس طرح مسجد شہید گنج کی بازیابی آج پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی متفقہ مطالبہ ہے۔ کہ مرزائیوں کو مسلمانوں میں سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا۔ تو چلئے ہم اِسی وقت موچی دروازہ کے باغ میں ایک جلسۂ عام کر کے مسلمانوں سے استصواب کر لیتے ہیں۔"

مولانا کی رائے درست تھی۔ احرار نے سالہا سال کے پراپگنڈے سے

مرزائیت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر رکھی تھی۔ اور اگر اس امر کے متعلق کسی جلسہ عام میں استصواب کیا جاتا۔ تو مسلمان یقیناً مرزائیت کے خلاف رائے دیتے چنانچہ مجبوراً غلام رسول خاں کو حلف نامہ میں ایک نئی شق کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی "میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا۔ تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کے لئے انتہائی کوشش کروں گا۔"

دوسرے روز غلام رسول خاں حلف نامے کا مسودہ لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انھیں سارا واقعہ سنایا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے مرزائیت کے متعلق نئی شق بڑھائی جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا اور نہ کوئی اعتراض کیا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے کے بعد سب کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا۔ جس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اگر پارلیمنٹری بورڈ نے کسی شخص کی درخواست منظور کر کے اُسے آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کی اجازت دیدی تو اس امیدوار کا فرض ہو گا کہ وہ پانسو روپے بورڈ کے فنڈ میں جمع کرائے۔

چودھری افضل حق نے اس مسئلے کی مزید وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا کہ "یہ پانسو روپے کس مقصد سے جمع کرائے جائیں گے"؟

غلام رسول خاں نے جواب دیا کہ "بورڈ کو تمام اُمیدواروں کی الیکشن کے سلسلے میں مختلف قسم کے اشتہارات اور پمفلٹ طبع کرانا ہوں گے۔ پھر ان امیدواروں کی حمایت میں مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان کے انتخابی حلقوں میں

دورہ کرنا ہو گا۔ آخر ان کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا"؟

چودھری افضل حق بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ کہنے لگے "واہ حضرت۔ پانچ سو روپے صرف اشتہارات اور پمفلٹ کے لئے۔ الیکشن کا خرچ الگ۔ میں تو پانچ سو میں الیکشن بھی لڑ سکتا ہوں۔ اور شادی بھی کر سکتا ہوں"۔

میں اتفاق سے چودھری صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ، خدا کے لئے دونوں کام کیجئے"۔

احرار اس پانچ سو کی شرط پر بگڑ گئے۔ اور چند روز کے بعد انہوں نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفٰی دے دیا۔ یوں مسلم لیگ اور احرار کا عارضی اتحاد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

مسلم لیگ کی تحریک بڑھنا شروع ہوئی۔ تو دوسرے لوگوں نے بھی اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ پارلیمنٹری بورڈ کی رکنیت کا حلقہ وسیع ہونے لگا۔ نئے آنے والوں میں سردار مظفر علی خاں قزلباش بیرسٹر۔ محمد عظیم خاں ایڈووکیٹ۔ شیخ محمد جان سوداگر انارکلی۔ حافظ فیروز الدین سوداگر برانڈرتھ روڈ۔ شیخ محمد حسن ریٹائرڈ سینیئر سب جج اور سید تصدق حسین بھیروی وغیرہ قابل ذکر تھے۔ اب تک پارلیمنٹری بورڈ کا کوئی مستقل دفتر نہیں تھا۔ غلام رسول خاں ٹمپل روڈ پر ۱۲ بنگلے میں رہتے تھے۔ وہیں اکثر لکھنے پڑھنے کا کام کیا جاتا تھا لیکن چونکہ الیکشن روز بروز قریب آ رہے تھے۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ الگ دفتر قائم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ایڈمنڈ روڈ پر چند کمروں کا ایک مختصر سا مکان کرایہ پر لے لیا گیا۔ اور محمد عظیم خاں کو اس دفتر کا انچارج مقرر کیا گیا

محمد عظیم خاں میرے بڑے پرانے اور عزیز دوست تھے۔ وہ لاہور میں وکالت کرتے تھے اور میونسپل کمشنر بھی تھے۔ اُن کے دادا خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں اپنے زمانے میں لاہور کے سب سے معزز، نیک نام اور سربرآوردہ لوگوں میں شامل ہوتے تھے۔ افسوس کہ عظیم عین جوانی میں انتقال کر گئے۔

یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ محمد عظیم خاں کے علاوہ ذیل کے اصحاب بھی باری باری سے دفتر میں کام کیا کریں گے۔ غلام رسول خاں۔ ملک زمان مہدی خلیفہ شجاع الدین ملک برکت علی۔ سردار مظفر علی خاں قزلباش اور عاشق حسین بٹالوی۔ اسکے علاوہ ایک فنانس کمیٹی بھی تشکیل کی گئی۔ جس میں اصحاب ذیل شریک تھے۔ مظفر علی خاں قزلباش۔ میاں عبدالمتان۔ سید محمد علی جعفری۔ شیخ جان محمد۔ شیخ محمد حسن۔ حافظ فیروز الدین۔ ملک نور الٰہی۔ ملک زمان مہدی میاں عبدالمجید اور غلام رسول خاں۔

پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا مینی فسٹو مرتب کرنے۔ اور اُس کی صوبے بھر میں نشرو اشاعت کرنے کے لئے بھی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں یہ لوگ شامل تھے۔ سید تصدق حسین بھیروی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ مظفر علیخاں قزلباش۔ شیخ محمد حسن۔ محمد عظیم خاں۔ عاشق حسین بٹالوی۔ ملک برکت علی۔ ملک زمان مہدی اور غلام رسول خاں۔

ایک کمیٹی پراپاگنڈے کے لئے۔ اور ایک کمیٹی اِس غرض کے لئے بنائی گئی کہ پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کرکے۔ عوام کو پارلیمنٹری بورڈ کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرے۔ اِن کمیٹیوں میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ کچھ اور لوگ

بھی شامل ہوئے۔ مثلاً میاں محمد شفیع سکرٹری انٹر کالجیئیٹ مسلم براد رہڈ۔ مولانا عبدالحنان۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ پیر تاج الدین وغیرہ۔

ظاہر ہے علامہ اقبال کسی کمیٹی میں بھی شامل نہیں تھے۔ اور اُن کی صحت کے پیشِ نظر یہی مناسب خیال کیا گیا تھا۔ کہ اُنھیں اِس ضمن میں حتی الوسع زحمت نہ دی جائے۔ لیکن ہر کمیٹی کے کام کی رُوداد سے اُن کو باخبر رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ غلام رسول خاں، ہر دوسرے روز، اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معاملات کی اطلاع کرآتے تھے۔

علامہ اقبال اپنے ۹ رجون ۱۹۳۶ء کے خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں۔

"..... مجھے اُمید ہے کہ جو اعلان بورڈ شائع کرے گا۔ اُس میں پوری سکیم کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح بحث کی جائے گی۔ اور اِس سلسلہ میں مخالفوں کی طرف سے جو اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ اُن کا بھی شافی جواب موجود ہوگا۔ بورڈ کو چاہیئے کہ اپنے اِس بیان میں اس امر کی وضاحت بھی کرے۔ کہ آج ایک طرف حکومت ہے اور دوسری طرف ہندو۔ اور اِن دونوں کے درمیان خود مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے۔ بورڈ کا فرض ہے۔ کہ اِس بیان کے ذریعہ سے مسلمانوں کو متنبہ کر دیا جائے۔ کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ کی موجودہ سکیم کو منظور نہ کیا۔ تو گزشتہ پندرہ سال میں ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ تمام تر ضائع کر بیٹھیں گے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ مسلمان خود اپنے ہاتھ سے اپنے قومی شیرازے کو پارہ پارہ کر دیں گے۔

میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں گا۔ اگر آپ یہ بیان اخبارات
کو دینے سے پہلے مجھے دکھا دیں۔" [1]

ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ بالا خط مسٹر جناح کو دہلی بھیجا تھا۔ مسٹر جناح اُس وقت پارلیمنٹری بورڈ کے افتتاحی اجلاس کے لئے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے اور ہوٹل میں مقیم تھے۔ جس بیان کی اہمیت کا ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں بار بار ذکر کیا ہے۔ اور جسے وہ اخبارات میں چھپنے سے پہلے خود دیکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا مینی فسٹو تھا۔ اسی مینی فسٹو میں مسلم لیگ نے اپنی آئندہ پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ یہی مینی فسٹو آئندہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا سنگ بنیاد بننے والا تھا۔ اور اسی مینی فسٹو سے اپنے اور بیگانے مسلم لیگ کے سیاسی موقف سے آگاہ ہونے کا حق رکھتے تھے۔

یہ پورا مینی فسٹو اس کتاب کے ضمیمہ میں درج کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک ہندوستان کی آزادی۔ ہندو مسلم اتحاد۔ برطانوی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد۔ اور اقتصادی بدحالی کو دفع کرنے کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ کا مینی فسٹو کانگرس کے مینی فسٹو سے ترقی پسندی میں کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ مسلم لیگ نے اُس خود غرض رجعت پسند اور حکومت کے حاشیہ نشین گروہ کی بھی مذمت کی تھی۔ جو ۱۹۲۰ء سے صوبائی حکومتوں پر قابض چلا آرہا تھا۔ اور جس نے اپنی انتہائی کوشش کی کہ ...

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

پہ اعتماد کرنے کی بجائے ہمیشہ سرکاری بلاک پر انحصار کیا تھا ۔ لیگ نے یہ کہہ کر کہ :

" .... مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نفاذ کے بعد یہ قومی مطالبہ روز بروز تقویت پکڑنے لگا ۔ کہ ہندوستان میں جلد از جلد مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو جانی چاہیئے ۔ مسلمان اس مطالبہ میں باقی اقوام کے ہم نوا تھے ۔ اور آزادی وطن کی جدّ و جہد میں وہ کسی طرح بھی ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے ...... لیگ اب بھی اس مطالبے پر قائم ہے کہ موجودہ صوبائی ۔ اور مجوّزہ مرکزی آئین کو فوراً بدل کر اس کی جگہ جمہوری اور خود اختیاری حکومت استوار کی جائے ۔"

گویا کانگرس کو اپنا دستِ تعاون پیش کیا تھا ۔

لیگ کے اس مینی فسٹو میں جن اہم امور پر خصوصیت سے زور دیا گیا تھا وہ یہ تھے ۔

۱ :۔ تمام تشدد آمیز قوانین کی تنسیخ ۔

۲ :۔ عوام کی بنیادی آزادی میں خلل انداز ہونے ۔ اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کرنے والے قوانین کا انسداد ۔

۳ :۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اخراجات میں تخفیف ۔

۴ :۔ ہندوستان کی فوج کو قومی فوج بنانا ۔

۵ :۔ ہندوستانی صنعت و حرفت کا فروغ ۔

۶:- ہندوستان کی اقتصادی خوش حالی کے لئے شرحِ سکہ اور شرحِ مبادلہ میں ضروری ترمیم۔

۷:- دیہاتی آبادی کی معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح۔

۸:- دیہاتی آبادی کے قرضے میں تخفیف۔

۹:- ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دینا۔

۱۰:- ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کرنا۔

اسی مینی فسٹو کو دیکھ کر پروفیسر کوپ لینڈ نے لکھا تھا۔ کہ:

"....مسلم لیگ کے انتخابی مینی فسٹو، جو مسٹر جناح کی زیرِ ہدایت تیار کیا گیا تھا، اور کانگرس کے مینی فسٹو میں کسی ضروری اور اہم امر کا اختلاف نہیں تھا۔ مجوزہ فیڈرل حکومت کی سخت مذمت کی گئی تھی۔ اور اگرچہ صوبائی آئین کو بھی قابلِ اعتراض ٹھہرایا گیا تھا —— بایں ہمہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ اس آئین سے امکانی حد تک فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ لیگ کے مینی فسٹو کا اہم ترین جزو وہ ہے۔ جہاں میثاقِ لکھنؤ کو ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ کا سب سے درخشاں باب قرار دیا گیا ہے۔..... اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ مسٹر جناح مسلم لیگ اور کانگرس کے اسی اتحاد کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے جو ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا تھا۔" ؎

؎ INDIA: A RESTATEMENT By, Sir Reginald Coupland, Page 152

پروفیسر کوپ لینڈ کی یہ رائے بالکل درست ہے۔ مسٹر جناح اس وقت شدت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ صوبائی حکومتوں کو اُن رجعت پسند عناصر سے پاک کیا جائے۔ جو گذشتہ سولہ سال سے اُن پر قابض چلے آرہے تھے۔ اور مسلمانوں کے ترقی پسند عنصر اور کانگرس کے درمیان اتحاد قائم کر کے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خواب بہرحال شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ سر دست اسی قدر اشارہ کر دینا کافی ہے۔ اِس کتاب کے ایک آئندہ باب میں اِس موضوع پر مفصّل بحث کی جائے گی۔

پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے جو مینی فسٹو شائع کیا۔ اُس کا پروگرام بھی کم و بیش اِنہی خطوط پر مرتب کیا گیا تھا۔ جو مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے قائم کئے تھے۔ مثلاً قومی مفاد کے تحت یہ امور درج تھے۔

(۱) ٹیکسوں کے گراں بوجھ میں کمی (۲) نظامِ حکومت کے اخراجات میں کمی اور قومی ترقی کے مختلف شعبوں کے لئے معتد بہ رقوم کا مہیّا کرنا (۳) عوام کی بنیادی آزادی کے مخالف قوانین کا اِنسداد۔ اور اُن قوانین کی تنسیخ۔ جو صوبے کی اقتصادی تباہ کاری کا باعث ہیں۔ (۴) تشدّد آمیز قوانین کی تنسیخ (۵) صوبے کے تمام طبقوں کے درمیان اتحاد، محبّت اور باہمی تعاون کے جذبات کو ترقی دینا۔

تنظیم اور ترقی زراعت کے تحت یہ امور درج تھے:

(۱) مقروض کاشتکاروں کے قرض کا بوجھ کم کرنے کے لئے امدادِ باہمی کے بنکوں کا قیام۔ اور اِن بنکوں کو ہندوستان کے ریزرو بنک سے الحاق کا رہن

اراضی کی غرض سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے مزید آسانیاں بہم پہونچانا۔ (۲) مالیہ کی موجودہ شرح میں کمی۔ اور حتی الامکان مالیہ کی تشخیص پر انہی اصولوں کا اطلاق کرنا جن کی بنا پر انکم ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے۔ (۳) منڈیوں۔ منڈی بورڈوں۔ ڈپوؤں اور سٹوروں کا قیام (۴) موجودہ پیداوار کو بڑھانے کے لئے ایسے اداروں کا قیام۔ جہاں زراعت کے متعلق تجربات ہوں۔ (۵) ایسے اداروں کا قیام جہاں کاشتکاروں کو پمفلٹوں۔ لکچروں اور ریڈیو کے ذریعے منڈیوں کے حالات۔ اجناس کے نکاس اور زراعت کے جدید طریقوں کے متعلق ضروری اطلاعات بہم پہونچائی جا سکیں۔ (۶) پنجاب کی پیداوار کو بیرونی اور غیر ملکی مقابلے سے محفوظ رکھنے کا انتظام۔ اور غیر ممالک کے زرعی حالات کے مطابق معلومات بہم پہونچانا۔ (۷) گھوڑوں اور دیگر مویشیوں کی ترقی نسل کا انتظام۔ (۸) مالکوں اور مزارعوں کو بیاج اور متعصبانہ سرمایہ داروں کے ظلم سے محفوظ رکھنا۔ (۹) قانون انتقال اراضی پنجاب کی حمایت۔ (۱۰) ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا۔ اور گھریلو صنعتوں کا رواج۔ (۱۱) ٹکنیکل اداروں کا قیام۔

مزدوروں کی فلاح و بہبود کے تحت یہ امور درج تھے:

(۱) معقول اجرتوں کا بندوبست (۲) کم سے کم اجرت مقرر کرنے کے لئے مختلف بورڈ قائم کرنا۔ (۳) کام کرنے کے اوقات میں کمی (۴) حادثات کیلئے معقول معاوضے کا بندوبست۔

معاشرتی اصلاحات کے تحت یہ امور درج تھے:

(۱) مسلمانوں کے اقتصادی اور تمدنی حالات کو بہتر بنانے کے لئے مؤثر اقدام (۲) مسلمانوں کی بہتری کے لئے صوبے کے تمام ذرائع سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے عملی اقدام۔ اور دیہاتی اور قصباتی مفاد کی مصنوعی تفریق کو دور کر کے مسلمانوں کو قومی اتحاد کے سلسلے میں منسلک کرنے کی سرگرم کوشش (۳) پس ماندہ اقوام کی ترقی (۴) ہسپتالوں، ڈسپنسریوں۔ اور زچہ خانوں کا قیام۔ جہاں مریض بچوں اور عورتوں کے لئے خاص انتظام ہو۔ (۵) دیہات اور قصبات میں صفائی کا بہتر انتظام۔ (۶) پینے کے لئے پاکیزہ اور صاف پانی کی فراہمی (۷) سڑکوں کی تعمیر اور درستی۔ (۸) روشنی کے بہتر انتظامات۔ (۹) شراب اور دیگر منشی اشیاء کے استعمال کا انسداد (۱۰) ایسی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا۔ جن سے بے روزگاری دور ہو۔ مثلاً بے روزگاری کا بیمہ۔ بیروزگاروں کو کام مہیا کرنے کے اداروں کا قیام۔ اور غریب لوگوں کی امداد کے قوانین۔

اسلامی قانون اور تمدن کی حفاظت کے ذیل میں یہ امور درج تھے:

(۱) تمام مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت (۲) اسلامی تمدن کی حفاظت کے لئے مؤثر اقدام (۳) جملہ اسلامی اوقاف کی بہتر تنظیم کے لئے شرع اسلامی کے مطابق مؤثر قوانین پاس کرانا۔ (۴) مساجد اور دیگر مقدس مقامات کی مرمت اور حفاظت کے لئے مؤثر قوانین پاس کرانا (۵) اردو زبان اور اردو رسم الخط کا تحفظ و ترقی۔

تعلیم کے ذیل میں یہ امور درج کئے گئے تھے۔

(۱) ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دینا (۲) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق

ایک وسیع النظر پالیسی اختیار کرنا۔ اور لوگوں کی ضروریات کے مطابق طریق تعلیم تجویز کرنا (۳) صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو ترقی دینا۔ (۴) پنجاب یونیورسٹی کے دستور اساسی اور نظام میں ایسی ضروری اصلاحات کرانا جن سے یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ اور دوسری متعلقہ مجالس اور ملازمتوں میں مسلمانوں کو بھی حصّہ نمائندگی حاصل ہو جائے۔

سرکاری ملازمتوں کے متعلق یہ امور درج تھے:

(۱) سرکاری ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر۔ اور جلد از جلد اُن کے کما حقہٗ تناسب کا تعین (۲) حکومت خود اختیاری کے اداروں میں مسلمانوں کو اُن کا جائز تناسب۔ اور حصّہ نمائندگی دلانا۔

آخر میں یہ شق درج تھی۔ کہ نئے دستور اساسی سے پورا فائدہ اُٹھائے۔ اور آئینی ترقی کے حصول کے لئے صوبے کی مختلف قوموں۔ اور سیاسی جماعتوں میں یکجہتی اور تعاون کو بڑھانا۔ اور اس امر کا قطعاً یقین کرا دینا۔ کہ ہر فرقے اور ہر جماعت کو اپنے معتقدات اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی ہو گی اور کسی اقلیت کو اپنے مذہب یا قلت تعداد کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے گا۔

جب پنجاب میں انتخابات کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو علامہ اقبال نے محسوس کیا۔ کہ مسٹر جناح کو پھر ایک بار یہاں تشریف لانے کی تکلیف دینا چاہئے تاکہ مسلم لیگ کی انتخابی مہم کا آغاز بھی اُنہی سے کرایا جائے۔ مسٹر جناح نے بڑی خوشی سے یہ دعوت قبول فرمائی۔ اور ۹ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور میں رونق افروز ہوئے۔ اس سے قبل جب وہ جون میں پارلیمنٹری بورڈ کے

افتتاحی اجلاس کے لئے لاہور آئے تھے۔ تو ہم صرف چھ، سات آدمی اُن کے استقبال کے لئے سٹیشن پر گئے تھے۔ غلام رسول خاں کی خواہش تھی۔ کہ اب کی استقبال بہتر طریق سے ہونا چاہیئے۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ احرار یا مجلسِ اتحادِ ملت کی طرح مسلم لیگ کے پاس باوردی رضا کاروں کا کوئی جیش نہیں تھا۔ اِس سلسلہ میں راجہ عبد العزیز نے بڑی مستعدی سے کام لیا۔ وہ عین وقت پر لاہور چھاؤنی کی انجمن اسلامیہ کے باوردی رضا کاروں کا ایک پورا دستہ لے کر آ گئے۔ اِس طرح مسٹر جناح کی تشریف آوری کے وقت لاہور کے سٹیشن پر اچھی خاصی رونق اور چہل پہل ہو گئی۔ راجہ عبد العزیز لاہور ہائی کورٹ کے بار روم میں ہیڈ کلرک تھے۔ لیکن ملازمت کے معیّنہ اوقات کے بعد۔ اُن کا بیشتر وقت لیگ کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔

مسٹر جناح نے اِس مرتبہ دو ہفتے لاہور میں قیام فرمایا۔ پھر چند روز کے لئے پشاور بھی تشریف لے گئے تھے۔ ۱۱ اکتوبر کی شام کو دہلی دروازہ کے باغ میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہوا۔ علّامہ اقبالؔ کا پختہ ارادہ تھا۔ کہ وہ اِس جلسہ کی صدارت فرمائیں گے۔ لیکن اُسی شام اُن کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ اِسی لئے ملک زمان مہدی خان نے صدارت کی۔ جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا۔ حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار، ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ مسٹر جناحؔ نے انتخابی مہم کا آغاز کرتے ہوئے۔ ایک نہایت زوردار تقریر کی۔ جو اِس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کی گئی ہے۔

مسٹر جناحؔ کی یہ تقریر اِس اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ کہ اِس میں انھوں نے

نہایت اختصار لیکن جامعیت سے وہ تمام اصول بیان کر دیئے تھے جن کی بنا پر مسلم لیگ پنجاب کے انتخابات میں حصّہ لینے کا عزم رکھتی تھی۔ پوری تقریر میں ایک لفظ بھی ہندوؤں سکھوں اور کانگرس کے خلاف نظر نہیں آتا۔ مسٹر جناح کے تمام حملوں کا ہدف یونینسٹ پارٹی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جہاں تک اِس صوبے کا تعلق ہے، مسلم لیگ کو اگر کسی جماعت سے جنگ پیش آنے والی ہے۔ تو وہ یونینسٹ پارٹی تھی۔ اس تقریر کے دو، چار جملے یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"...... کیا میں سر سکندر حیات خاں سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر وہ اہلِ پنجاب کے غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لئے اِس قدر بیتاب تھے۔ تو آج سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کیا انہوں نے ریزرو بنک کی ملازمت اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے قبول کی تھی؟ اس بلند مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے اس سے پہلے کیوں استعفےٰ نہ دیا؟ میں پوچھتا ہوں کہ نواب مظفّر خاں کی جگہ سر سکندر حیات خاں کو ظلمان وزارت سنبھالنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ کہ یہ تمام ردّ و بدل صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ارکان میں وزارتیں اور عہدے تقسیم ہوتے رہیں۔ یہ پارٹی جو خود غرض اور طامع افراد پر مشتمل ہے۔ اور جسکو حکومت پنجاب کی سرپرستی اور امداد بھی حاصل ہے۔ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کی جی کھول کر مذمت کی جائے"

جب مسٹر جناح نے یونینسٹ پارٹی پر پے در پے حملے کئے

تو لاہور کی فضا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اردو اخبارات میں سے صرف روزنامہ احسان لیگ کا حامی تھا۔ انگریزی اخباروں میں سول اور ٹریبیون کبھی کبھار لیگ کی خبر شائع کرتے تھے۔ سول میں آئے دن سیّد نور احمد۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور نواب زادہ خورشید علی خاں کے مضامین چھپتے تھے۔ جن میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف سخت زہر اُگلا جاتا تھا مسٹر جناح کی مذکورہ بالا تقریر کے جواب میں احمد یار خاں دولتانہ نے سول میں لکھا:

"... میرے معزز دوست مسٹر جناح لاہور کے ووٹروں کو ہمارے خلاف مشتعل کرنے میں مصروف ہیں۔ اور تعجب ہے کہ وہ یہ سب کچھ اس دعوے سے کر رہے ہیں۔ کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد ہو۔ اور پنجاب میں گورنر کی وزارت نہ قائم ہونے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح جس کام کا ایک دفعہ ارادہ کرلیں۔ پھر اُن کو اس کام سے باز رکھنا ممکن نہیں۔ تاہم میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مسٹر جناح ہم سے خواہ مخواہ مفت میں جنگ مول لے رہے ہیں۔ ہم اُن سے لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ ہماری مرضی کے خلاف ہمیں جنگ پر مجبور کر رہے ہیں۔ ہم تو اُن سے مفاہمت کے متمنی تھے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی قسم کے زبانی سمجھوتے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے۔

" اگر مسٹر جناح نے اپنی موجودہ مہم کو ترک نہ کیا۔ تو مجھے اندیشہ ہے کہ اُنھیں پنجاب میں سوائے ناکامی اور مایوسی کے کچھ حاصل نہ

ہوگا۔ کچھ بعید نہیں۔ کہ مسٹر جناح کی اِس قابلِ اعتراض روش سے تنگ آکر۔ آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے نمائندے۔ مسلم لیگ گروپ میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔ اور اُس کی بجائے اِنڈی پنڈنٹ رہنا پسند کریں۔ یا پھر لیگ کے مقابلے میں دوسری جماعتوں سے مِل کر کسی اقتصادی پروگرام کی بنا پر علیحدہ پارٹی بنا لیں"

جب دولتانہ کا یہ بیان شائع ہوا۔ تو مسٹر جناح پشاور میں تھے۔ اُنہوں نے وہیں سے سول ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر کو ایک طویل خط لکھ کر احمد یار خاں دولتانہ کے اِس بیان کی دھجیاں اُڑا دیں۔ اُنہوں نے فرمایا:

"..... مسلم لیگ کے جس پروگرام پر مَیں لیگ کے صدر کی حیثیت سے آج کل عمل کر رہا ہوں۔ یہ پروگرام آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس بمبئی میں ایک باضابطہ قرارداد کے ذریعے طے کیا تھا۔ جس وقت یہ قرارداد منظور ہوئی تھی۔ تو احمد یار خاں دولتانہ اجلاس میں موجود تھے۔ اور انہوں نے اِس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ کیا اُس وقت اُنھیں پنجاب کے حالات کا علم نہیں تھا۔ یا کیا اُس وقت اُنہوں نے پنجاب کی سیاست کا تجزیہ نہیں کیا تھا؟ بے شک یہ صحیح ہے۔ کہ جب میں کسی طے شدہ پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا عہد کر لیتا ہوں۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اُس پروگرام کی خلاف ورزی۔ یا اُس پروگرام سے بدعہدی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی

ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنھیں اِس قسم کی بدعہدی، خلاف ورزی اور وعدہ شکنی کرنے میں ضمیر کی کوئی سرزنش محسوس نہیں ہوتی ...... میں احمد یار خاں دولتانہ سے پوچھتا ہوں۔ کہ وہ کون سا زبانی سمجھوتہ تھا۔ جو اُنہوں نے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے مجھ کو پیش کیا تھا۔ اور جسے میں نے قبول کرنے سے انکار کیا ہے؟ یہ بڑا اہم معاملہ ہے اور اُن کا فرض ہے۔ کہ وہ کھُلے بندوں عوام کو بتائیں کہ یونینسٹ پارٹی کے کس رُکن نے اپنی پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے، میرے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی خواہش کی تھی ..... مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ اگر مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ خواہ مخواہ جنگ جاری رکھی۔ تو آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے مسلمان نمائندے۔ لیگ کے خلاف کسی اور پارٹی سے تعاون کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد یار خاں دولتانہ کے یہ الفاظ اُن کے ارادوں کی غمازی۔ اور اُن کی نیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ مقتدر آزماؤں کا یہ بے ضمیر جتھا۔ جسے یونینسٹ پارٹی کا نام دیا گیا ہے۔ اگر برسرِ اقتدار ہو گیا۔ تو کیا پنجاب اور کیا مرکز دونوں جگہ یہی کچھ کرے گا۔" [1]

۱۳/اکتوبر کو محمد عظیم خاں نے مسٹر جناح کے اعزاز میں، اپنے مکان پر چائے

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء

کی ایک پرتکلف دعوت دی۔ یہاں بھی مسٹر جناح نے ایک مختصر لیکن بہت زور دار تقریر کی اور مسلم لیگی کارکنوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ کہ آئندہ الیکشن کے لئے ضروری سرمایہ فراہم کریں۔ چنانچہ اُسی تقریب میں ملک زمان مہدی خان۔ خلیفہ شجاع الدین اور ملک برکت علی نے اپنے حصے کا پانچ پانچ سو روپیہ ادا کر دیا۔ ۱۴ راکتوبر کو ڈی۔ اے۔ وی کالج۔ سناتن دھرم کالج۔ دیال سنگھ کالج وغیرہ کے ہندو طلبہ نے مسٹر جناح کے اعزاز میں ایک جلسہ لاجپت رائے ہال میں منعقد کیا۔ جس کی صدارت سر منوہر لال نے فرمائی۔ اِس جلسہ میں سر منوہر لال کی تحریک پر حاضرین نے بالاتفاق یہ قرارداد منظور کی۔ کہ مسٹر جناح ہندوستان کے بہت بڑے اور قابل فخر محبّ وطن لیڈر ہیں۔ [1]

جب پنجاب میں یہ کچھ ہو رہا تھا۔ تو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ میں بھی ردّ و بدل جاری تھا۔ یو۔ پی سے نواب چھتاری۔ سر محمد یوسف اور نواب زادہ لیاقت علی خاں مرکزی بورڈ کے ممبر نامزد کئے گئے تھے۔ لیکن اب اِن تینوں نے بورڈ سے استعفٰے دے دیا۔ اور مسلم لیگ کی بجائے نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یو۔ پی کی یہ ایگریکلچرل پارٹی گویا پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا مثنیٰ اور ہمزاد تھی۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کے استعفے نے عجب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ ابھی چند مہینے ہوئے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب کئے گئے تھے

---

[1] سول ملٹری گزٹ مورخہ ۱۵ راکتوبر ۱۹۳۶ء

اب اُن کے استعفےٰ کے بعد لیگ کا کوئی سکریٹری نہیں تھا۔ بہار سے سیّد حسین امام اور سیّد عبدالعزیز نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفےٰ دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر بلا وجہ مسلم لیگ کے خلاف سب و شتم کا افسوسناک سلسلہ شروع کر دیا۔ اور مسٹر جناح کو مجبوراً انہیں پارلیمنٹری بورڈ سے نکال دینا پڑا۔

لاہور کے اردو اخباروں میں، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ صرف روزنامہ احسان لیگ کا حامی تھا۔ اِس لئے مسلم لیگ کے پراپا گنڈے کا تمام تر دارو مدار احسان پر تھا۔ اِس موقعہ پر ملک برکت علی نے بہت بڑی قربانی کی۔ اُنہوں نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے صرف کر کے انگریزی کا ایک ہفت روزہ اخبار نیو ٹائمز جاری کرا دیا۔ علّامہ اقبال نے بڑی خوشی سے اِس اخبار کی سرپرستی قبول فرمائی۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہے۔ اخبار کے سرِ ورق پر اُن کا نام نامی بطور سرپرست چھپتا رہا۔ نیو ٹائمز ۱۹۳۹ء کے اوائل تک جاری رہا۔ لیکن چونکہ خسارہ بے حد ہو رہا تھا۔ اِس لئے مجبوراً بند کرنا پڑا۔ تاہم اِس اخبار نے اپنی سوا دو سال کی زندگی میں بڑے زبردست مقالے اور مضامین شائع کئے۔ مسٹر جناح التزاماً اِس کا مطالعہ فرماتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں اُن کے اور پنڈت نہرو کے درمیان مراسلت ہوئی۔ اور پنڈت نہرو نے مسلمانوں کے مطالبات سے تجاہلِ عارفانہ کا اظہار کیا۔ تو مسٹر جناح نے اُن کو نیو ٹائمز کا وہ پرچہ بھیج دیا۔ جس میں اِسی موضوع پر ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

اسی دوران میں ایک روز سردار احمد بخش خاں ہمارے سیکرٹری غلام رسول خاں کے پاس آئے۔ احمد بخش سر سکندر حیات کے بہت قریبی عزیز تھے۔ اور غلام رسول کے پرانے دوست بھی تھے۔ دونوں بیرسٹری کے زمانے میں اکٹھے ہی انگلستان میں رہ چکے تھے۔ احمد بخش خاں نے غلام رسول کو سر سکندر کا یہ پیغام دیا کہ اگر لیگ پارلیمنٹری بورڈ الیکشن سے دست بردار ہو جائے۔ تو مسلم لیگ کے دو ممبروں کو سر سکندر بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھیجنے کو تیار ہیں۔ لیکن شرط یہ تھی کہ ملک برکت علی کو اسمبلی کی رکنیت قطعاً نہیں دی جائے گی۔ بات یہ تھی کہ سر سکندر اور ملک برکت علی کے تعلقات بہت کشیدہ تھے اور یہ کشیدگی ۱۹۲۱ء سے چلی آرہی تھی۔ جب سر سکندر کے انتخاب کے خلاف ان کے حریف سر محمد امین شمس آبادی نے اپیل کی تھی۔ تو ملک برکت علی نے اس اپیل کی پیروی کر کے۔ سر سکندر کو پنجاب کونسل سے خارج کرا دیا تھا۔ ملک برکت علی نے اس اپیل میں یہ مطالبہ کیا تھا۔ کہ سر سکندر کو آئندہ کبھی انتخاب میں کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن ٹربیونل نے ایسا سخت قدم اٹھانے کی بجائے صرف ان کا انتخاب ناجائز قرار دیئے جانے پر اکتفا کیا تھا۔

سردار احمد بخش چاہتے تھے۔ کہ اگر علامہ اقبال پارلیمنٹری بورڈ کے دو ممبروں کو نامزد کر دیں۔ تو سر سکندر انھیں بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھیج دیں گے۔ جب غلام رسول خاں نے یہ معاملہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے بلا تامل رد کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ تو لمذا

گوارا نہ تھا۔ کہ ملک برکت علی سے یوں بے وفائی کی جائے۔ اور دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان فرمائی۔ کہ لیگ کا مقصد محض یہ نہیں۔ کہ اسمبلی کی دو نشستیں حاصل کرلی جائیں۔ بلکہ اس تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔ اور اگر ہم نے صرف دو ممبریوں کی بھیک مانگ کر۔ اصل تحریک سے چشم پوشی کرلی۔ تو سارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء کے اواخر میں۔ ہم نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ جو لوگ لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں بورڈ کے پاس اپنی درخواستیں بھیج دیں۔ اس اعلان کے جواب میں آٹھ امیدوار کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ (۱) ملک برکت علی (۲) خلیفہ شجاع الدین (۳) ملک زمان مہدی خان (۴) راجہ غضنفر علی خان (۵) سردار کریم بخش حیدری (۶) میاں عبدالمجید (۷) مظفر علی خاں قزلباش (۸) مشتاق علی خان

ملک برکت علی پنجاب کے مشرقی قصباتی حلقے سے کھڑے ہو رہے تھے۔ جس میں جالندھر۔ فیروز پور۔ قصور۔ ہوشیار پور۔ نکودر۔ پٹی۔ اور پتو کی شہر شامل تھے۔ خلیفہ شجاع الدین لاہور شہر۔ ملک زمان مہدی تحصیل حافظ آباد راجہ غضنفر علی خاں تحصیل پنڈ دادن خاں۔ سردار کریم بخش حیدری تحصیل علی پور۔ اور مشتاق علی خاں ضلع رہتک سے اُمیدوار تھے۔ تحصیل لاہور سے دو امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ایک میاں عبدالمجید بیرسٹر ایٹ لا۔ اور دوسرے سردار مظفر علی خاں قزلباش۔ پارلیمنٹری بورڈ نے یہ امر واضح کر دیا تھا۔ کہ اگر کسی شخص کو بورڈ نے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا۔ تو

نہ شخص کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یا اپنے طور پر الیکشن میں کھڑے ہونے کا مجاز نہیں ہوگا۔ میاں عبدالمجید نے بلا تامل یہ شرط منظور کر لی۔ لیکن سردار مظفر علی خاں نے اِسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔ اور جب بورڈ نے میاں عبدالمجید کو اپنا اُمیدوار نامزد کیا۔ تو مظفر علی خاں قزلباش یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر اُن کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

لاہور شہر سے خلیفہ شجاع الدّین کی کامیابی کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ اُن کے مقابلے میں دو بڑے زبردست اُمّید وار تھے۔ ایک میاں امیرالدّین جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے تھے۔ اور دوسرے مشہور نو مسلم بیرسٹر خالد لطیف گابا۔ جو مجلس اتحادِ ملّت کے اُمیدوار تھے۔ علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ خلیفہ شجاع الدّین لاہور شہر کی بجائے کسی اور حلقے سے کھڑے ہو جاتے۔ تو بہتر تھا۔ لیکن انہوں نے مشورہ قبول نہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش بھی تھی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو اِس امر پر متحد ہو جانا چاہیئے۔ کہ ہر حلقے میں یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن افسوس کہ اِس ضمن میں مسلم لیگ۔ مجلسِ اتحادِ ملّت اور احرار کا کوئی باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اور اکثر حلقوں میں یہ جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئیں۔

امرتسر سے دو آدمیوں نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ایک یونینسٹ پارٹی کے اُمّیدوار شیخ محمّد صادق۔ اور دوسرے احرار کے اُمّیدوار شیخ حسام الدّین اس مقابلے میں شیخ محمّد صادق کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا۔ اور اندیشہ تھا

کہ کہیں یونینیسٹ پارٹی کو کامیابی نہ ہو جائے۔ اِس موقع پر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کھڑا ہونے پر آمادہ کیا۔ جو ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے تھے۔ اور اب امرتسر کی بجائے لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ امرتسر میں ڈاکٹر کچلو کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا بھی چراغ نہ جل سکتا تھا۔ لیکن دِقّت یہ تھی کہ کچلو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے۔ اور اُدھر کانگرسی ٹکٹ پر اُن کی کامیابی کے اِمکانات قطعاً نہیں تھے۔ علّامہ اقبال نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا۔ اور ڈاکٹر کچلو کو اِنڈی پینڈنٹ کھڑا ہونے پر رضامند کر لیا۔ چنانچہ جب اُنہوں نے امرتسر کے شہری حلقے سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا۔ تو ایک پبلک جلسے میں لوگوں نے پوچھا کہ "آپ کس ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں"؟ تو اُنہوں نے جواب دیا۔ "کچلو ٹکٹ"۔

سر سکندر مسلم لیگ کے دو اُمیدواروں کے سخت خلاف تھے۔ ایک ملک برکت علی اور دوسرے زمان مہدی۔ اور اِن دونوں کو شکست دینے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ زمان مہدی کے خلاف تو وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ تحصیل حافظ آباد میں جن لوگوں کی امداد و اعانت کے وعدے پر زمان مہدی کھڑے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ایک ایک کر کے رُوگردانی اختیار کر لی۔ البتہ ملک برکت علی کا معاملہ بہت ٹیڑھا تھا۔ سر سکندر نے اِس حلقے سے پہلے مولوی غلام محی الدین قصوری کو کھڑا کرنا چاہا۔ لیکن جب دیکھا کہ اُن کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ تو پھر بڑی کوشش سے جالندھر چھاؤنی

کے ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ کو یونینسٹ پارٹی کا امیدوار بنایا گیا۔

علامہ اقبال مرزا حمید اللہ بیگ کو جانتے تھے چنانچہ انھوں نے ایک آدمی بھیج کر حمید اللہ بیگ کو لاہور بلایا۔ اور خود اُن سے درخواست کی کہ ملک برکت علی کا مقابلہ نہ کریں۔ لیکن مرزا حمید اللہ بیگ نے یہ کہہ کر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ کہ سر سکندر اُن سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھوا کر قسم لے چکے ہیں۔ کہ وہ ملک برکت علی کے مقابلے سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ احرار نے بھی اِس حلقے سے اپنا امیدوار کھڑا کر دیا تھا۔ یہ فیروز پور کے ایک وکیل شیخ غلام حیدر تھے۔

جُوں جُوں الیکشن کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ لیگی کارکنوں کی قلت کو ہم بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ بڑے بڑے جادُو بیان خطیب اور پیشہ ور مقرر یا تو مجلسِ احرار میں تھے اور یا مجلسِ اتحاد ملت میں۔ اُدھر گورنر سے لے کر پٹواری تک سرکار کا پورا خانوادہ۔ یونینسٹ پارٹی کی پشت پر تھا۔ البتہ مولانا شوکت علی اپنی بے شمار مصروفیتوں میں سے ایک ہفتے کی مہلت نکال کر لاہور تشریف لائے۔ اور اُنہوں نے ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین اور ڈاکٹر کچلو کی حمایت میں امرتسر۔ جالندھر۔ لاہور۔ فیروز پور۔ ہوشیار پور وغیرہ شہروں کا دورہ کیا۔ علامہ اقبال نے بھی لیگی امیدواروں کی تائید میں بار بار اعلان شائع کئے۔ جو روزنامہ احسان میں بالالتزام چھپتے رہے۔ اور پوسٹروں کی صورت میں امیدواروں کے انتخابی حلقوں میں بھی تقسیم کئے جاتے تھے۔

حکومتِ پنجاب کا یونینو ممبر ہونے کے باوجود۔ سرسکندر کھلم کھلا یونینسٹ اُمیدواروں کی حمایت میں صوبے بھر کا دَورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک طرف تو ہندو سبھا پارٹی کے لیڈر راجہ نرندر ناتھ کے حریف سیٹھ ڈالمیا کو بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا تاکہ راجہ صاحب بلا مُقابلہ منتخب ہو سکیں۔ اور دوسری طرف ہر قابل مسلمان امیدوار کے خلاف اپنے آدمی کھڑے کر کے۔ راستہ روکنے کی کوشش کی۔

اِس الیکشن میں مجھے اور غلام رسول خاں کو شب و روز کام کرنا پڑا۔ پمفلٹ پوسٹر۔ اور اخباری بیان لکھنے کا سارا کام میرے سپرد تھا۔ اِس کے علاوہ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ بڑے بڑے مجمعوں میں الیکشن کی تقریریں بھی کرنا پڑیں۔ میں اِس فن سے بالکل بے گانہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے کبھی کبھی لاہور کے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ادبی موضوعات پر تقریریں کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن سقفِ آسمان کے نیچے۔ جاڑے کی راتوں میں۔ دس دس ہزار انسانوں کے مجمع میں، جہاں حامیوں کے نعرہ ہائے تحسین کے علاوہ مخالفوں کی تبرّا بازی بھی سمع خراشی کرتی تھی، الیکشن کی ہنگامی سیاست پر تقریریں کرنا۔ میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ پھر سب سے بڑی دِقّت یہ تھی کہ لوگ مسلم لیگ کے نام اور کام سے قطعًا نا آشنا تھے۔ جناح کا نام بھی اکثر لوگوں نے نہیں سُنا تھا۔ البتہ اقبال کا نام ایک ایسا کھرا سکہ تھا۔ جسے ہم بے دریغ چلاتے تھے۔ میں نے اُنہی دِنوں یہ محسوس کیا۔ کہ اقبال صرف پڑھے لکھے لوگوں ہی میں نہیں، بلکہ عوام میں بھی کتنا مقبول تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا

کہ کاش ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی ہوتی۔ اور وہ پنجاب کے چند بڑے بڑے شہروں کا ایک دفعہ دورہ کر لیتے۔ تو فضا بالکل صاف ہو جاتی۔ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک دن زمان مہدی کے سامنے بڑی حسرت سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

۱۸ر جنوری سے ۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء تک مجھے مسلسل ملک برکت علی کے حلقۂ انتخاب کا دورہ کرنا پڑا۔ اس دوران میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سر سکندر حیات اور اُن کے حواریوں نے کس شدّت سے مخالفت کا طوفان کھڑا کیا تھا۔ نواب ممدوٹ مرحوم نے نکودر اور فیروز پور میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جہاں انہوں نے اپنے اثر و رسوخ۔ اور اپنی کوششوں کا آخری شمہ تک مسلم لیگ کی مخالفت میں صرف کر دیا تھا۔ ۲۷ر جنوری سے جالندھر شہر میں پولنگ شروع ہونے والا تھا۔ اور ۲۶ر کی شام کو سر سکندر اپنی موٹر میں وہاں پہنچے۔ جالندھر کے چودھری عبدالحمید ہمارے بہت بڑے معاون اور سرگرم کارکن تھے۔ سر سکندر نے اُنھیں چکمہ دے کر موٹر میں بٹھا لیا۔ اور راتوں رات بھگا کر لاہور لے گئے۔ جہاں چودھری شہاب الدین نے انھیں اپنے بنگلے میں بند کر کے۔ ایک طویل درس دیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک برکت علی ہرگز اس قابل نہیں ہیں۔ کہ کوئی بھلا آدمی اُن کی مدد کرے۔ دوسرے دن جب سر سکندر کو یقین ہو گیا۔ کہ اب چودھری عبدالحمید اُنکے بتائے ہوئے پروگرام سے منحرف نہیں ہوں گے۔ تو اُن کو چھٹی دی گئی۔ اور وہ بمشکل غروب آفتاب کے بعد واپس جالندھر پہنچ سکے۔ جہاں انہوں نے

ہمارے پاس آکر۔ اور ایک مجمع کے رُو برو۔ یہ سارا واقعہ بیان کیا۔

جالندھر گویا پورے حلقۂ انتخاب کا مرکز اعصاب تھا۔ اور اِس مرکز میں ہماری کامیابی اگر کسی شخص کی ہمت و کوشش کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہے تو وہ قاضی بشیر حسین صدر میونسپل کمیٹی جالندھر تھے۔ قاضی صاحب صدر بلدیہ کے علاوہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ اور اِس لحاظ سے گورنر سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک ہر افسر کا دباؤ اُن پر ڈالا گیا۔ پہلے انھیں مختلف قسم کے انعام و اکرام کا لالچ دیا گیا۔ جب وہ اِس دامِ ہم رنگِ زمیں میں قدم رکھنے پر تیار نہ ہوئے۔ تو پھر دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آنریری مجسٹریٹی سے برطرفی اور صدارت سے برخاستگی کی دھونس بھی دی گئی۔ لیکن قاضی صاحب کے قدم پھر بھی نہ ڈگمگائے۔

اب سر سکندر کو ایک اور چال سوجھی۔ اُن کے بڑے بھائی سر لیاقت حیات خاں بھوپال میں وزیر تھے۔ چنانچہ سر لیاقت کے ذریعے سے نواب بھوپال سے کہا گیا۔ کہ وہ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی سیّد وزیر علی کو، جو بسلسلۂ ملازمت بھوپال ہی میں مقیم تھے، قاضی بشیر حسین کے پاس بھیجیں۔ سیّد وزیر علی نے کرکٹ میں جس قدر ترقی کی تھی۔ وہ تمام تر قاضی صاحب کی مُربیانہ شفقت اور توجہ کا نتیجہ تھی۔ جالندھر کے گورنمنٹ ہائی سکول سے لے کر علیگڈھ تک قاضی صاحب سیّد وزیر علی کی سرپرستی کرتے رہے۔ وزیر علی نے بادلِ ناخواستہ جالندھر آکر یہ ناگوار فرض ادا کیا۔ لیکن قاضی صاحب پھر بھی اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ سیّد وزیر علی سے میرے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۸ء

میں کرکٹ کا میچ کھیلنے کے لئے لاہور آئے۔ تو اُنہوں نے یہ سارا واقعہ خود مجھ کو سنایا تھا۔

اب تک قاضی صاحب پس پردہ رہ کر مدد کر رہے تھے۔ لیکن ۲۰ جنوری کو وہ تمام مصلحتوں کو پس پشت پھینک کر، ایک رضا کار کی طرح، ہمارے پولنگ سٹیشن پر آ کر کھڑے ہو گئے، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اہل جالندھر کو ادھر ہی کا رُخ کرنا ہو گا۔ چنانچہ ۲۸ جنوری کے پولنگ نے الیکشن کا فیصلہ کر دیا۔ اور ملک برکت علی صرف تو ّے ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے۔

میں اکثر سوچتا ہوں۔ کہ اگر ہمیں اس الیکشن میں بھی ناکامی ہوتی۔ تو پنجاب میں مسلم لیگ کا کیا حشر ہوتا۔ ملک برکت علی کی یہ کامیابی ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک کا ایک ایسا انقلاب آفریں موڑ ہے۔ جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اُس دور کا مورخ ہی کر سکتا ہے۔

۹ فروری کی سہ پہر کو جالندھر سے فون پر ملک برکت علی کی کامیابی کا مژدہ موصول ہوا۔ اور ساتھ یہ پیغام بھی پہونچا۔ کہ اُسی شام اہل جالندھر ایک بہت بڑا جلوس نکال رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں فوراً وہاں پہونچ جانا چاہیئے۔ ہم لوگ اُسی وقت موٹر میں روانہ ہو گئے۔ لیکن پہلے علامہ اقبال کے دولتکدہ پر حاضر ہونا ضروری سمجھا۔ تاکہ یہ خوشخبری اُن کو سنا دی جائے۔ جاوید منزل کے احاطے میں داخل ہوتے ہی۔ بے اختیار ہمارے منہ سے زندہ باد کے نعرے نکل گئے۔ ڈاکٹر صاحب اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ شور سن کر فوراً

باہر برآمدے میں آ گئے۔ اور ملک برکت علی سے بغلگیر ہو گئے۔ شدتِ جذبات اور وفورِ مسرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی تھی۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے سات امیدواروں میں سے صرف دو کامیاب ہوئے۔ یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں عبدالمجید کی کامیابی بظاہر یقینی نظر آتی تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے آخری روز پولنگ تسلی بخش نہ ہوا۔ اور وہ ڈھائی سو ووٹوں سے ہار گئے۔ اب قاعدے کی رُو سے ہونا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ لیگ کے دونوں کامیاب امیدوار مل کر بیٹھتے۔ اور پارلیمنٹری بورڈ کے مشورے۔ اور علامہ اقبال کی ہدایت سے۔ آئندہ طرزِ عمل اور طریقِ کار کا فیصلہ کرتے۔ لیکن اِس سلسلے میں سب سے تعجب انگیز واقعہ یہ ہے۔ کہ راجہ غضنفر علی خاں نے اپنی کامیابی کے بعد بورڈ کے دفتر میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے بجائے وہ سیدھے یونینیٹ پارٹی کے جلسے میں پہونچے۔ اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ترک کر کے یونینیٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔

راجہ صاحب کے اِس فعل سے لیگی حلقوں میں حیرت اور افسوس کی لہر پھیل گئی۔ مسلم لیگ کے مخالف اخباروں نے اس پر خوشیاں منانا شروع کیں۔ اور تمسخر و استہزاء سے بھرپور نظمیں شائع کیں۔ راجہ صاحب نے یونینیٹ پارٹی میں شامل ہوتے وقت جو اعلان کیا۔ اس میں اُنہوں نے مسلم لیگ کو ترک کرنے کی دو وُجوہ بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ بحالاتِ موجودہ پنجاب میں یونینیٹ پارٹی سے بہتر جماعت اور کوئی نہیں۔ دوسری یہ کہ جہاں تک

سیاسی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور یونینیسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی۔ تو معاملہ زیادہ شرمناک صورت اختیار نہ کرتا لیکن ستم یہ ہوا۔ کہ یونینیسٹ پارٹی کے اُسی جلسے میں راجہ غضنفر علی خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔ سر سکندر حیات نے جو تقریر کی۔ اُس میں انہوں نے فرمایا کہ:

"راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایما سے مسلم لیگ ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن شروع ہی سے انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینیسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے"۔

سوال یہ ہے کہ اگر راجہ صاحب کے نزدیک یونینیسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے پروگرام یکساں تھے۔ تو پھر انہوں نے اُس جماعت کو کیوں ترک کیا۔ جس کے ٹکٹ پر وہ کامیاب ہوئے تھے۔ مزید برآں انھوں نے ابتدا ہی میں اپنی مقدر آزمائی کے لئے یونینیسٹ پارٹی کو کیوں پسند نہ فرمایا۔

سر سکندر نے یہ کہہ کر کہ شروع ہی سے راجہ صاحب نے اُن کو اپنے خفیہ ارادوں سے مطلع کر رکھا تھا۔ گویا ایک شرمناک راز پر سے پردہ اُٹھا دیا تھا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہفتہ وار نیو ٹائمز نے لکھا:

"یہ صاف سیدھا فریب اور دھوکا ہے۔ اگر مسلم لیگ کو معلوم ہوتا کہ راجہ غضنفر علی خاں اور سر سکندر کے درمیان کوئی عہد و پیماں قائم ہیں۔ تو پارلیمنٹری بورڈ کبھی ایسے شخص کو ٹکٹ نہ دیتا۔ جو فریق مخالف کے لیڈر کے ساتھ خفیہ ساز باز میں شریک تھا...... ایک

غضنفر علی کا کیا ذکر ہے۔ مسلم لیگ افراد کے بل بوتے پر نہیں۔ بلکہ اپنے اصولوں کی بنا پر زندہ رہے گی۔ اور جب تک یہ جماعت اُن اصولوں پر قائم ہے، جو ہمیشہ اُس کے لئے موجب افتخار رہے ہیں، وہ ہر قسم کی منافقت کا پردہ چاک کرکے۔ اور ہر قسم کے فریب سے بے نیاز ہوکر، اُس راستے پر گامزن رہے گی۔ جو آزادیٔ وطن اور استقلالِ قومی کی منزل کی طرف جاتا ہے۔"[1]

انتخابات کے دوران میں مسٹر جناح نے بار بار اِس طرف اشارہ کیا تھا کہ مسلم لیگ اگرچہ کانگرس کے ساتھ ہر قسم کا اتحاد کرنے کو تیار ہے لیکن مسلمان کانگرس میں جذب ہوکر۔ اپنی جداگانہ قومی ہستی کو مٹا دینے پر تیار نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جب سے مسٹر جناح انگلستان سے واپس آئے تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ کہ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کی طرح کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی پائیدار مفاہمت ہو جائے۔ تاکہ ہندو اور مسلمان مل کر استخلاصِ وطن کی جدّوجہد میں حصہ لے سکیں۔ لیکن اِس ضمن میں انہیں سب سے زیادہ مایوسی پنڈت جواہر لال نہرو کی ضد اور تیز زبانی سے ہوئی۔

جب ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل ایوارڈ) کا سوال پیش ہوا تھا۔ تو مسٹر جناح کی کوشش اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی ہوش مندی سے کانگرس نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار

---

[1] ۲۲ر فروری ۱۹۳۷ء

کر لیا تھا۔

اس سے قبل ڈاکٹر انصاری کی ذاتِ گرامی سے مرعوب ہو کر، کانگرس کی مجلس عاملہ بھی اِس ضروری معاملے میں غیر جانب داری اختیار کر چکی تھی۔ لیکن اب کہ انتخابات کے موقع پر کانگرس نے اپنا مینی فسٹو شائع کیا۔ تو یہ غیر جانب داری ختم ہو گئی۔ اور مینی فسٹو میں یہ شق بڑھا دی گئی۔ کہ کانگرس فرقہ وارانہ فیصلے کو ختم کر کے دم لے گی۔

پنڈت نہرو نے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو بابو جگت نارائن لال (پٹنہ) کو اپنے خط میں صاف لکھا تھا۔ کہ "فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کانگرس ایک غیر جانبدارانہ اور مبہم رویّہ اختیار نہیں کر سکتی ...... اور جیسا کہ مینی فسٹو میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ ہم اِس فیصلے کو بالکل قبول نہیں کرتے"۔

اس کے علاوہ جب مسلم لیگ نے الیکشن میں حصّہ لینے کا عزم کیا۔ تو پنڈت نہرو نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے۔ انتہائی تمسخر سے اعلان کیا کہ "آج ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں۔ یعنی نیشنل کانگرس اور برطانوی حکومت۔ باقی جتنی جماعتیں ہیں۔ اُن کو یا کانگرس کے پیچھے چلنا پڑے گا۔ یا حکومت کا ساتھ دینا ہو گا"۔

اس قسم کی افسوسناک اور لاطائل باتوں کے جواب میں مسٹر جناح کو مجبوراً اعلان کرنا پڑا کہ "ہندوستان میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں نیشنل کانگرس برطانوی حکومت اور مسلمان۔ ہم نہ کانگرس کے ضمیمہ بردار بننے کو تیار ہیں۔ اور نہ حکومت کی کاسہ لیسی کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری اپنی قومی پالیسی اور ہمارا

اپنا قومی پروگرام ہے۔"

مسٹر جناح نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا۔ کہ کانگرس خواہ مخواہ مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں۔ اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے۔۔۔۔ کانگرس کو چاہیئے کہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں دخل نہ دے۔ ورنہ بدمزگی پیدا ہوگی۔

پنڈت نہرو اس پر سخت گرجے اور برسے۔ اُنہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک طویل بیان دیتے ہوئے۔ مسٹر جناح پر ناروا حملے کئے۔ اور کہا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جُداگانہ سیاسی ہستی ایک لایعنی اور مضحکہ انگیز دعوےٰ ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے۔ جس کا نام ہندوستانی ہے۔ اور تنہا کانگرس اس کی نمائندگی کا استحقاق رکھتی ہے۔ اور بیان کے آخر میں کہا:

"۔۔۔۔۔۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف اُس گروہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ جو متوسط طبقے کے بالائی حصّے سے تعلق رکھتا ہے مسلمان عوام کے ساتھ جس قدر مجھے ربط وضبط رہا ہے مسلم لیگ کے اکثر لیڈروں کو نصیب نہیں ہوا۔ مسلمان عوام کے افلاس، مصائب اور فاقہ کشی کا علم جس قدر مجھے ہے۔ اُتنا علم اُن لیگی لیڈروں کو ہرگز نہیں۔ جو اسمبلی کی نشستوں اور ملازمتوں کے بٹوارے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ کانگرس کے صدر کی حیثیت سے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دُکھ درد۔ افلاس اور فاقہ زدگی کی یکساں نمائندگی کا دعویدار ہوں۔"

جب پنڈت نہرو کی ضد نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو خواہ مخواہ ناراض کر کے۔ حالات و واقعات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ تو علامہ اقبال نے اِس افسوسناک کیفیت کو شدّت سے محسوس کیا۔ وہ جواہر لال کے مدّاح تھے۔ اور کانگرس کے سب دو لیڈروں میں جواہر لال کو غنیمت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اِس صورتِ حال سے متاثر ہو کر حسبِ ذیل بیان جاری کیا۔ جو سول کے علاوہ نیو ٹائمز میں بھی شائع ہوا تھا۔

"۔۔۔۔۔ میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزّت ہے۔ اُنہوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر جو مصائب برداشت کئے۔ اور جو قربانیاں گوارا کی ہیں۔ میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اُنہوں نے بلا وجہ مسٹر جناح کے ساتھ اُلجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے۔ اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے۔ وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں ہے۔ لیکن مسٹر جناح تخیّل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے۔ حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اِسی لئے اُن کی قوم پرستی اور حُبِّ وطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔

" مسٹر جناح کا آخر قصور کیا ہے۔ جس پر پنڈت نہرو اس قدر طیش میں آ رہے ہیں؟ صرف یہی کہ انہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کانگرس کی اِس روش کو غلط قرار دیا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کے حلقوں

میں اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ مسٹر جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ اپنے خیالات و عقائد اور اپنے مطمحِ نظر کے اعتبار سے، کانگرس سے بے حد قریب ہیں۔ اِس لئے ہر مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ جہاں تک مجالسِ قانون ساز میں مسلمانوں کے نمائندے بھیجنے کا سوال ہے۔ کانگرس اِس مسئلہ میں دخل نہیں دے گی۔ بلکہ یہ معاملہ کلیۃً مسلم لیگ کی صوابدید سے طے کیا جائے گا۔

"اگر کانگرس مسلمانوں میں بھی اُتنی ہی مقبول ہوتی۔ جتنی کہ ہندوؤں میں ہے۔ تو پھر پنڈت نہرو کو یقیناً یہ حق حاصل تھا۔ کہ وہ کانگرسی ٹکٹ پر مسلمان امیدوار کھڑے کرتے۔ لیکن یہ ایک اظہر من الشمس اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کہ ابتداء سے لے کر اب تک صرف گنتی کے چند مسلمانوں نے کانگرس کی شرکت گوارا کی ہے۔ مسلمان عوام ہمیشہ کانگرس سے الگ تھلگ رہے ہیں مسلمانوں کے اِس طرزِ عمل سے یہ نہیں سمجھنا چاہئیے۔ کہ وہ خدانخواستہ جذبۂ آزادی سے محروم ہیں۔ بلکہ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بعض بنیادی اختلافات ہیں۔ اور جب تک اُن اختلافات کو باہمی افہام و تفہیم سے رفع نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان اور ہندو کانگرس کے پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے۔

"یہ صحیح ہے۔ کہ مسٹر سی۔ آر۔ داس ایسے فراخ دل انسان نے مسلمانوں

کے خدشات کو دُور کرنے کی بڑی قابلِ تحسین کوشش کی تھی۔ لیکن اُن کے انتقال کے فوراً بعد پنڈت مالوی اور ڈاکٹر موُنجے کے تعصب نے اُس رواداری کا خاتمہ کر دیا۔ میں یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ کہ پنڈت جواہر لال نہرو واقعی کچھ عرصہ مالوی اور مونجے کی ذہنیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن حال ہی میں اُنہوں نے فرقہ دارانہ فیصلے کے متعلق کانگرس کی غیر جانبداری کو جس طریقے سے ختم کیا ہے۔ وہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بھی آخر کار، مہاسبھا کے روز افزوں اثر سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ پنڈت نہرو کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر اب مسلمانوں کو اُن پر بھی چنداں اعتماد نہیں رہا۔

"علاوہ ازیں پنڈت نہرو کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اِس بات کا شور مچاتے پھریں کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس اور فاقہ زدگی کا کوئی علم نہیں ہے۔ یا یہ کہ وہ (پنڈت نہرو) ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا خود پنڈت نہرو ہندوؤں کے متوسط درجے کے بالائی اور متموّل طبقے سے تعلق نہیں رکھتے؟ افلاس اور بھوک کا نام لے لے کر خلطِ مبحث کرنے۔ اور ماسکو سے مانگی ہوئی زبان میں باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو

بہ نظرِ غائر پرکھا جائے۔ مسٹر جناح اپنے اس دعوے میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگرس کو مسلمانوں کے انتخابی حلقوں میں اپنے امیدوار نہیں کھڑے کرنا چاہئیں۔ اس نصیحت سے ناراض ہونے کی بجائے کانگرس کا فرض تھا۔ کہ وہ اس پر عمل پیرا ہوتی۔

"مجھے امید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائیگا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور کیسے ارفع مقام کے مالک ہیں۔ اور اس احساس کے بعد وہ مسٹر جناح کو ناراض کرنے کی بجائے۔ اُن کی امداد و اعانت سے مستفید ہونے کی کوشش کرینگے جیسے کہ مرکزی اسمبلی کے کانگریسی لیڈر اب تک مستفید ہوتے رہے ہیں وہ مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ ممکن ہے پنڈت نہرو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے۔ جنت الحمقاء میں رہنا پسند کریں۔ اور یہ اصرار کرتے جائیں۔ کہ مسلمانوں کی نیابت کا حق کلی کانگرس ہی کو حاصل ہے اگر انہوں نے ایسی ضد کی۔ تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے ہندوستان کی آزادی کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ پنڈت نہرو کو چاہیئے۔ کہ وہ مسٹر جناح سے معذرت کرکے۔ اُس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ جو اُن کی جلد بازی اور ناتجربہ کاری نے پیدا کر دی ہے۔"

دسواں باب

"مسلم رابطۂ عوام" کی تحریک

جب مسٹر جناح کو پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ کی ناکامی کی اطلاع دی گئی۔ تو انہوں نے جواب میں۔ صوبائی لیگ کے سکرٹری کو ذیل کا حوصلہ افزا گرامی نامہ بھیجا:

"ڈیر مسٹر غلام رسول۔ آپ کا خط ملا۔ میں ممنون ہوں۔ کہ آپ نے پنجاب کی صورت حال کو واضح اور مفصل طریق پر بیان کیا ہے۔ سر محمد اقبال کا والا نامہ بھی ملا تھا۔ جس کا جواب میں نے بھیج دیا ہے۔ اس جواب کی ایک نقل آپ کو بھیجتا ہوں۔ میں آپ کی بہادرانہ اور بے باکانہ مساعی کی داد دیتا ہوں۔ آپ کو ناکامی کی پروا نہیں کرنا چاہئیے۔ ہمارے معاملے میں پنجاب کی شکست دراصل فتح ہے۔ یہ کچھ کم نہیں۔ کہ آپ نے پنجاب کی سرزمین میں مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ ہمیں اس بات کی پروا نہیں۔ کہ ہم کس حد تک کامیاب

ہوئے ہیں۔ کوئی ذی شعور انسان پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں معجز نمائی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ اور یہیں تو ایک عظیم الشان مہم درپیش ہے۔ میں آپ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم ۔ اے ۔ جناح"

ہندوستان کے چھ صوبوں کے الیکشن میں کانگرس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مدراس میں ایوان کی کل نشستیں ۲۱۵ تھیں۔ جن میں سے کانگرس نے ۱۵۹ پر قبضہ کیا۔ بہار میں ۱۵۲ نشستوں میں سے ۹۸ کانگرس کے حصے میں آئیں۔ صوبجات متوسط میں ۱۱۲ میں سے ۷۰، بمبئی میں ۱۷۵ میں سے ۸۶، یو۔پی میں ۲۲۸ میں سے ۱۳۴ اور اڑیسہ میں ۶۰ میں سے ۳۶ نشستوں پر کانگرس کا قبضہ ہو گیا۔ البتہ پنجاب۔ بنگال۔ سرحد۔ سندھ اور آسام میں کانگرس کو ایسی کامیابی نہ ہو سکی۔ پنجاب میں ایوان کی کل نشستیں ۱۷۵ تھیں۔ جن میں سے صرف ۱۸ کانگرس کے حصے میں آئیں۔ بنگال میں ۲۵۰ میں سے ۵۴۔ سرحد میں ۵۰ میں سے ۱۹۔ سندھ میں ۶۰ میں سے ۱۲۔ اور آسام میں ۱۰۸ میں سے ۳۳ نشستوں پر کانگرس قبضہ کر سکی۔

کانگرس کی اس فتح پر ایک نظر ڈالتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ کانگرس کو ان کے حلقہ ہائے انتخاب میں قطعاً کامیابی حاصل ہو سکی۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی کل نشستوں کی مجموعی تعداد ۵۰۰ تھی۔ جن میں سے صرف ۲۵ پر کانگرس قبضہ کر سکی اور ان ۲۵

میں سے ۵ نشستیں صوبۂ سرحد میں شامل تھیں۔ گویا صوبۂ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے برِّعظیم میں کانگرس کو صرف ۱۰ مسلمان اپنے حامی و مددگار مل سکے۔ مدراس میں چار۔ بہار میں چار اور پنجاب میں دو مسلمان کانگرس ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ یو۔ پی۔ صوبجاتِ متوسط۔ بنگال۔ سندھ۔ اڑیسہ اور آسام میں ایک مسلمان بھی کانگرس ٹکٹ پر منتخب نہ ہو سکا۔

پنجاب کے کامیاب امیدواروں میں ایک تو میاں افتخار الدین تھے۔ جو تحصیل قصور ضلع لاہور سے کھڑے ہوئے تھے۔ اور دوسرے چودھری محمد حسن جو لدھیانہ کے دیہی حلقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں اُمیدواروں کی کامیابی میں کانگرس کو رتّی برابر بھی دخل نہیں تھا۔

میاں افتخار الدین کی کامیابی کے تین اسباب تھے۔ اوّل اُن کی برادری۔ دوم اُن کی دولت اور سوم اُن کا مقابلہ ایک ایسے شخص سے آپڑا تھا۔ جسے سر سکندر حیات لامحالہ شکست دینا چاہتے تھے۔ میاں افتخار الدین کے مقابلے میں خان بہادر سردار حبیب اللہ تھے۔ جو ۱۹۲۳ء سے مسلسل پنجاب کونسل کے ممبر چلے آرہے تھے۔ سردار حبیب اللہ سر فضل حسین کی پارٹی کے زبردست رُکن تھے۔ اور وزارت سازی میں سر سکندر کے حریف سمجھے جاتے تھے اس لئے سر سکندر کو اُن سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ اس الیکشن میں سر سکندر نے اپنے سرکاری اثر و رسوخ کو کام میں لا کر سردار حبیب اللہ کو ایک ایسے شخص سے شکست دلائی جو بادی النظر میں کانگرس کا امیدوار تھا۔

چودھری محمد حسن کا معاملہ مختلف تھا۔ چودھری صاحب لدھیانہ میں وکیل تھے

اور اپنے کردار کی بلندی اور عمل کی بے لوثی کے باعث ہر گروہ میں بے حد مقبول تھے۔ ضلع کے سرکش حکام کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ عوام کی مدد کرتے تھے۔ زبانی ہمدردی ہی پر نہیں بلکہ امداد، مدت پیروی کرنے سے بھی انہیں دریغ نہ تھا..... دیانت داری اور اخلاص میں بھی اُن کا پایہ بے حد بلند تھا۔ اپنی اِنہی خوبیوں کے باعث وہ ہر جگہ عزت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی نے اُن کے خلاف ایک نہایت معمولی اور بے حیثیت آدمی کھڑا کیا تھا۔ پھر اپنے حلقۂ انتخاب میں چودھری محمد حسن کی برادری بھی کافی تھی۔ لوگوں میں سیاسیات کا شعور بالکل نہیں تھا۔ اس لئے چودھری صاحب آسانی سے کامیاب ہو گئے۔

الیکشن کے نتائج برآمد ہونے کے بعد، جب کانگرس کو اپنی طاقت اور قوت کا احساس ہوا۔ تو پنڈت نہرو نے ۱۹ر مارچ ۱۹۳۷ء کو دلی میں ایک آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقد کی۔ جہاں ہندوستان کی تمام صوبائی اسمبلیوں کے اُن آٹھ سو ممبروں کو، جو کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، مدعو کیا۔ اس کنونشن میں پنڈت نہرو نے جو تقریر کی۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے یُوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ گویا اٹھارویں صدی کے مرہٹہ یلغار کی طرح دلی تک تو ہندوستان کو فتح کر چکے ہیں۔ اور اب عنقریب اپنی فتوحات کا رُخ ایک طرف بنگال و آسام اور دوسری طرف لاہور و پشاور کی طرف پھیرنے والے ہیں۔

فتح و نصرت کے اِس نقشہ میں جواہر لال کو صرف ایک محاذ ایسا نظر آتا تھا جو اُن کی یلغار کے سامنے ابھی تک سرنگوں نہیں ہوا تھا۔ وہ محاذ ہندوستان کے

مسلمانوں کا تھا۔ اگر اس برِعظیم کے مسلمان بھی اپنی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے کانگرس میں جذب ہو جاتے۔ تو آج جواہر لال ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی۔ کہ کانگرس کی ساری کوششوں کے باوجود مسلمان اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم تھے۔ تاہم جواہر لال مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے۔ اپنے نطق کا رُخ مسلمانوں کی طرف پھیرا۔ تو فرمانے لگے۔

"ہم لوگ مدت تک اِس وہم میں مبتلا رہے۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں سے مفاہمت یا سمجھوتہ کرنے سے مسائل کا تصفیہ ہو جائے گا۔ اِس چکر میں پڑ کر ہم نے عوام کو نظر انداز کئے رکھا۔ یہ طرزِ عمل غلط اور یہ پالیسی بے کار تھی۔ آئندہ ہم کبھی اِس طرف رجوع نہیں کریں گے تعجب ہے۔ کہ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو مسلمانوں کو ایک الگ گروہ تصوّر کر کے ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں یہ اندازِ فکر قرونِ وسطیٰ میں رائج ہو تو ہو۔ موجودہ زمانے میں اِسے کوئی نہیں پوچھتا۔ آج کل ہر چیز پر اقتصادی نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک افلاس، بے کاری اور قومی آزادی کا سوال ہے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور مسیحیوں میں کوئی فرق نہیں ہے چونکہ فرقہ پرست لیڈر ہر وقت حصے، بخرے اور بٹوارے کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ اُن کی قوم کو ملازمتوں میں کتنا حصہ ملے گا۔ اور اسمبلی میں کتنی نشستیں حاصل ہوں گی۔ اِن لیڈروں کو چھوڑ کر۔ جب ہم براہِ راست عوام سے ملتے ہیں۔ تو پھر یہ دیکھتے ہیں کہ مسائل کا زمانہ

نظر آتے ہیں۔ جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ یعنی افلاس، بے کاری اور قومی آزادی کی لگن۔ اس نام نہاد فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کا بھی یہی طریقہ ہے۔ کہ لیڈروں کو نظر انداز کر کے۔ براہِ راست عوام سے ربط و ضبط پیدا کیا جائے۔

"عہدِ حاضر میں ہمارے ہاں جو حیرت انگیز واقعات رُونما ہوئے ہیں۔ اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کیا تعلیم یافتہ اور کیا جاہل، اضطراب کی ایک وسیع لہر چل نکلی ہے کوئی اچھی اور معقول قیادت میسّر نہ آنے کی وجہ سے۔ یہ لوگ ہوا کے جھونکے کی طرح، اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ اِس وقت وہ اپنی موجودہ بے بسی کے احساس سے سخت دل گرفتہ ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں نے اُنھیں سیاسی اعتبار سے سخت کمزور کر دیا ہے۔ اگرچہ برطانوی ملوکیت نے اُنھیں قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنے کے لئے۔ کچھ نہایت معمولی اور ادنٰی قسم کی مراعات عطا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

"تمام مسلمان، کیا بُڈھے اور کیا جوان، اور کیا اُن کے اخبارات آج اپنے خیالات و اعمال کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اور اِس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ کہ فرقہ پرستی کی لعنت سے دامن چُھڑا کر۔ اپنے آپ کو حُرّیت و ترقی کی تحریکوں سے وابستہ کریں۔ وہ یہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ کانگرس کے رویئے نے کس طرح ہندوؤں کی فرقہ دارا

جماعتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر۔ عوام کے دل و دماغ پر اپنا سکہ بٹھا دیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر مسلمان اُداس اور مغموم ہو رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گویا لاوارث سمجھنے لگے ہیں۔ اُن کا بھی جی چاہتا ہے۔ کہ وہ آج کی کامیابیوں میں حصّہ دار بنیں اور مستقبل کی کامرانیوں میں شریک ہوں۔ نہ صرف کامیابی و کامرانی میں شریک ہوں۔ بلکہ وہ ذمہ داریوں اور فرائض کا بوجھ اُٹھانے میں بھی شرکت کرنا چاہتے ہیں۔

"اگرچہ الیکشن میں ہمیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے حلقوں سے اپنے امیدوار منتخب نہیں کرا سکے۔ لیکن اِس کے باوجود مسلمان عوام بہتم کامیاب و سرخرو ہیں۔ یہ لوگ یقیناً فرقہ پرستی کی سنت کو ترک کرنے پر کسی حد تک آمادہ ہو گئے ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے۔ کہ اِن حالات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور مسلمان عوام اور اِن کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے۔ ملک کو ہر نوع کی فرقہ پرستی سے پاک کر دیں"[1]

قطع نظر اور امور کے۔ جواہر لال نے اپنی اس تقریر میں یہ بالکل دُرست کہی تھی۔ کہ کانگرس کی کامیابی نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہمہ گیر اُداسی، پریشانی اور بے بسی کا احساس طاری کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو

---

[1] انڈین اینول رجسٹر ۱۹۳۷ء جلد اوّل۔

گویا لاوارث سمجھنے لگے تھے۔ ہندوستان میں کانگرس کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اُس کا ایک مرکزی نظام تھا۔ جس کے تحت پشاور سے مدراس تک نہایت باقاعدہ شاخوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کانگرس کے صدر کے ایک اشارے پہ یہ پورا نظام حرکت میں آجاتا تھا۔ اور جگہ جگہ جلسے اور مظاہرے شروع ہو جاتے تھے۔ مسلمان اِس قسم کی مرکزیت سے محروم ہو گئے تھے۔ پنجاب۔ بنگال۔ سندھ اور سرحد اگرچہ اُن کی اکثریت کے صوبے تھے۔ لیکن یہاں ہر صوبے میں الگ الگ جماعتیں برسرِ اقتدار تھیں۔ جن کے درمیان کوئی باہمی ربط وضبط موجود نہیں تھا۔ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی کوئی سیاسی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اور کوئی مرکزی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ اندیشہ تھا کہ یہ جگہ جگہ بکھری ہوئی مسلمانوں کی ٹولیاں۔ کانگرس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے اندر بہہ جائیں گی۔

اِن حالات میں علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو دو خط لکھے۔ پہلا خط ۲۰ر مارچ ۱۹۳۷ء کا ہے۔ یعنی دہلی کنونشن کی کارروائی پڑھتے ہی۔ اُنہوں نے یہ خط لکھا۔ جس میں فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبۂ صدارت ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے اِس نتیجے میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُس کو بھی آپ نے بخوبی محسوس کر لیا ہوگا۔ آپ یقیناً اِس بات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کو۔

کم ازکم اِس بات کا ایک نادر موقع ضرور دیا ہے۔ کہ وہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا میں رُونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیشِ نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اِس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔

"اِس لئے میری رائے ہے۔ کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں۔ جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ۔ دیگر بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اِس کنونشن میں آپ پوری صفائی اور تحدّی کے ساتھ۔ یہ حقیقت بیان کیجئے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ سیاسی ہستی کے مالک ہیں۔ اور اِس حیثیت سے اُن کا سیاسی مطمح نظر کیا ہے۔

"یہ امر بے حد ضروری ہے۔ کہ اندرون و بیرونِ ہند کی تمام دنیا کو بتا دیا جائے۔ کہ ملک میں محض اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو مسلمانانِ ہند کے لئے ثقافت اور کلچر کا مسئلہ اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے

بہر حال کلچر کا مسئلہ کسی طرح بھی اقتصادی مسئلہ سے کم اہم نہیں ہے۔

" اگر آپ نے اس قسم کی کنونشن منعقد کی۔ تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح اُن مسلمان ممبروں کی نیّتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا جنہوں نے مسلمانانِ ہند کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ جماعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی۔ اور وہ اپنی جداگانہ تمدنی ہستی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں چند روز میں دہلی آرہا ہوں پھر اس موضوع پر آپ سے زبانی گفتگو ہوگی "[1]

دوسرا خط ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء کا ہے۔ جس میں لکھتے ہیں:

" میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میرا وہ خط جو میں نے دو ہفتے ہوئے لکھا تھا آپ کی خدمت میں پہونچا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو دہلی کے پتہ سے بھیجا تھا۔ اور جب میں نے دہلی پہونچ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔

" میں نے اُس خط میں یہ تجویز پیش کی تھی۔ کہ ہمیں فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کر کے۔ حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (شیخ محمد اشرف)

"حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اور بعض ایسے وجوہ سے، جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کا رجحان بڑی سرعت سے کانگرس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لئے میری درخواست ہے۔ کہ آپ جلد از جلد غور فرما کر میری اس تجویز کا فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تو آئندہ اگست تک ملتوی ہو چکا ہے۔ اور ادھر حالات ایسے ہیں کہ مزید انتظار یا تامل کئے بغیر مسلمانوں کی قومی پالیسی کا دوبارہ اعلان کر دینا بے حد ضروری ہے۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے چند بڑے بڑے مسلمان لیڈر ملک کا دورہ کر لیں۔ تو کنونشن بہت کامیاب رہے گی۔" [1]

علامہ اقبال بیمار تھے۔ اور دہلی صرف اس لئے گئے تھے۔ کہ اپنے معالج حکیم نابینا صاحب کو نبض دکھا سکیں۔ لیکن انھیں پنڈت نہرو کی کنونشن سے اس قدر تشویش تھی۔ کہ وہ بڑی شدت اور بڑے اصرار سے مسٹر جناح کو بار بار لکھتے ہیں کہ اسی نہج پر خود مسلمان ممبروں کی بھی کنونشن ہونی چاہیئے۔

مسٹر جناح جن مشکلات میں اُس وقت گھرے ہوئے تھے۔ اُن کا صحیح اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تن تنہا آل انڈیا مسلم لیگ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے مستعفی ہو جانے کے بعد لیگ کا کوئی

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (مرتبہ شیخ محمد اشرف)

سکرٹری نہیں تھا۔ ساری خط و کتابت مسٹر جناح کو خود کرنا پڑتی تھی۔ اُن کے پاس کوئی ٹائپسٹ بھی نہیں تھا۔ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ اقلیت کے صوبوں میں۔ کانگرس کی عظیم الشان کامیابی نے۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ جگہ جگہ یہ آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ کہ اب مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اپنی جداگانہ تنظیموں کو توڑ کر کانگرس میں شامل ہو جائیں۔ خود کانگرسی لیڈر اِس یقین میں مگن تھے۔ کہ اب کوئی دِن کی بات ہے۔ یہ جداگانہ انتخاب، یہ فرقہ وارانہ فیصلہ اور یہ اقلیتوں کے تحفّظات ختم کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر کانگرس پورے برِّ عظیم کی واحد نمائندہ جماعت بن کر۔ اپنی مرضی اور اپنی شرائط پر برطانوی حکومت سے گفت و شنید کرے گی۔

اِن حالات میں جناح کا سب سے پہلا کام یہ تھا۔ کہ وہ اقلّیت کے صُوبوں میں مسلمانوں کا قومی شیرازہ منتشر ہونے سے بچائیں اور انھیں مرکزیت سے اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ دیں۔ چنانچہ عین جس وقت علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کنونشن کے انعقاد کی تجویز پیش کی تھی۔ مسٹر جناح لکھنؤ پہونچ کر۔ اِس کوشش میں مصروف ہو چکے تھے۔ کہ یو۔ پی اسمبلی کے تمام مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیں۔

میرے سامنے اِس وقت ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کا روزنامہ سٹیٹسمین ہے جس میں اخبار مذکور کے نامہ نگار کے قلم سے روئداد درج ہے:

"گذشتہ اتوار کو مسٹر جناح نے یو۔ پی اسمبلی کے اُن مسلمان ممبروں سے"

جو انڈی پنڈنٹ یا نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے، مفصّل گفتگو کی تھی۔ مسٹر جناح بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں۔ کہ تمام مسلمان ممبر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ مسلم لیگ پارٹی کا ایک اجتماع سلیم پور ہاؤس میں ہوا تھا۔ جہاں اسی موضوع پر دیر تک بحث مباحثہ جاری رہا۔ آخر رات کے ساڑھے گیارہ بجے مسٹر جناح وہاں سے اٹھ کر نواب سر محمد یوسف کے مکان پر گئے۔ جہاں غیر لیگی ممبر اُن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر جناح نے اُن کو وہ شرائط پیش کیں۔ جو مسلم لیگ پارٹی نے مرتب کی تھیں آخرکار اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا۔ کہ غیر لیگی ممبر اپنی جماعتوں سے مستعفی ہو کر۔ اور مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرکے مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ یہ معاملہ تقریباً رات کے ایک بجے طے ہوا۔ اور اِس کام سے فارغ ہو کر مسٹر جناح واپس سلیم پور ہاؤس گئے۔ تاکہ لیگ پارٹی کو یہ خوش خبری سُنا سکیں۔"

غور فرمایئے۔ مسٹر جناح کی عمر اُس وقت ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے اپنی ساری زندگی آرام و راحت اور تموّل میں گذاری تھی۔ وکالت کے ابتدائی دو، چار برسوں کی مشقت کے بعد قدرت نے اُنھیں زندگی کی تمام آسائشیں اور نعمتیں بڑی فراخ دلی۔ اور فیاضی سے مہیا کر دی تھیں۔ مدت سے اُن کا یہ معمول چلا آ رہا تھا۔ کہ وہ گرمیوں میں سیر و تفریح کے لئے یورپ

چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن اب ساٹھ سال کی عمر کو پہونچ کر، جب قوائے انسانی کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، انہوں نے شب بیداریاں شروع کر دی تھیں۔

پنجاب میں سر سکندر نے اپنی وزارت قائم کر لی تھی۔ جس میں خود اُن کے علاوہ پانچ آدمی شریک تھے۔ مسلمانوں میں سے ملک خضر حیات ٹوانہ۔ اور میاں عبدالحی ۔ ہندوؤں میں سے چودھری چھوٹو رام اور سر منوہر لال ۔ اور سکھوں میں سے سر سندر سنگھ مجیٹھیہ لئے گئے تھے۔ سکھوں کی دو مختلف جماعتیں اسمبلی میں تھیں۔ ایک اکالی پارٹی تھی۔ جس کے دس ممبر تھے۔ اور دوسری کا نام خالصہ نیشنل پارٹی تھا۔ جس کے تیرہ ممبر تھے۔ سر سکندر نے خالصہ نیشنل پارٹی کے لیڈر سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کو اپنی وزارت میں شامل کیا تھا۔ اس کے علاوہ دو سکھ یونینسٹ پارٹی۔ اور چار سکھ کانگرس پارٹی میں بھی شامل تھے۔ سر سندر سنگھ کو وزارت میں جگہ دینے سے یہ بات واضح ہو گئی تھی۔ کہ یونینسٹ پارٹی سکھوں کی نمائندگی کا دعوٰے نہ کر سکتی تھی۔

ہندو ممبروں میں سے کانگرس کے علاوہ دس آدمی یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے۔ جو تمام کے تمام گوڑ گانوہ، رُہتک اور حصار کے جاٹ تھے۔ اِنکے لیڈر چودھری چھوٹو رام تھے۔ دس ہندو ممبروں کی ایک الگ جماعت بھی تھی جس کا نام ہندو الیکشن بورڈ پارٹی تھا۔ اس کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ تھے۔ سر منوہر لال کو اسی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے وزارت میں شامل کیا گیا تھا۔ سر منوہر لال کی شرکت اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ یونینسٹ پارٹی

کُلیتہً ہندوؤں کی بھی نمائندگی کا دعوٰے کرنے کے قابل نہ تھی۔

۸ راپریل ۱۹۳۷ء کو پنجاب اسمبلی کے سپیکر کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اور علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ چودھری شہاب الدین کے مقابلے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کھڑا کیا جائے۔ ڈاکٹر کچلو انڈی پینڈنٹ امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے تھے۔ اور اپنے ایثار و قربانی۔ اور اپنے کردار کی بلندی کے اعتبار سے اسمبلی کے پورے ایوان میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہی ایک شخص تھے۔ جو، سیاسی عقائد سے قطع نظر۔ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ اگر انتخاب میں پارٹی کی بے جا پابندیاں عائد نہ کر دی جاتیں۔ تو خود یونینیسٹ پارٹی کے بہت سے ممبر چودھری شہاب الدین کے مقابلے میں ڈاکٹر کچلو کو ووٹ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور چودھری شہاب الدین کامیاب ہو گئے۔

دہلی کی آل انڈیا نیشنل کنونشن کے ختم ہوتے ہی۔ پنڈت نہرو نے اپنی ساری توجہ مسلمانوں کی طرف مبذول کر دی۔ اُن کو اس بات کا وہم ہو گیا تھا کہ مسلمان عوام تو دل سے کانگرس کے ساتھ ہیں۔ یہ محض چند سرپھرے مسلمان لیڈروں کی شرارت ہے۔ کہ وہ انھیں بہکا کر غلط راستے پر ڈال رہے ہیں چنانچہ پنڈت نہرو نے مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ کرنے کے بعد آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر دفتر الہ آباد میں ایک الگ محکمہ قائم کر دیا جس کا نام مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹیکٹ) رکھا گیا۔ اس محکمے کے نگران میرے ایک عزیز دوست ڈاکٹر محمد اشرف مقرر کئے گئے۔ ڈاکٹر اشرف مسلم یونیورسٹی

علیگڈھ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ اور بہت معقول تنخواہ لیتے تھے۔ لیکن اپنے سیاسی عقائد اور جذبہ ایثار کے تحت انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سکرٹریٹ میں صرف پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا منظور کر لیا۔

کانگرس کی اس نئی تحریک یعنی مسلم رابطہ عوام کی غرض وغایت۔ اور اُس کے طریق کار کو اپنی عبارت میں بیان کرنے کی بجائے۔ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ خود جواہر لال کے الفاظ یہاں نقل کر دیئے جائیں۔ تاکہ اصل تصویر سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنڈت نہرو نے ہندوستان کی تمام صوبائی کانگرس کمیٹیوں کو ذیل کا گشتی مراسلہ بھیجا۔

"الیکشن کے ہنگامے کے دوران میں۔ اور اُس کے بعد بھی۔ ہمارے ہاں اکثر اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی ہے۔ کہ مسلمان عوام کے ساتھ کانگرس کا رابطہ کیونکر اُستوار کیا جائے۔ ہمیں اپنے دورے کے سلسلہ میں جہاں جہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ کہ مسلمانوں میں اس بات کی بڑی خواہش پائی جاتی ہے۔ کہ وہ کانگرس کا پیغام سُنیں۔ اور کانگرس کی تحریک آزادی میں شرکت بھی کریں۔ لیکن چونکہ بدقسمتی سے ہم نے مسلمانوں کو اب تک نظر انداز کئے رکھا ہے۔ اور یوں بھی کانگرس میں تجربہ کار مسلمان کارکنوں کا سخت قحط ہے۔ اس لئے مسلمان عوام کے اس شوق اور اُن کی اس بیداری کا ہم کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

"اُسی وقت سے کانگرس کے بڑے بڑے رہنما اس مسئلہ پر غور و خوض کر رہے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو کانگرس میں کیوں نہ شامل کیا جائے۔ تاکہ ہماری تحریک آزادی پہلے سے بھی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جائے۔ اور مسلمان اپنی حیثیت اور اہمیت کے مطابق کانگرس کے کاموں میں حصّہ لے سکیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب ہم ملک کے بنیادی مسائل۔ مثلاً آزادی حاصل کرنے کی تڑپ۔ یا افلاس اور بے کاری کو دور کرنے کی خواہش پر غور کرتے ہیں۔ تو صاف نظر آتا ہے کہ اِن مشترکہ معاملات میں ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی باہمی اختلاف نہیں ہے۔ جھگڑا صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب گنتی کے چند بڑے بڑے لیڈر فرقہ وارانہ حقوق کے بٹوارے کی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

" اندریں حالات سب سے مقدم اور ضروری کام یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنایا جائے۔ جب اُن کی ایک کثیر تعداد کانگرس میں شامل ہو جائے گی۔ تو وہ لوگ خود بخود کانگرس کے کاموں میں حصّہ لیں گے۔ اور اِس طرح اپنی کارکردگی سے کانگرس کی پالیسی پر بھی نظر انداز ہوں گے۔ میں آپ کی صوبائی کانگرس کمیٹی سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ اِس معاملہ پر خصوصیت سے توجّہ کرے۔ اور مسلمان ممبر بھرتی کرنے کا کام

فوراً تندہی سے شروع کر دیا جائے۔ میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ بے شمار مسلمان کانگرس کی رکنیت قبول کرنے کو تیار ہیں۔ صرف اُن تک پہونچنا آپ کا کام ہے۔

"میری رائے میں ہندوستان کے ہر صوبے کی کانگرس کمیٹی کو چاہیئے کہ اپنے ہاں مسلم رابطہ عوام کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کرے جس کے نگراں اور کارکن شہر اور دیہات میں پھیل جائیں۔ اور مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کریں۔ میں اس کے لئے کوئی صاف، واضح اور معیّن لائحۂ عمل تجویز نہیں کر سکتا۔ یہ کام آپ کی صوبائی کمیٹی کا ہے۔ کہ وہ مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر جو طریق عمل موزوں سمجھے اختیار کرے۔ بہرحال یہ ضروری ہے۔ کہ مسلمان ممبروں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیا جائے۔ اور کانگرس کے کاموں میں مسلمانوں کی دلچسپی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ کانگرس کے مسلمان ممبر اپنی الگ دلچسپیاں مہیا کریں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مجموعی طور پر کانگرس ایسا پروگرام اختیار کرے۔ جس سے مسلمان بھی خاص دلچسپی کا اظہار کریں۔

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر دفتر واقع الہ آباد میں۔ اس غرض کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی جملہ صوبائی کانگرس کمیٹیوں میں مسلم رابطہ عوام کی جتنی شاخیں کھولی جائیں گی وہ سب کی سب الہ آباد کے مرکزی محکمے کے تحت کام کریں گی۔

مناسب یہی ہے کہ آپ مرکز کو اپنی کارگزاریوں کی باقاعدہ اطلاع بھیجتے رہیں۔ ہم آپ کو اس کام کے لئے مختلف پوسٹر اور پمفلٹ بھی مہیا کرتے رہیں گے۔

"اسی سلسلہ میں ایک اور ضروری گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مرکزی دفتر میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی ہیں۔ کہ کانگرس کے جلسوں کے اشتہار عموماً اردو میں شائع نہیں کئے جاتے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو کانگرس کے جلسوں، جلوسوں کی اطلاع نہیں ہونے پاتی یہ شکایت بالکل درست ہے۔ مہربانی فرماکر اپنے صوبے کی ضلع وار اور مقامی کانگرس کمیٹیوں کو سخت ہدایت کر دیجئے۔ کہ وہ آئندہ اردو میں بھی اشتہار شائع کیا کریں۔ بالخصوص پنجاب یو۔پی اور دہلی کے صوبوں۔ اور ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں اس قاعدے کی پابندی بے حد ضروری ہے" [1]

جواہر لال نے مسلم ماس کانٹیکٹ کا محکمہ قائم کر کے۔ اور کانگرس کمیٹیوں کے نام یہ گشتی مراسلہ جاری کر کے۔ گویا اس امر کا اعلان کر دیا تھا۔ کہ اب کانگرس جناح سے کوئی بات چیت نہیں کرے گی۔ اور اس کے بجائے وہ براہِ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی۔ اور انھیں بہلا پھسلا کر۔ ڈرا دھمکا کر۔ ورغلا کر بہکا کر۔ جھکے دے کر اور ہر قسم کے سبز باغ دکھا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئیگی

---

[1] روزنامہ سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۳۷ء

جواہر لال کے مزاج میں ضد اور تیز زبانی کے علاوہ ایک اور عنصر بھی شامل ہے جس کا نام ہے فریبِ نفس۔ وہ بعض اوقات صاف اور بدیہی حقائق کو دیکھنے سے محض اِس لئے انکار کر دیتے ہیں۔ کہ اُن کے نہاں خانۂ دماغ میں۔ اُن کے تصورات و توہمات نے جو دنیا تعمیر کر رکھی ہے۔ وہ اُن خارجی حقائق سے مختلف ہے۔

ہندوستان کے اچھوتوں کے مشہور لیڈر ڈاکٹر امبیدکار پنڈت نہرو کی اِس نئی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مسلم رابطۂ عوام کی تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان قوم کے لیڈروں کو نظر انداز کر کے۔ یا اُن سے بے نیاز و بے پروا ہو کر عام ہندؤں اور مسلمانوں میں یک سی یگانگت پیدا کی جائے۔ اگر اِس تحریک کی تحلیل اور اُس کا تجزیہ کیا جائے۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ برطانیہ کی قدامت پسند جماعت (کنزرویٹو پارٹی) کا منصوبہ تھا۔ کہ "لوریوں کی دولت" سے لیبر پارٹی کو خرید لیا جائے۔ یہ تحریک جتنی فتنہ انگیز تھی۔ اتنی ہی بے معنی بھی تھی۔ کانگرس نے اِس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا۔ کہ دنیا میں بعض ایسی گراں بہا چیزیں بھی ہیں۔ جن کا مالک اُن کی قدر و قیمت سے آگاہ ہونے کے بعد۔ اُن کو کبھی اپنے سے جُدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور کسی طرح دھوکہ اور فریب دے کر۔ اُس شخص سے وہ متاعِ عزیز ہتھیا لی جائے۔ تو سخت رنجش اور کشیدگی پیدا ہو جانے کا

احتمال ہے۔

"قوموں کی زندگی میں سب سے بیش قیمت سرمایہ اُن کا سیاسی اِقتدار ہے۔ بالخصوص ایسی قوم کے لئے جسے آئے دِن غنیم کے حملوں کا ہدف بننا پڑے۔ اور جسے اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ہمہ اوقات جدّوجہد میں مصروف رہنے کی ضرورت پیش آئے یہ سیاسی قوّت جان سے بھی زیادہ عزیز چیز ہے۔ یہی سیاسی قوّت ایک ایسا حربہ ہے۔ جس سے یہ قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر غلط پراپگنڈے کے زور سے۔ یا واقعات وحقائق کو مسخ کر کے۔ یا اعزاز و مناصب کا لالچ دے کر۔ یا سیم وزر کی جھلک دِکھا کر۔ کسی قوم سے اُس کی سیاسی قوت چھیننے کی کوشش کی جائے گی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اُس قوم سے گویا حفاظتِ خود اختیاری کا تمام اسلحہ چھین لیا گیا ہے۔ اور آئندہ اُسے ہمیشہ کے لئے مغلوب و محکوم بنا کر اُس کی خودداری سلب کر لی جائیگی"

"ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کریں۔ کہ اِن ہتھکنڈوں سے ملک میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا خیال بالکل غلط اور فسادانگیز ہے۔ مکروفریب کی اِن مکرو چالوں سے فریقِ مخالف کی آواز کو دبایا تو جا سکتا ہے۔ لیکن اِن چالوں سے اِتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یُوں کہنا صحیح ہوگا کہ اتحاد کی بجائے عداوت، کدورت اور مخالفت کی آگ پہلے

سے بھی زیادہ تندی کے ساتھ بھڑک اُٹھے گی۔ کانگرس کی جاری کردہ تحریک مسلم رابطہ عوام نے یہ تمام فتنے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس لئے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ مسلمانوں میں پاکستان کا تصور پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری اسی احمقانہ تحریک کے سر عائد ہوتی ہے۔" لـه

ڈاکٹر امبیدکار بہر حال سیاسی آدمی تھے۔ اب میں ایک ایسے شخص کی رائے پیش کرتا ہوں۔ جو اہل علم کے طبقے میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ اور جنہوں نے مسلم رابطہ عوام کی تحریک پر بالکل غیر جانبدارانہ انداز سے غور کیا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:

"...... انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد۔ جب کانگرس کو چھ صوبوں میں اپنی حکومت قائم کرنے کی امید نظر آنے لگی۔ تو اس نے مسلم رابطہ عوام کی تحریک جاری کر کے مسلمان عوام کو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس تحریک کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی۔ کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ اقتصادی اور سیاسی ہے۔ لہٰذا کانگرس کو سب قوموں کی نمائندہ جماعت بن جانا چاہیے۔ مسلم لیگ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ کانگرس کے برسر اقتدار ہو جانے

لـه "PAKISTAN OR THE PARTITION OF INDIA" By Dr. Ambedkar, Page 337

کے بعد، کیا صوبائی حکومتیں اور کیا مرکزی وفاقی حکومت، دونوں جگہ سے لیگ کو بے دخل کر دیا جائے گا۔ کانگرس کے ہائی کمان کا ضابطہ اس قدر سخت، اور اس کی گرفت اس قدر مضبوط تھی۔ کہ خود کانگرس کے اندر کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہونے کا قطعاً کوئی احتمال نہیں تھا۔ اس لئے کولیشن قسم کی وزارتیں بننے کی بھی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کانگرس کے پیشِ نظر یہ مقصد تھا۔ کہ اقتصادی و سیاسی پروگرام کا نعرہ بلند کر کے، مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہیئے تاکہ اس طرح سے مسلم لیگ کے پاؤں کے نیچے سے خود بخود زمین نکل جائے یہ درست ہے کہ کانگرس نے اقتصادی اصلاح کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن کانگرسی لیڈر اس حقیقت کو فراموش کر گئے۔ کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا" [1]

آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی کی اس بارے میں رائے ملاحظہ فرمایئے:

"کانگرس نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے۔ ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان قوم کے لیڈروں کو نظر انداز کر کے، مسلمان عوام سے براہِ راست درخواست کی جائے

---

[1] "INDIA'S HINDU MUSLIM QUESTION" (1946)
By Beni Parshad (Page 74)

کہ وہ کانگرس میں شریک ہو جائیں۔ ظاہر ہے اس تجویز پر عمل کرنے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ کہ مسلمانوں کا قومی شیرازہ منتشر ہو۔ اور اُن کے اس انتشار سے فائدہ اُٹھا کر۔ مسلمانوں کو کانگرس میں جذب کر لیا جائے۔

"فرض کیجئے کہ ہندوستان کو سوراج مل جاتا ہے۔ اور اس کے بعد آپ کسی غیر ملک، مثلاً جاپان سے گفت و شنید کرتے ہیں، اس صورت میں جاپان کی حکومت کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے گی۔ کہ آپ بالا بالا جاپان کے عوام کے پاس جا کر۔ اُن سے معاملے طے کریں۔ اگر آپ نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی۔ تو جاپانی حکومت یہ کہے گی۔ کہ میں جاپان کے عوام کی نمائندہ ہوں۔ جو کچھ کہنا سننا چاہتے ہو۔ مجھ سے کہو۔ اور اگر تم نے مجھ کو پس پشت ڈال کر۔ براہِ راست عوام پہ ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ تو میں تمہارے سفیر کو بیک بینی و دو گوش یہاں سے نکال دوں گی۔" [1]

اِن سب باتوں کے باوجود پنڈت نہرو بدستور اس فریب میں مبتلا تھے کہ مسلمان عوام دل و جان سے کانگرس کے حامی ہیں۔ بس ایک مرتبہ اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھنے کی دیر ہے۔ وہ خوشی سے لبیک کہتے ہوئے۔ بھاگے آئیں گے۔

---

[1] "CONGRESS IN OFFICE"
By Dr. C. R. Reddy (Page 60)

مسٹر جناح اب بھی کانگرس سے آبرومندانہ مفاہمت کے خواہاں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کانگرس اور لیگ کو مل کر حکومت چلانے کا موقع ملے گا تو فرقہ وارانہ رنجشیں ختم ہو جائیں گی۔ ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ آگے بڑھیں گے۔ اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی منزل روز بروز قریب آنا شروع ہو جائے گی۔ انہوں نے ۹ رمارچ ۱۹۳۷ء کو ایک اخباری بیان میں کہا:

"ہماری پالیسی بالکل صاف ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ موجودہ آئین سے، چاہے وہ جیسا کچھ بھی ہے، حتی الامکان پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس پالیسی کے اندر رہ کر ہم ہر ترقی پسند جماعت کے ساتھ اشتراک کرنے کو تیار ہیں۔ مسٹر راج گوپال اچاریہ نے حال ہی میں جس پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ لیگ کی پالیسی اُس سے مختلف نہیں ہے۔ ہم یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ مختلف صوبوں میں وزارتیں اور حکومتیں اس طرح چلائی جائیں۔ گویا گورنروں کے خاص اختیارات کا وجود نہیں ہے۔" [1]

۲۰ رمارچ کو انہوں نے پھر فرمایا:

"اس وقت ہم ملک میں قومی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ اور کانگرس کا اتحاد کچھ مشکل نہیں ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ لیگ کا پروگرام قوم پرستی اور وطن دوستی

---

[1] سول ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ رمارچ ۱۹۳۷ء

کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ہم کانگرس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرنے۔ اور کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔ لیکن اگر کانگرس نے انفرادی طور پر اِکّے دُکّے مسلمان کو، انعام واکرام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ تو اِس کے نتائج چنداں خوشگوار نہیں ہونگے“[1]

مسٹر جناح کے اِس انتباہ کے باوجود کانگرس نے تہیّہ کر لیا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں میں انتشار پھیلا کر اُن کی صفوں کو درہم برہم کرے گی۔ چنانچہ سب سے پہلا حملہ یو۔ پی پر ہوا۔ اور تجویز یہ قرار پائی کہ یو، پی کی مجلسِ قانون ساز کی کانگرس پارٹی کے جلسے میں۔ اُن مسلمان ممبروں کو بھی مدعو کیا جائے۔ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اور پھر باہمی گفت وشنید کے بعد۔ وہیں اُن سے کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرا لئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیگ اُس وقت ابھی ترقی و تنظیم کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گذر رہی تھی۔ اور خود مسلمانوں کو اِس بات کا یقین نہیں تھا۔ کہ کانگرس کی روزافزوں طاقت کے سامنے مسلم لیگ ٹھہر سکے گی۔ چنانچہ شکست خوردگی کے اِس عالم میں بعض لوگ علانیہ کہنے لگے تھے۔ کہ اب کانگرس سے الگ رہ کر کام کرنا یا زندہ رہنا محال ہے۔

مسٹر جناح تنہا اِس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی کوئی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) نہیں تھی۔ جس کے ممبروں سے بوقتِ ضرورت مشورہ کر لیا جاتا۔ لیگ کے سالانہ اجتماع کا بھی کوئی

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۹۳۷ء

امکان نہیں تھا۔ اس لئے ہندوستان بھر میں صرف جناح کی ایک آواز تھی۔ جو ان حالات نامساعد میں کبھی کبھی بلند ہوتی۔ اور مسلمان یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی طرف سے بولنے والا ابھی کوئی شخص موجود ہے۔ جب یو۔ پی کی کانگرس پارٹی کی مذکورہ بالا سازش کی اطلاع مسٹر جناح کو ملی۔ تو انہوں نے فرمایا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یو۔ پی کی کانگرس پارٹی کے ایک اجلاس میں۔ جو ۲/۴ مئی کو ہونے والا ہے۔ بعض ایسے مسلمان ممبروں کو بھی مدعو کیا گیا ہے جو یو۔ پی کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں۔ اس چال کی غرض وغایت سے میں بالکل بے خبر ہوں۔ تاہم میں یہ واضح کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اگر کسی فرد یا چند افراد نے کسی فریق کے ساتھ۔ یا بحثیت آخر کسی پورے صوبے کے ساتھ بھی۔ کوئی سمجھوتہ کر لیا۔ تو یہ سمجھوتہ عام مسلمانوں کو قطعاً پابند نہیں کر سکے گا۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ کہ اس قسم کی قابل اعتراض اور ناپسندیدہ حرکتیں محض اس لئے کی جا رہی ہیں۔ کہ مسلمانوں کی قومی جمعیت میں انتشار پیدا ہو۔ ایسے لوگوں کے ساتھ گفت وشنید کرنا۔ جو جلب منفعت کے لئے آج مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ اور جنہیں اپنے ذاتی مفاد کے لئے۔ کل کانگرس میں شامل ہونے سے بھی دریغ نہیں۔ قطعاً سود مند نہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ یو۔ پی کے مسلمان اس نازک وقت میں مسلمانانِ ہند کے خلاف غداری نہیں کریں گے۔ فریق ثانی کے ساتھ محض چند افراد کا سمجھوتہ، ہر چند کہ اس سمجھوتے سے دو، ایک آدمیوں کو ذاتی فائدہ پہنچے

کا امکان بھی کیوں نہ ہو، ہمارے قومی مسائل کا حل نہیں ہے۔ یو۔ پی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر خلیق الزمان نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اپنے ہاں کے حالات سے مجھے مطلع کریں گے۔ میں اُن کو اس سلسلہ میں کئی بار یاددہانی بھی کرا چکا ہوں۔ لیکن گذشتہ تین ہفتوں کے مسلسل انتظار کے باوجود۔ انہوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ میں اُن کی اِس پُر اسرار خاموشی کا مطلب سمجھنے سے معذور ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ فریقِ ثانی کے ساتھ ایسی کوئی مفاہمت نہیں کریں گے جسے انجام کار اُن کے صوبے ہی کے مسلمان نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان رد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

"محض چند متفرق افراد یا چند افراد کے کسی گروہ کے ساتھ۔ قومی مسائل کے تصفیہ کی گفت و شنید کرنے کا نتیجہ سوائے اِس کے اور کچھ نہیں نکلے گا۔ کہ مسلمان قوم کی پوری جمعیت کو درہم برہم کر کے۔ اسے مختلف گروہوں اور صوبائی حدبندیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔" [1]

چھ صوبوں میں کانگرس کی واضح اکثریت کے باوجود آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے فیصلہ کر دیا تھا۔ کہ جب تک اِن صوبوں کے گورنر صاحبان واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے۔ کہ وہ اپنے اُن اختیارات کو جو از روئے آئین اُنھیں حاصل ہیں، استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے۔ کانگرس اِن

---

[1] منقول از "نیوز ٹائمز" مورخہ ۳ مئی ۳۷ء ۱۹

چھ صوبوں میں وزارتیں مرتب نہیں کر سکے گی۔ وہ خاص اختیارات کیا تھے؟ صرف یہ کہ گورنر اِس بات پر نگاہ رکھے۔ کہ اکثریت کے ہاتھ سے اقلیت کے حقوق تلف نہ ہونے پائیں۔ اور اگر کسی صوبے کی وزارت اپنی اکثریت کے زعم میں۔ کوئی ایسا قانون نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ جس سے اقلیت کے حقوق کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو تو گورنر بطور مصلحت اُس قانون کے نفاذ کو روک سکے۔

میری رائے ہے کہ اِس بارے میں گورنر مجبور تھے۔ اُن کے اختیاراتِ خصوصی ۱۹۳۵ء کے دستور کا ایک جزو تھا۔ جس سے چشم پوشی یا صریح اِنکار آئینی لحاظ سے بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وائسرائے اور وزیر ہند دونوں نے کانگرس کے اِس مطالبہ کو ناجائز قرار دے کر۔ اِس قسم کا وعدہ کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگرس نے اپنی اکثریت کے باوجود، وزارتیں بنانے سے اِنکار کر دیا۔ اور ایک نئی کشمکش پیدا ہوگئی۔ جو مسلسل تین مہینے تک چلتی رہی۔ آخر ۷ر جولائی ۱۹۳۷ء کو وائسرائے کے ایک بیان سے مطمئن ہو کر کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے صوبائی وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ وائسرائے نے اپنے اِس بیان میں اگرچہ صاف، واضح اور قطعی الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا کہ صوبوں کے گورنر اپنے اختیاراتِ خصوصی کو استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے لیکن اُنہوں نے اِتنا ضرور کہہ دیا تھا۔ کہ صوبائی نظم و نسق کی حقیقی ذمہ داری وزیروں پر عائد ہوتی ہے۔ اور گورنر ایک آئینی حکمران کی حیثیت سے وزارت کے فیصلے کا پابند سمجھا جائے گا۔ باقی رہا اختیاراتِ خصوصی کا دائرہ۔ اِس دائرہ میں گورنر حتی الوسع یہی کوشش کرے گا کہ اُس کے اور صوبائی وزیروں کے درمیان

کوئی غیر ضروری نزاع پیدا نہ ہونے پائے۔

مسٹر جناح نے کانگرس کے اس تازہ فیصلے کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور فرمایا:

"میں خوش ہوں۔ کہ کانگرس نے صوبائی وزارتیں مرتب کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ میں تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے بار بار یہ کہہ رہا ہوں۔ کہ بحالاتِ موجودہ صوبائی آئین پر کاربند ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ..... مجھے امّید ہے کہ جہاں تک اپنے ابنائے وطن کا سوال ہے۔ کانگرس اپنے راستے میں کسی بیکار اور غیر ضروری وقار کے احساس کو حائل نہیں ہونے دیگی اور صوبوں کی مجالسِ قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ بخوشی اشتراک و تعاون کرے گی۔ میں کئی بار اس امر کا اعادہ کر چکا ہوں کہ ہمارا ہاتھ، جو دوستی، تعاون اور اخوت کا ہاتھ ہے۔ ہر وقت حاضر ہے۔ ہم کانگرس کے ہر اُس پروگرام میں شریک ہونے کو تیار ہیں جس کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہے۔ خواہ وہ پروگرام مجالسِ قانون ساز کے اندر رہ کر چلایا جائے۔ یا مجالسِ قانون ساز سے باہر اس کا نفاذ کیا جائے۔ آج ہندوستان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کریں"۔ [1]

جناح کی نیک نیّتی، خلوص، حبِّ وطن اور سیاسی دُور اندیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ کہ وہ بار بار اپنا ہاتھ کانگرس کی طرف بڑھاتا ہے۔ اور دوستی

---

[1] سول ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۷ء

تعاون، اخوت اور متحدہ محاذ کا واسطہ دے دے کر درخواست کرتا ہے۔ کہ آؤ ہم سب مل کر اپنے وطنِ عزیز کی خدمت کریں۔ آؤ! ایک مشترکہ پروگرام بنائیں جس سے عوام کی مصیبتیں رفع ہوں۔ آؤ ایک ایسا محاذ قائم کریں۔ جہاں ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ کھڑے ہو کر بدیشی حکومت کا مقابلہ کر سکیں۔

ہندوستان کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ کانگرس نے طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر۔ جناح کی اس پیشکش کو رد کر دیا۔ اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اُسکے ارمغانِ اخوت کو ٹھکرا دیا۔ کانگرسی لیڈر مسلم رابطۂ عوام کی تحریک میں مست تھے اور خیال کر رہے تھے۔ کہ اب جناح سے بات کرنا بے سُود ہے۔ عنقریب خود مسلمان جناح کی قیادت کو رد کر کے۔ کانگرس کے حلقہ بگوش بن جائیں گے۔

مسلم رابطۂ عوام کی تحریک کا پہلا ثمر یہ تھا۔ کہ کانگرس نے فیصلہ کیا کہ اگر مسلمانوں کے کسی حلقے میں ضمنی انتخاب ہوا۔ تو وہ پورے جوش و خروش سے اپنا اُمیدوار کھڑا کرے گی اور مسلم لیگ کا مقابلہ کرے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا معرکہ بہرائچ (یو۔ پی) میں ہونے والا تھا۔ جہاں سے عام انتخاب میں مسلم لیگ کے ایک ممبر ٹھاکر اصغر علی کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن اسمبلی کے ایوان میں داخل ہونے سے قبل ہی فوت ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بیّن انداز میں فرمایا تھا۔ کہ یہ نشست مسلم لیگ کی ہے۔ اور ہم اِسے اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیں گے۔ اُن کے الفاظ یہ تھے:

"بہرائچ کی نشست مسلم لیگ نے جیتی تھی۔ لیکن مجھے سخت افسوس ہے کہ جو ممبر اس حلقے سے کامیاب ہوئے تھے۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے

ہمیں اس نشست پر لازماً قبضہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے ہم نے اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کانگرس بھی اس حلقے سے اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر کانگرس نے ایسا کیا تو وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرے گی۔ اب چونکہ آئین جدید کو توڑنے کی شق کانگرس کے پروگرام میں سے خارج ہو چکی ہے۔ اس لئے مسلم لیگ اور کانگرس کے پروگرام میں عملاً کوئی فرق باقی نہیں رہا۔"[1]

مسٹر جناح کے اس واضح اور غیر مشتبہ اعلان کے باوجود کانگرس نے اپنے ٹکٹ پر رفیع احمد قدوائی کو بہرائچ کے اس ضمنی انتخاب میں کھڑا کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ یو۔ پی مسلم لیگ نے کانگرس کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یوں مسلم لیگ کی یہ سو فیصدی یقینی نشست بلا مقابلہ کانگرس کے حوالے کر دی۔

یہ راز اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ یو۔ پی مسلم لیگ نے اپنی جیتی ہوئی نشست۔ کیوں مفت میں کانگرس کی جھولی میں ڈال دی۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت عام طور پر یہ افواہ مشہور تھی۔ کہ چودھری خلیق الزمان کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی کامیاب ہوئے ہیں۔ اور چودھری خلیق الزمان ہی کے ایما سے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا۔

چونکہ اس واقعہ کو بیس بائیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس لئے یہ کتاب

---

[1] نیوٹائمز۔ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء

لکھتے وقت مجھے اندیشہ ہوا۔ کہ مبادا میرے ذہن سے بعض باتیں نکل گئی ہوں چنانچہ میں نے ڈاکٹر اشرف کو دہلی خط لکھ کہ اس بارے میں مزید تصدیق کی۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ :

"رفیع قدوائی عام انتخابات کے بعد ایک حلقے سے چنے گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے اُن کی مخالفت نہیں کی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کی کامیابی میں خلیق صاحب کو بھی دخل تھا۔"

اسی طرح الہ آباد کے حاجی سید محمد حسین نے، جو اس زمانے میں کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے، اپنے ایک طویل بیان میں جو اپریل ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں ہندوستان کے بعض روزانہ اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ چودھری خلیق الزماں پر یہی الزام عائد کیا تھا۔ [1]

بہرحال اِس سے بحث نہیں۔ کہ کس شخص کے ایما سے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا نہ کیا۔ یا کس شخص کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی بلا مقابلہ منتخب ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ رفیع قدوائی کے اسمبلی میں داخل ہوجانے کے بعد سیاسیات نے ایک ایسا رُخ پلٹا۔ جو ہر اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے پریشان کُن اور مسلم لیگ کے لئے نقصان رساں ثابت ہوا۔

جولائی ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں ایک اور ضمنی انتخاب یو۔پی میں ہوا۔ اب کی یہ معرکہ جھانسی میں تھا۔ یہاں کانگرس نے نثار احمد شروانی کو اور مسلم لیگ

---

[1] نیو ٹائمز۔ مورخہ ۲۶ر اپریل ۳۷ء

نے رفیع الدین کو کھڑا کیا تھا۔ مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور نثار شروانی کم و بیش ایک ہزار ووٹ سے ہار گئے۔

لیگ اور کانگرس کی اس باہمی کشمکش سے دونوں فریقوں میں بدمزگی بڑھنے لگی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے جس متحدہ محاذ کا خواب مسٹر جناح نے دیکھا تھا وہ اس روز افزوں کشمکش میں پریشان ہوتا نظر آرہا تھا۔ بعض درد دل رکھنے والے لوگوں نے اخبارات کے ذریعے پنڈت نہرو کو تنبیہہ کی۔ کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ رابطہ عوام کی تحریک کو بند کر دو۔ اور براہِ راست مسٹر جناح سے مفاہمت کر لو۔ لیکن افسوس کہ اس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا۔

مئی ۱۹۳۷ء میں مسلم رابطہ عوام کی تحریک نے پنجاب کا رُخ کیا۔ اُس کی صورت یہ ہوئی۔ کہ خالد لطیف گابا چونکہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں اُن کی نشست خالی ہو گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اس خالی نشست کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا کی شخصیت، عظمت اور قومی خدمات کے پیشِ نظر۔ پنجاب کے کسی مسلمان کو اُن کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہو سکی۔ امرتسر کے شیخ محمد صادق بیرسٹر اور شیخ حسام الدین بھی اِس نشست کے امیدوار تھے۔ لیکن جونہی اُنھیں معلوم ہوا۔ کہ مولانا کھڑے ہو رہے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے نام واپس لے لئے۔

البتہ اِس موقعہ پر انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ، کانگرس آگے بڑھی اور

اُس نے مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کر دیا۔ یہ امیدوار کون تھا؟ سُنیئے۔ لاہور میں ٹمپل روڈ پر ایک بزرگ خان بہادر میاں چراغ دین رہتے تھے۔ جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایک ریٹائرڈ افسر تھے۔ اُن کے صاحبزادے میاں عبدالعزیز کانگرس کے اُمیدوار بن کر سامنے آگئے۔ خان بہادر چراغ دین ایک مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ جن کے پورے خاندان کو سیاسیات سے دُور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ میاں عبدالعزیز ٹھیکیداری کرتے تھے۔ اور بہت مال دار آدمی تھے۔ تعلیم کے لحاظ سے وہ مڈل پاس بھی نہیں تھے۔ متموّل رئیس ہونے کی وجہ سے بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ اور کچھ ہی تھوڑا عرصہ قبل آنریری مجسٹریٹ بننے کی کوشش بھی کر چکے تھے۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میاں عبدالعزیز کو یکایک اِس امن، چین، تموّل اور سرکار پرستی کے خول سے نکالنے اور مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے پر کانگرسی امیدوار بنا دینے کا سہرا میاں افتخار الدین کے سَر تھا۔

میاں افتخار الدین اُس زمانے میں نئے نئے کانگرس میں شامل ہوئے تھے۔ اور حُسنِ خدمات کے بدلے، جواہر لال سے جلد از جلد خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میاں عبدالعزیز چونکہ ارائیں تھے۔ اِس لئے میاں افتخار الدین نے یہی مناسب خیال کیا کہ سب سے پہلے اپنی ہی برادری پر سیاسی ڈاکہ ڈالیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ڈاکٹر ستیہ پال سے کہہ سُن کر میاں عبدالعزیز کو کانگرس کا ٹکٹ دلوا دیا۔ مجھے پختہ یقین ہے۔ کہ گوپی چند بھارگو اور ستیہ پال اِس واقعے سے قبل۔ میاں عبدالعزیز کے نام، کام اور شکل و صورت سے بھی

واقف نہ تھے۔ خود میاں افتخار الدین کی اُس وقت یہ حالت تھی۔ کہ وہ صرف دو سال قبل اپنی تعلیم ختم کر کے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ اور سن و سال کے اعتبار سے ابھی اُسی منزل میں تھے جسے بقول شخصے "جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ سیاسیات کے اُتار چڑھاؤ، مسلمانوں کے قومی مزاج اور مولانا ظفر علی خاں کے شاندار ماضی سے قطعاً بے خبر تھے۔ اِسی لئے اُن سے یہ ایسی حرکت سرزد ہو گئی۔ جس سے پورے پنجاب کے مسلمانوں کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا۔ اور سینہ غم و غصّہ کا محشرستان بن گیا۔

پنجاب کی ساری ارائیں برادری نے متفقہ طور پر مولانا ظفر علی خاں کی امداد کا وعدہ کیا۔ اور کانگرس کے فریب خوردہ لیڈروں کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ قبائلی عصبیت کے نام سے۔ مسلمانوں میں تشتّت و افتراق کا بیج نہیں بو سکیں گے۔ اِدھر علامہ اقبال نے خان بہادر میاں چراغ دین کو بار بار پیغام بھیجا کہ خُدارا اپنے صاحبزادہ کو سمجھائیے کہ وہ ہندوؤں کا آلہ کار نہ بنے۔ میاں چراغ دین بڑے ہوش مند بزرگ تھے۔ اُنہوں نے فوراً ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ رسمی طور پر چند آدمیوں کا ایک بورڈ بنا دیجئے۔ جو مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کے معاملے میں ثالث بالخیر بن کر فیصلہ کرا دے۔

ظاہر ہے میاں عبدالعزیز اس غیر مساوی مقابلے سے دست بردار ہونے کو بالکل آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے۔ اُن کی یہ خواہش بیجا نہ تھی۔ کہ اِس قسم کا ایک ثالثی بورڈ بن جائے۔ جو فریقین میں تصفیہ کرا دے

چنانچہ علامہ اقبال نے ملک برکت علی۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا اور بیگم شاہ نواز پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا۔ جس نے اپنا فیصلہ مولانا ظفر علی خاں کے حق میں صادر کر دیا۔ اور وہ انجام کار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

کانگرس کی اس حرکت سے دو فائدے یقیناً ہوئے۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ جہاں تک مسلمان عوام سے رابطہ استوار کرنے کا تعلق ہے۔ کانگرس کی جہالت، خود فریبی اور ابن الوقتی کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوٹا۔ جو جماعت اپنے آپ کو انقلاب کی حامی اور برطانوی ملوکیت کی دشمن ظاہر کرتی تھی۔ اور جس کا یہ دعوٰے تھا۔ کہ وہ مفلس پس ماندہ عوام کی رہنمائی کرتی ہے۔ اُس نے اسمبلی کے انتخاب میں مولانا ظفر علی خاں ایسے بطلِ حرّیت کے مقابلے میں اُس شخص کو اپنا ٹکٹ دیا۔ جو ابھی چند مہینے قبل آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ جسے عوامی یا سیاسی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور جس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دولت مند تھا۔ اور کانگرس اُس کی دولت کی آڑ میں اپنا ذاتی کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا۔ کہ سر سکندر نے صریحاً محسوس کر لیا۔ کہ اگر کانگرس کی نئی تحریک یعنی رابطہ عوام نے مسلمان قوم کے گھر میں نقب لگائی۔ تو یونینسٹ پارٹی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یونینسٹ پارٹی ایک مخلوط جماعت تھی۔ جو ایک خاص قسم کے اقتصادی پروگرام پر قائم کی گئی تھی۔ اُدھر کانگرس بھی ایک مخلوط جماعت ہونے کا دعوٰے کرتی تھی۔ جس کا پروگرام اقتصادی اور سیاسی تھا۔ دونوں جماعتیں اپنے آپ کو فرقہ پرستی سے بالاتر سمجھتی تھیں۔ ظاہر ہے کانگرس اور

یونینسٹ پارٹی کے باہمی مقابلہ ہیں۔ یونینسٹ پارٹی کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اِسی لئے جب کانگرس نے پنجاب کے مسلمانوں پر یہ پہلا حملہ کیا۔ تو سر سکندر نے فوراً محسوس کر لیا۔ کہ اِس معرکے میں صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کو بچا سکے گی چنانچہ مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کی اِس چپقلش کے دوران میں سر سکندر کے آدمی بار بار اُن کا پیغام لے کر ہمارے دفتر میں آتے تھے اور خود سر سکندر نے۔ اِس سلسلہ میں ملک برکت علی سے خود ملنے اور مشورہ کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا نتیجہ برآمد ہونے۔ اور صوبائی وزارت بن جانے کے بعد۔ جب فضا کسی قدر صاف ہوئی۔ تو ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا۔ کہ آئندہ اِس صوبے میں مسلم لیگ کی حیثیت کیا ہوگی۔ کیا لیگ محض اُوپر کے طبقے کے لوگوں کا ادارہ بن کر رہ جائے گی۔ یا وہ کسی عوامی جماعت کی صورت اختیار کرے گی؟

الیکشن کے دوران میں ہم نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ مسلم لیگ کا عوام کے ساتھ کوئی ربط و ضبط نہیں تھا اور اکثر و بیشتر لوگ لیگ کے نام اور کام سے بالکل نا آشنا تھے۔ حالات اِس سُرعت سے بدل رہے تھے۔ اور واقعات کی رفتار اِس قدر تیز ہو گئی تھی۔ کہ اب کسی سیاسی جماعت کا عوام سے الگ تھلگ ہو کر رہنا قطعاً ناممکن تھا۔ مشکل یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی نظام اُس وقت تک منظم نہیں ہوا تھا۔ اور خود مسٹر جناح کی مصروفیتیں اِس قدر زیادہ تھیں۔ کہ وہ ہنوز اِس کام کی تفصیلات و جزئیات کی طرف توجہ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم علامہ اقبال

کی رائے اِس بارے میں بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ لیگ کو جلد از جلد ایک عوامی ادارہ بن جانا چاہیئے۔ اور لیگ کی آواز کا ایک ایک بچے تک پہونچ جانا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اِس سلسلہ میں ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو بھی لکھا تھا کہ :

"........ لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ کہ کیا وہ بدستور ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی۔ یا اُن مسلمان عوام کے ایک اجتماعی ادارے کی صورت اختیار کرے گی۔ جنھوں نے ابتک بعض معقول وجوہ کی بنا پر۔ لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اُس سیاسی جماعت کے زندہ رہنے کا اب کوئی امکان نہیں۔ جو عامۃ المسلمین کی حالت سدھارنے یا اُن کی فلاح و بہبود کے کاموں کی طرف توجہ کرنے سے گریز کرتی ہے..... اگر لیگ نے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ نہ کی۔ تو پھر مجھے یقین ہے کہ مسلمان عوام بدستور سابق لیگ سے بے تعلق اور غافل رہیں گے" [1]

انہی خیالات کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے اپریل کے دوسرے ہفتے میں مسلم لیگ کے چند کارکنوں کو اپنے دولت کدے پر بلایا۔ اور لیجسلیٹو اسمبلی کے متعلق مشورہ

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (محمد اشرف)

کرنے کے بعد۔ صوبائی لیگ کے جنرل سکرٹری کو تاکید کی۔ کہ پنجاب کے مختلف شہروں کا فوراً دَورہ شروع کر دیا جائے۔ تاکہ جگہ جگہ لیگ کی مقامی شاخیں قائم کی جاسکیں۔

۲۵ر اپریل کو غلام رسول خاں نے پنجاب صوبائی لیگ کا ایک اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں کیا۔ جہاں ملک زمان مہدی خاں کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا یہ فرض تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی ضلع وار اور مقامی شاخیں قائم کرنے۔ اور عوام سے لیگ کا ربط و ضبط بڑھانے کی ایک جامع سکیم جلد از جلد مرتب کرے۔

مئی کے پہلے ہفتہ میں یہ سکیم مرتب ہو گئی۔ جسے علامہ اقبال نے منظور فرمایا اور مئی کے دوسرے ہفتے سے ہم نے پنجاب کا دَورہ شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں بہت سی مشکلات سدِ راہ تھیں۔ سب سے بڑی مشکل روپے کی کمی تھی۔ دوسری مشکل یہ تھی۔ کہ ہم میں سے کوئی شخص پیشہ ور لیڈر یا پیشہ ور سیاستدان نہیں تھا ہر ایک کو اپنی روٹی کمانے کا دھندا درپیش تھا۔ اور عام لیڈروں کی طرح دو دو ہفتے سفر میں رہنا۔ ہمارے لئے بالکل ناممکن اور خارج از بحث تھا۔ تاہم جون کے آخر تک ہم نے امرتسر۔ جالندھر۔ فیروزپور۔ رُہتک۔ لُدھیانہ۔ پانی پت انبالہ۔ بھیرہ۔ کیمبل پور گوڑگانوہ کا دورہ کر لیا۔ اور ان مقامات پر لیگ کی ضلع وار مقامی شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ اس دَورے میں میاں فیروزالدین احمد مرحوم رخادمِ خلافت) بے حد مفید اور کارآمد ساتھی ثابت ہوئے۔ وہ برسوں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے ہمراہ رہ کر۔ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے

طور طریقوں سے خوب واقف ہو چکے تھے۔

جولائی کے شروع میں میں اور ملک برکت علی ڈلہوزی چلے گئے۔ زمان مہدی اپنے گاؤں تشریف لے گئے۔ اور غلام رسول خاں کا ارادہ تھا کہ وہ جولائی کا مہینہ لاہور میں ٹھہر کر اگست میں کشمیر چلے جائیں گے۔ ہمیں ڈلہوزی گئے ہوئے مشکل سے دو ہفتے گزرے تھے۔ کہ غلام رسول خاں کا تار گیا۔ کہ فوراً لاہور پہنچو۔ ہم واپس لاہور آئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ فلسطین کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو رائل کمشن مقرر کیا تھا۔ اُس کی رپورٹ شائع ہو گئی ہے جس میں کمشن نے تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی ہے علامہ اقبال اِس فیصلے سے مغموم اور رنجیدہ تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ فوراً لاہور میں ایک جلسۂ عام منعقد کرکے۔ اِس تجویز کی مخالفت کرے۔ خود علامہ مرحوم نے رائل کمشن کے اِس فیصلے کے خلاف ایک زبردست بیان انگریزی میں لکھا تھا اور اُن کا ارشاد تھا۔ کہ یہ بیان جلسۂ عام میں پڑھ کر سنایا جائے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اب تک مسلم لیگ کے اہتمام سے لاہور میں کوئی جلسۂ عام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ یہ جلسہ ۲۶ رجولائی ۱۹۳۷ء کو ملک برکت علی کی زیر صدارت، موچی دروازے کے باغ میں منعقد ہوا۔ لیگ کی عوامی تحریک کا سب سے پہلا اور بڑا کامیاب جلسہ ثابت ہوا۔ اِس جلسے میں فلسطین کے متعلق برطانوی حکومت کے رویّے کی مذمت کرنے کے علاوہ۔ حکومت پنجاب سے آغا عبدالکریم شورش اور مولانا عبدالکریم آصف کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

شورش میرے کرم فرمائے قدیم ہیں۔ اور اگرچہ انہوں نے اپنی زبانِ قلم و زبانِ دہن کو میرے خلاف استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن انہیں شاید حقیقت

معلوم نہیں۔ کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سے اُن کی قید و بند کے خلاف پہلی اور آخری مرتبہ جو صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی۔ وہ قرارداد میں نے ہی پیش کی تھی۔ فلسطین کے متعلق علامہ اقبال کا بیان آج بلاشبہ تبرکات میں شامل کرتا چاہیئے۔ یہ بیان اُن کی زندگی کے آخری سال کی اہم ترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اصل بیان انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن جلسہ عام میں غلام رسول خاں نے اُس کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ انگریزی بیان سوائے ٹائمز کے اور کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اب اُس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

"میں آپ لوگوں کو اِس امر کا یقین دلاتا ہوں۔ کہ عربوں کے ساتھ جنا انصافی کی گئی ہے۔ میں اُس کو اُسی شدت سے محسوس کرتا ہوں جس شدت سے ہر وہ شخص اُسے محسوس کرتا ہے جسے مشرق قریب کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی پانی سر سے نہیں گذرنے پایا۔ اور انگریز قوم کو بیدار کر کے۔ اِس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اُن وعدوں کو پورا کرے۔ جو اُس نے انگلستان کے نام پر عربوں کے ساتھ کئے تھے۔ بہر حال یہ امر کسی حد تک موجب اطمینان ہے۔ کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اِس موضوع پر حال ہی میں جو بحث ہوئی ہے۔ اُس میں تقسیم فلسطین کے مسئلے کا کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانانِ عالم کو چاہیئے۔ کہ وہ پوری بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کریں۔ کہ برطانیہ کے مدبرین جس عقدے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُس کا تعلق صرف

فلسطین تک محدود نہیں۔ بلکہ وہ، ایک سرے سے دوسرے سرے تک، پورے عالم اسلام کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے۔

" اگر تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ یہ معاملہ خالصتہً اور کلیتہً مسلمانوں کا معاملہ ہے تاریخ اس بات پر شاہد ہے۔ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ بیت المقدس میں تشریف لے گئے تھے ـــــ اور اس واقعہ پر بھی آج تیرہ سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے ـــــ تو اُن کی تشریف آوری سے مدتوں پہلے یہودیوں کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہودیوں کو فلسطین سے زبردستی نہیں نکالا گیا تھا۔ بلکہ جیساکہ پروفیسر ہاکنگز کی رائے ہے، وہ اپنی خوشی سے دوسرے ممالک میں چلے گئے تھے۔ اور اُن کے صُحفِ مقدس کا بیشتر حصّہ بھی فلسطین سے باہر ہی قلم بند کیا گیا تھا۔ یہ بھی امرِ واقعہ ہے۔ کہ فلسطین کا سوال کبھی مسیحیوں کا مسئلہ نہیں بنا تھا۔ دورِ حاضر کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں تو راہب پیٹر کا وجود بھی مشتبہ اور غیر یقینی نظر آنے لگا ہے۔ اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ صلیبی جنگوں کی غرض و غایت یہ تھی۔ کہ فلسطین کو مسیحی مسئلہ بنایا جائے۔ تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ صلاح الدین کی فتوحات نے ایسی تمام کوششوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا تھا۔ لہٰذا میری نگاہ میں فلسطین کا مسئلہ سراسر اور کلیتہً مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔

" مشرقِ قریب کے مسلمانوں کے بارے میں، برطانوی شہنشاہیت

کے مذموم ارادوں کو جس بُری طرح رائل کمشن نے اِس رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے۔ اُس کی مثال پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تجویز تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اِس متقدس اور مذہبی سرزمین پر۔ اپنا مستقل اقتدار قائم رکھ کر برطانوی شہنشاہیت خود اپنے لئے ایک نیا ٹھکانہ پیدا کر رہی ہے۔ یہ اقدام ایک خطرناک تجربہ ہے۔ اور برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رُکن نے بھی اِس کو خطرناک تجربے ہی سے تعبیر کیا ہے۔ بحرِ رُوم میں برطانیہ کو جو مشکلات درپیش ہیں۔ یہ تجربہ اُن کو رفع نہیں کر سکے گا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کہ اُن مشکلات کو رفع کرنے کی بجائے۔ یہ تجویز برطانوی شہنشاہیت کے لئے بہت سے نئے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

"عربوں کو جس جس طریقے سے تنگ کر کے اپنی ارضِ مقدّس جس پر مسجدِ عُمرؓ قائم ہے، فروخت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اُس میں ایک طرف تو مارشل لا جاری کر دینے کی سخت دھمکیاں ہیں اور دوسری طرف عربوں کی قومی فیاضی اور اُن کی روایتی مہمان نوازی کے جذباتِ لطیف کو برانگیختہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرزِ عمل گویا اِس بات کا ثبوت ہے۔ کہ برطانوی تدبّر کا اب دیوالہ نکل چکا ہے۔ یہودیوں کو زرخیز اراضی کی پیش کش کر کے۔ اور عربوں کو پتھریلی بنجر زمین کے ساتھ کچھ نقد رقم دے کر راضی کرنے کی کوشش

قطعاً کسی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادنے درجے کی حقیر سودے بازی ہے۔ جو یقیناً اُس عظیم الشان قوم کے لئے موجب ننگ اور باعث شرم ہے۔ جس کے نام پر عربوں سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ اُن کے درمیان ایک مشترکہ و متحدہ وفاق قائم کر دیا جائے گا۔

" میں اِس مختصر سے بیان میں رائل کمشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی ایشیا کو زمانہ حال کی تاریخ سے بعض بے حد اہم سبق ضرور سیکھنا چاہئیں۔ تجربے نے یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ مشرقِ قریب کے لوگوں کی سیاسی زندگی کی بقا صرف اِس راز میں مضمر ہے۔ کہ ترکوں اور عربوں کا اتحاد جلد از جلد قائم ہو جانا چاہیئے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں کو عالمِ اسلام سے جدا کر دینے کی سازشیں بدستور جاری ہیں۔ گاہے گاہے اِس قسم کی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں۔ کہ تُرک اِسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی بولا گیا ہوگا۔ اِس نوع کے شرارت انگیز اور فتنہ پرور پراپاگنڈے کا شکار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جنھوں نے اسلامی فقہ اور اسلامی اصولِ قانون کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔

" یہ عرب ہی تھے۔ جن کے مذہبی شعور نے اسلام کو جنم دیا تھا جس نے

آگے چل کر ایشیار کی مختلف قوموں کو متحد و مربوط کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لئے عربوں کو چاہیئے۔ کہ وہ اُن نتائج کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے ابتلاء اور مصیبت کے وقت ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

"دوسرا سبق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ عربوں کو چاہیئے۔ کہ اپنے قومی مسائل پر غور و فکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں۔ کیونکہ بحالاتِ موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ضمیر و ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہونچ سکیں۔

"تیسرا سبق یہ ہے۔ کہ آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی حمیّت و غیرت کا امتحان ہے۔ خواہ وہ ممالک عرب ہیں یا غیر عرب —— منصب خلافت کی تنسیخ کے بعد۔ عالم اسلام کے لئے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے۔ اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لئے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔

"بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیار کے آزاد اسلامی

ممالک کو اُس اینگلو فرانسیسی ادارے سے، جسے غلطی سے جمعیتِ اقوام کا نام دے دیا گیا ہے، اِس قدر بدگمان و برگشتہ کر دے۔ کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے اقوامِ مشرق کی ایک علیحدہ جمعیّت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔"

گیارھواں باب

کانگرسی راج

جب مئی ۱۹۳۷ء میں ہم نے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔ تو ایک یہ سوال بھی درپیش تھا۔ کہ مسلم لیگ کا وہ کون سا پیغام اور پروگرام ہے۔ جو عوام تک پہونچایا جائے گا۔ الیکشن ختم ہوچکے تھے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت قائم ہوگئی تھی۔ اور کانگرس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ اِن حالات میں بظاہر ہمارا سب سے بڑا ہدف یونینسٹ پارٹی ہی کو ہونا چاہیے تھا۔ الیکشن کے دوران میں ہمارا مقابلہ صرف یونینسٹ پارٹی سے تھا مسٹر جناح نے بھی انتخابات کے معرکے کا افتتاح کرتے وقت یونینسٹ پارٹی ہی کو مسلم لیگ کی حریف جماعت قرار دیا تھا۔ اِس کے علاوہ یہ یونینسٹ پارٹی ہی تھی۔ جو مخلوط جماعت ہونے کے باوجود مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوے کرتی تھی۔ اِس دوران میں البتہ ایک تبدیلی ایسی ضرور ہوئی تھی۔ جس نے ہماری توجّہ کو یونینسٹ پارٹی سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کرلیا تھا۔ اس

تبدیلی کا مفصل ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ یعنی کانگرس نے ....
.... مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے۔ مسلمانوں کو گمراہ کرنے۔ اور اُن کی جمعیت میں رخنہ ڈالنے کی مذموم کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اِن کوششوں کا ازالہ بھی بے حد ضروری تھا۔

با ایں ہمہ جب ہم نے مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے کی غرض سے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔ تو ہم اپنی تقریروں میں التزاماً یونینسٹ پارٹی ہی کو اپنے حملوں کا نشانہ بناتے تھے۔ ہمیں یقین تھا۔ کہ کانگرس سے نپٹ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ سب سے بڑا فتنہ یونینسٹ پارٹی کا وجود تھا۔ جس نے پندرہ سال سے پنجاب کے مسلمانوں کو سیاسی بیداری سے محروم کر رکھا تھا۔ اور جس نے شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تقسیم پیدا کر کے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ کھڑا کر دیا تھا اِس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یقین تھا۔ کہ جب تک یونینسٹ پارٹی کی قسم کی مخلوط جماعت برسرِ اقتدار ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو کانگرس کی یورش سے بچانا آسان نہیں۔ بہر حال جون کے آخر تک ہم نے جگہ جگہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف تقریریں کیں۔ اِس پارٹی کی ہیئتِ ترکیبی اور پالیسی کی جی کھول کر مذمت کی۔ اور اِس کو مسلمانوں کی قومی تنظیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ اِن جلسوں میں عوام بڑی خوشی سے شریک ہوتے۔ اور غور سے ہماری تقریریں سنتے تھے۔ اور جلسے کے بعد بعض لوگ سوال بھی کرتے تھے۔ جو اِس بات کا ثبوت تھا کہ عوام میں سیاسی شعور پیدا ہو رہا تھا۔ سر سکندر حیات خاں تک اِن جلسوں اور تقریروں کی سرکاری رپورٹیں باقاعدہ پہونچ رہی تھیں۔ اور وہ سخت متفکر تھے۔ کہ اگر

مسلم لیگ کے کارکنوں کو یُونہی کُھلی چھٹی ملی رہی۔ تو یہ لوگ اندر ہی اندر اُن کی وزارت اور یونینیٹ پارٹی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔

یہ صورتِ حال تھی۔ جب کانگرس نے ہندوستان کی بساطِ سیاست پر ایک ایسی خطرناک اور غلط چال چلی جس نے حالات و واقعات کا رُخ یکسر بدل دیا ۹ر جولائی ۱۹۳۷ء کو کانگرس نے وزارتیں قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اب یو، پی۔ سی، پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس اور اُڑیسہ میں کانگرس کو موقع حاصل تھا۔ کہ وہ اپنی اُس قومی پالیسی کا نفاذ کرے۔ جس کا وہ برسوں سے دعوےٰ کرتی آ رہی تھی الیکشن سے پہلے کانگرس اور مسلم لیگ نے جو مینی فسٹو شائع کئے تھے۔ اُن سے صاف عیاں ہوتا تھا۔ کہ اِن دونوں جماعتوں کے تعمیری اور سیاسی پروگرام میں چنداں فرق نہیں ہے۔ خود مسٹر جناح وضاحت سے فرما چکے تھے کہ مسلم لیگ کانگرس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرنے کو تیار ہے۔

پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں کہ :

"مسلم لیگ نے اپنے مینی فسٹو میں جس معاشرتی پروگرام کا خاکہ پیش کیا تھا۔ وہ کانگرس کی معاشرتی پالیسی سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ صنعت و حرفت کی ترقی۔ دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور کاشتکاروں کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کا پروگرام اِن تمام امور میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کلی اتفاق تھا سیاسی امور میں بھی اِن دونوں جماعتوں کے درمیان بظاہر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ کانگرس کی طرح مسلم لیگ بھی شخصی آزادی کی

علم بردار۔ اور تمام جابرانہ و متشددانہ قوانین کی تنسیخ کی حامی تھی۔ فیڈریشن کی مخالفت میں بھی، مسلم لیگ نے کانگرس کی طرح پوری شدت سے آواز بلند کی تھی۔ صوبوں کی حکومت خود اختیاری پر بھی مسلم لیگ نے قوم پرستانہ نقطۂ نگاہ سے سخت اعتراض کئے تھے۔ اگرچہ وہ اس بات کی حامی تھی۔ کہ یہ حکومت خود اختیاری اَدھری بھلی جیسی بھی ہے، اس سے پورا فائدہ اُٹھا لینا چاہیئے"۔

آگے چل کر پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔ کہ:

"مسلم لیگ کے مینی فسٹو کا اہم حصّہ وہ تھا۔ جہاں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ لیگ کانگرس کے ساتھ اشتراک و تعاون کر کے۔ ملک کو غلامی سے آزاد کرائے گی۔ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کو نہ صرف ہندوستان کی دستوری و آئینی تاریخ کا ایک درخشاں باب قرار دیا گیا تھا۔ بلکہ یہ میثاق گویا اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ ماضی میں ہندوستان کی دو سب سے بڑی جماعتوں نے فکر و عمل کی وحدت اور اشتراک و تعاون کا کیسا زبردست نمونہ پیش کیا تھا۔ اس میثاق کے بعد مسلمانوں نے ہمیشہ آزادیٔ وطن کی تحریک میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ حصّہ لیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ نئے دستور میں۔ ایک اقلیت کی حیثیت سے اُنھیں تحفظات درکار ہیں یقیناً فرقہ پرستی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص تاریخ عالم سے واقف ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ مطالبہ بالکل

طبعی اور فطری تھا۔ اور اس مطالبے کو قبول کر لینا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اقلیتوں کا دلی تعاون۔ اور اُن کی خیرسگالی حاصل کرنے کا اس سے بہتر طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مقصد بہرحال یہ تھا کہ اقلیتیں پورے اطمینان سے اکثریت پر اعتماد کر کے اپنی تقدیر اُسکے ہاتھوں میں سونپ سکیں۔

" جو لوگ میثاقِ لکھنؤ کی غرض وغایت سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں۔ کہ کانگرس نے اس موقع پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کی رعایت منظور کر دی تھی۔ وہ مسلم لیگ کے مینی فسٹو سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھے۔ کہ سنہ ۱۹۱۶ء کی طرح مسلم لیگ پھر کانگرس سے رشتۂ اُخوت اُستوار کرنے کی خواہاں تھی۔ مسٹر جناح کو ایک مرتبہ خود کانگرسی لیڈروں نے " ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔ کہ آج وہی جناح اُن سے صرف ایک رعایت کا طلبگار تھا۔ تاکہ ہندوستان کی ان دو سب سے بڑی جماعتوں میں مضبوط دستحکم اتحاد قائم ہو سکے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کو جو خوشگوار فضا مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی۔ اُس فضا کو صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا؟ کیا اس قسم کے خوش آئندہ اقدام سے ہندوستان کی وحدت اور انجام کار ہندوستان کی آزادی کے حصول کا سب سے بڑا مرحلہ طے نہ ہو جاتا؟"

"یہ ایک امر واقعہ ہے - کہ مسلم لیگ کا مینی فسٹو اشتراک و تعاون کی ایک کھلی ہوئی دعوت تھی - اور اگر کانگرسی لیڈر اس دعوت کو قبول کر لیتے تو آئندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات - اور ہندوستان کے دستوری معاملات بالکل مختلف صورت - اور قطعی طور پر جداگانہ رنگ اختیار کر لیتے - یہ بھی امر واقعہ ہے کہ انتخابات سے قبل کانگرس اور لیگ کے باہمی اتحاد کی توقعات بہت ہمت افزا تھیں - اگرچہ کانگرس اپنی قومی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے - مسلمانوں کی نمائندگی کا بھی دعوے کرتی تھی - لیکن کم از کم انتخابات کے دوران میں لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت پیدا ہو گئی تھی - صوبجات متحدہ میں تو لیگی اور کانگرسی لیڈر بہت یگانگت آمیز طریقے سے ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کرنے لگے تھے"! لہ

پروفیسر کوپ لینڈ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں - وہ آکسفورڈ میں تاریخ کے معلم تھے - اور اُن کی ساری زندگی علمی کاموں میں بسر ہوئی ہے - اُنھوں نے ہندوستان، بالخصوص برطانوی دور کے ہندوستان پر جو تاریخی تحقیقات کی ہے - اُس کا خلاصہ نہایت قابل قدر کتابوں کی صورت میں موجود ہے اُن کا انداز فکر محققانہ اور غیر جانبدارانہ ہے - تاہم ہم اِس ضمن میں دو ایک

لہ INDIAN POLITICS (1936—1942)
BY SIR REGINALD COUPLAND pages 14-15

باتوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پروفیسر کوپ لینڈ کے مذکورہ اقتباس میں ایک یہ فقرہ بھی موجود ہے۔ کہ:

"کیا یہ ممکن نہ تھا۔ کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو خوشگوار فضا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی اس فضا کو اُسی صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا۔"

یہ فقرہ بڑا بلیغ، معنی خیز اور حقائق آموز ہے۔ اس فقرے کے پیچھے ہندوستان کے ایک خوشگوار دور کا ایک نہایت روح پرور باب ہمیں دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے۔ اور جب تک ہم اُس باب کا اچھی طرح مطالعہ نہ کر لیں۔ ہم پر ایک طرف تو جناح کی عظیم الشان شخصیت کے بعض دلآویز پہلو منکشف نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف ہم اُس ٹریجڈی سے بھی کما حقہٗ آشنا نہیں ہو سکتے۔ جو کانگرسی لیڈروں کی ہٹ دھرمی، ضد اور مصلحت ناشناسی سے ہندوستان پر نازل ہوئی۔

مسٹر جناح دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر واپس ہندوستان نہیں آئے تھے بلکہ انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور غالباً اُن کا ارادہ وہیں مستقل قیام کرنے کا تھا۔ ایک طرف تو وہ برطانوی حکومت کے ہتھکنڈوں سے سخت نالاں تھے اور دوسری طرف ہندو مسلم مناقشے نے انھیں بہت آزردہ کر رکھا تھا۔ تاہم بعض حالات و واقعات کی بنا پر وہ ۱۹۳۴ء کے آخر میں واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اور آتے ہی مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی انڈی پنڈنٹ پارٹی کو دوبارہ زندہ کیا۔

۱۹۳۴ء کی مرکزی اسمبلی میں مختلف پارٹیوں کے ممبروں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

کانگرس	۴۴	نیشنلسٹ پارٹی	۱۱
انڈی پنڈنٹ پارٹی	۲۲	یورپین	۱۱
سرکاری بلاک	۲۶	نامزد ممبر	۱۳

اس نقشے کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے۔ تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ کانگرس اور نیشنلسٹ پارٹی کی مجموعی طاقت ۵۵۔ اور حکومت کے حامیوں کی (جن میں یورپین بھی شامل کئے جا سکتے ہیں) ۵۰ ممبر تھے۔ کانگرس اور حکومت کی اس باہمی آویزش میں مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کو ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ اگر یہ پارٹی حکومت کا ساتھ دیتی۔ تو کانگرس کو کسی معرکے میں بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اور اگر یہ پارٹی حکومت کے خلاف ووٹ دیتی۔ تو کانگرس کو ہر قدم پر کامیابی نصیب ہوتی۔

آیئے دیکھیں۔ کہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کی پارٹی نے کیا روش اختیار کی۔ اور کیا اس روش کو وطن دوستی و قوم پرستی کے نقطۂ نگاہ سے قابل اعتراض کہا جا سکتا ہے۔ یا فخر و مباہات کی مستحق؟

اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ۲۱ جنوری سے ۹ اپریل ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ اور اس اجلاس میں ہندوستان کے قوم پرست عنصر نے، جس میں جناح اور کانگرس دست بدست شامل تھے، حکومت کو پے در پے شکستیں دیں۔ پہلی شکست سرت چندر بوس کی نظر بندی کے خلاف تحریک التواء پر ہوئی۔ دوسری شکست انڈو برٹش تجارتی معاہدہ کی تنسیخ پر ہوئی۔ تیسری شکست خدائی خدمت گاروں کی

کی تحریک کو خلاف قانون قرار دیئے جانے پر ہوئی۔ چوتھی شکست ریلوے بجٹ پر تخفیف زر کے سلسلے میں ہوئی۔ پانچویں شکست کراچی میں پبلک پر گولی چلائے جانے کے خلاف ہوئی۔ چھٹی شکست سالانہ بجٹ کو مسترد کئے جانے پر ہوئی۔ اور ساتویں شکست وائسرائے کے اختیارات خصوصی سے منظور شدہ بجٹ کو دوبارہ مسترد کئے جانے پر ہوئی۔

جب اسمبلی کے پہلے اجلاس ہی میں حکومت کو یکے بعد دیگرے سات شکستیں ہوئیں۔ تو نئی دہلی سے لے کر لندن کے وائٹ ہال تک ایک کھلبلی مچ گئی حکومت پریشان تھی اور ہر طرف کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح جناح کو کانگرس سے علیحدہ کیا جائے۔ بد قسمتی سے پنجاب کے دو مسلمان ممبر بڑی آسانی سے حکومت کے ہاتھ بک گئے۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر جناح نے اپنی پارٹی کے شیرازے کو بڑی ہنر مندی سے مجتمع کئے رکھا۔ سٹیٹسمین جیسا بادقار اخبار بھی اس صورتِ حالات پر تو کھلا گیا تھا۔ اس نے جناح کے خلاف ایک اداریہ لکھتے ہوئے۔ نہایت اوچھے انداز میں کہا کہ

"...... ہمیں اس بیّن اور نمایاں حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کے سیاست دانوں اور صنعت کاروں کا ایک زبردست طبقہ برطانیہ کے خلاف ہے یہ طبقہ برطانیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کا حامی نہیں ہے۔ اور نہ تجارتی اور کاروباری معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ رنج و بغض کی بنا پر ذاتی فوائد

سے دستبردار ہو جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کانگرس پارٹی کو ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس پارٹی کا سب سے بڑا حربہ نسلی منافرت کا جذبہ ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ کانگرس کو وقتاً فوقتاً ایسے حامی بھی مل جاتے ہیں۔ جو برطانیہ کے ساتھ دشمنی رکھنے کی بنا پر کانگرس کے ہم خیال سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً مسٹر جناح۔ جو ابتدا میں گول میز کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن۔ اور فیڈریشن کے بڑے پُر جوش حامی تھے۔ لیکن چونکہ اُنھیں گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے اب وہ حکومت سے ناراض ہیں مسٹر جناح بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہیں۔ اُن کا ذاتی رجحان مخلوط انتخاب کی طرف ہے۔ اور اُن کی خواہش ہے کہ نشستوں کے تحفظ کا اصول منوا کر ہندوؤں سے مخلوط انتخاب کی بنا پر مفاہمت کر لی جائے۔ لیکن ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے لیڈر بھی ہیں۔ اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اور نہ کانگرس کے ساتھ مل کر اصلاحات کی مخالفت کرنا اُنھیں منظور ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اُن چودہ[۱۴] نکات کے حامی ہیں۔ جو مسٹر جناح کے نام سے منسوب تو ہو چکے ہیں لیکن جنھیں مسٹر جناح کے دل کے ساتھ چنداں مناسبت نہیں ہے۔

لے روزنامہ سٹیٹسمین۔ مورخہ ۲ر فروری ۱۹۳۵ء۔

اسمبلی کا دوسرا اجلاس ۲ ستمبر ۱۹۳۵ء سے ۵ ستمبر تک صرف ۲۴ روز جاری رہا۔ اس میں بھی حکومت کو دو شکستیں ہوئیں۔ پہلی شکست قبائلی علاقے پر بمباری کے خلاف۔ اور دوسری شکست مسودہ قانون فوجداری کی ترمیم پر ہوئی۔ مسودہ قانون فوجداری کی ترمیم پر ایوان میں تین روز بحث ہوتی رہی۔ حکومت نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بعض مسلمان ممبروں کو اپنے ساتھ ملانے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن جناح کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ آخر اکہتر اور اکسٹھ ووٹوں کی تقسیم سے حکومت کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۹۳۶ء کا اجلاس بھی بڑا پُرخروش تھا۔ اس اجلاس میں حکومت کو یکے بعد دیگرے چھ شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شکست سوبھاش چندر بوس کے بارے میں ہوئی۔ جن کا ہندوستان میں داخلہ حکومت نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ اور دوسری اہم شکست اٹاوہ پیکٹ کو ختم کئے جانے کی تحریک پر ہوئی۔ قانون فوجداری کے ترمیم شدہ مسودے کی طرح حکومت نے اٹاوہ پیکٹ کو بچانے کی بھی سر توڑ کوشش کی تھی۔ لیکن مسٹر جناح کی دھواں دھار تقریر کے بعد انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ہر رکن نے حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ اور انجام کار صرف پانچ ووٹوں کی کثرت سے حزب مخالف کو فتح ہوئی بجٹ کو اس مرتبہ بھی مسترد کر دیا گیا تھا۔ جسے وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے منظور کیا۔ پروفیسر کوپ لینڈ اس صورت حال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ :

"۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں دونوں مرتبہ اسمبلی نے بجٹ مسترد

کر دیا تھا۔ اور مجبوراً وائسرائے کو اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر بجٹ منظور کرنا پڑا۔ ان دو برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحد ہو کر جس شدت سے حکومت کی مخالفت کی۔ اور جس بری طرح اسے پریشان کیا۔ اس کی مثال پہلے کبھی ہندوستان کے قوم پرست طبقے نے پیش نہیں کی تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۰ء تک ۲۴ مواقع ایسے پیش آئے ہیں۔ جب اسمبلی کے مسترد کئے ہوئے قوانین کو حکومت نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر منظور کیا ہو۔ ان چوبیس میں سے آٹھ مواقع صرف سنہ ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۳۶ء میں رونما ہوئے۔

"ہر چند کہ اس دفعہ ہندو یا مسلمان لیڈروں نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے کوئی اپیل شائع نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ قبل ازیں جب کبھی ہندوستان میں نئی اصلاحات کے نفاذ کا وقت قریب آتا تھا۔ تو (حقوق کے بٹوارے کی بنا پر) ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ کشمکش تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن اب کہ صوبوں میں پہلی مرتبہ مکمل اور مرکز میں جزوی طور پر ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ فرقہ وارانہ تعلقات میں کسی قسم کی غیر معمولی تلخی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔"[۵۱]

[۵۱] INDIA: A RESTATEMENT, page 151

پروفیسر کوپ لینڈ کی حیرت بجا ہے کہ گاندھی اور جواہرلال دونوں خاموش تھے۔ کسی نے بھی ہندو مسلم اتحاد کی اپیل شائع نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود مرکز سلطنت دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ جس کی زندگی بخش شعاعیں خود بخود ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں پھیل رہی تھیں۔

راقم التحریر کو ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کا زمانہ یاد ہے۔ جب پورا ہندوستان جناح کی آواز پر کان لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔ جب جناح قوم پرست ہندوؤں کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ اور جب مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے۔ کانگرس پارٹی کی تمام کامیابیوں کا سہرا مسٹر جناح کے سر باندھا تھا

اس ماحول اور اس فضا میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپریل ۱۹۳۶ء میں اپنا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد کیا تھا۔ جہاں صدر محترم نے اپنے خطبے میں فرمایا تھا۔ کہ

"...... برطانوی پارلیمنٹ زبردستی ہم پر ایک ایسا آئین ٹھونس رہی ہے۔ جسے کوئی شخص نہ پسند کرتا ہے۔ اور نہ منظور کرتا ہے۔ مسلسل کئی سال تک حکومت نے ہمیں کمیٹیوں، کانفرنسوں، رپورٹوں اور کمشنوں کے چکر میں الجھائے رکھا۔ اور اب اس چکر میں سے ایک ہتوا نکلا ہے۔ جسے کانسٹی ٹیوشن ایکٹ کا لباس پہنا کر ہندوستان کو پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ آئین سراسر غیر جمہوری ہے جس سے ہندوستان کے رجعت پسند عنصر کے ہاتھ پہلے سے کہیں

زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔ اور بجائے اِس کے کہ ہم آئندہ ترقی
پسندانہ راستے پر گامزن ہو سکیں۔ یہ آئین جمہوریت اور آزادی کی
ساری رُوح کو کچل کر رکھ دے گا۔"

کیا کانگرس کا بڑے سے بڑا "باغی صدر" بھی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بارے میں
اِس سے زیادہ تلخ لہجہ یا اِن سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کر سکتا تھا؟۔ خود
مسٹر جناح نے ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں۔ اِسی موضوع
پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"۔۔۔ برطانوی حکومت نے ہم پر یہ آئین ٹھونسنے کا مصمم ارادہ
کر لیا ہے۔ حالانکہ جس طرح میں اِس حقیقت سے آگاہ ہوں اسی
طرح خود برطانوی حکومت بھی اِس سے بے خبر نہیں، کہ یہ نیا آئین
اُس آئین سے جو اِس وقت رائج ہے۔ کہیں زیادہ لغو ہے۔ پھر
سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت اِس آئین کو ہماری مرضی کیخلاف
کیوں ہم پر مُسلط کرنے پر تُلی ہُوئی ہے؟

"اگر یہ آئینِ جدید ہمارے ملک میں رائج ہو گیا۔ تو مجھے یقین ہے
کہ اِس کے نتائج نہایت خراب نکلیں گے۔ برطانوی ہند اُس تمام
ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جو اُس نے اب تک اپنے یہاں نمائندہ حکومت
قائم کرنے کے سلسلے میں کی ہے۔ اِس آئین کے بارے میں ہندوستان
کے کسی صُوبے سے، بحیثیت موجودہ، مشورہ نہیں کیا گیا۔ نہ کسی صُوبے
سے استفسار کیا گیا ہے۔ کہ آیا وہ ہندوستان کے متحدہ وفاق میں

اُن شرائط پر شریک ہونے کو تیار رہے۔ جو والیانِ ریاست یا حکومتِ برطانیہ نے۔ اپنی صوابدید سے وضع کی ہیں ...... حقیقت یہ ہے کہ یہ آئین اس قدر ناقص ہے۔ کہ اِس سے نہ تو کسی کی تسلی ہوتی ہے۔ اور نہ کسی کے قلیل ترین مطالبات منظور ہوتے ہیں ....

"جناب والا! اگرچہ ہم بے بس ہیں۔ لیکن ہماری خودداری کا تقاضا ہے۔ کہ ہم آگے قدم بڑھائیں۔ ہم نے اِس سکیم کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور ہم اسے کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ میں اپنی رائے کے اظہار میں کسی قسم کے تامل یا پس و پیش کو روا نہیں رکھتا۔ مجھ کو یہ کہہ کر دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ کہ کیا تم ہمیشہ تاریکی میں ٹانگ لڑیئے مارنا پسند کرو گے؟ میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی دھمکیاں بے کار ہیں۔ ممکن ہے کہ حکومت پھر پوچھے۔ کہ بہت اچھا۔ بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟ میرا جواب سن لیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبائی حکومت کی مجوزہ سکیم میں ترمیم کی جائے۔ مرکزی حکومت کی سکیم کو یک قلم ترک کر دیا جائے۔ اور ہندوستان کے اہل الرائے اصحاب کے مشورے سے پوری سکیم پر اس طرح نظرِ ثانی کی جائے۔ کہ برطانوی ہند میں جلد از جلد مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو سکے۔"

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو مردود و مقہور قرار دینے۔ اور ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنے کے لئے۔ مسٹر جناح کانگرس کے ہم نوا تھے۔ اگرچہ

۱۹۲۸ء میں وہ کانگرس کی احسان فراموشی تنگ دلی اور ہندوانہ ذہنیت کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب تک اس بات کے آرزو مند تھے کہ مسلمانوں کے لئے چند تحفظات منظور ہو جائیں۔ تو وہ دل و جان سے کانگرس کے ساتھ مل کر آزادی وطن کا متحدہ محاذ قائم کریں۔ ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کی جس تقریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اُس میں آگے چل کر اُنہوں نے کہا۔

"...... میرے معزز دوست نے فرمایا ہے۔ کہ پہلے اقتدار حاصل کر لیا جائے۔ پھر اُس کا بٹوارہ بھی ہوتا رہے گا۔ معاف فرمائیے گا۔ یہ رائے میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں۔ کہ پہلے حصول اور پھر تقسیم ہو۔ ہم یقیناً اراضی کا کوئی قطعہ نہیں خرید رہے۔ نہ کوئی تجارتی یا کاروباری مہم شروع کر رہے ہیں۔ کہ بعد میں اُس کا منافع تقسیم کرنے بیٹھیں گے۔ اگر معاملہ یہی ہوتا کہ پہلے مطلوبہ چیز حاصل ہو۔ اور پھر اُس کے حصے بخرے کئے جائیں۔ تو بتایئے کہ مہاتما گاندھی نے مرن برت کیوں رکھا تھا؟ کیوں انھوں نے ہندوستان کے تمام لیڈروں کی رضامندی اور منظوری سے اچھوتوں کے ساتھ وہ معاہدہ کیا تھا جو پونا پیکٹ کے نام سے مشہور ہے؟ (نعرہ ہائے تحسین) کیوں اچھوتوں سے صاف صاف نہیں کہہ دیا گیا تھا کہ پہلے آزادی حاصل کر لینے دو۔ بٹوارہ بعد میں ہوتا رہے گا؟

(نعرہ ہائے تحسین)

"میں سمجھتا ہوں کہ مہاتما گاندھی اپنے اس فعل میں بالکل حق بجانب تھے

وہ جانتے تھے۔ کہ یہ پانچ چھ کروڑ انسان دراصل ہندو قوم ہی کا ایک جزو ہیں میں نے خود انگلستان میں مہاتما گاندھی سے درخواست کی تھی۔ کہ اچھوتوں کے ساتھ مفاہمت کر لیجئے۔ انہوں نے ابتدا میں میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اچھوتوں سے الگ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس طرح ہندو سماج میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ میں نے بار بار درخواست کی۔ اور یقین کیجئے۔ کہ میں نے مسلمانوں سے زیادہ اچھوتوں کے لئے مہاتما گاندھی سے التجائیں کی تھیں۔ شروع میں تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ لیکن آخرکار انہوں نے معاملہ کی اہمیت سمجھ لی تو آمادہ ہو گئے۔ میں اپنے ہندو بھائیوں کو مبارک باد عرض کرتا ہوں۔ کہ انہوں نے قومی تحفظات عطا کر کے اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اور یہ کس قدر خوشی کا مقام ہے کہ مہاتما گاندھی اب بھی انکی بہتری کے لئے کام کر رہے ہیں۔

" میں آپ سے کہتا ہوں۔ کہ ہمارے ساتھ بھی اسی رواداری اور اسی مصالحت کا سلوک کیجئے۔ ہمارا ہاتھ حاضر ہے۔ یہ دوستی اور اخوت کا ہاتھ ہے۔ آپ بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایئے۔ ہم اتحاد کے لئے بالکل تیار ہیں" [1]

---

[1] مسٹر جناح نے اپنی اس تقریر میں گاندھی جی کے لئے التزاماً اور احتراماً مہاتما کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ہندوؤں کو HINDU BRETHREN کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ اسکو محض ایک رسمی بات سمجھ کر نظرانداز نہیں کر دینا چاہیئے یہ چیز مسٹر جناح کے اس وقت کے جذبات و خیالات کی آئینہ داری کیلئے کافی ہے

مجھے لندن میں دو بڑے ذمہ دار انگریزوں سے ملنے۔ اور مسٹر جناح کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن میں ایک لارڈ جوئٹ[1] اور دوسرے لارڈ ٹمپل وڈ ہیں لارڈ جوئٹ انگلستان کے بڑے نامور قانون دان تھے اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء تک لارڈ چانسلر کے معزز ترین عہدے پر فائز رہے تھے[2]۔ ۱۹۳۱ء کے بعد جب مسٹر جناح لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ تو لارڈ جوئٹ بھی اُن دنوں یہاں پریکٹس کرتے تھے۔ اور مسٹر جناح سے اُن کے مراسم نہایت اچھے تھے۔ اگست ۱۹۵۷ء میں اُنکا انتقال ہوا۔ میں نے لارڈ جوئٹ میں ایک ملاقات میں یہ دریافت کیا تھا کہ "۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک جب آپ کو مسٹر جناح سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ تو مسٹر جناح کے سیاسی خیالات کس قسم کے تھے؟"

لارڈ جوئٹ نے جواب دیا کہ "مسٹر جناح برطانوی حکومت سے سخت نالاں تھے اور تین سال کے عرصے میں میں نے کبھی اُن کی زبان سے مہاتما گاندھی۔ انڈین نیشنل کانگرس یا ہندو قوم کے خلاف ایک لفظ نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ برطانوی حکومت کی

[1] LORD JOWITT.

[2] انگلستان میں دارالعوام کے صدر کو سپیکر اور دارالامراء کے صدر کو لارڈ چانسلر کہتے ہیں لارڈ چانسلر کی حیثیت سے وہ پریوی کونسل کی جوڈیشنل کمیٹی کی صدارت بھی کرتا ہے۔ اور دارالامراء کی اُس منتخب کمیٹی کا جو انگلستان کی سب سے اعلیٰ عدالت اپیل ہے، صدر بھی وہی ہوتا ہے۔ ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر اُس کے مشورے سے کیا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے مجسٹریٹوں کا تقرر براہِ راست وہ خود کرتا ہے۔

پالیسی کی مذمت کرتے تھے۔"

کم وبیش اِنہی خیالات کا اظہار مجھ سے لارڈ ٹمپل وُڈ نے کیا تھا جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک سر سیموئیل ہور کے نام سے وزیرِ ہندرہ چکے ہیں۔ لارڈ جونٹ اور لارڈ ٹمپل وُڈ کی رائے کو میں بالکل صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔ ۱۹۳۴ء کے آخر میں جب مسٹر جناح واپس ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ تو وہ برطانوی حکومت سے سخت نالاں تھے اور اِس عزم صمیم کے ساتھ وطن گئے تھے۔ کہ کانگرس سے جلد از جلد سمجھوتہ کر کے برطانوی حکومت کے خلاف محاذ قائم کریں گے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں انھوں نے مرکزی اسمبلی کے اندر اپنے اِس عزم صمیم کو عملی جامہ پہنا کر دُنیا کو دکھا دیا تھا۔ کہ آئندہ وہ ہندوستان کی سیاست کو کس رُخ پر چلانا چاہتے ہیں۔

اندریں حالات بقول پروفیسر کوپ لینڈ کے "کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو خوشگوار فضا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی اُس فضا کو اب صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا؟"

اِس سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ اِس فضا کو یقیناً صوبائی حکومتوں تک وسیع کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے آخر میں جب ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ تو عام خیال یہ تھا کہ نئے دستور کے تحت جب صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہوگا۔ تو کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندے مل کر وزارتیں مرتب کریں گے۔ اور اُس رجعت پسند عنصر کو ایوانِ حکومت سے خارج کر دیں گے۔ جو ۱۹۲۱ء سے اب تک ہندوستان کی سیاست پر قابض چلا آرہا تھا۔ مسٹر جناح نے ایک دیانتدار کھلاڑی کی طرح، جس کا دامن ہر قسم کے مکر و فریب سے پاک تھا، اپنے پتے

مرکزی اسمبلی میں سب کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ اب یہ فریق ثانی یعنی کانگرس کا کام تھا۔ کہ وہ بھی دیانت دار کھلاڑی کی حیثیت سے مسٹر جناح پر اعتماد کرتی۔

متعدد وجوہ سے یو۔ پی کو ہندوستان کے تمام صوبوں میں قلب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اوّل اس لئے کہ یہ علاقہ تین سو سال تک مغل حکومت کے جاہ و جلال کا مرکز رہ چکا ہے اور اُس کے آثار یہاں کے چپّے چپّے پر موجود ہیں۔ دوم اس لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کی صحیح تہذیب اور ہندوستان کے صحیح ادب نے اسی خطّے میں فروغ پایا تھا۔ سوم اس لئے کہ یو۔ پی کے مُسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود۔ تہذیب و تمدن۔ علم و ادب اور قومی و ملی رجحانات میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے تھے۔ چہارم اس لئے کہ یہ صوبہ نہرو خاندان کا وطن ہونے کی وجہ سے کانگرسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اِنہی وجوہ سے سارے ہندوستان کی نظریں یو۔ پی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو معاملہ وہاں طے ہوگا۔ اُسی کا عکس پورے برّ عظیم پر پڑے گا۔

۱۹۳۶ء میں یو۔ پی میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ایک غیر رسمی سی مفاہمت ہوگئی تھی۔ کہ دونوں جماعتیں الیکشن میں ایک دوسری کی مدد کریں گی۔ چنانچہ جگہ جگہ کانگرسی اُمیدواروں نے لیگی امیدواروں کی حمایت کی۔ اور لیگی کارکنوں نے کانگرسی امّیدواروں کا ہاتھ بٹایا۔ اس طرح سیاسی فضا نہایت خوشگوار ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں۔ کہ :

"۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کا پہلو رقیبانہ نہیں

بلکہ دوستانہ تھا۔ اور جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے۔ یہ توقعات تھیں۔ بلکہ بعض افراد نے ہمت افزائی بھی کی تھی۔ کہ مشترکہ وزارت بنے گی۔ البتہ کوئی معاہدہ نہ تھا۔" [1]

ڈاکٹر اشرف کی رائے درست ہے۔ کہ کوئی معاہدہ نہ تھا۔ اور ایسا معاہدہ اُس وقت ممکن بھی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگرس کو ہرگز امید نہ تھی کہ اسمبلی میں اُسے اتنی بڑی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ کہ آئندہ وزارت سازی کے لئے اُسے کسی دوسرے گروہ کا محتاج نہیں بننا پڑے گا۔ اِس لئے ۱۹۳۶ء میں کانگرسی لیڈروں کا رویہ دوستانہ تھا۔ اور وہ سوچ رہے تھے۔ کہ اگر مختلف صوبوں میں وزارتیں مرتب کرنے کی نوبت آئی۔ تو مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

لیکن ہوا کیا؟ جب ۱۹۳۷ء کے اوائل میں الیکشن کے نتائج برآمد ہوئے۔ اور کانگرس کو چھ صوبوں میں خلافِ توقع بہت بڑی اکثریت حاصل ہو گئی۔ تو اُس تنگ دست لیکن کم ظرف انسان کی طرح، جسے عمر بھر کے انتظار کے بعد یکایک لاٹری سے بہت سی دولت ہاتھ آجائے۔ کانگرس کا دماغ اِس کامیابی سے چل گیا۔ مفاہمت کی جگہ حقارت نے لے لی۔ دوستی کی بجائے نفرت پیدا ہو گئی اور تعاون کی جگہ رعونت آگئی۔ وہی جناح جو کل تک آزادی و حریت کا پیکر سمجھا جاتا تھا۔ اب رجعت پسند بن گیا۔ وہی جناح جس کی مدد سے کانگرس نے مسلسل

---

[1] ڈاکٹر اشرف کا خط اِس کتاب کے مصنف کے نام۔ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۵۷ء

دو سال تک مرکزی اسمبلی میں حکومت کو پے درپے شکستیں دی تھیں۔ اب ایک فرقہ پرست لیڈر قرار دے دیا گیا۔ اور وہی جناح جس نے اپنے قول سے نہیں بلکہ فعل سے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اُس وقت اتحاد پیدا کر کے دکھا دیا تھا جب گاندھی اور نہرو منہ میں گھنگنیاں بھر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب ہندوستان کا بدخواہ سمجھا جانے لگا۔ یہ سب کچھ اُس اقتدار کے طفیل ہوا۔ جو کانگرس کو یکایک چھ صوبوں میں حاصل ہو گیا تھا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے؟

بادہ نوشیدن وہشیار نشستن سہل است

گر بدولت برسی، مست نگردی، مردی

جولائی ۱۹۳۷ء میں جب کانگرس نے چھ صوبوں میں وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا۔ تو ایک یہ سوال بھی درپیش تھا۔ کہ کیا ان وزارتوں میں مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں۔ صوبائی گورنروں کے نام جو ہدایات موجود تھیں۔ اُن میں درج تھا۔ کہ ہر صوبے کے گورنر کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے صوبے کے کابینہ میں اقلیت کے نمائندوں کو بھی شریک کرے۔ اِس لحاظ سے ضروری تھا۔ کہ کانگرسی صوبوں کی وزارتوں میں مسلمان بھی شامل کئے جائیں۔ یو۔ پی کی اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد چھیاسٹھ تھی جن میں سے پینسٹھ غیر کانگرسی ممبر تھے اور صرف رفیع احمد قدوائی ایک ضمنی انتخاب میں کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے تھے۔ تمام غیر کانگرسی مسلمان ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگی بن چکے تھے۔ اور اُن کے لیڈر چودھری خلیق الزمان تھے۔

گذشتہ دو سال کے واقعات کے پیشِ نظر ہر شخص کو یہی توقع تھی. کہ آئندہ صوبائی حکومتوں میں کانگرس اور لیگ مِل جُل کام کریں گی. لیکن جب وزارت سازی کا وقت آیا. تو یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جن کو کانگرس نے یو۔پی۔ بنگال۔ پنجاب اور سرحد کے پارلیمنٹری امور کا سربراہ بنادیا تھا، چودھری خلیق الزمان کو خط لکھ کر چند شرائط پیش کیں۔ اور فرمایا کہ اگر یہ شرطیں ماننے کو تیار ہو۔ تو مسلم لیگ کے کسی ممبر کو ہم وزارت میں جگہ دے سکتے ہیں:

وہ شرطیں کیا تھیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

اوّل: یو۔پی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کو توڑ کر بالکل ختم کر دیا جائے۔

دوم: مسلم لیگ پارٹی کے تمام ممبر کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کر کے کانگرسی بن جائیں۔ اِس طرح یہ لوگ کلیتہً کانگرس کے نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط کے تحت آ جائیں گے۔ اور آئندہ اپنے تمام اعمال و افعال کے لئے کانگرس کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ کانگرس پارٹی کے جلسوں میں اِن لوگوں کو شریک ہونا ہوگا۔ جہاں دیگر کانگرسی ممبروں کی طرح یہ لوگ بھی ہر معاملہ میں ووٹ دیں گے۔

سوم: کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے مختلف اسمبلیوں کے کانگرسی ممبروں کے لئے جو ضابطۂ عمل تیار کیا ہے۔ مسلم لیگ کے ان ممبروں کو جو آئندہ کانگرس کے ممبر سمجھے جائیں گے اُس ضابطے پر باقاعدہ عمل کرنا ہوگا۔

چہارم : مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دیا جائے گا۔ اور آئندہ کسی انتخاب میں مسلم لیگ کو اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ کام کانگرس کے ذمے ہوگا۔ کہ وہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرے۔

پنجم : تمام ممبروں کو کانگرس کے لائحہ عمل پر کاربند ہونا پڑے گا۔ اور کانگرس کے اغراض ومقاصد میں تکمیل میں ہر ممکن کوشش کرنا ہوگی۔

ششم : اگر کانگرس نے کبھی وزارت یا اسمبلی سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ تو ان ممبروں کو بھی اس فیصلے کی پابندی کرنا پڑے گی۔

غور فرمایئے۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگرس کا نقیب بن کر جو شرائط پیش کی تھیں۔ کیا وہ مسلم لیگ کو اشتراک وتعاون کی دعوت تھی؟ یا اس بات کی للکار تھی کہ ہتھیار ڈال کر گھٹنے ٹیک دو۔ اور کانگرس کی غلامی کا پٹہ گردن میں ڈال کر ہماری بارگاہ پر سربسجود ہو جاؤ؟ کیا کوئی خوددار سیاسی جماعت ان ذلت آمیز شرائط کو ایک لمحے کے لئے بھی قبول کرنے پر تیار ہو سکتی تھی؟ چنانچہ جب مسٹر جناح کو اطلاع ملی۔ تو انہوں نے صاف کہہ دیا۔ کہ ہم ایک مساوی فریق کی حیثیت سے تعاون کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن اپنی جداگانہ قومی ہستی کو ختم کر کے۔ اپنے آپ کو مٹا دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

کاش مولانا ابوالکلام آزاد اس موقع پر اس جرأت وہمت اور اس غیرت وحمیت کا ثبوت دیتے۔ جو کسی زمانے میں ڈاکٹر انصاری کا شیوہ خاص تھا!

۱۹۳۳ء میں جب کانگریس فرقہ وارانہ فیصلے کی مخالفت کرنے پر تلی ہوئی تھی تو ڈاکٹر انصاری نے ویانا سے گاندھی جی کو تار دیا تھا۔ کہ فرقہ وارانہ فیصلے کا بدل صرف ایک متفقہ فیصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک ایسا متفقہ فیصلہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ ہو جائے۔ کمیونل اوارڈ کو برقرار رکھا جائے گا۔ اور اگر کانگریس نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ تو وہ کانگریس سے مستعفی ہو جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر انصاری کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ اور متعصب سے متعصب کانگریسی بھی اُن کے سامنے جھک جانے پر مجبور تھا۔ چنانچہ اُن کے اس انتباہ کے معاً بعد کانگریس نے کمیونل اوارڈ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپے کمائے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے والیان ریاست اُن کے زیر علاج رہتے تھے۔ اور وہ ایک ایک معاینہ کی فیس ہزاروں روپے وصول کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ کمایا بے دریغ کانگریس پر خرچ کر دیا۔ وہ جب تک زندہ رہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہمیشہ ان کے مکان پر ہوتے تھے۔ اُن کے فوت ہو جانے کے بعد یہ اجلاس وردھا میں ہوتے لگے تھے۔ واقف حال لوگ جانتے ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے ایک اجلاس پر بیسیوں ہزاروں روپے اُٹھ جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری[1] نہایت خندہ پیشانی سے یہ

---

[1] ڈاکٹر انصاری کا پورا نام مختار احمد انصاری تھا۔ وہ مئی ۱۹۳۶ء میں ریل میں سفر کرتے ہوئے سکتہ قلب سے فوت ہو گئے تھے۔

تمام مصارف برداشت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے انتقال پر دہلی کے دریا گنج والے مکان کے سوا اُن کے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ حالانکہ اُن کے کوئی اولاد بھی نہ تھی۔

جب مسلم لیگ نے اپنی جداگانہ قومی ہستی کو ختم کر دینے سے انکار کیا۔ تو یو۔پی میں کانگرس نے رفیع احمد قدوائی کو وزارت کا منصب سونپ دیا۔ اور ساتھ ہی حافظ محمد ابراہیم کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، یہ لالچ دیا کہ اگر وہ لیگ سے مستعفی ہو کر کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ تو انہیں وزارت عطا کر دی جائے گی۔ چنانچہ حافظ صاحب اِس لالچ کا شکار ہو گئے۔ یہی حربہ کانگرس نے مدراس، بمبئی، صوبجات متوسط اور بہار میں استعمال کیا۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن اور بہار میں ڈاکٹر سیّد محمود کو وزیر بنا دیا گیا۔ بمبئی اور صوبجات متوسط میں کوئی مسلمان کانگرس ٹکٹ پر کامیاب نہیں ہوا تھا یہاں بھی وہی حافظ ابراہیم والا کھیل کھیلا گیا اور یٰسین نوری اور محمد یوسف شریف کو لیگ سے توڑ کر کانگرس میں شامل کیا اور اُنھیں علی الترتیب بمبئی اور صوبجات متوسط کا وزیر بنا دیا گیا۔

یہ سب کچھ گویا اِس بات کا اعلان تھا۔ کہ آئندہ کانگرس کے علاوہ ہندوستان میں کسی اور جماعت کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہوگا۔ اور اگر مسلمان اِس ملک میں زندگی کا سانس لینا چاہتے ہیں تو اُنھیں اپنی جداگانہ قومی تنظیم کو ختم کر کے کانگرس میں جذب ہو جانا پڑے گا۔

میری ناچیز رائے میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد۔ ہندوستان کے مسلمانوں

کے لئے اِس سے زیادہ پُر آشوب زمانہ کبھی نہیں آیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز نے تیغ و تفنگ سے مسلمانوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔ یہ سخت جان قوم اُس اِبتلا سے پژمردہ و پریشان تو ضرور ہوئی تھی۔ لیکن انجام کار زندہ بچ نکلی تھی۔ اب ہندو نے اِقتدار کے نشے میں مست ہو کر مسلمانوں کے قومی وجود کو سرے ہی سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنی اکثریت کے سیلاب میں مسلمانوں کو بہا لے جانے کا مصمّم اِرادہ کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اِس برّ عظیم کے مسلمان ایک عجیب قسم کی بھول بھلیاں میں پڑ گئے۔ اُنہوں نے بڑی کوشش اور کاوش سے اپنے لئے جداگانہ انتخاب کا حق منظور کرایا تھا۔ اب وہی جداگانہ انتخاب جسے وہ اپنی قومی ہستی کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کانگرس کی ایک شاطرانہ ضرب سے پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حالیہ انتخاب میں بالاتّفاق کانگرس کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اور صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے ملک میں صرف دس مسلمان کانگرس ٹکٹ پر کامیاب ہو سکے تھے۔ لیکن اِس کے باوجود کانگرس نے اعلان کر دیا تھا کہ تنہا وہی مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض انجام دے گی۔

یو۔پی میں حافظ ابراہیم اور رفیع قدوائی۔ بمبئی میں لیسین نوری۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن۔ بہار میں سیّد محمود اور سی۔ پی میں یوسف شریف کو محض اِس لئے وزارت میں جگہ دی گئی تھی۔ کہ وہ مسلمان تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لوگ مُسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے صُوبے کی کابینہ میں کس کی نمائندگی کرتے تھے؟ یقیناً یہ نمائندگی مُسلمان قوم کی نہیں تھی۔ یو۔پی کی مجلس

قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی تعداد ۶۶ تھی۔ جن میں سے ۴۴ حافظ ابراہیم اور رفیع قدوائی کو اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ بمبئی اسمبلی میں مسلمان کل ۳۰ تھے جن میں سے ۲۹ کو لیسین نوری پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں تھا۔ مدراس اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد ۲۸ تھی۔ جن میں سے ۲۳ کو سیٹھ یعقوب حسن پر کوئی اعتماد نہیں تھا۔

اِسی طرح بہار اور صوبجاتِ متوسط کی مجالسِ قانون ساز میں علی الترتیب مسلمان ۴۰۔ اور ۱۴ تھے۔ لیکن بہار کے ۳۶۔ اور صوبجاتِ متوسط کے تیرہ ممبر سید محمود اور یوسف شریف کو اپنا اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ پھر کانگرس نے اِن نام نہاد مسلمان وزیروں کو کس قوم کا نمائندہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا؟۔

کانگرس نے ہمیشہ انگریز کے خلاف یہ الزام لگایا تھا۔ کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے جائز، صحیح اور مستند قومی نمائندوں کو نظر انداز کرکے۔ اپنے جی حضوریوں کو اسمبلی اور کونسل میں نامزد کرتی ہے۔ لیکن اب کیا ہو رہا تھا؟۔ خود کانگرس نے انگریز کی جانشین بن کر مسلمانوں کے جائز، صحیح اور مستند قومی نمائندوں کو نظر انداز کرکے۔ اپنے چند جی حضوریوں کو وزارت کے منصب پر بٹھا دیا تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے۔ اُس کانفرنس کے نمائندوں کا ذکر نہایت حقارت آمیز طریقے سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ

"یہ لوگ جنھیں برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا۔ سوائے اپنی

ذات کے اور کسی کی نمائندگی کا دعوےٰ نہ کرسکتے تھے بحیثیت مجموعی یہ لوگ اُن مفاد کی نمائندگی کرتے تھے۔ جو ہندوستان میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ ہیں۔ انگریزی حکومت کے نامزد کئے ہوئے ان ممبروں پر ہندوستان کے باشندوں کو،

کیا پنڈت نہرو کے یہی الفاظ اُن مسلمان وزیروں کے متعلق نہیں کہے جاسکتے جنہیں کانگرس نے محض اپنے مفاد کی نمائندگی کرنے کے لئے نامزد کردیا تھا؟ کیا یہ مسلمان وزیر مسلمان قوم کی نمائندگی کا دعوےٰ کرسکتے تھے؟ اور کیا ان مسلمان وزیروں کو، مسلمان ممبروں کی خواہش کے خلاف، کانگرس نے زبردستی اُن پر مسلط نہیں کیا تھا؟

سوال یہ نہیں۔ کہ راج گوپال اچاری۔ ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد زیادہ لائق تھے۔ یا گول میز کانفرنس کے ہندو ممبر تیج بہادر سپرو۔ سری نواس شاستری اور ایم۔ آر۔ جیکار زیادہ قابل تھے جواہر لال نہرو کہ سپرو۔ شاستری اور جیکار ایسے عظیم المرتبت انسانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ ان کو ہندوستان کے باشندوں نے اپنا نمائندہ منتخب نہیں کیا تھا۔ بلکہ برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی پشت پر قوم کی آواز نہ ہو۔ وہ شخص اس قوم کی نمائندگی کا دعوےٰ نہیں کرسکتا۔

کیا رفیع قدوائی۔ حافظ ابراہیم۔ سید محمود۔ لیٹین نوری۔ لیفٹو سید حسن اور

لہ ص ۲۹۳ (طبع ۱۹۴۹ء)

شریف کی پُشت پر اُن کی قوم کی آواز تھی؟ اگر نہیں تھی۔ تو جواہر لال نے کس منطق، کس فلسفہ، کس دلیل، کس قاعدہ اور کس اصول سے اُن کو مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے کر وزارتوں میں جگہ دی تھی؟

بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔ کہ کانگرس تو یو۔ پی میں مسلم لیگ کو وزارت میں شامل کرنے پر آمادہ تھی۔ لیکن جھگڑا صرف اِس بات پر ہو گیا تھا۔ کہ لیگ دو وزارتیں مانگتی تھی۔ اور کانگرس لیگ کو صرف ایک وزارت دینے پر تیار تھی۔ یہ بات قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اِس بات میں۔ کانگرس کی طرف سے جو ضابطہ تحریر چودھری خلیق الزمان کو بھیجی تھی۔ وہ الہ آباد کے انگریزی روزنامہ پائنیر مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء میں چھپ گئی تھی۔ اور مولانا کا یہ خط ہم نے وہیں سے نقل کر کے اوپر درج کیا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب کانگرس مسلمانوں کے ساتھ یہ کھُلی ناانصافی بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ دھاندلی کر رہی تھی۔ تو صوبوں کے گورنروں نے مداخلت کیوں نہ کی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ انگریزی ابن الوقتی نے محسوس کر لیا تھا کہ مداخلت کرنے سے "ڈیڈ لاک" پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور برطانوی حکومت ہر قیمت پر اِس "ڈیڈ لاک" سے بچنا چاہتی تھی۔ یو۔ پی، سی۔ پی، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں کانگرس کو اتنی بڑی اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ کہ ایوان کی باقی تمام پارٹیاں مل کر بھی اُس کی برابری نہ کر سکتی تھیں۔ اِس لئے اگر گورنر مسلمانوں کے دادرس اور خیر خواہ بن کر۔ کانگرس کی اِس پالیسی

ہیں مداخلت کرتے۔ تو کانگرس اِس فعل کے خلاف بطورِ احتجاج مستعفی ہو جاتی اُس صورت میں باقی جماعتیں مل کر بھی متبادل وزارت بنانے کی طاقت نہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ چھ صوبوں میں یقیناً "ڈیڈ لاک" پیدا ہوتا۔ اور برطانوی حکومت دنیا بھر میں بدنام ہو جاتی۔ اِس مخمصے میں پھنس کر انگریز کے سامنے ایک طرف تو مسلمانوں کی حق تلفی تھی۔ اور دوسری طرف کانگرس کی خوشنودی انگریز نے ابن الوقتی کی دیرینہ روایات پر عمل کرتے ہوئے۔ حد درجہ خیرہ چشمی سے کام لیا۔ اور مسلمانوں کی حق تلفی کو تو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ لیکن کانگرس کو ناراض کرنا گوارا نہ کیا۔

مسٹر جناح نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ کے موقع پر، اپنے خطبۂ صدارت میں، وزیرِ ہند لارڈ زٹلینڈ۔ وائسرائے اور گورنروں پر کھلے الفاظ میں یہی الزام عائد کیا تھا۔ کہ

"۔۔۔۔ اِن لوگوں نے کانگرس کے ساتھ مل کر۔ اُن مسلمانوں کو وزارت کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔ جن کے متعلق اُن کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ اُن افراد کو مسلمان قوم کی قطعاً تائید اور حمایت حاصل نہیں ہے۔ جب اِس کام میں گورنروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر کے۔ یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ اقلیت کے اُن حقوق کی حفاظت کرنے سے قطعاً معذور ہیں۔ جس کا ذمہ برطانوی حکومت نے اُٹھایا تھا۔ تو آئندہ اُن سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر بیسیوں نہیں سیکڑوں ایسے مسائل پیش آئیں گے۔ جب اقلیتوں کو اپنے

حقوق کی پاسداری کے لئے اُن کی امداد و اعانت درکار ہوگی۔ اُس وقت بھی یہ لوگ اِسی طرزِ عمل کا ثبوت دیں گے"۔

مہاتما گاندھی ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ کہ جب تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہو جاتا ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت جاری رہے گی۔ گاندھی جی اِس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ جنگ کے وقت ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں اپنے باہمی اختلافات کے باوجود، غنیم کے خلاف ہمیشہ مشترکہ حکومت اور مشترکہ وزارت بنایا کرتی ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں برطانیہ کی تمام پارٹیوں نے مِل کر جرمنی کے خلاف متحدہ وزارت قائم کی تھی۔ پھر جب ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی۔ تو ٹوری اور لیبر نے اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور دشمن سے نبرد آزما ہونے کی خاطر۔ قومی حکومت قائم کرلی تھی۔ تاکہ ملک کے تمام عناصر یکجا ہو کر وطن کی مدافعت کرسکیں۔ کیا ایسی حالت میں۔ کہ ابھی ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت جاری تھی۔ اور غنیم بدستور ہمارے سامنے کھڑا دندنا رہا تھا۔ یہ مصلحت کا تقاضا نہ تھا۔ کہ مسلم لیگ اور کانگرس مِل کر قومی حکومت قائم کرتیں؟

اُنہی دنوں سردار سر دُول سنگھ کولیشر نے مہاتما گاندھی کو خط لکھ کر بڑی دردمندی سے اِلتجا کی تھی کہ خدا کے لئے صوبائی وزارتوں میں مسلم لیگ کو شامل کرکے متحدہ محاذ قائم کیجئے۔ سردار سر دُول سنگھ کولیشر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے بڑے پُرانے رُکن تھے۔ لیکن چونکہ وہ وزارتیں قبول کرنے کے حامی نہیں تھے۔ اِس لئے جب اِس مسئلہ پر اُن کا کانگرس سے اِختلاف ہوا۔ تو انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ

دے دیا تھا۔ تاہم کانگرس کے بالائی حلقوں میں اُن کا وقار بدستور قائم تھا۔ سردار کورلیشر نے گاندھی جی کو لکھا تھا۔ کہ

۱:۔ جب کانگرس مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں قطعاً کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ تو کہاں کا اخلاق اور انصاف ہے کہ آپ اکّے دُکّے مسلمان ممبر کو وزارت کا چکمہ دے کر کانگرس میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور پھر اسکو مسلمان قوم کا نمائندہ قرار دیکر بڑے فخر سے اُس کی نمائش کرتے پھرتے ہیں۔

۲:۔ جب کانگرس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو منظور کرتے ہوئے یہ الیکشن لڑی ہے۔ تو جداگانہ انتخاب کا تقاضا ہے۔ کہ اسی مسلمان کو وزارت میں جگہ دی جائے جس پر اُس کی قوم کو اعتماد ہے۔

۳:۔ جہاں تک تعمیری اور سیاسی پروگرام کا تعلق ہے مسلم لیگ اور کانگرس کے مینی فسٹو میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کے ممبروں کو لیگ سے منحرف کر کے کانگرس میں شامل کرنے کی جدوجہد بیکار ہی نہیں بلکہ شر انگیز ہے۔ اس طرح مسلمان ہمارے دشمن بن جائیں گے۔

۴:۔ جب مسلم لیگی ممبر کانگرس کے پروگرام پر عمل کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔ تو انہیں کیوں ورغلا کر۔ کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے اِس خط کا جواب دیا تھا۔ کہ

"آپ کا خط، آپ ہی کی طرح، مدلل اور دوسروں کو قائل کر دینے والا ہے، لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے آپکا خط بالائی حلقوں میں بھیج دیا ہے۔"

سردار سردول سنگھ کویشر نے اپنا خط اور مہاتما گاندھی کا جواب دونوں اُسی زمانے میں اخباروں میں شائع کر دیئے تھے۔ کویشر کے علاوہ ایم۔ این رائے بار بار اپنے اخبار انڈی پنڈنٹ انڈیا میں کانگرس کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور گاندھی جی سے درخواست کرتے تھے۔ کہ صوبوں میں مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ وزارتیں بنا لیجئے۔ خود کانگرسی حلقوں میں۔ ایک اچھا خاصہ طبقہ کانگرس کی اس پالیسی کے خلاف تھا۔ لیکن ضابطے کی پابندی کی وجہ سے زبان بند رکھنے پر مجبور تھا۔ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی آر ریڈی نے اُسی زمانے میں بار بار اپنی تقریروں میں اس اہم مسئلہ پر بحث کی تھی۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

"۔۔۔ جداگانہ انتخاب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی حکومت پر اعتماد نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھیئے کہ تنہا جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے جملہ خدشات کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف اُن مسلمانوں کو وزارت میں شامل کیا جائے۔ جو جداگانہ انتخاب کے تحت اپنی قوم کا اعتماد حاصل کرکے اسمبلی میں آئے ہیں۔ قطع نظر اس سے۔ کہ وہ ایوان کی سب سے بڑی پارٹی کے رکن ہیں یا نہیں۔۔۔۔ فرض کیجئے کہ مسلمانوں کے لئے بیس نشستیں محفوظ ہیں۔ انتخاب کے وقت کانگرس ان بیس نشستوں سے اپنے امیدوار کھڑے کرتی ہے۔ لیکن صرف پانچ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اگر کانگرس ان پانچ امیدواروں میں سے

ایک کو وزارت کا منصب بخش کر یہ خیال کرتی ہے۔ کہ اُس کا نامزد کیا ہوا مسلمان وزیر مسلمانوں کے حقوق کا محافظ تصوّر کیا جانا چاہیئے۔ تو یہ طرزِ عمل جمہوری اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔

" ایک صوبے میں، جہاں کانگرس ٹکٹ پر کوئی مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا تھا، ایک انڈی پنڈنٹ مسلمان کو گھیر گھار کر اُس سے کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرا لئے۔ اور اُسے فوراً وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں، کیا اِسی کا نام جمہوریت ہے؟ کیا جداگانہ انتخاب کے اصول پر عمل کرنے کا یہی طریقہ ہے؟

" اب یہ امر بالکل واضح ہو چکا ہے۔ کہ "اقلیتوں کے تحفظات"۔ اور جداگانہ انتخاب کو کانگرس کے اِس طرزِ عمل نے تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے مسلمانوں نے آئین اور دستور میں اپنے لئے جو مقام حاصل کیا تھا اُسے بالکل توڑ پھوڑ دیا گیا ہے۔ اندریں حالات کیا آپ یہ توقع رکھ سکتے ہیں۔ کہ مسلمان آپ کی اِس کارگزاری سے مطمئن ہوں گے؟ یہی وجہ ہے کہ اُن کے جذبات میں اضطراب اور ہیجان پیدا ہو رہا ہے اور وہ آئندہ کسی بہتر اور زیادہ مؤثر دستور کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں

" میں خود ایک زمانے میں اِس بات کا حامی تھا۔ کہ نشستوں کے تحفظ کے ساتھ ملک میں مخلوط انتخاب رائج ہونا چاہیئے لیکن کانگرس کا موجودہ رویّہ۔ اور اُس کا ردِّ عمل دیکھنے کے بعد۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامّل نہیں کہ آئندہ ہندوستان میں مخلوط انتخاب جاری ہونے کا

قطعاً کوئی امکان باقی نہیں رہا۔" لے

سر پرسیوَل گرفتھس جو ایک زمانے میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں یورپین گروپ کے لیڈر تھے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"..... کانگرس ہائی کمان نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں۔ کانگرس اور لیگ کی مشترکہ وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اور اپنی وزارتوں کو صرف کانگرس پارٹی کے ممبروں تک محدود رکھا۔ مثلاً جب یو۔ پی میں وزارت سازی کا وقت آیا۔ تو مسلمانوں سے کہا گیا۔ کہ اگر وہ مسلم لیگ کو توڑ کر انفرادی اور مجموعی طور پر کانگرس میں جذب ہو جائیں تو انہیں وزارت میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ باقی صوبوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

"بلاشبہ کانگرس کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ لیگ اور کانگرس کے معاشرتی اور سیاسی پروگرام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اسی لئے اگر کانگرس لیگ سے مل کر مشترکہ وزارتیں بنا لیتی۔ تو ایسی وزارتیں نہایت آسانی سے کام کر سکتی تھیں۔ بجا ہی یا بے جا۔ مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کہ انہیں اقتدار سے صرف اس لئے محروم رکھا گیا ہے کہ کانگرس سراسر ہندوانہ ایک جماعت ہے" کے

لے Congress in Office (1940) By C.R. Reddy, page 82

کے The British Impact on India By Sir Percival Griffiths, page 340

سید طفیل احمد منگلوری مرحوم، جو مسلم لیگ کے سخت مخالف اور کانگرس کے بہت بڑے معاون تھے۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"..... مسلم لیگ کے مینی فسٹو میں مسلمانوں کی مخصوص ضروریات میں سے صرف مذہب، زبان اور رسم الخط کی حفاظت درج تھی۔ اُس کے بعد ملکی ترقی کے کاموں۔ اور عوام الناس کے فوائد کے بارے میں مسلم لیگ نے کانگرس کا پروگرام اختیار کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ہر جگہ کانگرس نے انتخابات اسمبلی میں مدد دی۔ اُس وقت معلوم ہوتا تھا۔ کہ بیس سال بعد قران السعدین واقع ہوگا۔ اور مسلم لیگ اور کانگرس یک جان و دو قالب ہو کر ملکی کام کریں گی۔ مگر فلک کج رفتار کو کب گوارا تھا۔ کہ یہ دونوں جماعتیں پھر دوش بدوش کام کریں چنانچہ انتخابات میں کانگرس کی غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ہی مسلم لیگ سے اس کی بدمزگی ہو گئی۔ بدمزگی کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ کانگرس نے اپنی اکثریت دیکھ کر اپنے وزراء میں مسلم لیگ کے لوگوں کو شامل کرنے سے انکار کر دیا۔" [1]

ایڈورڈ ٹامسن، جو گاندھی، جواہر لال، راج گوپال اچاریہ اور رابندرناتھ ٹیگور کے ذاتی دوست تھے۔ اور انگلستان میں سالہا سال تک کانگرس کی حمایت کرتے رہے تھے۔ اسی مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" از سید طفیل احمد منگلوری ص ۴۵۹

" اگر آپ مجلسِ قانون ساز میں ۔کسی جماعت کے لئے جداگانہ نشستیں محفوظ کرنے کا قاعدہ اختیار کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اس قاعدے کا طبعی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ جماعت کابینہ میں بھی۔ اسی نسبت سے اپنے لئے جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کرے گی۔ اور اگر آپ یہ مطالبہ پورا نہ کریں گے۔ تو وہ جماعت یہ کہنے پر مجبور ہوگی۔ کہ اس قسم کی جداگانہ نیابت۔ جو اُسے طاقت اور اقتدار سے محروم رکھتی ہے۔ محض ایک فریب ہے۔

" کانگرس نے اپنے مختصر سے کابینہ میں، جو صرف چھ آدمیوں پر مشتمل تھا، کسی مسلم لیگی کو شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ میں غم و غصّہ کی ایک شدید لہر پھیل گئی۔ موجودہ ہندو مسلم کشیدگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ایک واقعہ ہے۔ مسلم لیگ نے جب دیکھا کہ اُسے سیاسی طاقت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تو وہ صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ سخت مخالفت پر اُتر آئی۔

" بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ یہ کانگرس کی غلطی تھی۔ جب تک جداگانہ انتخاب کا طریقہ قائم ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ فرقہ وارانہ اصولوں پر پارٹیاں بنائی جائیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ جب تک جداگانہ انتخاب ختم نہیں ہو جاتا۔ ہندوستان میں مشترکہ وزارتیں (کولیشن) ہی قائم ہونی چاہئیں۔ کانگرسی لیڈر اب اپنی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں" [1]

(حاشیہ ۴۶۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ مسلم لیگ نے صرف چھ وزارتوں کیلئے ہندوستان بھر میں طوفان کھڑا کر دیا۔ یہ اندازِ فکر غلط، گمراہ کن اور سیاسی حقائق سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ سوال چھ وزارتوں کا نہیں تھا۔ بلکہ سوال یہ تھا کہ کیا ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومی ہستی کے مالک ہیں یا نہیں؟ انگریز نے ۱۹۰۶ء میں جداگانہ انتخاب کا اصول منظور کر کے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور کانگرس نے ۱۹۱۶ء میں میثاقِ لکھنؤ پر دستخط کر کے۔ اس جداگانہ قومی ہستی کی توثیق کر دی تھی۔ میثاقِ لکھنؤ بدستور قائم تھا۔ جس کے بوجھ سے لیگ اور کانگرس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ پھر کانگرس کس منہ سے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی سے انکار کر سکتی تھی؟

کانگرس نے جب کھلے میدان میں شکست کھائی۔ تو چور دروازہ سے داخل ہو کر مسلمانوں کے قومی شیرازہ کو منتشر کرنا شروع کیا۔ گاندھی جی ہمیشہ صداقت، اخلاق اور اصول کا پرچار کرتے تھے۔ لیکن اُن کے حواریوں نے اُن کی آنکھوں

ل ENLIST INDIA FOR FREEDOM (1940)

By Edward Thompson. Page 66

ایڈورڈ ٹامسن یہ حکایت مشہور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ کہ علامہ اقبال اپنی زندگی میں نظریۂ پاکستان کے مخالف ہو گئے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ میں اس کتاب میں آگے چل کر۔ ایڈورڈ ٹامسن اور ان کی اس حکایت پر تفصیلی بحث کروں گا۔

کے سامنے، مسلمانوں کو وزارت کی رشوت دے دے کر۔ اپنی قوم سے غداری کرنیکا سبق سکھانا شروع کیا۔ کسی مسلمان کو پارلیمنٹری سکریٹری بنانے کا چکمہ دیا گیا کسی سے نوکری کا وعدہ کیا گیا۔ اور کسی کو ممبری کا لالچ دیا گیا۔ لیکن ہر جگہ شرط یہ رکھی گئی۔ کہ پہلے مسلم لیگ کو چھوڑ کر۔ کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرو۔ پھر سب کچھ مل جائے گا۔

یہ وہی پرانے ہتھکنڈے تھے۔ جو انگریز برتا کرتا تھا۔ اور اب چونکہ انگریز کے "امپیریلزم" کی جگہ کانگرس کا "امپیریلزم" قائم ہو گیا تھا۔ اس لئے پرانی شراب نئے گلاسوں میں تقسیم ہونے لگی تھی۔

کانگرس نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ وہ کسی صوبے میں۔ کسی غیر کانگرسی کو اپنی وزارت میں جگہ نہیں دے گی۔ ہندو اقلیت کے صوبوں میں، جہاں غیر کانگرسی حکومتیں قائم تھیں، کانگرس نے وزارتوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا بنگال میں مولوی فضل الحق نے جب وزارت مرتب کی۔ تو اُن کی خواہش تھی کہ کانگرس بھی اُس میں شرکت کرے۔ لیکن کانگرس نے اِس بنا پر یہ پیشکش کو رد کر دیا۔ کہ وہ کسی غیر کانگرسی وزارت کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنا گناہ سمجھتی ہے۔

۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم کی وزارت کو حزب مخالف کے ہاتھ سے شکست ہوئی۔ لیکن اسمبلی کے ایوان میں، جس کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۵۰ تھی۔ کانگرسی ممبر صرف ۱۹ تھے۔ اس لئے تنہا کانگرس اپنے بل بوتے پر نئی وزارت بنانے کے قابل نہ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو صوبہ سرحد کے

انچارج تھے۔ جھٹ حکم دے دیا کہ غیر کانگرسی عناصر کو ساتھ لے کر وزارت بنالی جائے چنانچہ چار ممبر ڈیموکریٹ پارٹی کے۔ دو انڈی پنڈنٹ اور دو مہاسبھائی ممبروں کو شریک کر کے ڈاکٹر خان صاحب نے "کانگرسی وزارت" قائم کر لی۔ سر عبدالقیوم کے کابینہ میں تین وزیر تھے۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کے لئے ڈیموکریٹ پارٹی کا ایک غیر کانگرسی وزیر بھی شامل کر لیا۔ اور وزراء کی تعداد تین کی بجائے چار کر دی گئی۔

یوپی۔ سی پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس اور اڑیسہ میں کانگرس کا اصول یہ تھا کہ کسی غیر کانگرسی کو وزارت میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ پارلیمنٹری جمہوریت کا تقاضا ہے۔ کہ صرف ایک پارٹی کی حکومت ہو۔ لیکن جب صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں باہمی انتشار پھیلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ تو فوراً یہ ناقابلِ ترمیم و غیر متبدل اصول بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اور مشترکہ وزارت (کولیشن) بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی۔ اُس روز اتفاق سے ایوان میں صرف ۴۷ ممبر موجود تھے۔ چنانچہ سات کانگرسی۔ آٹھ مہاسبھائی اور آٹھ یونائیٹڈ پارٹی کے مسلمان ممبروں نے اکٹھے ہو کر حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ تین ممبر غیر جانبدار رہے۔ اس طرح دو ووٹوں کی کمی سے سر غلام حسین کی وزارت ٹوٹ گئی۔

سندھ اسمبلی میں کانگرسی ممبروں کی تعداد صرف نو تھی۔ ظاہر ہے اس قلیل تعداد سے کانگرس مشترکہ وزارت تو بنا نہیں سکتی تھی۔ اِس لئے کانگرس ہائی کمان

نے حکم دیا۔ کہ مسلمانوں کی باہمی پھوٹ سے جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اٹھایا جائے۔ چنانچہ کانگرس نے سر غلام حسین کے حریف خان بہادر اللہ بخش کو مدد دینے کا پورا وعدہ کیا۔ اس طرح اللہ بخش نے یونائیٹڈ پارٹی کے اٹھارہ مسلمان اہل سبھا کے گیارہ ہندو اور کانگرس کے نو ممبروں کو اپنے ساتھ ملا کر وزارت قائم کر لی۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو آسام میں سر سعد اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی۔ آسام اسمبلی کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۱۰۸ تھی۔ جن میں سے ۳۵ مسلمان تھے اور ۳۳ کانگرسی ہندو تھے۔ سعد اللہ نے غیر کانگرسی ارکان کو اپنے ساتھ ملا کر۔ ایک اچھی خاصی مضبوط حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن کانگرس اندر ہی اندر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انجام کار یہ کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور کانگرس پارٹی کے لیڈر گوپی ناتھ باردولائی نے غیر کانگرسی ہندوؤں۔ اور سعد اللہ کے مخالف مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر متبادل حکومت قائم کر لی۔ سعد اللہ کے کابینہ میں پانچ وزیر تھے۔ لیکن باردولائی نے وزیروں کی تعداد کو بڑھا کر آٹھ کر دیا۔ جن میں چار کانگرسی اور چار غیر کانگرسی تھے۔ ان میں تین وزراء مسلمان تھے۔ جو تینوں کے تینوں غیر کانگرسی تھے۔

یہ سب کچھ "امام الہند" مولانا ابوالکلام آزاد کی آنکھوں ہی کے سامنے نہیں بلکہ اُن کی شبانہ روز کوشش اور محنت سے ہو رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اب مولانا کا صرف یہ کام رہ گیا تھا۔ کہ جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہاں اُن کی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے۔ اُنھیں ہندو اکثریت میں مدغم کر دیا جائے۔ اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں سازشوں۔ ریشہ دوانیوں اور افتراپردازیوں کے

جال پھیلا کر اُن کی قومی جمعیت کو پارہ پارہ کیا جائے۔ تاکہ اغیار کو حکمرانی کے مواقع مہیا ہوتے رہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔

بدر الدین طیب جی سے لے کر تصدق احمد خاں شروانی تک۔ ہندوستان کے بیسیوں مسلمان اکابر وقتاً فوقتاً کانگرس میں شریک رہ چکے تھے جن میں محمد علی ایسے آتش نفس، انصاری ایسے ایثار پیشہ، جناح ایسے آئین پسند، حسن امام ایسے قانون داں اور حسرت موہانی ایسے رئیس المتغزلین سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس بے حسی بلکہ سنگدلی سے قربان کرنے کا شرف حضرت "امام الہند" کے حصے میں آیا تھا۔ وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا [۱]

---

[۱] مولانا ابوالکلام آزاد کا نام غلام محی الدین اور اُن کے بڑے بھائی کا نام غلام لٰیسین اور تخلص آہ تھا۔ لیکن مولانا نے اپنا نام بتدریج بدلا۔ پہلے محی الدین احمد رکھا۔ پھر عرب بننے کے شوق میں صرف احمد رہ گئے۔ فرماتے ہیں۔

"یہ غریب الدیار، عہد و ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش۔

معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت۔ کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے۔"

مولانا کا آبائی وطن قصبہ کھیم کرن۔ تحصیل قصور۔ ضلع لاہور تھا۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ

"آبائی وطن دہلی مرحوم ہے۔ مگر وطنِ مادری سرزمینِ مطہر طیبہ ودارا لہجرت سید الکونینؐ وشہرستانِ نبوت و وحی ہے۔"

مولانا کے دادا کا نام عمر دین عرف عمرا چھیکڑی تھا۔ وہ کھیم کرن میں گائے بھینس کی کھالیں رنگنے کا کام کرتے تھے۔ اور کھیم کرن ہی میں دفن ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۶۸ پر)

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اُس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگرس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ ہرنا جائز وسیلہ اختیار کرکے۔ اور ہر شرمناک حرکت کو کام میں لاکر مسلم لیگ کا زور توڑ دے۔ تاکہ مسلمانوں کو، سیاسی اعتبار سے، بے والی و وارث بنایا جاسکے۔ کانگرس پورے برِ عظیم ہند کی شہنشاہی کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اور

(بقیہ حاشیہ ص۴٦٦) لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ

"میرے دادا مولانا محمد ہادی دہلی مرحوم کے ایک مشہور خاندانِ علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ جس میں بیک وقت پانچ پانچ علماء درس و افتا اور اصحابِ سلوک وطریقت پیدا ہوئے ہیں"۔

مولانا کے والد خیر دین (جو بعد میں صوفی پیر خیرالدین کے لقب سے مشہور ہوئے) دس گیارہ سال کی عمر میں تعلیم کرن سے بھاگ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ مولانا کے حقیقی چچا یعنی خیر دین کے بھائی۔ امام دین کا ستر سال کی عمر کے لگ بھگ۔ لاہور میں انتقال ہوا تھا اور اُن کی قبر بھی لاہور میں ہے۔ امام دین کے بیٹے۔ یعنی مولانا کے چچازاد بھائی فیروز دین گلٹ ساز۔ ابھی چند سال ہوئے۔ لاہور میں موری دروازے کے اندر ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ اِن حقائق کے باوجود مولانا فرماتے ہیں۔

"والدِ مرحوم کے نانا رُکن المدرسین مولانا منور الدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذۂ علم و درس اور اصحابِ طریقت وسلوک میں سے تھے۔ اور اُن مخصوص اصحاب کمال میں سے۔ جن کو اللہ تعالےٰ علوم ظاہر و باطن عطا

(باقی ص۴٦۹ پر)

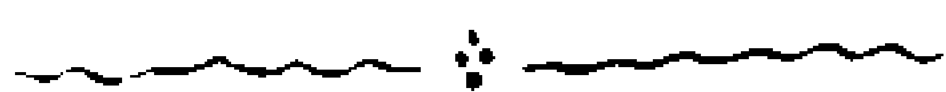
اِس خواب کی حسب منشار تعبیر جب ہی ممکن تھی۔ کہ مسلمانوں کا کانٹا نکل جائے۔ مسلمانوں کی اقلیت کے صُوبوں میں تو کانگرسی راج ، بلا شرکت غیرے قائم ہو چکا تھا۔ البتہ پنجاب ۔ بنگال ۔ سندھ اور سرحد کا مغلوب و مفتوح ہونا باقی تھا۔ بیرونیسیر کوپ لینڈ لکھتے ہیں :

" مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں کانگرس کا طریق کار یہ تھا کہ وہاں غیر کانگرسی وزارتوں کے مخالفوں کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور حامیانِ وزارت میں پھوٹ ڈالی جائے۔ مسلم لیگ کا زیادہ زور اقلیت کے صوبوں میں تھا ۔ کانگرس محسوس کر رہی تھی کہ اگر اقلیت کے صوبوں میں مسلم لیگ کو کچل دیا گیا ۔ تو باقی صوبوں میں اُس کا زور خود بخود ختم ہو جائے گا ۔ چونکہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت ایسی نہیں تھی ۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک

(بقیہ حاشیہ ص۴۶۸) :-

فرماتا ہے ۔ اُن کا شمار حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اجلۂ تلامذہ میں تھا ۔ اور سلطنت مغلیہ کے آخری رُکن المدرسین تھے ۔"

تقسیم ہند کے بعد قصبہ کھیم کرن بھارت میں رہ گیا ہے ۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ کھیم کرن کے باشندوں کی درخواست پر ۔ مشرقی پنجاب کی حکومت نے کھیم کرن کے چھٹا دروازہ کا نام مولانا آزاد گیٹ رکھدیا ہے اور مولانا کا آبائی مکان آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے



پلیٹ فارم پر جمع کر سکے۔ اس لئے لیگ کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا بے والی و وارث ہو جانا یقینی تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگرسی حکومت قائم ہو ہی چکی تھی۔ پنجاب اور بنگال میں اگرچہ کانگرس کا برسرِ اقتدار ہونا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر ان صوبوں کے مسلمانوں کو مجتمع کرنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ تو پھر کانگرس ان میں ہر صوبے کے لیڈروں سے الگ الگ مفاہمت کرکے۔ اور انہیں چند تحفظات عطا کرکے۔ اپنی بالادستی قائم کرلے گی۔“ ؎

پروفیسر کوپ لینڈ کے مذکورہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد غور فرمائیے۔ کہ جب اٹھارویں صدی میں۔ مغلیہ حکومت کا مرکزی نظام کمزور ہو گیا تھا۔ تو کیا انگریز نے بتدریج ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے۔ من وعن یہی طریقے اختیار نہیں کئے تھے؟ جونہی ہندوستان کے تمام صوبوں کو مجتمع کرنے والی مرکزی طاقت باقی نہ رہی۔ انگریز نے سراج الدولہ کے بنگال سے لے کر دلیپ سنگھ کے پنجاب تک۔ ایک ایک صوبے کو آسانی سے ہضم کر لیا تھا۔ کانگرس بھی انگریز کے ”امپیریلزم“ کو اپنے لئے نمونۂ عمل قرار دے کر۔ اسی راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب اس کی انتہائی کوشش تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانانِ ہند کے مرکزی نظام کو۔ جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ تھا۔ پاش پاش کیا جائے۔ ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی وائس چانسلر آندھرا یونیورسٹی فرماتے ہیں۔

؎ INDIAN POLITICS (1936 To 1940), Page 181

" کانگرس نے مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے جو طریقے اور حربے اختیار کئے تھے اُن میں سب سے پہلا حربہ یہ تھا۔ کہ تمام فرقہ وارانہ جماعتوں کو ختم کر دیا جائے۔ تاکہ کانگرس کا یہ دعوےٰ صحیح ثابت ہو سکے کہ وہی ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت ہے۔ جو برطانوی امپیریلزم کے ساتھ گفت و شنید کا استحقاق رکھتی ہے۔

" جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ کانگرس نے اپنی مذکورہ بالا پالیسی کے پیشِ نظر مندرجۂ ذیل طریق کار اختیار کیا۔

۱:- مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو اپنا رہنما تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

۲:- الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرسی امیدوار کھڑے کئے گئے۔

۳:- کانگرسی وزارتوں میں۔ اُن مسلمانوں کو شامل کرنے سے انکار کیا گیا۔ جنہیں جداگانہ انتخاب کی رُو سے اپنی قوم کا اعتماد حاصل تھا۔ جو اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

۴:- اسمبلی کے اُن ممبروں کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یا انڈیپنڈنٹ منتخب ہو کر آئے تھے، وزارتوں اور عہدوں کا لالچ دیکر۔ کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اور جب اُنہیں اس قسم کے ہتھکنڈوں سے خرید لیا گیا۔ تو شرافت کے تمام اصولوں کو

بالائے طاق رکھ کر، انہیں دوبارہ الیکشن لڑنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔

۵:- ہر چند کہ کانگرس کا یہ دعوٰے تھا۔ کہ وہ کسی غیر کانگرسی فریق کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت نہیں بنائے گی۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں۔ کانگرس نے اِس اصول کو آسانی سے ترک کر دیا۔ اس نے پہلے تو مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالی۔ اور پھر اُنکے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر۔ اُن کی وزارتوں کو توڑا۔ اور اپنی مخلوط وزارتیں قائم کیں۔

۶:- کانگرس نے اقلیتوں کے آئینی تحفظات کا قلع قمع کر دیا۔ اور صوبوں میں وحدانی وزارتیں قائم کر کے نیز دوسرے قابلِ اعتراض ذرائع اختیار کر کے۔ ایسی جمہوری حکومتوں کے قیام کے تمام اِمکانات کو ختم کر دیا۔ جن میں باہمی مشاورت اور یگانگت سے نظامِ سلطنت چلایا جاتا ہے۔ بقول مسٹر جناح کے کانگرس نے اِس طرح اپنی فسطائیت کا ثبوت دیا۔" لے

مسٹر جناح ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ۔ اور مخلوط انتخاب کو قبول کر لینے پر بالکل آمادہ تھے۔ لیکن وہ صرف یہ چاہتے تھے۔ کہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے

لے CONGRESS IN OFFICE : page 135

اِس نازک موقع پر۔ سخت بے دردی سے جناح کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور معمولی سی ترمیم منظور کرنے پر بھی راضی نہ ہوئے۔

مسلسل آٹھ برس تک حالاتِ نامساعد کا شکار رہنے کے بعد بھی۔ جناح نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اب ۱۹۳۷ء میں اُنہوں نے پھر کانگرس کی طرف اخوت و محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن موتی لال کے جواں بخت و جواں سال صاحبزادے نے حد درجہ تبختر و حقارت سے کام لے کر۔ اُس ہاتھ کو پھر جھٹک دیا۔ اور علی الاعلان کہا۔ کہ ہم جناح کے تعاون کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم تو مسلم لیگ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر دم لیں گے۔

تعجب ہے کہ وہ نامور باپ اور یہ نامور بیٹا۔ دونوں گنگا نہا کر قوم پرست کے قوم پرست۔ اور محبِّ وطن کے محبّ وطن بنے رہے۔ اور جناح غریب پر فرقہ پرستی اور وطن دشمنی کا الزام لگ گیا ؎

طعنہ بر فیضی مزن زاہد بترس از کُلہ خاں

پاکدامانیِ رندانِ گریباں چاک را

بارھواں باب

سکندر جناح پیکٹ

(۱)

گذشتہ باب میں کانگرس کی جن سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کا اثر پنجاب پر بھی پڑا۔ اِس بارے میں مسلم لیگ کی پوزیشن بالکل صاف تھی۔ ہم لوگ کھلے میدان میں کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ کانگرس خواہ کسی پہلو اور کسی زاویئے سے حملہ آور ہوتی۔ اور جو حربہ چاہتی استعمال کرتی۔ لیگ مسلمانانِ پنجاب کی مدافعت کے لئے ہمہ اوقات مستعد تھی۔ فکر سر سکندر حیات کو تھی۔ جن کی یونینسٹ پارٹی کے نوّے فی صد ارکان مسلمان تھے۔ اور جو اِن مسلمانوں کو اپنی جماعت میں شامل رکھنے کے لئے۔ ایک ایسی مخلوط پارٹی کے محتاج تھے۔ جو بزعم خود چند سیاسی اور اقتصادی اصولوں پر کھڑی کی گئی تھی اب کانگرس کے سیاسی اور اقتصادی پروگرام کا مقابلہ یونینسٹ پارٹی کے سیاسی اور اقتصادی پروگرام سے ہونے والا تھا۔ اِس مقابلے میں۔ اگر

یونینیٹ پارٹی کے ہندو ممبر کٹ کر کانگریس میں شامل ہو جاتے۔ تو یونینیٹ پارٹی ختم ہو جاتی۔ اور اگر سندھ، سرحد اور آسام کی طرح خود مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ کانگریس کا ہم نوا بن جاتا۔ تو بھی یونینسٹ پارٹی کے مٹ جانے میں کوئی شک باقی نہ تھا سر سکندر گویا ایک مخمصے میں گرفتار تھے۔ اگر وہ کھلے بندوں۔ کانگریس کے مقابلے میں مسلمانوں کو منظم کرنے کے لئے۔ میدان میں اتر آتے۔ تو یونینیٹ پارٹی کا بھرم نہیں رہ سکتا تھا اور اگر وہ خاموشی سے تماشا دیکھتے۔ اور محض اپنے اقتصادی پروگرام پر اعتماد کر کے۔ بیٹھے رہتے۔ تو کانگریس کی یلغار کے سامنے ان کی وزارت کا بہت دنوں تک قائم رہنا محال تھا۔ صوبے کے تمام ہندو اخبارات کانگریس کی پشت پر تھے۔ اور ہندوؤں کی بے اندازہ دولت۔ کانگریس کو اپنے پراپگنڈے کے لئے ہر وقت میسر آسکتی تھی۔ مسلمان اخباروں میں سے صرف روزنامہ انقلاب یونینیٹ پارٹی کا حامی تھا۔ زمیندار، احسان اور سیاست اس پارٹی کے ہم نوا نہیں تھے۔ ان حالات و خطرات کو دیکھ کر۔ یونینسٹ پارٹی کے بعض ذمہ دار ارکان نے دبی زبان سے مسٹر جناح کی تعریف و توصیف اور مسلم لیگ کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ حکومت پنجاب کے چیف پارلیمنٹری سیکرٹری میاں احمد یار خاں دولتانہ نے۔ اس تعریفی مہم کا آغاز کرتے ہوئے لکھا:

"مسلمانان ہند نے اپنے لئے جو سیاسی تحفظات حاصل کئے ہیں انہیں یقیناً اس وقت تک قائم رہنا چاہیئے۔ جب تک کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مستقل مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ اس بارے میں تمام مسلمان متحداً ہم خیال ہیں۔ اس لئے کیا یونینیٹ، اور

کیا غیر یونینیسٹ۔ پنجاب کے تمام مسلمان۔ آل انڈیا مسائل میں مسٹر جناح کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر بالکل آمادہ ہیں۔ مسٹر جناح سے ہمارا جھگڑا۔ صرف اس وجہ سے ہوا تھا۔ کہ ہم ایک ایسی غیر فرقہ وارانہ جماعت کو توڑنے پر تیار نہ تھے۔ جو مدت سے ہمارے صوبے میں قائم چلی آرہی تھی۔ اور جس کے ذریعہ سے ہم، بلا امتیاز مذہب و ملت، عوام کے حقوق کی نگہداشت بہترین طریقے سے کر سکتے ہیں.... آل انڈیا مسائل میں، ہماری کوئی جداگانہ پالیسی نہیں ہے۔ اس لئے اگر مسٹر جناح یونینیسٹ پارٹی کا نقطۂ نگاہ تسلیم کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ تو ہم اس جھگڑے کو ختم کرنے پر تیار ہیں۔ سیاسی تحفظات کو مفاہمت کی بنیاد قرار دے کر۔ جس فرقہ وارانہ سمجھوتے کی کوششیں مسٹر جناح کر رہے ہیں۔ ہم اُن کوششوں میں اُن کے شریک و سہیم بننے کو آمادہ ہیں"۔ [1]

یہ "آل انڈیا مسائل" اور "صوبائی مسائل" کی تقسیم بالکل بے معنی تھی۔ کانگرس کا ایک "آل انڈیا" نظام تھا۔ اور اس نظام کے تحت اُس نے سندوستان کے تمام سندوؤں کو متحد و منظم کر رکھا تھا۔ اس نظام میں کوئی رخنہ بندی کوئی تفرقہ پسندی یا کوئی صوبہ پرستی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کی مجموعی طاقت اس قدر زبردست تھی۔ کہ اُس کے ریلے کے سامنے سندھ، سرحد اور آسام کے

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۷ مئی ۱۹۳۷ء

صوبے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

کانگرس کے اِس "ہندوستان گیر" نظام کا جواب صرف آل انڈیا مسلم لیگ کا "ہندوستان گیر" نظام ہی ہو سکتا تھا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق اور پنجاب میں سر سکندر حیات آہستہ آہستہ اِس حقیقت سے آگاہ ہوتے جا رہے تھے۔

پنجاب کا دَورہ کرتے وقت۔ اور عوام تک مسلم لیگ کا پیغام پہونچاتے ہوئے ہم ہمیشہ یونینسٹ پارٹی پر سخت اعتراض کرتے تھے۔ اور اُس کے وجود کو مسلمانوں کی قومی تنظیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے تھے۔ لیکن اَب کانگرس کی رَوِش نے۔ ہمیں اِس بات پر مجبور کر دیا تھا۔ کہ مسلمانانِ پنجاب کو اُس خطرے سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ جو کانگرس کی یورش سے چاروں طرف پیدا ہو رہا تھا۔

دس دس، پندرہ پندرہ ہزار کے مجمع میں۔ ہمیں تقریریں کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لوگ ہماری تقریریں سنکر سوچتے تھے۔ کہ اگر کانگرس نے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے اِنکار کر دیا ہے۔ تو اِس کا جواب کیا ہونا چاہیئے؟ اگر کانگرس نے جداگانہ انتخاب کو اپنی شاطرانہ چالوں سے کالعدم کر کے رکھدیا ہے۔ تو آئندہ جداگانہ انتخاب کا بدل کیا ہوگا؟ اگر کانگرس نے وزارتوں کی رشوت اور عہدوں کا لالچ دے دے کر۔ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ جیسی قومی جماعت سے۔ غدّاری کرنے کا سبق سکھایا ہے۔ تو اِس قسم کے ناقابلِ اعتبار ممبروں کو قومی زندگی سے کیونکر خارج کیا جا سکے گا؟ اگر سندھ، سرحد اور آسام میں کانگرس اپنے اصولوں سے منحرف ہو کر۔ مسلمانوں کی قومی جمعیّت کو پارہ پارہ

کرسکتی ہے تو پنجاب کے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا کیا طریقہ ہے ؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ سادہ، ناخواندہ اور سیاسی مسائل سے بے خبر مسلمان عوام کو یہ سمجھانا مشکل تھا۔ کہ مخلوط "یا کولیشن" وزارت کسے کہتے ہیں۔ اور ایک پارٹی کی دعاتی حکومت کیا چیز ہوتی ہے۔ پارلیمنٹری حکومت کیا شئے ہے اور آیا جداگانہ انتخاب کی موجودگی میں۔ اِس قسم کی پارلیمنٹری جمہوریت قائم بھی رہ سکتی ہے یا نہیں۔ تاہم جب عوام کو صاف، سیدھی زبان میں یہ بتایا جاتا تھا۔ کہ کانگرس نے اُن مسلمانوں کو وزارت کی گدّی پر بٹھا دیا ہے۔ جن کو سَو میں سے ننانوے مسلمان اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ تو بات فوراً اُن کی سمجھ میں آجاتی تھی۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے خِلاف پورے ہندوستان میں احتجاج ہوا تھا۔ تو احتجاج کرنے والوں میں۔ تعلیم یافتہ لیڈروں کے پہلو بہ پہلو عوام بھی شامل تھے۔ اُس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے تمام منتخب شدہ ممبروں نے ووٹ دیا تھا۔ کرنل ویجوڈ اس بات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میرا خیال ہے۔ کہ ہندوستانی عوام کا اگر جائزہ لیا جائے۔ تو ایک لاکھ میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جسے یہ معلوم ہو۔ کہ رولٹ ایکٹ کیا چیز ہے۔ تاہم وہ لوگ یہ ضرور جانتے ہیں۔ کہ جن ممبروں کو انہوں نے منتخب کرکے اسمبلی میں بھیجا تھا۔ اُن میں سے سَو فی صد نے، بلا استثنار، اس ایکٹ کے خِلاف ووٹ دیا تھا۔

لیکن اِس کے باوجود۔ حکومت نے اِس قانون کو۔ ملک پر ٹھونسنے سے دریغ نہیں کیا۔ عوام کا یہی احساس گزشتہ فسادات کا سب سے بڑا سبب تھا"۔ ؎

کم و بیش یہی حقیقت ہم مسلمان عوام کے ذہن نشین کرتے تھے۔ کہ کانگرس نے مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہے۔ اور مسلمان قوم کے نمائندوں کے احتجاج کو نظر انداز کر کے۔ اپنی مرضی، اپنی صوابدید اور اپنی ہٹ دھرمی سے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ صوبائی خود مختاری کے نفاذ کے بعد۔ ہندوستان میں ایک وفاق یعنی فیڈریشن قائم ہونے والا ہے ظاہر ہے۔ کہ اِس وفاق میں بھی کانگرس کو ناقابلِ ترمیم اور مستقل اکثریت حاصل ہونے کا یقین اُس صورت میں۔ کانگرس وہاں بھی مسلم لیگ کے ساتھ وہی سلوک کرتی۔ جو اُس نے چھ صوبوں میں کیا تھا۔ اُن حالات میں صاف نظر آرہا تھا۔ کہ مستقبل نہایت تلخ اور یاس انگیز ہے۔ اب صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ یا ہم شکست قبول کرتے۔ اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتے۔ اور یا غنیم کا چیلنج قبول کرتے۔ اور انجام سے بے نیاز ہو کر۔ جنگ جاری رکھتے۔ ہم نے دوسری صورت کو زیادہ عزیز اور آبرو مندانہ سمجھ کر قبول کر لیا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ۔ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:

؎ "THE LAST OF THE RADICALS."

By C.V. WEDGWOOD. Page 130

"۱۹۳۷ء میں۔ جب کانگرس نے ہندو اکثریت کے بل پر خالص کانگرسی وزارتیں مرتب کیں۔ اور اُس کے ساتھ مسلم رابطہ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی۔ تو مسلمانوں کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ اِن اسباب نے مِل کر مسلمان قوم میں ایک سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ گویا مسلم لیگ کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ لیگ نے کانگرس کے اس چیلنج کو، جو اُس کے نزدیک تکبّر و غرور اور نشۂ اقتدار کا نتیجہ تھا، بخوشی قبول کر لیا ...... مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اُس نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اور کانگرس کو ایک سراسر ہندوانہ جماعت قرار دیا۔" [1]

ہندوستان کے مسلمانوں میں رنج و اضطراب کی ایک وسیع لہر جاری تھی جب کہ ۱۵/۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا اِس اجلاس میں وہ مشہورِ زمانہ تحریر معرضِ رقم میں آئی۔ جس نے بعد ازاں سکندر جناح پیکٹ کے نام سے خاص قسم کی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ تحریر، جسے اُس وقت قومی اتحاد کی ایک گراں مایہ دستاویز سمجھ کر اھلاً و سھلاً کہا گیا تھا، آگے

---

[1] "INDIA'S HINDU-MUSLIM QUESTION" By BENI PARSHAD, Page 76

چل کر پنجاب کی سیاسیات میں ایک اہم اور فیصلہ کُن حصّہ لینے والی تھی۔

تمام حالات و واقعات کو جرح و تنقید کی عینک سے دیکھنے کے بعد۔ میں آج اس نتیجے پر پہونچا ہوں۔ کہ سکندر جناح پیکٹ ایک ایسی تحریر تھی۔ جس کے نتائج بڑے افسوسناک ثابت ہوئے۔ اسی تحریر نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو عملاً ختم کر کے رکھ دیا۔ اسی تحریر نے لیگ کو ایک عوامی جماعت بننے سے روک دیا۔ اسی تحریر نے مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بن جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی تحریر کا سہارا لے کر ۱۹۴۴ء میں ملک خضر حیات ٹوانہ نے مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پنجاب کے مسلمان عین اُس وقت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ جب اُنھیں اتحاد و اتفاق کی سخت ضرورت تھی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد ملک خضر حیات نے جو کچھ کیا۔ میں بالواسطہ اُسے بھی سکندر جناح پیکٹ ہی کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ ایک فریق اِس پیکٹ کے وجود ہی سے انکار کرتا تھا۔ اور دوسرا فریق اِس پیکٹ کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

ملک خضر حیات نے جو کچھ کیا۔ کیا وہ غلط تھا یا صحیح؟ اِس پیکٹ کی جو تعبیر وہ کرتے تھے۔ کیا وہ اُس میں حق بجانب تھے یا فریقِ مخالف راستی پر تھا؟ میں سرِدست اِس مسئلہ سے بحث نہیں کرتا۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ دونوں طرف ضد کارفرما تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ضد میں انسان کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں شکست کھانے کے باوجود۔ خضر حیات نے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر وزارت بنا ڈالی۔ یہی وزارت آنے والے فسادات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اور یہی فسادات تقسیمِ پنجاب کا سبب بنے۔ اور یہی تقسیمِ پنجاب تقسیم

ہندوستان کا موجب بنی۔ اور یہ سب کچھ بالواسطہ سکندر جناح پیکٹ ہی کا نتیجہ تھا۔

علامہ اقبال ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو لکھتے ہیں:

"اہلِ پنجاب کی ایک بہت بڑی جمعیت مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے لکھنؤ پہونچ رہی ہے۔ یونینسٹ مسلمان بھی، سر سکندر حیات کی زیرِ قیادت، اجلاس میں شریک ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں ....
لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لئے میں اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے۔ مسٹر غلام رسول کو دے دوں گا۔ وہ یہ فہرست آپ کو دکھائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بڑے غور سے اِن اٹھائیس ممبروں کا انتخاب کریں گے۔ ہمارے آدمی ۱۳ کو لاہور سے روانہ ہونگے"[1]

ڈاکٹر صاحب نے اٹھائیس آدمیوں کی جس فہرست کا ذکر کیا ہے۔ میں پہلے اُس کی وضاحت کر دوں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ ۸ جون ۱۹۳۶ء کو۔ جب لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے تھے۔ تو اُس موقع پر۔ یونینسٹ پارٹی نے کھلم کھلا لیگ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح سے کہا تھا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کو۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر بھی ہیں۔ کونسل سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن مسٹر جناح نے بعض مصلحتوں سے اُن باغی ممبروں کو سزا دینا مناسب نہ سمجھا۔

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

اب کہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر اُس خواہش کا اظہار فرمایا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے باغی ممبروں کو، جن کی تعداد اٹھائیس تھی۔ لیگ کونسل میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے اُن کی جگہ اٹھائیس مخلص آدمیوں کو نامزد کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اِن اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے۔ غلام رسول خاں کو دی تھی۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے یہ اٹھائیس ممبر بدستور لیگ کونسل میں شریک رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ لطف وکرم۔ جن لوگوں کے بارے میں "ہمارے آدمی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُن میں ملک برکت علی۔ میاں غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین۔ میاں عبدالمجید۔ ملک زمان مہدی۔ خلیفہ شجاع الدین اور یہ خاکسار شامل تھے۔ ہمارے ساتھ راجہ عبدالعزیز اور اللہ بخش سلیم بھی لکھنؤ گئے تھے۔ راجہ عبدالعزیز کے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ وہ ہائی کورٹ کے بار روم میں ہیڈ کلرک تھے۔ لیکن فرصت کے اوقات میں۔ لیگ کے دفتری امور میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اور انگریزی مسودے ٹائپ کرنے کا سارا کام اُن کے سپرد تھا۔ اللہ بخش سلیم پنجاب مسلم لیگ کے دفتر میں کلرک تھے۔ اور زندگی و زندہ دلی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ۔ اور بہت سی خوبیوں کے مالک انسان تھے۔

مسلم لیگ کے اِس اجلاس میں پنجاب سے اکثر لوگ شریک ہوئے تھے۔ مثلاً مسٹر حمید نظامی، جو اُس وقت اسلامیہ کالج لاہور میں طلبہ کی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں۔ میاں فیروز الدین احمد

ملک لال دین قیصر۔ میاں بشیر احمد۔ حاجی امین الدین صحرائی وغیرہ۔ یونینسٹ پارٹی کا جو لشکر لکھنؤ پہونچا تھا۔ اُس میں سر سکندر۔ ملک خضر حیات ٹوانہ میاں عبد الحئی۔ نواب نثار علی خاں۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ راجہ غضنفر علیخاں۔ میاں امیر الدین بیگم شاہنواز۔ سید امجد علی۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔ میر مقبول محمود۔ سید افضال علی حسنی۔ نواب ممدوٹ۔ میاں غیاث الدین۔ سر شیر محمد خاں۔ نواب مظفر خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے نامہ نگار سید نور احمد بھی تھے جو یونینسٹ پارٹی کے حسب منشا اور سر سکندر کی پسند کے مطابق خبریں مرتب کر کے اپنے اخبار کو بھیجتے تھے۔

۱۴ / اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو۔ محمود آباد ہوس میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اور صدارت کی کرسی پر مسٹر جناح کی بجائے نواب اسمٰعیل خاں بیٹھے تھے۔ جلسے کی کارروائی بڑی بے کیف ہو گئی تھی۔ میں اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے باہر آ گیا۔ اتنے میں غلام رسول خاں میرے برابر سے گذرے۔ میں نے پوچھا کہاں کے دھاوے ہیں؟ کہنے لگے "مسٹر جناح کے کمرے میں سر سکندر حیات سے کچھ لکھت پڑھت ہونے لگی ہے۔ وہیں جا رہا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔"

ہم مسٹر جناح کے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو سامنے میز کے گرد مسٹر جناح سر سکندر ملک برکت علی اور میر مقبول محمود بیٹھے تھے۔ دروازے کے قریب دو کرسیاں پڑی تھیں۔ غلام رسول خاں اور میں وہیں بیٹھ گئے۔ ملک برکت علی کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ لکھ چکے تو انہوں نے

کاغذ مسٹر جناح کو دے دیا۔ مسٹر جناح نے پڑھ کر وہی کاغذ سر سکندر کے حوالے کر دیا۔ سر سکندر نے جب مسودہ پڑھا۔ تو غصے میں آ کر کہنے لگے "ہم نہیں ملتے ملک صاحب تو ہماری وزارت توڑنے کے درپے ہیں"۔ اِس پر ملک برکت علی سر سکندر اور میر مقبول محمود کے درمیان کچھ تیز تیز باتیں ہوئیں۔ اب مسٹر جناح نے سر سکندر سے لکھنے کو کہا۔ اُنہوں نے میر مقبول محمود سے کہا۔ جب میر مقبول محمود لکھ چکے۔ تو مسودہ باری باری مسٹر جناح۔ ملک برکت علی اور سر سکندر نے پڑھا۔ ملک برکت علی نے چند اعتراض کئے۔ اور شاید مسودے میں کہیں ایک آدھ جگہ کچھ تبدیلی بھی کی گئی۔ اِس ساری کارروائی میں کافی وقت خرچ ہوا۔ میرا خیال ہے اُس وقت گیارہ بج چکے تھے۔ مسٹر جناح فارغ ہو کر سیدھے لیگ کونسل میں چلے گئے۔ اور اُن کے جانے کے بعد۔ سر سکندر بڑی گرم جوشی سے ملک برکت علی سے بغلگیر ہو گئے۔

اِس واقعہ کے پندرہ بیس منٹ کے بعد۔ ہم پانچوں آدمی بیک وقت لیگ کونسل کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ جونہی سر سکندر نے اندر قدم رکھا۔ سارا پنڈال تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا۔ بہت سے لوگ تو اپنا جوشِ مسرت ضبط نہ کر سکے۔ اور بے تابانہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کے رویّے نے اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو ایک خاص قسم کی دہشت اور سراسیمگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور وہ بڑے ہراساں ہو کر۔ اسلامی اکثریت کے صوبوں کی طرف امداد و اعانت کے لئے دیکھ رہے تھے۔ سر سکندر کی ذات گویا اِس بات کی علامت بن گئی تھی کہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن پنجاب اقلیت کے صوبوں کے

مسلمانوں کی پشت و پناہ بنتے ۔ اور ان کے دُکھ درد میں شریک ہونے کو تیار رہے اسی احساس نے اُس وقت لیگ کونسل کے پنڈال میں ۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۔ مسرت و شادمانی کی ایک لہر طاری کر دی تھی ۔

مسٹر جناح نے کھڑے ہو کر ۔ سر سکندر کو خوش آمدید کہا ۔ اور فرمایا ۔ کہ سر سکندر نے اعلان کیا ہے کہ وہ اور اُن کی جماعت کے تمام ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے ۔

مسٹر جناح کے اس ارشاد پر پھر پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا ۔ اور حاضرین کے چہروں پر ایک ایسی مسرت و طمانیت کے آثار نظر آنے لگے ۔ جیسے میدانِ جنگ میں تازہ دم کمک کے پہنچ جانے سے تھکی ہوئی فوج کے اندر نئی زندگی کی رَو دوڑ جاتی ہے ۔

سر سکندر نے پلیٹ فارم پر جا کر ۔ ایک نہایت جچی تلی اور موزوں تقریر کی ۔ اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے ۔ اعلان کیا ۔ کہ وہ اپنی جماعت سمیت مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں ۔ پھر ذیل کی تحریر پڑھ کر سنائی گئی ۔ جو ابھی نصف گھنٹہ قبل مسٹر جناح کے کمرے میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی ۔

سکندر جناح پیکٹ

(۱) سر سکندر حیات خاں نائیں پنجاب جا کر ۔ اپنی پارٹی کا ایک خاص جلاس منعقد کریں گے ۔ جس میں پارٹی کے اُن تمام مسلمان ممبروں کو ۔ جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے ۔ ہدایت فرمائیں گے ۔ کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے ۔ لیگ میں شامل ہو جائیں ۔ اندریں حالات

وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔ لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

(ب) اِس معاہدے کے قبول کے بعد۔ آئندہ مجلسِ قانون ساز کے عام اور ضمنی انتخابات میں۔ وہ متعدد فریق۔ جو موجودہ یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں، متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

(ج) یہ کہ مجلسِ قانون ساز کے وہ مسلم ارکان۔ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں۔ یا اب لیگ کی رُکنیت قبول کرتے ہیں۔ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصوّر ہوں گے۔ ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی۔ کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔ کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کرے۔ اِس قسم کا تعاون انتخابات کے ماقبل یا مابعد۔ ہر دو صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ نیز پنجاب کی موجودہ متحدہ جماعت اپنا موجودہ نام یونینسٹ پارٹی برقرار رکھے گی۔

(د) مذکورہ بالا معاہدے کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل از سرِ نو عمل میں لائی جائے گی۔"

مذکورہ بالا تحریر، جو آگے چل کر سکندر جناح پیکٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ خالص قانونی یا عدالتی اصطلاح میں معاہدہ نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اس پر

مسٹر جناح کے دستخط نہیں تھے۔ یہ ایک بیان تھا۔ جو سر سکندر کی طرف سے لیگ کونسل میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ سر سکندر نے اپنے اور اپنی جماعت کے آئندہ طرزِ عمل کے بارے میں۔ چند وعدے کئے تھے۔ اور اُن وعدوں کا لیگ کونسل میں اعلان کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل نے سکندر جناح پیکٹ کا جو مسودہ مرتب کیا تھا۔ اُس پر مندرجۂ ذیل سطریں تمہید کے طور پر درج تھیں۔

"آج سر سکندر حیات خاں اور مسٹر جناح کے درمیان تبادلۂ خیالات ہوا۔ جس کے بعد اول الذکر دعوتِ خصوصی پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ اِس اجلاس میں مندرجۂ ذیل اعلان کیا گیا۔"

یہ پیکٹ بڑا مبہم، غیر واضح اور گومگو تھا۔ جس میں نہ مسلم لیگ کی حیثیت واضح کی گئی تھی۔ اور نہ یونینسٹ پارٹی کا مُوقف کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ سر سکندر اپنی جگہ خوش تھے۔ کہ انھیں کانگرس کے مقابلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اور اب کانگرس اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو برگشتہ نہیں کر سکے گی۔ اِدھر مسٹر جناح اپنی جگہ مطمئن تھے۔ کہ پنجاب کا وزیرِ اعظم لیگ میں شامل ہو گیا ہے۔ اِس لئے لیگ کی نمائندہ حیثیت مسلّم ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ کانگرس مسٹر جناح کو بار بار طعنے دیتی تھی۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کو کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ صرف اسلامی اقلیت کے صوبوں کا شور و غوغا ہے۔ اِس طعنے کا بہترین جواب یہی تھا۔ کہ

پنجاب اور بنگال کے وزراء اعظم مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے اسی اجلاس میں مولوی فضل الحق اور سر محمد سعد اللہ نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں:

"ان تینوں مسلمان وزرائے اعظم کی شرکت نے مسلم لیگ میں زندگی کی جو روح پھونکی۔ وہ تمام پُرجوش تقریروں سے زیادہ تھی۔ مسٹر جناح کا شمار اگرچہ ہمیشہ ہندوستان کی صف اوّل کے لیڈروں میں ہوتا رہا ہے۔ لیکن انھیں اب تک اپنی قوم کی مجموعی اور غیر مشروط تائید کبھی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے قائد اعظم ہونے کی بجائے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ انہیں سیاسیات کے بائیں بازو کا ایک ایسا لیڈر خیال کیا جاتا تھا۔ جو برطانوی اقتدار کا سخت مخالف۔ اور ہندوستانی قومیت کا پُرجوش علمبردار تھا۔ انہی خصائص کی بنا پر قدامت پسند مسلمان انہیں کانگرس کا حامی سمجھنے پر مجبور تھے۔ لیکن اب جناح کی حیثیت یہ نہیں رہی تھی وہ مسلمانوں کے بہت سے لیڈروں میں سے ایک لیڈر نہیں تھے۔ بلکہ وہ پوری قوم کے تنہا اور واحد نمائندہ لیڈر بن گئے تھے"[1]

سکندر حیات، فضل الحق اور سعد اللہ کی شرکت نے۔ لکھنؤ کے اس اجلاس

---

[1] INDIAN POLITICS (1936 To 1940), Page 183

کو قومی اتفاق و اتحاد کا بڑا دل خوش کن منظر بنا دیا تھا۔ لیگ کی حیثیت یقیناً بڑی بلند ہو گئی تھی۔ اور ادھر کانگرس کے سوراج بھون اور اُدھر برطانوی حکومت کے ایوان میں بھی ہلچل مچتی نظر آنے لگی تھی۔ لیکن جوش و خروش اور اتفاق و اتحاد کے اِن روح پرور مناظر میں۔ کسی شخص کا ذہن اِس طرف نہیں گیا تھا۔ کہ یہ تحریر جو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے موسوم کی جا رہی ہے۔ آگے چل کر کن حوادث کا موجب اور کن پریشانیوں کا سبب بننے والی ہے۔

اِس جگہ یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے۔ کہ لکھنؤ میں کسی شخص نے اِس تحریر کو پیکٹ یا میثاق قرار نہیں دیا تھا۔ تمام لوگ اُسے سر سکندر حیات خاں کا ایک اعلان سمجھتے تھے۔ سول ملٹری گزٹ کے نامہ نگار پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے اخبار کو مراسلہ بھیجتے وقت اِس دستاویز کو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے تعبیر کیا تھا۔ بعد میں یہ لفظ اِس قدر چل نکلا۔ کہ اپنے اور بیگانے، دوست اور دشمن حتّٰی کہ اقبالؔ اور جناحؔ بھی اُسے سکندر جناح پیکٹ کہنے لگے تھے۔

جب ہم واپس لاہور آئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ مسلم لیگ کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے حلقے میں اِس پیکٹ پر سخت رنج اور افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے خود ڈاکٹر صاحب بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ اِس پیکٹ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کو بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔ اور لیگ کو ثانوی حیثیت ملی ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی اِس صورتِ حال سے خوش نہیں تھا۔ لیکن مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا۔ کہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُس سے حتی الوسع بہترین نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

سکندر جناح پیکیٹ کی روشنائی بھی ہنوز خشک نہ ہونے پائی تھی۔ کہ سر سکندر چودھری چھوٹو رام۔ راجہ غضنفر علی خاں اور میر مقبول محمود نے اُس کی عجیب و غریب تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ لوگ لکھنؤ میں جو کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ محض دِکھاوے کا ایک کھیل تھا۔ ورنہ وہ یونینسٹ پارٹی کی اجارہ داری میں رتّی برابر کمی کرنے کو تیار نہ تھے۔ سب سے پہلے سر سکندر نے لب کشائی کی۔ اور فرمایا۔ کہ

" جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ یہ معاہدہ مختلف جماعتوں پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اور اِن جماعتوں کی موجودہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ البتہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کو' جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں' یہ مشورہ دیا جائے گا۔ کہ وہ لیگ کی رُکنیت بھی قبول کر لیں۔

" جہاں تک عام یا ضمنی انتخابات کا تعلق ہے۔ اِس معاہدے کا یہ نتیجہ ہوگا۔ کہ وہ مسلمان جو مسلم لیگ ٹکٹ پر کھڑے ہونگے۔ اُنہیں الیکشن سے پہلے یہ اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد۔ وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ اِس طرح الیکشن میں اُنہیں یونینسٹ پارٹی کی مدد بھی حاصل ہو گی۔

" اِن باتوں سے صاف عیاں ہوتا ہے۔ کہ پنجاب میں اِس وقت جو جماعتیں جس جس طرح کام کر رہی ہیں اُن میں کوئی فرق نہیں آئیگا"[1]

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

سر سکندر کے اِس بیان سے پہلے۔ سول ملٹری گزٹ کے نامہ نگار نے لکھنؤ سے جو رپورٹ اپنے اخبار کو بھیجی تھی۔ وہ اپنے مطالب و معانی کے لحاظ سے بڑی عجیب و غریب تھی۔ اُنہوں نے لکھا تھا۔ کہ

"...... سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ مسلم لیگ کے بھی ممبر بن جائیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی۔ اور اس بورڈ پر عملاً یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ یہ بورڈ تمام ضمنی انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کی طرف سے امیدوار کھڑے کرے گا۔ اور آئندہ عام انتخابات میں۔ مسلمان امیدواروں کو اِس شرط پر مسلم لیگ ٹکٹ دیا جائے گا۔ کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کے غیر مسلم امیدواروں کی بھی مدد کرے گا۔ اِسی طرح یونینسٹ پارٹی لیگی امیدواروں کی بھی ہر طرح امداد و اعانت کرے گی"۔ [1]

راجہ غضنفر علی خاں نے اِس پیکیٹ کی جو تعبیر کی۔ اُسے بے ربطی بیان اور ژولیدگیٔ فکر کا شاہکار کہنا چاہیئے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ

"..... میرے خیال میں اِس معاہدے کی عبارت اسقدر صاف ہے۔ کہ کسی بحث و تمحیص کی گنجائش ہو نہیں سکتی۔ پنجاب کی مجلس

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء

قانون ساز ہیں۔ اِس وقت جو جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ اُن کی حیثیت من وعن یہی رہے گی۔ اور سکندر جناح پیکٹ اُس میں قطعاً کوئی تبدیل نہیں کرے گا۔ اقتصادی پروگرام کے اعتبار سے مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ مسلم لیگ کے پروگرام کی ایک بنیادی شق ہے۔ اسی طرح یونینسٹ پارٹی بھی اقلیتوں اور پس ماندہ اقوام کے مفاد کی نگہداشت کو اپنا اولین مقصد سمجھتی ہے۔ لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ خود مختار و قائم بالذات ہیں۔ اور ان دونوں جماعتوں کو صوبائی اسمبلی میں اپنے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اندریں حالات یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کے رویّے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی۔ اور یونینسٹ پارٹی اور موجودہ وزارت کے دوسرے فریقوں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے پائے گا۔" [1]

اصل بات یہ ہے۔ کہ جب دل میں چور ہو۔ نیّت میں فتور ہو۔ اور عمل میں کھوٹ ہو۔ تو الفاظ کی بڑی سے بڑی جادوگری بھی حقیقت پر نقاب نہیں ڈال سکتی۔ یہی حال یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں کا تھا۔ وہ اپنے قول و فعل کے تضاد کو۔ رنگم رنگم کے پردوں میں چھپانا چاہتے تھے۔ لیکن بات پھر بھی نہ بنتی

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء

سکتی ۔ ایک طرف اُنھیں یہ خطرہ لاحق تھا ۔ کہ اگر مسلم لیگ کے دامن میں پناہ نہ لی ۔ تو کانگرس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے ۔ یونینسٹ پارٹی کے جزوِ اعظم یعنی مسلمان ممبروں کو مجتمع رکھنا محال ہو جائے گا ۔ دوسری طرف وہ چودھری چھوٹو رام سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبراتے تھے ۔ کہ کہیں مسلم لیگ کی شرکت کی وجہ سے اُن پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگ جائے ۔ اُن کا خیال تھا کہ لکھنؤ کا ڈرامہ لکھنؤ ہی میں ختم ہو گیا ہے ۔ پنجاب میں اُس کا چرچا نہیں ہونا چاہئیے۔

اب چودھری چھوٹو رام آگے بڑھے ۔ اور انھوں نے ایک طویل بیان میں سکندر جناح پیکٹ کی تعبیر فرمائی ۔

چودھری چھوٹو رام کا بیان :-

" سر سکندر حیات کا جو بیان ۱۵ اکتوبر کے اخبارات میں شائع ہوا تھا اُس سے حاسدوں اور بدخواہوں نے تین نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان تینوں اخذ کردہ نتائج کو دیکھ کر مجھے وہ پرانا مقولہ یاد آ گیا ہے ۔ کہ خیال در اصل خواہش کی پیداوار ہے ۔

وہ تین نتائج جو دشمنوں نے اِس بیان سے اخذ کئے ہیں ۔ وہ درج ذیل ہیں ۔

(ل) سر سکندر نے مسٹر جناح کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں ۔

(ب) سکندر جناح پیکٹ کا نتیجہ یہ ہوگا ۔ کہ یونینسٹ پارٹی کو توڑ دیا جائے گا ۔

(ج) مسلم لیگ کو پنجاب میں وہی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو کانگرسی صوبوں میں ہے۔

گزشتہ سال۔ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے درمیان جو بلانتیجہ گفت و شنید ہوتی رہی تھی۔ مجھے اُس کا حال معلوم ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر کس طرح اِس بات کے دل سے خواہش مند ہیں۔ کہ مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ میں اِس حقیقت سے بھی واقف ہوں۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر آل اِنڈیا مسائل میں اِتفاق و اِتحاد۔ اور یک جہتی قائم کرنے کے کس درجہ خواہاں ہیں۔ اپنی اِنہی معلومات کی بنا پر۔ میں نے مذکورہ بالا تینوں نتائج کو درخورِ اعتنا سمجھنے سے اِنکار کر دیا تھا۔ چنانچہ سر سکندر نے لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت۔ جو بیان اخباروں کو دیا تھا۔ اُس سے میرے اِن خیالات کی کلی تصدیق ہو گئی ہے۔

بااین ہمہ۔ اگر سر سکندر کے صرف پہلے بیان ہی پر غور کیا جائے۔ تو اُس سے بھی حاسدوں کی مطلب برآری نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ میں جانتا ہوں۔ کہ سر سکندر نے یہ بیان نہایت رواروی اور جلدی میں دیا تھا۔ جس سے اُن کا مفہوم بخوبی ظاہر نہیں ہو سکا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سر سکندر نے مسٹر جناح کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ ایک ارزاں قسم کا اور عامیانہ مذاق ہے۔ باقی رہی یہ بات۔ کہ یونینسٹ پارٹی کو توڑ دیا جائے گا۔ اُس کے متعلق مجھے اپنے سیاسی حریفوں سے صرف اتنا عرض کرنا ہے۔ کہ وہ اطمینان رکھیں۔ اُن کی یہ آرزو کبھی بر نہیں آئے گی۔ اور اُن کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔ سر سکندر کے بیان میں اِس اَمر کا

اشارہ تک بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے صاف کہا ہے کہ یونینیسٹ پارٹی قائم و دائم رہے گی۔ سر سکندر نے اپنے اس بیان میں۔ تین مختلف موقعوں پر ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے۔ اور کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔ مثلاً

(ا) یہ پیکٹ موجودہ کولیشن یعنی یونینیسٹ پارٹی کی ہستی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو گا۔

(ب) آئندہ ضمنی اور عام انتخابات میں۔ وہ متعدد فریق (جو یونینیسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ متحد ہو کر) اُن امیدواروں کی مدد کریں گے۔ جن کو یہ فریق کھڑا کریں گے۔

(ج) موجودہ مشترکہ پارٹی کا نام بدستور یونینیسٹ پارٹی رہے گا۔

اب آئیے۔ اس قیاس اور امکانات کی طرف۔ کہ مسلم لیگ کو پنجاب میں وہی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو کانگرسی صوبوں میں ہے۔ اس بارے میں مَیں صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں۔ کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جس شخص کو سیاسیات کا ذرا سا شعور ہے۔ وہ ایسی صورت حال کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ کانگرس کو کانگرسی صوبوں میں جو اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ وہ صرف اس حد تک محدود نہیں کہ ایک سیاسی پالیسی مرتب کر کے وزارت کے سپرد کر دی جائے۔ بلکہ کانگرس اِن صوبوں کی حکومت۔ اور اُس حکومت کے جملہ محکموں کی ایک ایک تفصیل پر کڑی نظر رکھتی ہے اور خفیف سے خفیف جزئیات بھی کانگرس کی مرضی کے بغیر طے نہیں ہو سکتیں۔ مجھے اِس بات کا علم ہے کہ کانگرسی وزارتیں کانگرس کی

اس روزمرہ مداخلت سے سخت نالاں ہیں۔ اور اگر کانگرس نے اپنے رویئے میں تبدیلی نہ کی۔ تو بہت ممکن ہے کہ کانگرسی وزارتیں یا تو علم بغاوت بلند کردیں۔ اور یا اس ناجائز خارجی دباؤ کے تحت اپنی ہستی ہی کو ختم کر ڈالیں گی۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ اگر ہندوستان کے کسی صوبے میں مسلم لیگ کو قطعی اکثریت بھی حاصل ہو جائے۔ تو بھی مسٹر جناح ایسا عقل مند اور تجربہ کار آدمی کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ جو کانگرس سے سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ کانگرس کو حکمرانی کے طور طریقوں کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں ہے۔ پنجاب میں نہ مسلم لیگ کو، نہ یونینیٹ مسلمانوں کو اور نہ مجموعی طور پر تمام مسلمانوں کو۔ ایسی اکثریت حاصل ہے۔ کہ وہ تنہا اپنے بل پر حکومت کا نظم و نسق چلا سکیں۔ اس لئے یہاں وزارت چار عناصر پر مشتمل ہے۔ یعنی یونینیسٹ مسلمان۔ یونینیٹ غیر مسلم۔ پروگریسو یونینسٹ اور خالصہ نیشنلسٹ۔ تعجب ہے کہ ان حالات میں مسلم لیگ کو پنجاب میں وہ حیثیت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ جو کانگرسی صوبوں میں کانگرس کو حاصل ہے۔ مگر چونکہ لیگ کانگرس کی غلطی کا اعادہ کرنے ہی پر کیوں نہ آمادہ ہو جائے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو بیان جاری کیا ہے۔ اس کے آخر میں درج ہے کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینیٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس خبر کو پڑھنے کے بعد اُن لوگوں کا منہ بند ہو جانا چاہیئے۔ جو یہ مشہور کر رہے ہیں۔ کہ یونینیٹ پارٹی توڑ دی جائے گی۔ یا یہ کہتے پھرتے ہیں کہ۔ یونینیٹ پارٹی کے لیڈر نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

سر سکندر کے دوسرے بیان نے تو پوری صورت حال کو الم نشرح کر کے رکھ

دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ "اس پیکٹ کا پنجاب کی موجودہ پارٹیوں پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اور وہ پارٹیاں جُوں کی تُوں قائم رہیں گی"۔ آئندہ عام اور ضمنی انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے۔ سر سکندر نے کہا ہے کہ "اُن مسلمان امیدواروں کو۔ جو مسلم لیگ ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ اِس بات کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد۔ وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ اِس طرح اُنھیں الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کی حمایت بھی حاصل ہوگی"۔ آخر میں سر سکندر فرماتے ہیں کہ "جہاں تک پنجاب کی موجودہ جماعتوں کے باہمی اشتراک یا اُن کی ترتیب کا تعلق ہے۔ اُس میں ہرگز کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جائے گا"۔

کیا اِن واضح الفاظ کے بعد بھی۔ اِس بات کے باور کرنے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے۔ کہ اِس پیکٹ کے باوجود یونینسٹ پارٹی زندہ و سلامت اور قائم و دائم رہے گی اور اسی پارٹی کے جھنڈے کے نیچے وہ تمام لوگ جمع ہوں گے۔ جو ناتوانوں۔ غریبوں۔ کمزوروں اور فلاکت زدوں کی امداد و اعانت کو اپنا مسلک قرار دیتے ہیں؟

سر سکندر کے واپس لاہور تشریف لانے پر۔ مجھے اِس معاملے کے متعلق اُن سے گفتگو کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے (اگرچہ اُن کے دوسرے بیان کے بعد۔ اِس یقین دہانی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی) کہ حسبِ سابق یونینسٹ پارٹی پنجاب کی سیاسیات کا ایک مستقل عنصر رہے گی۔ اور اسمبلی کے اندر اور باہر۔ دونوں جگہ۔ یہ جماعت ہمیشہ غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر اپنا کام جاری رکھے گی۔ ہاں فرق صرف اِتنا پڑا ہے۔ کہ اب یہ جماعت پہلے سے زیادہ جوش و خروش۔ اور مستعدی و گرم جوشی سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہوگی۔ غالباً

ہمارے اس عزمِ صمیم ہی نے بدخواہوں پر ہراس طاری کر دیا ہے۔ اور اسی ہراس کی وجہ سے وہ قسم قسم کی افواہیں اُڑانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اگر محض قوم پرستانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو ذاتی طور پر میں اس پیکیٹ کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ پیکیٹ حالات و واقعات کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ اس لئے قابلِ درگذر بھی ہے۔ کانگرس۔ ہندو سبھا اور تمام ہندو اخبارات نے ہندوستان کے اُن دو بڑے صوبوں کی حکومتوں کے خلاف جہاں مسلمانوں کی جزوی اکثریت ہے۔ جس شدت سے پراپاگنڈا جاری کر رکھا ہے یہ پیکیٹ اس کا ایک لازمی ردِّ عمل ہے۔ مسلم اکثریت کے ان دو بڑے صوبوں کے مسلمانوں میں کچھ باہمی اختلافات بھی ہیں (جو یقیناً نہیں ہونے چاہیئں) کانگرس اور ہندو سبھا اِن اختلافات سے ہر ممکن فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔ ظاہر ہے۔ ایسا ہونا کچھ بعید از فہم بھی نہیں۔ کیونکہ سیاسیات میں ہر فریق اپنے حریف کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا کرتا ہے۔ اِن حالات میں مسٹر جناح اور سر سکندر ایسے تجربہ کار سیاست دانوں کی یہ کوشش بالکل فطری اور طبعی ہے کہ وہ غنیم کے مقابلہ میں اپنی قوم کے اختلافات رفع کر کے۔ اس میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔ میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اس پیکیٹ سے یونینسٹ پارٹی کو بھی ایک ضمنی فائدہ پہونچے گا۔ وہ یہ کہ اس سے قبل مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان چپقلش جاری تھی۔ وہ اب ختم ہو جائے گی اور ہم اپنی مجموعی کوششوں کو۔ آپس میں سب و شتم کرنے کی بجائے تعمیری کاموں پر صرف کر سکیں گے۔

" یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ یونینسٹ مسلمان۔ اب کی پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے۔ بلکہ اُن میں سے اکثر بیشتر اس سے قبل نہ بھی مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ اور اُن کی رُکنیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ گذشتہ الیکشن میں۔ جب لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ تو آپس کے تعلقات کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ ہمارے وزیراعظم اب یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں۔ کہ ماضی کی تلخیوں کو بھول جانا چاہیئے۔ اور جو لوگ لیگ میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں۔ بخوشی شامل ہو جائیں۔

" ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں۔ کہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد۔ یونینسٹ مسلمان بیک وقت دو ایسی متضاد جماعتوں کے ساتھ اپنی وفاداری کیونکر نبھا سکیں گے۔ جن میں سے ایک خالص فرقہ وارانہ ہے۔ اور دوسری غیر فرقہ وارانہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اقتصادی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں چنداں فرق نہیں ہے۔ اس لئے یہاں باہمی تصادم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ باقی رہے خالص فرقہ داری اور مذہبی مسائل۔ اس بارے میں جو دقت مسلمانوں کو پیش آئے گی۔ وہی دقت یونینسٹ پارٹی کے ہندوؤں کو بھی پیش آرہی ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں ہمارا مسلک بالکل صاف ہے۔ ہم اس نوع کے تمام اختلافات کو باہمی رواداری سے برداشت کرنے کے قائل ہیں۔ اور ایک فریق کو زبردستی دوسرے پر اپنے عقائد مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

" دو مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ بیک وقت اپنی وفاداری

نبھانے کا مسئلہ صرف یونینسٹ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اِس قسم کی اور بھی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں۔ کانگرس، ہندو سبھا اور ہندو اخباروں کو اس بارے میں ہم پر طعنہ زنی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے صوبجات متوسطہ کے کانگرسی ہندوؤں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندو سبھا کے سالانہ اجلاس میں شرکت نہ کریں۔ تو ہندو سبھا کے لوگ پنڈت نہرو پر بُری طرح برسے تھے۔ گویا ہندو سبھا کے حامیوں کے نزدیک یہ فعل بالکل جائز اور مستحسن ہے کہ ایک شخص بیک وقت ہندو سبھا اور کانگرس ایسی دو متحارب جماعتوں کا ممبر بنا رہے۔

"اگر کانگرس کے موجودہ صدر کے خیالات و عقائد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے۔ تو بھی اِس بات کے بہت سے ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں کہ لوگ بیک وقت ایک فرقہ وارانہ جماعت کے ممبر ہوتے ہوئے بھی کانگرس کے ممبر رہے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۳ء کے انتخاب میں سکھ لیگ اور سنہ ۱۹۲۶ء کے انتخاب میں اکالی پارٹی نے اپنے اُمیدواروں کو جو ٹکٹ دیئے تھے اُنہیں کانگرس نے باضابطہ منظور کر لیا تھا۔

یہ واقعہ اِس امر کا ثبوت ہے کہ خالص فرقہ وارانہ جماعتوں کے ٹکٹ قبول میں کانگرس نے کسی قسم کے تامّل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لوکمانیہ تلک۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ لالہ لاجپت رائے۔ سوامی شردھانند۔ ڈاکٹر مونجے۔ اور مسٹر کیلکر ایسے نامور لوگوں کو ہمیشہ کانگرس میں بلند سے بلند منصب عطا

عطا ہو تا رہا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ہندو سبھا کے کرتا دھرتا تھے۔

سر وزیر حسن اور سیٹھ یعقوب حسن (جو مدراس کی کانگرسی حکومت میں وزیر ہیں) عرصہ دراز تک بیک وقت کانگرس اور مسلم لیگ میں شریک رہے ہیں۔

"مذکورہ بالا مثالیں معترضین کو دنداں شکن جواب دینے کے لئے کافی ہیں۔ اگر ان مثالوں کے باوجود کانگرس یا ہندو سبھا یا ان جماعتوں کے لگے بندھے بدستور یونینسٹ پارٹی پر بیہودہ اعتراض کریں کہ اس پارٹی کے بہت سے ممبروں کی وفاداری دو حصوں میں منقسم ہے۔ تو ایسے ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کو صرف یہی جواب دیا جائے گا کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو" [1]

میں نے چودھری چھوٹو رام کا یہ مکمل بیان اس لئے درج کیا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے نفس ناطقہ چھوٹو رام تھے۔ سکندر حیات خاں نہ تھے۔ چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی کے سنگِ بنیاد تھے۔ اور اُن کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتی۔

چودھری چھوٹو رام نے اپنے اس بیان میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ یقیناً سر سکندر کے مشورے اور ایما سے کہا ہو گا۔ سر سکندر جو باتیں اپنی زبان سے کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہی باتیں انہوں نے چھوٹو رام کی زبان سے کہلوایا

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء

کہلوادیں۔

جب سر سکندر۔ راجہ غضنفر علی خاں اور چودہری چھوٹو رام کے بیان یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ تو پنجاب کے مسلمانوں میں ایک ہیجان برپا ہوگیا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ کہ سکندر جناح پیکٹ نے مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ لیگ کے دفتر میں پے در پے شکایتیں اور استغاثے آنا شروع ہوگئے۔ ہر شخص پوچھتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ آخر غلام رسول خاں اور ملک برکت علی نے مجبور ہوکر حقیقت کے چہرے پر سے پردہ اُٹھایا۔ پہلے غلام رسول خاں نے اپنا مختصر سا بیان شائع کیا۔

غلام رسول خاں کا بیان :-

"۱۴ اکتوبر کو لکھنؤ میں جو سکندر جناح پیکٹ مرتب ہوا تھا۔ اُس کی مختلف تاویلیں کی جارہی ہیں۔ جنھوں نے قسم قسم کی غلط فہمیاں پھیلادی ہیں۔ پنجاب مسلم لیگ کے سکرٹری کی حیثیت سے میں اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں۔ کہ اصل صورتِ حال بیان کرکے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کردوں۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ ۱۴ اکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں۔ سر سکندر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنی تقریر کے دوران حسب ذیل اعلان کیا تھا۔

(۱) وہ مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔

(ب) واپس پنجاب جاکر۔ وہ پنجاب اسمبلی کے یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ مسلم لیگ ٹکٹ قبول کر کے۔ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ اس طرح یہ تمام مسلمان ممبر مجموعی طور پر مل کر پنجاب اسمبلی کے ایوان میں مسلم لیگ پارٹی کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور یہ پارٹی آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ اور مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد وضوابط کی پابند ہوگی۔

(ج) اس طرح اسمبلی میں جو مسلم لیگ پارٹی معرض وجود میں آئے گی۔ اُسے اس امر کی آزادی ہوگی۔ کہ وہ ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ مل کر، جس کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں، ایک کولیشن بنائے۔ اس کولیشن کا نام یونینسٹ پارٹی ہوگا۔ لیکن یہ کولیشن اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی جداگانہ حیثیت کو قطعاً کوئی گزند نہیں پہنچائے گی۔

مذکورہ بالا اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ایسی کولیشن انتخابات سے پہلے بھی وجود میں آسکتی ہے اور انتخاب کے بعد بھی۔

(د) اس معاہدہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آئندہ ضمنی اور عام انتخابات کے لئے۔ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی۔" [1]

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء

ملک برکت علی کا بیان :-

"آنریبل سر چھوٹو رام نے سکندر جناح پیکٹ کے عنوان سے۔ جو بیان اخبارات میں شائع کیا ہے۔ اُس میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ

"ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو بیان جاری کیا ہے۔ اُس کے آخر میں درج ہے کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اِس خبر کو پڑھنے کے بعد۔ اِن لوگوں کا منہ بند ہو جانا چاہیئے۔ جو یہ مشہور کر رہے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے گی۔ یا یہ کہتے پھرتے ہیں۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں"

معلوم ہوتا ہے کہ سر چھوٹو رام نے پیکٹ کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اس پیکٹ کا مسودہ میں نے اور سر سکندر نے، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی زیرِ ہدایت، اکٹھے بیٹھ کر مرتب کیا تھا۔ میں آنریبل سر چھوٹو رام کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اُن کی اطلاع کے لئے۔ یہ عرض کرنا بے حد ضروری ہے۔ کہ نہ اصل پیکٹ میں۔ اور نہ ایسوسی ایٹڈ پریس کے بیان میں۔ کہیں یہ الفاظ درج ہیں۔ کہ

"پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا"

یہ الفاظ در اصل سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کی ذاتی اختراع ہیں۔ انہوں نے ۱۴ اکتوبر کو لکھنؤ سے جو پیغام اپنے اخبار کو بھیجا تھا۔ اُس وقت میں بلاوجہ یہ الفاظ درج کر دیئے تھے۔ حالانکہ جس وقت سول کے نامہ نگار نے یہ پیغام بھیجا ہے اُس وقت مسٹر جناح پیکٹ کا مسودہ لکھا بھی نہیں گیا تھا۔ پیکٹ کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"اس معاہدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل ہو گی"۔

ظاہر ہے کہ جب یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔ تو انھیں لامحالہ پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں نمائندگی ملنی چاہیئے۔ معاہدہ کی یہ شق اسی غرض کے لئے رکھی گئی ہے۔ لیکن پورا معاہدہ پڑھ جایئے۔ آپ کو کہیں بھی یہ نظر نہیں آئے گا۔ کہ پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔

سر چھوٹو رام کو ایک اور غلط فہمی ہوئی ہے۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی ہے۔ کہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے مسلمان ممبر آئندہ اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کہلائیں گے۔ اور یہ مسلم لیگ پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے تابع۔ اور اُنکے قواعد و ضوابط کی پابند ہو گی۔

معاہدے کی ایک شق یہ بھی ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی کے وہ یونینسٹ ممبر جو سر سکندر کے مشورے سے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے، اسمبلی کے واحد مسلم لیگی ممبر کے ساتھ مل کر، مسلم لیگ پارٹی بنائیں گے۔ تو اس پارٹی کو اس امر کی آزادی ہوگی۔ کہ وہ ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ مل کر، جس کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں۔ ایک کولیشن بنائے۔ اس قسم کی کولیشن انتخاب سے پہلے بھی وجود میں آ سکتی ہے۔ اور انتخاب کے بعد بھی۔ یہ کولیشن بدستور اپنا نام یونینسٹ پارٹی رکھ سکتی ہے۔

سر چھوٹو رام ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ اس معاہدہ کی رُو سے۔ یونینسٹ پارٹی کی ہیئت ترکیبی یکسر بدل جائے گی۔ آئندہ یونینسٹ پارٹی مندرجہ ذیل اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوگی۔

(ا) اسمبلی کی وہ مسلم لیگ پارٹی جو اس معاہدے کی رُو سے وجود میں آئے گی۔ اور جو آل انڈیا مسلم لیگ کے تابع۔ اور اُس کے قواعد و ضوابط کی پابند ہوگی۔

(ب) سر چھوٹو رام کا گروپ۔ یا کوئی اور گروپ۔ جو مسلم لیگ کے ساتھ کولیشن بنانے پر رضامندی کا اظہار کرے گا۔

ظاہر ہے، ان حالات میں یونینسٹ پارٹی، پہلے کی طرح، ایک مستقل اور قائم بالذات پارٹی نہیں رہے گی۔ بلکہ یونینسٹ پارٹی کا نام صرف اُس کولیشن کے لئے استعمال ہوگا۔ جس میں مسلم لیگ پارٹی

اور سر چھوٹو رام کا گروپ شامل ہوں گے۔ مسلم لیگ پارٹی اپنے اعمال و افعال کے لئے۔ کلیتہً آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ اور اس پارٹی کے ممبروں کی وفاداری صرف لیگ سے وابستہ ہوگی اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آئی۔ کہ مسلم لیگ کے بنیادی اغراض و مقاصد۔ اور کولیشن کے دوسرے گروپ (خواہ وہ گروپ چھوٹو رام کا ہو یا کوئی اور) کے اغراض و مقاصد کے درمیان تصادم ہوا۔ تو مسلم لیگ پارٹی صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے احکام کی پابند ہوگی۔

یہ نہ سمجھیئے۔ کہ ہم ابھی سے کسی ایسے تصادم کا تصور کئے بیٹھے ہیں۔ یا ایسے تصادم کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ ہم تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر معمولی عقل اور رواداری سے کام لیا جائے تو روزمرہ کے مسائل نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو سکتے ہیں اور نظم و نسق کی گاڑی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ بایں ہمہ کسی شخص کو۔ اس کولیشن کے متعلق۔ جو مسلم لیگ پارٹی اور سر چھوٹو رام کے گروپ کے اتحاد سے رونما ہوگی۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ ہر چند کہ اس کولیشن کا نام یونینسٹ پارٹی ہی کیوں نہ ہو۔" [1]

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء

مذکورہ بالا بیانات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ سکندر جناح پیکٹ کی تاویل و تعبیر کے بارے میں۔ دونوں فریقوں میں بنیادی اختلاف تھا۔ سر سکندر اور اُن کے حواری کہتے تھے۔ کہ یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی ادارہ کی حیثیت سے۔ اسمبلی کے اندر اور باہر۔ دونوں جگہ۔ بدستور قائم رہے گی۔ اور مسلم لیگ کو محض اپنی اغراض کے لئے ایک حربے کے طور پر استعمال کرے گی۔ اس کے برعکس ملک برکت علی اور غلام رسول خاں کا خیال تھا۔ کہ پُرانی یونینسٹ پارٹی۔ جس کے ٹکٹ پر۔ ابھی چند مہینے قبل انتخابات کی جنگ لڑی گئی تھی۔ ختم ہو گئی ہے۔ اب یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر۔ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے بعد۔ خود بخود ایک مسلم لیگ پارٹی کی صورت اختیار کر لیں گے۔ جو سراسر آل انڈیا مسلم لیگ کے تابع فرمان ہو گی۔ یونینسٹ پارٹی کا نام صرف اُس کولیشن کے لئے استعمال ہو گا۔ جو اس نوزائیدہ مسلم لیگ پارٹی اور چودھری چھوٹو رام کے گروپ کے تعاون سے پیدا ہو گی۔

افسوس ہے کہ فریقین کے اس باہمی نزاع میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ہماری کوئی رہنمائی نہ کی۔ اور بجائے اس کے کہ اس قضیئے کو کسی قطعی اور دو ٹوک فیصلے کے ذریعے حل کر دیا جاتا۔ مرکز نے ڈھیل دے کر۔ حالات کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔

علامہ اقبال کے خطوط:

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھا کہ:

"عام افواہ ہے۔ کہ یونینیسٹ پارٹی کا ایک حصّہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار نہیں ہے۔ سر سکندر اور اُن کی جماعت نے اب تک اس پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے آج صبح معلوم ہوا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک اِسی طرح ٹال مٹول کرتے رہیں گے۔ خود یونینیسٹ پارٹی کے ایک رکن نے مجھ کو بتایا ہے۔ کہ یونینیسٹ پارٹی کا اصل مقصد یہ ہے۔ کہ اِس قسم کے ہتھکنڈوں سے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔ بہرحال میں چند روز تک آپ کو پورے کوائف سے مطلع کروں گا۔ اور پھر آپ کی رائے درکار ہوگی۔ کہ آئندہ ہم کس طرح کام جاری رکھیں۔ مجھے اُمید ہے کہ لاہور میں لیگ کے اجلاس کے انعقاد سے قبل آپ کم از کم دو ہفتوں کے لئے ہمارے صُوبے کا دَورہ کر سکیں گے"۔ [1]

اگلے ہی روز۔ یعنی یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے اِسی موضوع پر۔ ایک اور خط مسٹر جناح کو لکھا۔ جو درجِ ذیل ہے۔

"ڈیئر مسٹر جناح!

سر سکندر حیات خاں کل مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اُن کے ہمراہ اُن کی جماعت کے بھی چند ارکان تھے۔ ہمارے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ موضوع وہی یونینیسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی اختلافات

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (شیخ محمد اشرف)

تھے۔ دونوں فریقوں کی طرف سے اخباری بیان شائع ہو چکا ہے۔ ادہر فریق سکندر جناح پیکیٹ کے بارے میں اپنی الگ تاویل کرتا ہے۔ اِس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ میں انشاءاللہ چند روز میں آپ کو ان تمام بیانات کی نقول ارسال کر دوں گا۔ سرِدست میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر۔ مجھے فی الفور اُس معاہدے کی ایک نقل بھیج دیجئے۔ جس پر سر سکندر کے دستخط ثبت ہیں۔ اور جو غالباً آپ کے پاس موجود ہے۔

"ایک اور امر بھی وضاحت طلب ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے اِس بات پر رضامندی کا اظہار فرمایا تھا کہ لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا؟ سر سکندر مجھ سے کہتے ہیں۔ کہ آپ اِس بارے میں اپنی منظوری دے چکے ہیں۔ اور اِسی بنا پر وہ اصرار کر رہے ہیں۔ کہ اِس بورڈ کے ارکان میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ سر سکندر جناح پیکیٹ میں۔ اِس قسم کی کوئی شق موجود نہیں۔ مہربانی فرما کر اِس خط کا جواب علیٰ از جلد عنایت فرمایئے۔

"ہمارے آدمی بدستور صوبے کے دورے میں مصروف ہیں۔ اور جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔ گزشتہ رات

ہم نے لاہور میں ایک بڑا کامیاب جلسہ کیا تھا۔ جلسوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔"[1]

مذکورہ بالا خط کے ایک ہفتہ بعد۔ یعنی ۸ر نومبر کو۔ ڈاکٹر صاحب کی زیر ہدایت۔ غلام رسول خاں نے ذیل کا خط مسٹر جناح کی خدمت میں ارسال کیا۔

"ڈیئر مسٹر جناح!

آپ نے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کو جو خط بھیجا تھا۔ اُس کے پیش نظر انہوں نے مجھے ہدایت فرمائی ہے۔ کہ آپ کو اطلاع دے دوں کہ

(۱) لکھنؤ میں۔ آپ کے اور سر سکندر کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ صوبے بھر میں شدید اختلافات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ سر سکندر نے پنجاب واپس آتے ہی۔ ایک بیان شائع کر دیا تھا۔ کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ سابقہ صورت حال ہنوز قائم اور بحال ہے۔ البتہ اُس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلم ارکان کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں۔ مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں۔ تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں۔ جو مسلم امیدوار لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ انھیں یہ عہد کرنا ہوگا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد وہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ انتخابات کی

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

جنگ میں۔ انھیں یونینیسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہوگی۔

سر سکندر کی جماعت کے بعض دیگر ارکان نے بھی اِس قسم کے بیان شائع کئے ہیں کہ سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینیسٹ پارٹی کے قبضے میں چلا جائے گا۔

سر چھوٹو رام نے۔ اپنے دستخط سے۔ ایک بیان اخبارات کو دیا ہے جس میں انھوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ آئندہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینیسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی اور وہ یونینیسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن کر رہ جائے گی۔

یونینیسٹ پارٹی کے ارکان کی اِن تصریحات سے مسلمانان پنجاب میں زبردست ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ سخت حیران ہیں کہ ایسا معاہدہ کس طرح کیا گیا ہے۔ جس کے تحت لیگ کی مُستقل حیثیت کالعدم ہو گئی ہے۔ اور وہ یونینیسٹ پارٹی کی ایک ماتحت جماعت بنا دی گئی ہے۔ حالانکہ عوام کی نگاہ میں۔ یونینیسٹ پارٹی بدترین رجعت پسندوں کا ایک گروہ ہے۔ اِن حالات کے پیشِ نظر میں نے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے۔ اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مشورے سے۔ ایک بیان شائع کیا جس کا مقصد پنجاب مسلم لیگ کے متعلق جدید غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے۔ محض سکندر جناح پیکٹ کی اہم شقوں کو نقل کر دیا۔ اور

دُہرایا کہ اِس معاہدے کی رُو سے ۔ جو مسلم لیگ پارٹی معرضِ وجود میں آئے گی ۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ ۔ مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اور مسلم لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط کے تحت ہوگی۔

اسی ضمن میں ملک برکت علی ایم ۔ ایل ۔ اے نے بھی ایک بیان شائع کیا ہے ۔ جس میں انہوں نے معاہدے کی شرائط کو نقل کر کے واضح کر دیا ہے ۔ کہ مجلسِ قانون ساز کے اندر ۔ صرف مسلم لیگ پارٹی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی اصول اور لائحہ عمل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۔ کسی دوسرے گروہ سے مل کر کولیشن بنائے ۔ یا کسی کولیشن کو قائم رکھے ۔ اِن ہر دو بیانات کی نقول ارسالِ خدمت ہیں ۔

مسلمان عوام پر اِن بیانات کا خوشگوار اثر ہوا ہے ۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے مقتدر ارکان ۔ اِن بیانات کی اشاعت سے برہم ہو گئے ہیں ۔ روزنامہ ٹریبیون نے ۔ اِن بیانات پر جو تبصرہ کیا ہے ۔ وہ بھی ارسالِ خدمت ہے ۔

(۲) ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ۔ میں نے سر سکندر ۔ کی خدمت میں ۔ رکنیت کے تو سے فارم بھیجے ۔ اور یہ درخواست کی ۔ کہ اسمبلی کی یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے ۔ اِن پر دستخط کرائے جائیں ۔ کیونکہ اُن ایام میں وائسرائے کی آمد کے سلسلہ میں ، تمام ارکان لاہور میں

موجود تھے[لہ] مگر اِس وقت تک ایک فارم پر بھی دستخط نہیں ہوئے۔ اور نہ کوئی فارم ہمیں واپس کیا گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو خود میں نے اسمبلی کے بعض مسلم ارکان سے۔ اِن فارموں پر دستخط کرنے کو اُن میں سے بعض نے بڑی مسرّت سے۔ میری درخواست کو شرف قبول بھی بخشا۔ لیکن سر سکندر نے۔ اسمبلی کے ارکان کو پیغام بھیج دیا۔ کہ اِن فارموں پر دستخط نہ کئے جائیں ۔۔۔۔۔۔ یہ ہے ہماری موجودہ پوزیشن!

سر سکندر۔ اور اُن کے بعض دوست۔ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ مسلم لیگ موجودہ یونینسٹ پارٹی کے قبضۂ اقتدار میں آ گئی ہے۔ اور سکندر جناح پیکٹ کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی میں لیگ کا واحد نمائندہ۔ مسلم لیگ بلاک کے وجود میں آنے کے بغیر ہی وزارتی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سکندر جناح پیکٹ سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی شہرت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر اِس کا تدارک نہ کیا گیا۔ تو لیگ سے مسلمانانِ پنجاب کی تمام ہمدردی ختم ہو جائے گی۔ میں یہ

لہ وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو سرکاری دورے پر لاہور آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ۲۲ اکتوبر کو قلعہ شاہی کے دیوانِ عام میں دربار کیا۔ اور ۲۳ کو اُن کے اعزاز میں۔ رؤسائے پنجاب نے شالامار باغ میں ایک بہت بڑی گارڈن پارٹی دی تھی۔

بھی واضح کر دوں۔ کہ اگر ہم یہ بیانات شائع نہ کرتے۔ تو آل انڈیا مسلم لیگ کے وقار کو سخت ٹھوکر لگتی۔

(۳) آپ کو یہ شنکر مسرت ہوگی۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک وفد (جس میں خان بہادر ملک زمان مہدی۔ ملک برکت علی۔ مسٹر عاشق حسین بٹالوی اور راقم الحروف کے علاوہ بعض دیگر ارکان بھی شامل ہیں) پنجاب کا دورہ کر کے۔ مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر رہا ہے۔ ان مقامات پر۔ مسلمان عوام نے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ سے۔ جس خلوص اور عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ ہماری کوششوں سے اس وقت تک ۳۱۷ شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور مزید شاخیں قائم ہو رہی ہیں۔ مگر چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے۔ اس لئے ہم اپنا دورہ ملتوی کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ سر سکندر کی پارٹی کے ایک رکن نے بھی ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

(۴) میر مقبول محمود نے ملک برکت علی کو سکندر جناح پیکٹ کی نقل مہیا نہیں کی۔ اس لئے اس کے متعلق آپ کو تار دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بھی۔ سر سکندر حیات کو پیغام بھیجا تھا کہ معاہدۂ مذکورہ کی ایک نقل بھیج دیں۔ سر سکندر نے نقل بھیج دی ہے۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ نقل اصل کے مطابق ہے۔ یا

نہیں، کیونکہ میر مقبول محمود نے مجھے بتایا ہے کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو گیارہ بجے، جبکہ معاہدے کی تمام شرائط آپ کے کمرے میں طے ہو چکی تھیں۔ سر سکندر نے بعض ترمیمیں پیش کیں۔ اور بالآخر وہ معاہدہ مرتب ہوا۔ جس کی نقل ڈاکٹر سر محمد اقبال کو بھی پہونچائی گئی ہے۔ چونکہ ہمیں اُن ترمیموں کا کوئی علم نہیں۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ اس معاہدہ کی، جو آپ کے پاس موجود ہے، ایک نقل ہمیں ارسال فرما دیجئے۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے میر مقبول محمود سے یہ نقل مانگی تھی۔ تو اُنہوں نے جواب دیا تھا۔ کہ مطلوبہ نقل آپ کو بھیج دی گئی ہے۔

(۵) اب میں اِن امور کی طرف آتا ہوں۔ جن کے متعلق آپ نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مشورہ طلب کیا ہے۔

(۱) فروری ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور میں منعقد کرنے کے متعلق۔ جہاں تک سر سکندر کی دعوت کا تعلق ہے ہم اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ہم اُس وقت تک کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ جب تک کہ اس قسم کا واضح اور غیر مبہم سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ کہ سر سکندر کی پارٹی کے مسلمان ارکان۔ کسی مزید تاخیر کے بغیر، مسلم لیگ کے حلف نامے اور قرطاسِ رکنیت پر دستخط کر دیں اور اعلان کریں۔ کہ اسمبلی کے اندر بھی اُن کی جماعت مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔ جہاں تک صورتِ حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صاف

معلوم ہوتا ہے۔ کہ سر سکندر حیات خاں کی طرف یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔

(ب) جہاں تک آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل کا سوال ہے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ کہ پراونشل مسلم لیگ اس وقت موجود ہے۔ اور ہم ہر ضلع ہر تحصیل اور اکثر دیہات میں لیگ کی مقامی شاخیں قائم کر رہے ہیں۔ اس لئے پنجاب میں کسی آرگنائزنگ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔

(ج) جہاں تک مسلم لیگ کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا تعلق ہے ہماری یہ تجویز ہے۔ کہ پنجاب کو پانچ نشستیں دی جائیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی درخواست ہے۔ کہ وہ خرابی صحت کی بنا پر اس قابل نہیں ہیں کہ مجلس عاملہ کے جلسوں میں شریک ہو سکیں اس لئے اُن کی جگہ ملک زمان مہدی ڈپٹی پریزیڈنٹ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو لے لیا جائے ملک برکت علی ورکنگ کمیٹی میں بدستور شامل رہیں اور مسٹر غلام رسول خان بیرسٹر ایٹ لاء کا نام بھی شامل کر لیا جائے۔ جہاں تک سر سکندر اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کا تعلق ہے اس مسئلہ کے حل کا انحصار بیشتر اُنکے اس فیصلے پر ہے۔ کہ وہ لیگ ٹکٹ پر دستخط کر دیں اور کسی مزید تاخیر کے بغیر اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں۔ اگر وہ اس معاہدے پر عمل کریں تو یہ خیال رکھا جائے۔ کہ اُن کی نیابت کسی صورت میں موجودہ مسلم لیگ پارٹی کی نیابت سے تجاوز نہ کرنے پائے"۔

آپ کا مخلص

(غلام رسول)

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)

تیرھواں باب :-

سکندر جناح پیکٹ

(۲)

علامہ اقبال کا خط :-

۱۰ رنومبر ۱۹۳۷ء کو۔ ڈاکٹر صاحب نے۔ مسٹر جناح کو ایک اور خط لکھا۔ جو درج ذیل ہے۔

"مائی ڈیر مسٹر جناح !

سر سکندر اور اُن کے احباب سے متعدد ملاقاتیں کرنے کے بعد۔ میں قطعی طور پر اس نتیجے پر پہونچ گیا ہوں۔ کہ سر سکندر مسلم لیگ۔ اور پراونشل پارلیمنٹری بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اُن کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا۔ اُس میں درج ہے۔ کہ پارلیمنٹری بورڈ کی ممبروں سے نئی تشکیل کی جائے گی۔ اور اس میں یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کو اکثریت حاصل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پچھلے دنوں آپ کو خط لکھکر

دریافت کیا تھا۔ کہ کیا واقعی یہ درست ہے۔ کہ آپ پارلیمنٹری بورڈ میں یونینیسٹ پارٹی کو اکثریت دینے کا وعدہ کر چکے ہیں؟ اب تک آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔

ذاتی طور پر مجھے سر سکندر کی اس خواہش کو قبول کر لینے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ اس معاہدے کی شرائط سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ لیگ کے تمام عہدیداروں میں اُن کے حسب منشا ردّو بدل کیا جائے۔ وہ خصوصیت سے موجودہ سیکرٹری کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ لیگ کی ترقی اور تنظیم میں ہمارے سیکرٹری نے انتہائی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ سر سکندر کی یہ بھی خواہش ہے کہ لیگ کا فنڈ اور سارا حساب کتاب اُن کے آدمیوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اس تمام کارروائی سے اُن کا مقصد یہ ہے۔ کہ وہ کسی نہ کسی طرح لیگ پر قابض ہو کر۔ اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ کم از کم میرا اندازہ تو یہی ہے۔

میں اپنے صوبے کی رائے عامہ کو خوب پہچانتا ہوں۔ اس لئے میں لیگ کو سر سکندر۔ اور اُن کے احباب کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری لینے پر بالکل تیار نہیں ہوں۔ سکندر جناح پیکٹ نے پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اور اگر یونینیسٹ پارٹی کے موجودہ ہتھکنڈے جاری رہے تو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یونینیسٹ پارٹی کے ممبروں نے۔ ابھی تک مسلم لیگ کے حلف نامہ پر دستخط نہیں کئے

اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ وہ دستخط کرنا بھی نہیں چاہتے۔ اب وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس۔ لاہور میں فروری کی بجائے اپریل میں ہونا چاہیئے۔

میرا خیال ہے کہ اس لیت و لعل سے۔ اُن کا مقصد یہ ہے۔ کہ آہستہ آہستہ اُن کی زمیندارہ لیگ کے پاؤں جم جائیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں۔ کہ لکھنؤ سے واپس آکر۔ سر سکندر نے پنجاب میں۔ ایک زمیندارہ لیگ قائم کی ہے۔ اور اب اُس زمیندارہ لیگ کی شاخیں۔ صوبے کے طول و عرض میں۔ پھیلائی جا رہی ہیں۔ براہِ کرم مجھے اطلاع دیجئے۔ کہ اِن حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اگر تکلیف نہ ہو۔ تو بلا توقف تار دے دیجئے۔ اور اگر تار ممکن نہ ہو۔ تو جلد از جلد ایک مفصّل خط لکھیئے۔

آپ کا مخلص[1]

محمد اقبال"

ڈاکٹر صاحب نے۔ اپنے اِس گرامی نامے میں۔ پنجاب مسلم لیگ کے سکریٹری کی برطرفی کے جس مطالبہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ سر سکندر۔ اپنے دو، تین احباب کے ہمراہ۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا: "آپ لوگ مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کیوں نہیں کرتے؟"

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

سر سکندر نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے جواب دیا کہ "ہم غلام رسول خاں کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ وہ بہت تیز مزاج آدمی ہیں۔ آپ کسی اور شخص کو لیگ کا سکریٹری مقرر کر دیجیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "بہت اچھا اب میں ملک برکت علی سے کہوں گا کہ وہ یہ کام سنبھال لیں۔"

سر سکندر نے عرض کیا۔ "ہمیں ملک صاحب بھی منظور نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "خلیفہ شجاع الدین کو سکریٹری بنا دوں؟"

سر سکندر نے خلیفہ صاحب کے نام پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا: "آپ خود کوئی آدمی کیوں تجویز نہیں کرتے؟"

جواب میں سر سکندر نے نوابزادہ خورشید علی خاں کا نام پیش کیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب سخت غصے میں آ گئے۔ اور انھوں نے یہ نام منظور کرنے سے بالکل انکار کر دیا[1]۔

ملک برکت علی کا خط:۔

۳ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ملک برکت علی نے۔ ذیل کا خط مسٹر جناح کی خدمت

---

[1] میرے دوست راجہ حسن اختر صاحب۔ اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ سر سکندر خود تشریف نہیں لائے تھے۔ بلکہ انہوں نے میر مقبول محمود کو یہ پیغام دے کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔

میں ارسال کیا۔

"ڈیر مسٹر جناح!

آپ کا گرامی نامہ محررہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۷ء۔ مجھے وقت پر مل گیا تھا خدا کا شکر ہے۔ کہ آپ کی طبیعت اب بہتر ہے۔ اور تکلیف رفع ہو گئی ہے آپ کے مزاج کی ناسازی۔ سراسر اُس محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ جو اجلاسِ لکھنؤ کے بعد۔ آپ کو برداشت کرنا پڑی۔

میں نے آپ کا خط۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور غلام رسول خاں کو دکھا دیا ہے۔ اس بارے میں مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔ کہ جوں ہی کوئی مسلمان۔ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے۔ اُس کا ممبر بنتا ہے۔ وہ اپنے حقوق و فرائض کے لحاظ سے۔ لیگ کے پرانے ممبروں کے ہم پلہ ہو جاتا ہے۔

میرے تمام احباب اس حقیقت کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ سر سکندر اور اُن کے رفقا نے ابھی تک لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے۔ اس کے برعکس وہ مسلسل یہ پراپاگنڈہ کئے جا رہے ہیں۔ کہ لکھنؤ جانے سے قبل جو حالت پنجاب میں تھی۔ وہ بجنسہٖ برقرار ہے۔ اور اُس میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اس باہمی آویزش میں۔ یونینسٹ پارٹی کو فتح اور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ مسلم لیگ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت شاخ کی حیثیت سے کام کرے گی۔

اگر سر سکندر اور ان کے رفقاء لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ تو انھیں لیگ کے تمام معاملات میں حصّہ لینے کی پوری آزادی ہو گی۔ اور اگر وہ لیگی ممبروں کی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے میں بھی کامیاب ہو جائیں۔ تو انھیں یقیناً یہ اختیار ہو گا۔ کہ وہ لیگ کی پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکیں۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہ وہ نہ لیگ میں شامل ہوتے ہیں اور نہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار ہیں۔ یہ طرز عمل تو معاہدہ لکھنؤ کے صریح خلاف ہے۔

سر سکندر اس بات پر بھی مُصر ہیں۔ کہ لیگ کے موجودہ عہدیداروں کو برطرف کر کے۔ اُن کی جگہ ان کے۔ یعنی سر سکندر کے آدمیوں کو مقرر کیا جائے۔ اور جب تک یہ نہیں ہو گا وہ لیگ کی رکنیت قبول نہیں کریں گے۔ سر سکندر کا یہ مطالبہ تمام جمہوری قواعد کے خلاف ہے ہم کسی عہدیدار کو مستعفی ہونے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ البتہ باہمی تفاہم و تفہیم سے معاملات طے کرنے پر ہمیشہ آمادہ ہیں۔

مسلم لیگ پر قبضہ کر کے۔ اُسے ایک مُردہ جماعت بنا دینے کی پالیسی کی ہم کبھی تائید نہیں کریں گے۔ بلکہ ہر وہ شخص۔ جو لیگ کے آئین کو تمام دوسری باتوں پر مقدم رکھتا ہے۔ کبھی اِس پالیسی کی حمایت نہیں کرے گا۔ ہاں اگر آپ لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہمیں حکم دیں۔ کہ لیگ کو کلیتہً یونینیٹ پارٹی کے حوالے کر دیا جائے

"تو ہمیں آپ کے اِس ارشاد کی تعمیل میں قطعاً کوئی عذر نہیں ہوگا۔
لیکن اِس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ کہ پنجاب میں لیگ کو ختم کرنے۔ اور اُسے موت کی نیند سُلا دینے کی۔ اِس سے زیادہ مؤثر تجویز اور کوئی نہ ہوگی۔

ذاتی طور پر میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ تمام معاملات خوش اسلوبی اور دوستانہ طریقے سے طے ہو جائیں۔ اور ہمارا متحدہ محاذ ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن اِس ضمن میں۔ سر سکندر اور میر مقبول محمود نے لکھنؤ سے واپس آنے کے بعد۔ جو اخباری بیان شائع کئے ہیں۔ وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔ آپ کی اُن بیانوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ کہ ہمارے صوبے کے عوام نے سکندر جناح پیکٹ پر جو اعتراضات کئے ہیں۔ وہ آپ کی نظر سے گذرے ہیں یا نہیں۔ عوام نے اِس پیکٹ پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اُن کی رائے ہے۔ کہ اِس پیکٹ کی رُو سے لیگ کو یونینسٹ پارٹی کے حوالے کر دیا۔ گویا لیگ کی موت کے محضر پر خود اپنے ہاتھوں سے مُہر ثبت کرنے کے برابر ہے۔

میری آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے۔ کہ بہت جلد سر سکندر اور اُن کے احباب کو مشورہ دیجئے۔ کہ وہ مزید تاخیر کے بغیر لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ اور اپنے خلوص کا اوّلین ثبوت یہ پیش کریں۔ کہ مجلسِ قانون ساز کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں

اگر سر سکندر ایسا کر دیں۔ تو ہم کھلے دل سے اُن کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ لیگ کی جمہوری حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ اور وہ بدستور مسلمانانِ پنجاب کے عزائم اور اُن کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی کا فرض ادا کرتی رہے۔

جہاں تک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا تعلق ہے۔ میری درخواست ہے کہ مہربانی فرما کر۔ اصحابِ ذیل کو اُس کے ممبر نامزد کر دیجئے۔

مسٹر غلام رسول خاں۔ خلیفہ شجاع الدین۔ میاں عبدالمجید بیرسٹر ایٹ لاء۔ حافظ محمد عبداللہ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی) اور مسٹر عاشق حسین بٹالوی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال علالت کی وجہ سے۔ اِس بورڈ کی رکنیت قبول کرنے سے معذور ہیں۔

آپ کے مکتوبِ گرامی کا جواب دینے میں جو دیر ہوئی ہے۔ اُس کے لئے دوبارہ معذرت پیش کرتا ہوں۔ وجہ صرف یہ تھی۔ کہ میں مسجد شہید گنج کے مقدمے میں سخت مصروف تھا۔ وہ مقدمہ کل ختم ہوا ہے۔ آپ کو یہ سُنکر مسرت ہو گی۔ کہ پنجاب میں لیگ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ اور اُس کی شاخیں جا بجا قائم کی جا رہی ہیں۔ جن میں مقامی مسلمان بڑے جوش و خروش سے حصّہ لے رہے ہیں۔

آپ کا مخلص

برکت علی"

ممکن ہے بعض لوگ سوال کریں۔ کہ مسٹر جناح نے سر سکندر کے ساتھ ایسا قابلِ اعتراض معاہدہ کیوں کیا۔ میری ذاتی رائے ہے۔ کہ مسٹر جناح اُس وقت دو مختلف محاذوں پر لڑنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ کانگرس اِس شدّت سے مسلمانوں کی قومی جمعیّت کو تہس نہس کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ اور اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہ ہم اپنے گھر کے اندرونی اختلافات کو کسی نہ کسی طرح تہہ کر کے۔ ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتے۔ مسٹر جناح نے یہی کچھ کیا۔ اگر سکندر جناح پیکٹ نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینیسٹ پارٹی کے درمیان جنگ جاری رہتی۔ اِس جنگ کی شدّت اور طوالت کے متعلّق آج کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکتی۔ مسلم لیگ اُس وقت کمزور تھی۔ اور یونینیسٹ پارٹی طاقت ور تھی۔ ممکن ہے۔ یہ دونوں جماعتیں مسلسل دو، تین سال تک۔ ایک دوسری کے خلاف برسرِ پیکار رہتیں۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ جنگ خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جاتی فتح انجام کار لیگ کی ہوتی۔ ملک برکت علی نے ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو، پنجاب اسمبلی کے بجٹ سیشن میں، تقریر کرتے ہوئے کہا تھا

"...... اِس وقت پنجاب میں۔ ایک نہایت غلط قسم کی دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے۔ اگرچہ اصطلاحی معنوں میں۔ اب دفتری حکومتیں ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن پنجاب پر بدستور یہ لعنت مسلّط ہے۔ اِس لعنت سے نجات پانے۔ اور اِس طلسم کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دینے کے لئے۔ ہمارے صوبے کو سرتوڑ محنت کرنا پڑے گی یہ حکومت ایک کابوس کی طرح ہم پر

سوار ہے۔ جس نے ہماری اُن تمام کوششوں کو بیکار بنا رکھا ہے۔
جو ہم اُس مبارک دن کے لئے کر رہے ہیں۔ جب ہمارا صوبہ۔ اُن
بندھنوں اور زنجیروں سے آزاد ہو گا۔ جنہوں نے ماضی میں ہم کو
بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔"

وزیرِاعظم (سر سکندر حیات خاں) !۔ "لیجئے بلی تھیلے سے باہر نکل آئی ہے۔"

ملک برکت علی :۔

"ہاں۔ بلی تھیلے سے باہر نکل آئی ہے۔ اور یہ بھی سن لیجئے کہ وہ کیوں باہر نکلی ہے۔ اِس وقت پنجاب میں۔ ایک بدترین قسم کی رجعت پسند حکومت قائم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اِس حکومت کی کمزوریوں کو واشگاف طور پر بیان کر کے۔ اُسے ختم کرنے کی کوشش کریں تاکہ آلام و مصائب کی وہ اندھیری رات۔ جو اِس وقت ہمارے صوبے پر چھائی ہوئی ہے کسی طرح ختم ہو۔ اور تاریخ پنجاب کا یہ افسوسناک باب اپنے انجام کو پہنچے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے سامنے اکثریت کی ایک سنگین دیوار کھڑی ہے۔ جو اُن لوگوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ جن میں خطاب یافتہ رئیس بڑے بڑے زمیندار آنریری مجسٹریٹ۔ آنریری سب رجسٹرار۔ ذیلدار اور دفتری حکومت کے پُرانے ہوا خواہ اور کاسہ لیس شامل ہیں۔ لیکن کچھ پرواہ نہیں خواہ اِس دیوار کو پاش پاش کرنے کے لئے ہمیں برسوں کیوں نہ سر ٹکرانا پڑے۔ ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔

مسٹر جناح اگر سر سکندر سے مفاہمت نہ کرتے۔ تو ہماری جدوجہد یقیناً ......

...... جاری رہتی ۔ یہ صحیح ہے کہ لیگ کی مالی حالت سخت مخدوش تھی۔ دیہاتی آبادی کو یہ کہہ کر کہ لیگ شہری مسلمانوں کی ایک جماعت ہے ۔ ہم سے بدگمان کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں زمیندارہ لیگ قائم کرکے دیہاتوں کے لوگوں کو بھڑکانے کی کوششیں بھی شروع ہو گئی تھیں ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کانگرس کی یلغار سے ۔ شہری اور دیہاتی مسلمان ۔ دونوں پریشان ہو رہے تھے۔ اور اُن کی پریشانی کا مداوا صرف مسلم لیگ کے پاس تھا ۔ مسٹر جناح کو انجام کار یونینسٹ پارٹی کے خلاف لڑنا ہی پڑا۔ اگرچہ یہ لڑائی چھ سال بعد ہوئی ۔ اور میری رائے میں نامناسب موقع پر ۔ نامناسب اسباب اور نامناسب حالات میں ہوئی تاہم یہ سب کچھ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ کہ سکندر جناح پیکیٹ ایک غلط اور نقصان دہ معاہدہ تھا ۔

اجلاسِ لکھنؤ کے بعد ۔ اگرچہ پنجاب میں سکندر جناح پیکیٹ کا قضیہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا حکم تھا ۔ کہ اس قضیئے سے آنکھیں بند کرکے ۔ ہمیں اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے ۔ چنانچہ لکھنؤ سے واپس آتے ہی ہم پھر دورے میں مصروف ہو گئے ۔

اسمبلی کے الیکشن کے دوران میں ہم نے ۔ پراونشل مسلم لیگ کے دفتر کے لئے۔ ایبٹ روڈ پر ایک کرائے کا مکان لے لیا تھا۔ لیکن اب مسلم لیگ کا سرمایہ بالکل ختم ہو گیا تھا ۔ اور آئندہ کہیں سے روپیہ دستیاب ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں تھی ۔ اس لئے ایبٹ روڈ کا مکان چھوڑنا پڑا ۔ اور لیگ کا دفتر۔

غلام رسول خاں کے مکان ۱۲۔ ٹمپل روڈ پر آ گیا۔

الیکشن ختم ہونے کے بعد۔ ڈاکٹر صاحب نے غلام رسول خاں کو ایک ہزار روپیہ عطا فرمایا تھا۔ اور اسی روپے سے اب تک لیگ کا کام چل رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ایک ہزار روپیہ ڈاکٹر صاحب کو کس شخص نے دیا تھا۔ غالباً کوئی سرکاری ملازم تھے۔ جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غلام رسول خاں کو ان کا نام معلوم تھا۔ لیکن میں نے کبھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

جب حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ تو ہم نے مجبوراً لیگ کے دفتری کلرک اللہ بخش سلیم کو بھی جواب دے دیا۔ انھیں غالباً تیس ۳۰ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن سلیم محض کلرک ہی نہیں۔ بلکہ ہمارے دوست بھی تھے۔ اور ان کی علیحدگی ہم سب پر شاق گزری۔

اب فیصلہ یہ ہوا کہ لیگ کے دفتر کا سارا کام میں خود سنبھال لوں۔ چنانچہ صبح سے شام تک مجھے لیگ کے دفتری امور میں سر کھپانا پڑتا تھا۔ راجہ عبدالعزیز شام کو ہائی کورٹ کی ملازمت سے واپس آتے۔ تو انگریزی کے خطوط اور مسودے ٹائپ کر دیتے تھے۔ دورے کے مصارف بھی کچھ دیر لیگ کے فنڈ میں سے ادا ہوتے رہے۔ لیکن جب لیگ کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ تو یہ خرچ بھی ہم میں سے ہر اک کو انفرادی طور پر خود برداشت کرنا پڑا۔

مختلف اضلاع کے صدر مقامات میں لیگ کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں اور ان کے تحت ابتدائی شاخیں بھی کام کر رہی تھیں۔ ان شاخوں کے عہدیداروں میں اکثر جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو ان جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے، ہم

میں سے کسی نہ کسی کو خود وہاں جانا پڑتا تھا۔ پھر آئے دن باہر سے ۔ پراونشل مسلم لیگ کے وفد کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں۔ خصوصاً ملک برکت علی کے پاس تو ہر جگہ سے پُر اصرار بلاوا آتا تھا ۔ لیکن وہ اپنی بے شمار مصروفیتوں کی وجہ سے تمام دعوتیں قبول کرنے سے معذور تھے۔ ان دیں حالات ۔ اکثر و بیشتر موقعوں پر مجھے اُن کا قائم مقام بن کر جانا پڑتا تھا۔ اِس کے علاوہ مسلم لیگ کی شاخوں کا بھی یہ اصرار تھا ۔ کہ اُن کو لیگ کے تازہ بتازہ حالات سے باخبر رکھا جائے ۔ تاکہ تحریک میں کمزوری نہ آنے پائے ۔ اِن تمام اغراض کے لئے روپیہ درکار تھا ۔

اُنہی دنوں میں نے اور غلام رسول خاں نے ایک تجویز مرتب کی ۔ کہ پنجاب مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ۔ مہینے میں دو بار ایک رسالہ شائع ہونا چاہئیے۔ جس میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی مسلم لیگی اور کانگرسی سرگرمیوں کے مفصّل حالات درج ہوں ۔ تاکہ پنجاب کے مسلمان ہندوستان کے سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر رہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ یہ رسالہ کم از کم ایک ہزار کی تعداد میں چھپوا کر ۔ صوبے کی تمام شاخوں میں مفت تقسیم کیا جائے گا۔ غلام رسول خاں نے یہ تجویز ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کی ۔ تو انہوں نے اِسے پسند فرمایا ۔ بلکہ اُن کا خیال تھا کہ اِس رسالہ کی اشاعت کے بعد ۔ لیگ کے وفد کو بار بار دورہ کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی ۔ اور اُس کی بجائے تمام حالات مطبوعہ صورت میں ۔ لیگ کی شاخوں کے پاس پہونچ جایا کریں گے ۔ لیکن دقّت یہ تھی۔

کہ اس تجویز کی تکمیل کے لئے بھی روپیہ درکار تھا۔

ایک روز۔ ڈاکٹر صاحب نے۔ غلام رسول خاں سے کہا۔ کہ "کوٹ فتح خاں کے رئیس، سردار محمد نواز خاں، مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے اُن سے لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا تھا۔ وہ مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ اُن سے فلیٹی ہوٹل میں جا کر ملیئے"۔

دوسرے روز۔ ملک برکت علی اور غلام رسول خاں، سردار محمد نواز خاں سے ملے۔ اور لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا۔ سردار محمد نواز خاں کے جتنے مقدمات ہائی کورٹ میں پیش ہوتے تھے۔ اُن کی پیروی ملک برکت علی کرتے تھے۔ اس لئے ملک صاحب سے انکی کوئی بیگانگی نہ تھی۔ سردار محمد نواز خاں نے پہلا سوال یہ کیا کہ "مسلم لیگ اور سکندر حیات کے تعلقات کیسے ہیں؟"

غلام رسول خاں نے صاف کہا: "اس وقت تو ہمارے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ اگر سر سکندر نے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم نہ کی۔ تو ہم اُن کی مخالفت جاری رکھیں گے"۔

اس پر سردار محمد نواز خاں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا۔ اور فرمایا۔ کہ "دیکھیئے! میرے موجودہ حالات اس قسم کے ہیں کہ میں سر سکندر کو خفا کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنے خانگی معاملات میں قدم قدم پر حکومتِ پنجاب کی مدد درکار ہے۔ اگر میں لیگ کو روپیہ دوں تو ظاہر ہے کہ آپ اس روپے کو سر سکندر اور اُن کی جماعت کے خلاف پراپاگنڈے پر صرف کریں گے۔ سر سکندر کو یہ سب کچھ معلوم ہو گا۔ تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس لئے مجھے

افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد سردار محمد نواز خاں نے ملک برکت علی سے کہا۔ کہ "اس وقت میری فلاں اپیل (اپیل کا نام لیا۔ جو مجھے یاد نہیں) ہائی کورٹ میں دائر ہے آپ اس اپیل کی دوگنی فیس مجھ سے لے لیجئے۔ اور جی چاہے تو اس روپے کو لیگ کے کام پر صرف کروا لیے۔ مجھے کچھ اعتراض نہیں ہوگا۔"

ملک صاحب نے ہنس کر کہا۔" حضرت! یہ تو ایک بددیانتی ہے جس کا میں بحیثیت ایک قانون دان اور وکیل کے مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد غلام رسول خاں اور ملک برکت علی اُٹھ کر واپس چلے آئے۔ اور روپیہ حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی ناکام رہی۔

اُنہی دنوں۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب نے۔ میجر ملک ممتاز ٹوانہ کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ" وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اور میں نے اُن سے لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا تھا۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ دیں گے۔ آپ ایک وفد بنا کر سرگودھا جایئے"۔

غلام رسول خاں نے مجھ سے یہ قصہ سنایا۔ تو میں نے مایوسی کا اظہار کیا مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ یہ بڑے بڑے زمیندار مسلم لیگ کو ایک پیسہ بھی دینگے میجر ممتاز ٹوانہ سے میری بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں نے اُن کی خوبیوں کا ذکر سن رکھا تھا کہ پڑھے لکھے اور با اخلاق آدمی ہیں اور ادب کا بھی بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ زمان مہدی خاں سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ زمان مہدی خاں میجر صاحب سے مل کر کوئی تاریخ مقرر کریں اور اس تاریخ کو لیگ کا وفد لاہور سے چل کر

سرگودھا پہونچ جائے۔

ہم دسمبر میں سرگودھا گئے۔ وفد میں ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ زمان مہدی اور راقم التحریر شامل تھے۔ ہم نے تین روز میجر ممتاز ٹوانہ کے دولت کدے پر قیام کیا۔ شہر میں ایک پبلک جلسہ بھی ہوا۔ جہاں ہم نے خوب تقریریں کیں میجر صاحب نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ دونوں وقت دسترخوان کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھر دیا جاتا تھا مُرغِ مسلّم۔ ماہی بریاں۔ بط دم پخت۔ حلوائے گذر۔ اور مُزعفر نارنج کی بھری ہوئی قابیں آتی تھیں۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی بسیار خور نہیں تھا۔ اِس لئے جنّت نگاہ کے اِس سامان کا بیشتر حصّہ واپس چلا جاتا تھا۔ لیکن جس غرض کے لئے ہم نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ افسوس کہ اُس میں قطعاً کامیابی نہیں ہوئی۔ اور تین روز کے بعد۔ ہم خالی ہاتھ واپس لاہور آ گئے۔

اُس زمانے میں ایک تکلیف یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ میں کام کرنے والوں کی سخت کمی تھی۔ جس مہم کو ہم نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اور جس قسم کے حالات و واقعات درپیش تھے۔ اُن کا تقاضا تو یہ تھا کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے پاس۔ کم از کم نصف درجن کے قریب۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ نوجوان موجود ہوتے۔ جنھیں تحریر و تقریر کے فن پر پُورا عبُور ہوتا۔ اور جو صوبے کے طول و عرض میں گھوم کر۔ تحریک میں نئی جان ڈال دیتے۔ ہمارے پاس ایسا ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ ایم۔ اے۔ اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد۔ بہت سے مسلمان نوجوان بے کار پھر رہے تھے۔ لیکن انھیں پیٹ کے دھندے نے

مجبور کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے پاس سوائے ایثار، قربانی، قومی جدّ وجہد اور حکومت کے عتاب کے۔ اور رکھا ہی کیا تھا۔ پھر تعلیم یافتہ نوجوان اِس طرف کیوں رُخ کرتے۔ بہت سے نوجوانوں کو یونینسٹ پارٹی نے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ علاوہ اِس اُمید پر کہ زُود یا بدیر۔ اُنھیں یونینسٹ لیڈروں کے طفیل سرکاری ملازمت مل جائے گی۔ اِس پارٹی کے صدر دفتر میں کام کر رہے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو۔ عدم تعاون کی تحریک میں۔ تعلیم کرنے کا جو تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اُس کے بعد۔ اُن کو کسی سیاسی تحریک میں شرکت کی دعوت دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُس دور میں بھی، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ہماری قوم کے بعض نوجوانوں نے۔ ایثار و قربانی کا ایک بلند معیار پیش کیا تھا۔ جس کی مثال خود ہندوؤں کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ رنج اِس بات کا ہے کہ اُن کی قربانیوں سے سراسر اغیار نے فائدہ اٹھایا اور ہم محروم رہے۔

ڈاکٹر محمّد اشرف کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی پروفیسری چھوڑ کر۔ کانگرس میں کام کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد (زین العابدین احمد) نے علیگڑھ سے اقتصادیات میں ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر لندن سے اقتصادیات میں بی۔ ایس۔ سی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ واپس وطن آنے کے بعد۔ اُنھیں محکمۂ تعلیم میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن انھوں نے نوکری چھوڑ دی۔ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا منظور کیا صاحبزادہ محمود الظفر نے انگلستان کے پبلک سکول میں تعلیم پائی تھی۔ پھر کیمبرج سے ڈگری لی تھی۔ ہندوستان واپس آکر۔ اُنھیں بھی معقول ملازمت مل گئی تھی

لیکن انہوں نے بھی یہ ملازمت ترک کر کے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دفتر میں پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ باتیں اِس لئے رنج دہ ہیں کہ ؎

سیاہ بختی ازاں بیشتر نمی باشد
کہ مجلسِ دگرے روشن از چراغِ من است

تاہم اِس بات کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہیں۔ کہ ہماری خاکستر میں اب بھی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ ہمارے ملک میں وکالت ایک ایسا پیشہ ہے۔ جس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اِس پیشے میں۔ انسان اپنی آزادی اور خودداری کو قائم رکھ کر۔ سیاسیات میں بے دریغ حصّہ لے سکتا ہے۔ اِس امر سے بھی انکار محال ہے کہ ہندوستان کی سیاسیات میں ہمیشہ وکلا نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ اور یہی لوگ سیاسی تحریکوں میں آگے آگے رہے ہیں۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے عروج کے زمانے میں۔ خود مسلمان وکلا کا بہت بڑا طبقہ اِس پارٹی کا حلقہ بگوش بن گیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں۔ پراونشل مسلم لیگ کا وفد منٹگمری جانے والا تھا۔ شام کو غلام رسول خاں نے۔ ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا۔ کہ ہم لوگ صبح منٹگمری جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ کہ منٹگمری میں کہاں ٹھہریں گے آپ؟ غلام رسول خاں نے۔ ایک وکیل صاحب کا نام لیا۔ کہ اُن کے ہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب وہ نام سنکر خاموش ہو گئے۔ پھر بولے۔ کہیں اور کیوں نہیں آپ ٹھہرتے" غلام رسول خاں نے جواب دیا کہ اُن وکیل صاحب کو اطلاع کر چکے ہیں اب کہیں اور ٹھہرنا مناسب نہیں۔

زمان مہدی خاں بھی اُس وقت موجود تھے۔ اُنھوں نے بتایا۔ کہ انھوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں۔ وکیل صاحب سے بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ اس لئے اب اُن کے ہاں ٹھہرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب خاموش ہوگئے لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اِس تجویز سے خوش نہیں ہیں۔

دوسرے روز۔ جب ہم منٹگمری پہونچے۔ تو وکیل صاحب غائب تھے۔ تاہم ڈاکٹر صاحبزادہ ارشاد علی اور اُن کے احباب نے وفد کی پذیرائی انتہائی گرمجوشی اور خوش اسلوبی سے فرمائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وکیل صاحب خود اِن دِنوں خطاب اور جاگیر کے حصُول کی کوشش میں سرگرداں تھے۔ اور چونکہ یہ دونوں چیزیں سراسر پنجاب کے وزیراعظم کی خوشنودی سے حاصل ہوسکتی تھیں۔ اِس لئے انھوں نے اپنے آپ کو لیگ کے وفد سے وابستہ کرنے کی غلطی نہ کی چنانچہ انھیں خطاب بھی عطا ہوا۔ اور جاگیر بھی ملی۔

البتہ اِس دوران میں۔ ملتان کے اُس خانوادہ رُشد و ہدایت نے جسے عرف عام میں گیلانی خاندان کہا جاتا ہے۔ جس خلوص و محبت اور جس استقلال و پامردی سے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ اُس کی یاد آج بھی میرے لئے سرمایہ انبساط اور موجب فخر و مُباہات ہے۔ سید محمد رضا شاہ گیلانی مرحوم اور سید ولایت حسین شاہ گیلانی مرحوم۔ دونوں اسمبلی کے رُکن تھے۔ وہ اگرچہ ایوان کے اندر یونینسٹ پارٹی کے حلقے میں بیٹھتے تھے۔ لیکن انھوں نے بارہا ہم سے کہا تھا۔ کہ جس دن آپ حکم دیں گے۔ ہم وزارتی پارٹی کو چھوڑ کر الگ بیٹھ جائیں گے۔ ملتان شہر میں لیگ کے بڑے بڑے شاندار جلسے ہوئے۔ جن کی تمام تر کامیابی اِنہی اصحاب کی

کوشش کا نتیجہ تھی۔

ایک پبلک جلسے کی صدارت تو خود حضرت مخدوم پیر صدر الدین شاہ صاحب گیلانی نے بہ نفسِ نفیس فرمائی تھی۔ حضرت کا سنِ شریف اُس وقت اُسّی کے لگ بھگ تھا۔ اور مدت سے خانہ نشین ہو چکے تھے۔ لیکن جب اُنھیں معلوم ہوا کہ آج قوم کو اُن کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ تو وہ بے دریغ گوشۂ عزلت سے نکل کر میدانِ میں آ گئے۔

ہفتہ وار نیوٹائمز کو جاری ہوئے بھی سال بھر ہو چکا تھا۔ اور اس ایک سال کے عرصے میں اس اخبار نے اسلامیانِ پنجاب کے انگریزی خواں طبقے کو مسلم لیگ کے کام اور پیغام سے روشناس کرنے میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔۔۔ اخبار کی سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا پیغام ارسال فرمایا۔

"گذشتہ ایک سال میں۔ نیوٹائمز نے قوم کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ میں اُن کو بڑے اطمینان اور مسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں میں تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں۔ اس اخبار کے خریدار بنیں۔ تاکہ نیوٹائمز ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک ذمہ دار۔ اور با وقار ترجمان کی حیثیت اختیار کر لے۔"

۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر کا بحیثیت مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام۔ لاہور میں یومِ اقبال کی تقریب منائی جانے والی تھی۔ جس کے لئے مسلم برادرہڈ نے بڑی گرمجوشی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بیرونِ لاہور سے بھی بعض لوگ شرکت کیلئے

آرہے تھے۔ اِس موقع پر سر سکندر حیات خاں نے ذیل کا بیان اخبارات میں شائع کیا۔

"یومِ اقبال کو ایک مقدس قومی تقریب کے طور سے منائے جانے پر۔ ہر ہندوستانی کو بالعموم اور ہر پنجابی کو بالخصوص۔ سچے دِل سے خوش ہونا چاہیئے۔ میری دلی تمنا ہے کہ اِس یادگار تہوار کی مسرتیں جو ایشیا کے نامور فلسفی اور عظیم المرتبت شاعر کے نام سے منسوب ہے صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہنی چاہئیں۔ بلکہ تمام مشرقی ممالک کو اُن میں شریک ہونا چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اِس تقریب کو اُس متانت سنجیدگی اور وقار سے منائیں۔ جس سے ایک طرف تو دنیا پر اقبال کی عظمت، اور اُس کی شاعری کی حقیقی قدر ومنزلت ظاہر ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے۔ کہ ایشیا اپنے اِس فرزندِ جلیل کے ادبی کارناموں کی قدر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

"عرصۂ دراز کی گراں خوابی کے بعد۔ اگر آج ہمیں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نظر آتے ہیں۔ تو یہ سب کچھ اقبال کی پُرجوش آواز کا اثر ہے اِدھر ہندوستان کے باشندوں میں بھی جو تڑپ اور بلند نگہی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ بھی اِس نابغۂ عظیم کی مساعی کی شرمندۂ احسان ہے۔ لہٰذا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ کہ وہ یومِ اقبال کو ایک مقدس قومی وظیفہ سمجھ کر۔ اِس میں سرگرمی سے حصّہ لے۔

"اِسی سلسلہ میں مَیں یہ تجویز پیش کرتا ہوں۔ کہ جس جس شہر میں یوم اقبالؔ منایا جائے۔ وہاں کے باشندوں کو چاہیئے کہ وہ شاعرِ اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ اِس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ۔ اقبالؔ کمیٹی کو چاہیئے۔ کہ امپیریل بنک آف انڈیا میں یوم اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبالؔ کے نیازمندوں اور اُن کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہِ راست بنک کو ارسال کر دیں۔ جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

"علاوہ ازیں۔ میں یہ بھی درخواست کرتا ہوں۔ کہ تمام مسجدوں اور مندروں میں اقبالؔ کی صحت اور درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگی جائیں۔ کہ خدا تعالےٰ اُنھیں عرصہ دراز تک سلامت رکھے تاکہ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کر سکیں"۔ [1]

سرسکندر کی اِس تجویز کے جواب میں۔ ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا بیان اخبارون میں شائع فرمایا۔

"سرسکندر حیات خاں نے۔ انٹر کالیجیٹ مسلم برادرہڈ کے نام جو پیغام دیا ہے۔ اُس میں اُنھوں نے میرے متعلق بہت سے محبت آمیز جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۳۷ء

"مسٹر سکندر نے یہ تجویز پیش کی ہے۔ کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ سب مل کر مجھ کو ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں۔ ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں ہر چند کہ اُس شخص کی شاعری نے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی روح کو کیوں نہ جلا بخشی ہو۔ فرد اور اُس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ لیکن قوم اور اُس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔

"آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے۔ کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے، لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیئر قائم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہونی چاہیئے۔ اسلامی تاریخ فقہ، دینیات اور تصوف سے جس قدر جہالت پنجاب میں بڑھتی جا رہی ہے۔ اور اس جہالت سے جس قدر ناجائز فائدہ ملا لوگوں نے پنجاب میں اٹھایا ہے ہندوستان میں کہیں نہیں اٹھایا

"اب وقت آگیا ہے۔ کہ اسلامی فکر۔ اور اسلامی طرز حیات کا تجزیہ مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اُس مقصد اور پیغام کو کس طرح تہہ در تہہ پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہیئے۔ تاکہ نئی نسل کے نوجوان۔ اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں۔

"مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی۔ یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے۔ تو دوسری طرف۔ اُس نے نوعِ انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اِس تجویز کو پنجاب کے وزیرِ اعظم پسند فرمائیں گے۔ اور اپنے اثر و رسوخ سے اِسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔ تاہم میں ایک سَو روپے کی حقیر رقم۔ اِس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں"۔ لے

۱۹۳۷ء کے اختتام تک۔ یونینیسٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔ اور دونوں فریق اپنے اپنے راستے پر گامزن رہے۔ اُنہی دنوں میں نے ایک روز ملک برکت علی سے پوچھا تھا کہ "۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو۔ جب آپ نے سکندر جناح پیکٹ کا پہلا مسودہ مرتب کیا تھا۔ تو اُس میں آپ نے کون سی ایسی بات لکھی تھی جسے سکندر حیات نے منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا؟"

ملک صاحب نے جواب دیا۔ "کہ میں نے اُس میں لکھا تھا۔ کہ یہ اعلان کیا جائے۔ کہ وہ یونینیسٹ پارٹی۔ جس کی تشکیل اپریل ۱۹۳۶ء میں سر فضلِ حسین نے کی تھی۔ اور جس کے تحت ۱۹۳۷ء کی الیکشن لڑی گئی تھی ختم ہو چکی ہے اور اب اس پارٹی کے مسلمان ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگی بن گئے ہیں۔"

لے سول ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۷ء

ظاہر ہے اگر۔ ملک برکت علی کی یہ تجویز۔ اُس وقت مان لی جاتی۔ تو سارا قضیہ ختم ہو جاتا۔ اور آئندہ کوئی جھگڑا رونما نہ ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ میاں مشتاق احمد گورمانی نے پچھلے دِنوں روزنامہ ٹائمز آف کراچی کے ایڈیٹر۔ زیڈ۔ اے سلیری کے خلاف۔ اِزالہ حیثیت عرفی کا جو استغاثہ دائر کیا تھا۔ اُس میں اُنہوں نے۔ عدالتِ عالیہ کے روبرو شہادت دیتے ہوئے۔ کہا تھا کہ یونینسٹ پارٹی ایک پارلیمنٹری گروپ تھا۔ وہ سیاسی یا قومی مفہوم کے اعتبار سے۔ کوئی جداگانہ پارٹی نہ تھی لہ

میں سمجھتا ہوں کہ گورمانی صاحب کی یہ رائے غلط ہے۔ یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی پارٹی تھی۔ جس کا وجود اسمبلی سے باہر موجود تھا گورمانی صاحب خود یونینسٹ پارٹی کی وزارت میں پارلیمنٹری پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ اُن سے بہتر اِس حقیقت سے کون واقف ہو گا۔ پھر تعجب ہے۔ انھوں نے یہ کیونکر کہہ دیا۔ کہ یونینسٹ پارٹی محض ایک پارلیمنٹری گروپ تھا۔ اور اسمبلی سے باہر اُس کا وجود نہیں تھا۔

ممکن ہے بعض لوگ سوال کریں۔ کہ سکندر جناح پیکٹ کے متعلق پنجاب کے عام ہندوؤں کے تاثرات کیا تھے۔ عام ہندوؤں سے مراد اگر غیر کانگرسی ہندو ہیں تو اُن کا بیشتر حصّہ ہندو سبھا سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے ترجمان پروفیسر گلشن رائے تھے۔ پروفیسر گلشن رائے۔ ۱۹۲۲ء سے سر فضل حسین کی پالیسی کے سب سے

لہ روزنامہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۵۸ء

بڑے نکتہ چیں اور معترض چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ تحریر و تقریر سے۔ فضل حسین کی پالیسی کو ہدفِ طعن بنائے رکھا تھا۔ ہندوؤں کا یہی طبقہ تھا جس نے چودھری چھوٹو رام کو۔ اس شرط پر وزارت کی پیش کش کی تھی۔ کہ وہ فضل حسین کا ساتھ چھوڑ کر۔ ہندو سبھا میں شامل ہو جائیں۔

پروفیسر گلشن رائے کے نزدیک یونینسٹ پارٹی سراسر مسلمانوں کے مفاد کی خاطر قائم کی گئی تھی۔ اور اس پارٹی کا غیر فرقہ وارانہ بہروپ۔ صرف ہندوؤں کو فریب دینے کی ایک چال تھی۔ لیکن عجیب بات ہے۔ کہ جونہی سکندر جناح پیکٹ مرتب ہوا۔ پروفیسر گلشن رائے نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ اب یونینسٹ پارٹی کی غیر فرقہ وارانہ روح سلب ہو گئی ہے۔ اور آئندہ پنجاب پر مسلم لیگ ایسی فرقہ پرست جماعت کی حکومت ہو جائے گی۔ اس موضوع پر۔ اُن کا ایک مضمون۔ جو ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سول ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں۔ پنڈت جواہر لال نہرو لاہور تشریف لائے۔ اور جاوید منزل میں علامہ اقبال سے بھی ملے۔ پنڈت نہرو کی تشریف آوری کی وجہ بڑی دلچسپ تھی۔ ۷ر مئی ۱۹۳۷ء کو۔ سول ملٹری گزٹ میں۔ میاں احمد یار خان دولتانہ کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ کانگرس ہائی کمان نے۔ پنجاب کے مسلمانوں میں کانگرس کا پراپاگنڈہ کرنے کے لئے۔ ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور عنقریب مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائیں گے۔ تاکہ مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر ایٹ لاء کے

مشورے سے۔ اِس پراپاگنڈہ کا خاکہ تیار کیا جائے۔ یہ روپیہ ڈاکٹر محمد عالم کی تحویل میں رہے گا۔ جس سے وہ اردو کا ایک روزنامہ اخبار جاری کریں گے۔ اور بہت سے تنخواہ دار آدمیوں کو پراپاگنڈے کے لئے ملازم بھی رکھیں گے۔

ڈاکٹر عالم اپنی شہرت اور نیک نامی کے بارے میں بلا وجہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ مضمون پڑھنے کے بعد سول ملٹری گزٹ کے انگریز ایڈیٹر اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کے خلاف۔ ازالہ حیثیت عرفی کا استغاثہ دائر کر دیا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کو بطور گواہ طلب کیا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اِس مقدمہ میں شہادت دینے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اور میاں افتخار الدین کے دولت کدے پر فروکش ہوئے۔

علامہ اقبال نے انھیں پیغام بھیجا۔ کہ مجھ سے ملتے جائیے گا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اِس پیغام کی تعمیل میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اِس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:

"۔۔۔۔ اپنے انتقال سے چند مہینے قبل جبکہ وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ انہوں نے مجھے یاد فرمایا۔ اور میں نہایت خوشی سے۔ اِس ارشاد کی تعمیل میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود۔ ہمارے درمیان کس قدر باہمی اشتراک موجود تھا۔ اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اِس شخص کے ساتھ کام کرنا۔ کتنا آسان اور سہل ہے۔ وہ اُس وقت پرانی یادیں تازہ

کر رہے تھے۔ اور گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی۔ جس میں میں نے خود بہت کم حصہ لیا۔ بلکہ زیادہ تر، اُنہی کی باتیں سنتا رہا میں اُن کی شاعری کا مدّاح ہوں۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے۔ اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں"۔ لہ

پنڈت نہرو کے ساتھ۔ میاں افتخار الدین بھی تھے۔ اور باتیں واقعی مختلف موضوعات پر ہوتی رہیں۔ پنڈت نہرو۔ اُس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پراپاگنڈا کرنے میں مصروف تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے۔ اور دونوں مرتبہ اپنے خطبات صدارت میں اُنہوں نے کہا تھا۔ کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں میں۔ کوئی شخص بھی اِس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل۔ راج گوپال اچاری اور ستنیہ مورتی نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اِس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔

دورانِ ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا۔ کہ "سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟"

پنڈت جی نے جواب دیا کہ "نصف درجن کے قریب"۔

لہ 'THE DISCOVERY OF INDIA'
By Jawahar Lal Nehru (Page 298)

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تعجب ہے۔ خود آپ کی جماعت میں۔ آپکے ہم خیالوں کی تعداد۔ صرف نصف درجن ہے۔ اِدھر آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں۔ کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہو جانے کا مشورہ دوں۔ تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں"۔

اِس پر پنڈت جی خاموش ہو گئے۔

پھر جب ہندو مسلم کشیدگی کا ذکر چھڑا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مغربی ایشیا دراصل اسلامی ایشیا ہے۔ اور آئندہ سیاسیاتِ عالم میں۔ مغربی ایشیاؔ کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ اگر ہندوستان میں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ اور انھیں ناراض کر لیا۔ تو خود مغربی ایشیاؔ کے ساتھ اُن کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اِس لئے ہندوؤں کا فائدہ اِسی میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں۔ تاکہ مغربی ایشیاؔ کے ساتھ بھی اُن کے تعلقات اچھے رہیں۔

ابھی اِن دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی۔ کہ یکا یک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں۔ تو نتیجہ بہتر نکلے گا"۔

ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور انگریزی میں کہنے لگے "اچھا۔ تو چال یہ ہے۔ کہ آپ مجھے

بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو اُن کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔"

اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ اور کمرے میں تکدّر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا۔ کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے۔ اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سُود ہے۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے [1]

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب میں جہاں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ

"اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اقبال کا رُجحان سوشلزم کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اشتراکی روس نے جو زبردست ترقی کی ہے اُس نے اقبال کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعری میں بھی اب ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔"

اِس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مسلمانوں کے افلاس۔ اور اُن کی اقتصادی زبوں حالی

---

[1] اِس ملاقات کے وقت میرے دو دوست بھی وہاں موجود تھے ایک میاں فیروز الدین احمد مرحوم اور دوسرے راجہ حسن اختر۔ چند روز بعد دونوں نے مجھے ملاقات کی پوری روئداد سنائی تھی۔ تاہم میں نے بنظر احتیاط پچھلے دنوں راجہ حسن اختر کو لاہور خط لکھ کر اِس واقعہ کی تصدیق کی تو راجہ صاحب نے ایک ایک لفظ کی تائید فرمائی۔

کی وجہ سے ۔ڈاکٹر صاحب کو دولت کی اُس غیر مساویانہ تقسیم کی طرف توجّہ کرنی پڑی تھی ۔ جس نے قوم کے ایک بہت بڑے طبقے کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا رکھا تھا خواہ اِسے سوشلزم کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے دیجئے ۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب روز بروز اِس مسئلہ کی طرف زیادہ توجّہ کر رہے تھے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو بھی ۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ

" روٹی کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہمیّت اختیار کرتا جا رہا ہے اور مسلمان یہ محسوس کرنے لگا ہے ۔کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے تدریج نیچے گرتا چلا جا رہا ہے ۔مسلمان کے خیال میں ۔ اُس کا افلاس ہندو ساہوکار اور سرمایہ داروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ یہ پہلو ابھی اُس کی آنکھوں سے اُوجھل ہے ۔کہ اِس افلاس کی ایک بہت بڑی وجہ بدیشی حکومت بھی ہے ۔تاہم زُود یا بدیر ۔ اِس حقیقت کا احساس اُسے ہوکر رہے گا ۔ جہاں تک جواہر لال کے اُس سوشلزم کا تعلق ہے ۔ جس کی بنیاد دہریت پر ہے ۔مسلمان اُس طرف چنداں توجّہ نہیں کریں گے ۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر مسلمانوں کا افلاس دور کرنے کی اور تدبیر کیا ہوسکتی ہے ؟

یاد رکھیئے ! مسلم لیگ کے سارے مستقبل کا انحصار صرف اِس بات پر ہے ۔کہ لیگ اِس سوال کا کوئی تسلّی بخش حل تلاش کرے ۔ اگر لیگ ایسا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوئی ۔ تو مسلمان عوام حسبِ سابق ۔ لیگ سے بے تعلّق اور غافل رہیں گے "۔

واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے مسلمان زمینداروں نے ۔ جس طرح قومی تحریک سے بے اعتنائی اور بے رُخی برتی تھی ۔ اور اِس کے برعکس ۔ جس جرأت و سرفروشی سے پنجاب کے غریب مسلمانوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہا تھا ۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو مجبور کر دیا تھا ۔ کہ وہ اِس غریب ۔ پس ماندہ اور فاقہ کش طبقے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجّہ مبذول کریں ۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ۔ اُن دِنوں ایک اور جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا ۔ جسے جذبۂ سرفروشی کہنا چاہیئے ۔ ایک زمانہ یقیناً ایسا بھی گذرا تھا ۔ جب اقبال کی عافیت پسندی اور اعتدال مزاجی ضرب المثل بن گئی تھی ۔ اور انہوں نے ایک خط کے جواب میں ۔ اپنے ایک دوست کو بھی لکھ دیا تھا کہ :

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مِرا ہے سینہ خراش

اوّل تو وہ عرصۂ دراز تک ۔ سیاسیات سے کنارہ کش رہے ۔ اور جب سیاسیات میں آئے بھی تو حد درجہ اعتدال پسندی ۔ میانہ روی ۔ اور عافیت کیشی کے ساتھ لیکن اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں اقبال وہ پُرانا اقبال نہیں رہا تھا ۔ جو اِس خارزار میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا عادی تھا ۔ اب اقبال سِول نافرمانی میں شریک ہونے ۔ قید و بند کے شدائد برداشت کرنے ۔ اور سینے پر گولی کھانے کو آمادہ تھا ۔ یہ انقلاب کیونکر آیا ۔ اِس کے پیچھے بہت سے نفسیاتی اسباب کارفرما تھے ۔

مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے ۔ ڈاکٹر صاحب ۷ راکتوبر ۱۹۳۷ء کو

مسٹر جناح کو لکھتے ہیں۔

"مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے ..... ذاتی طور پر میں ایک ایسے مسئلے کی خاطر۔ جس کا تعلق اسلام اور ہندوستان کے ساتھ ہے جیل جانے کو تیار ہوں۔ مشرق کے دروازے پر۔ مغربی استعمار کے اِس اڈے کی تعمیر۔ اسلام اور ہندوستان۔ دونوں کے لئے خطرے کا باعث ہے" لہ

جب ۲۶ رجنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ کے فل بنچ نے۔ مسجد شہید گنج کی اپیل خارج کر دی۔ تو مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اور بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ اُسی شام غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ تو ڈاکٹر صاحب رو پڑے۔ اور کہنے لگے "مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ۔ اور اُس طرف لے چلو۔ جدھر مسلمان جا رہے ہیں۔ اگر گولی چلی۔ تو میں بھی اُن کے ساتھ مروں گا"

یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں کس حد تک بدل گئے تھے۔ شعر وہ اب بھی کہتے تھے۔ گریۂ بے اختیار اب بھی اُن پر طاری ہوتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جوں جوں بیماری اُن پر غالب آ رہی تھی۔ اُسی نسبت سے وہ سیاسیات میں انتہا پسند بنتے جا رہے تھے۔

لہ اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

۱۹۳۷ء کی سرگرمیوں میں۔ ڈاکٹر محمد اشرف، جو کانگرس کی تحریکِ مسلم رابطۂ عوام کے نگراں تھے۔ لاہور تشریف لائے تھے۔ اور علامہ اقبال سے بھی ملے تھے۔ میں نے پچھلے دنوں۔ انھیں خط لکھ کر۔ اس ملاقات کا حال دریافت کیا۔ تو انہوں نے مجھ کو جو جواب دیا۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

"کروڑی مل کالج
دہلی یونیورسٹی
دہلی
۲ر فروری ۱۹۵۸ء

میرے مشفق۔ میرے محترم۔ آپ نے خط کیا لکھا۔ جانے کب کب کی یاد تازہ کر دی۔ خدا کرے آپ مستقل طور سے لندن ہی میں رہیں۔ تاکہ علمی کام کر سکیں۔

یہ صحیح ہے۔ کہ مجھے علامہ مرحوم سے لاہور میں پہلی بار تفصیلی ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اور یہ ملاقات مجھے ساری زندگی یاد رہے گی۔ یہ زمانہ میری اور آپ کی جوانی کا تھا جسے لوگ اب "ایامِ جاہلیت" سے تعبیر کریں گے۔ میں صرف یہی نہیں کہ قوم پرست تھا۔ بلکہ آپ کو یاد ہوگا تقسیمِ وطن سے پہلے۔ ہم سب میں اُبال کی خود اعتمادی تھی۔ چنانچہ میں موقع بے موقع جسارت اور شوخی سے بھی کام لیتا تھا۔ علامہ مرحوم کی ملاقات کے موقع پر۔ میں نے لاہور وارد ہونے سے پہلے۔ اخبارات میں ایک بیان دے کر۔ ارکانِ مسلم لیگ سے ایک متحدہ سامراج دشمن

محاذ بنانے کی اپیل کی تھی۔ چنانچہ ملتے ہیں۔ علامہ مرحوم نے پہلے اِس بیان کا ذکر کیا۔ اور اِس کے بعد میرے خیالات کی تائید کی۔ مگر پھر کچھ افسردگی کے ساتھ فرمایا۔ کہ ہماری جماعت (یعنی مسلم لیگ) میں قوتِ عمل کی بڑی کمی ہے۔ میں نے حال ہی میں مسٹر جناح (اُس زمانے تک قائدِاعظم کا لقب رائج نہ ہوا تھا) کو اِس سلسلہ میں لکھا بھی ہے۔ کہ مسلمان جیسی فعال جماعت کو۔ آپ محض آئینی اور قانونی طور طریق سکھانا چاہتے ہیں۔ جس سے اِس کی قوّتِ عمل مفلوج ہو جائے گی"!

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب میں۔ جہاں اقبالؔ سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ

" اقبالؔ پاکستان کے اوّلین حامیوں میں تھے۔ حالانکہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اِس تجویز کی لغویت۔ اور اُن خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اِس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے۔ کہ اقبالؔ نے ایک ملاقات کے دوران میں، اُن سے کہا تھا۔ کہ انہوں نے پاکستان کی تجویز محض اِس لئے پیش کی تھی۔ کہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر تھے۔ لیکن اب اُن کا خیال ہے کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے۔ سخت نقصان رساں ہوگی۔ اقبالؔ نے غالباً بعد میں اپنا نقطۂ نگاہ بدل لیا تھا۔ یا ممکن ہے۔ انہوں نے ابتدا میں۔ اِس تجویز کے چند پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔

تھا۔ کیونکہ اُس وقت پاکستان کے تصور نے ابھی اتنی اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ حیاتِ انسانی کے متعلق اقبال کا جو نظریہ ہے وہ تقسیم ہند یا قیامِ پاکستان جیسی تجویز کے ساتھ قطعاً مطابقت نہیں رکھتا" لے

پنڈت نہرو کی یہ کتاب دنیا کے اکثر ممالک میں پڑھی گئی ہے۔ اور اُن کے مذکورہ بالا الفاظ نے بہت سے لوگوں کو۔ اس وہم میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں تقسیم ہند یا قیامِ پاکستان کی تجویز کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس لئے میں پنڈت نہرو کے اس دعوے پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ جو مغالطہ انہوں نے پھیلا دیا ہے اُس کا ازالہ ہو سکے۔

پنڈت نہرو کے اس دعوے کا دارومدار، کلیتہً ایڈورڈ ٹامسن کی روایت پر ہے۔ ایڈورڈ ٹامسن آکسفورڈ میں تاریخ ہند اور بنگلہ زبان کے پروفیسر تھے۔ انہیں ہندوستان سے خاص لگاؤ تھا۔ اور اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ مرتبہ وہ انگلستان کے مشہور اخبار مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار بن کر بھی ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ مہاتما گاندھی۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ جواہر لال نہرو۔ راج گوپال اچاری۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ سے اُن کے خاص مراسم تھے۔ اُن کا شمار اُن انگریزوں میں ہوتا تھا۔ جو کانگرس کے بہت بڑے معاون، ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر و تحریر میں ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت اور

لے THE DISCOVERY OF INDIA

کانگرس کی حمایت کی۔ ایڈورڈ ٹامسن کم بیش پچپن کتابوں کے مصنّف اور مؤلف ہیں۔ جن میں ادب۔ شعر تنقید۔ تاریخ۔ سیاست۔ فلسفہ سبھی کچھ ہے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں اُن کا انتقال ہوا تھا۔

جس روایت پر۔ پنڈت نہرو نے۔ اپنے دعوےٰ کا انحصار کیا ہے۔ اُس کا ذکر ایڈورڈ ٹامسن کی دو کتابوں میں موجود ہے۔ ایک کتاب جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی اُس میں وہ کہتے ہیں۔

"اِس بارے میں کچھ جھگڑا چلا آرہا ہے۔ کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے کس کو سوجھا تھا۔ عام طور پر مشہور شاعر سر محمد اقبال کا نام لیا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے پہلے پہل یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ اقبال میرے دوست تھے۔ اور انہوں نے اِس ضمن میں میرے تمام خدشات کو رفع کر دیا تھا۔ پہلے انہوں نے اِس بات پر تشویش کا اظہار کیا۔ کہ "میرے وسیع، غیر منظم اور نازک ملک میں طوائف الملوکی پیدا ہوتی نظر آتی ہے"۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ "ان کا خیال ہے کہ پاکستان ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔ اور آخر میں انہوں نے کہا: لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں۔ اس لئے میرا فرض ہے۔ کہ میں اِس تجویز کی حمایت کروں"۔ [لہ]

لہ ENLIST INDIA FOR FREEDOM (1940)

By Edward Thompson Page 58

ٹامسن کی اِس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اور اقبال کے درمیان زبانی گفتگو ہوئی تھی۔ جس میں اقبال نے اپنا درِدِل اُن کے سامنے بیان کیا تھا۔ لیکن انہوں نے۔ ایک اور جگہ اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے۔ واضح کر دیا ہے کہ اقبال نے انھیں اِس موضوع پر خط لکھا تھا۔ زبانی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اقبال بیک وقت ایک فلسفی، شاعر، عالمِ دین اور سیاست داں تھے۔ انہوں نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے۔ جبکہ انھیں معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ اِس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مجھ کو ایک خط میں۔ نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ "میرے وسیع، غیر منظّم اور خانہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے"۔ [1]

ایڈورڈ ٹامسن کی اِس روایت سے تین قابلِ غور نکتے پیدا ہوتے ہیں۔

اوّل: اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے۔ جبکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اِس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ محسوس کر لیا تھا۔ کہ ہندوستان میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔

دوم: بدیں وجہ۔ انہوں نے اِس خیال کا اظہار کیا۔ کہ پاکستان ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔

---

[1] "ETHICAL IDEALS IN INDIA TO-DAY" (1942)

سوم: آخر میں انہوں نے فرمایا "لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اِس تجویز کی حمایت کروں" [1]

ایڈورڈ ٹامسن کی اِس روایت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس وقت اقبال نے اُن کو خط لکھا تھا۔ اُس وقت اقبال مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور اگرچہ وہ پاکستان کو ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے لئے تباہی کا موجب خیال کرتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے اس لئے انہیں مجبوراً تجویز پاکستان کی حمایت کرنا پڑی۔ یُوں کہنا چاہیئے کہ اُس وقت مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان تھا۔ اور خود اقبال اِس نصب العین سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ لیکن از بسکہ انہیں لیگ کی کرسی صدارت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس لئے انہیں طوعاً وکرہاً اِس نصب العین کی حمایت کرنا پڑی۔

علامہ اقبال اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ مسلم لیگ کے صدر بنے تھے اور یہ واقعہ دسمبر ۱۹۳۰ء کا ہے۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد میں ہوا تھا۔ اُس وقت مسلم لیگ کا نصبُ العین پاکستان نہیں تھا۔ بلکہ ہندوستان میں حکومتِ خود اختیاری کا قیام تھا۔ جس میں مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق محفوظ ہوں۔ ظاہر ہے اُس وقت اقبال اپنی مرضی

[1] ایڈورڈ ٹامسن نے علامہ اقبال کے جو الفاظ اپنی کتاب میں درج کئے ہیں وہ یہ ہیں:

"But I am the president of The Moslem League and therefore it is my duty to support it"

کے خلاف یا اپنی طبیعت پر جبر کر کے ۔ نظریہ پاکستان کی حمایت کرنے پر قطعاً مجبور نہ تھے ۔

ساری دنیا کو معلوم ہے ۔ کہ الہ آباد کے اسی اجلاس میں ۔ پہلے پہل اقبال نے یہ خیال پیش کیا تھا ۔ کہ شمال مغربی ہندوستان کے اُن علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔ باہم ملا کر ۔ ایک جداگانہ مملکت بنا دیا جائے ۔ اُنکے الفاظ یہ ہیں ۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب ۔ صوبۂ سرحد ۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے ۔ خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے ۔ خواہ اسکے باہر ۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے ۔ کہ اور نہیں ۔ تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی" [1]

یہ تجویز سر اقبال کا ذاتی خیال تھا ۔ مسلم لیگ کی سرکاری پالیسی نہ تھی ۔ خود اقبال نے اپنے خطبے کے شروع میں ۔ صاف کہدیا تھا ۔ کہ "میں کسی جماعت کا رہنما نہیں نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں ۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست ، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل و متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی روح سے ، جیسا کہ مختلف زبانوں میں ۔ اُس کا اظہار ہوا ہے ادراک ہے ۔ میں نے

---

[1] خطبۂ صدارت ۔

اِس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔"

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ اُس سے ایڈورڈ ٹامسن کی اِس روایت کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ کہ اقبال کو صرف اِس لئے پاکستان کی حمایت کرنا پڑی کہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ لیکن اُس کے ساتھ ٹامسن یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اقبال نے اِن خیالات کا اظہار اُس وقت کیا تھا۔ جبکہ وہ بستر علالت پر دراز۔ اور دنیا سے رخصت ہونے کے قریب تھے۔

اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا۔ اگر ایڈورڈ ٹامسن کے الفاظ پر اعتبار کر لیا جائے۔ تو اقبال نے اپنی وفات سے سال ڈیڑھ سال پہلے ٹامسن کو وہ خط لکھا ہوگا۔ جس کا حوالہ انہوں نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ لیکن جب ہم اقبال کی اُن تحریروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو انہوں نے اپنی وفات سے صرف سال بھر پہلے سپردِ قلم کی تھیں۔ تو حیرت سے ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ اقبال اُس وقت اِس شدت اور اِس غیر مشتبہ انداز سے پاکستان کی حمایت اور تبلیغ کر رہے تھے۔ کہ اُس کی نظیر خود اُن کی زندگی میں۔ اِس سے قبل کہیں نہیں ملتی۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو اقبال مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"شریعتِ اسلام کا طویل اور عمیق مطالعہ کرنے کے بعد۔ میں اِس نتیجے پر پہونچا ہوں۔ کہ اگر اِس قانون کو۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر نافذ کیا جائے۔ تو کم از کم ہر شخص کو زندہ رہنے کا سامان

مزید میسر آسکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعت کا نفاذ اُس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک کہ یہاں ایک یا ایک سے زائد آزاد و خود مختار اسلامی مملکتیں قائم نہ ہو جائیں۔ میں کئی سال سے اس عقیدے کا حامی ہو گیا ہوں۔ اور اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے روٹی کا مسئلہ حل کرنے۔ اور ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ اگر یہ امر ناممکن ہے۔ تو پھر دوسری صورت سوائے اس کے۔ اور کوئی نہیں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی برپا ہو۔۔۔۔۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی نئے سرے سے تقسیم ہو۔ اور ایک یا ایک سے زیادہ مملکتیں قائم کی جائیں۔ جہاں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل ہو کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ اس چیز کا مطالبہ کرنے کا وقت آپہونچا ہے"۔[1]

ڈاکٹر صاحب نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو ایک اور خط مسٹر جناح کو لکھا جس میں پہلے اُنہوں نے ۱۹۳۵ء کے آئین کے نقائص بیان کئے۔ کیونکہ اس آئین کی رُو سے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی۔ مسلمانوں کو کلیتہً ہندوؤں کے رحم و کرم پر ڈال دیا گیا تھا۔ پھر اُنہوں نے کانگرس کے صدر کا شکوہ کیا۔ جس نے مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

اس کے بعد انہوں نے ہندو مہاسبھا کے اس اعلان کا ذکر فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم نہیں بنائی جا سکتی۔ اور آخر میں فرمایا:

"......... اندریں حالات یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو مذہبی۔ نسلی اور لسانی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ بہت سے برطانوی سیاست دان بھی اس چیز کو محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان میں لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ میری یہ تجویز ہی ہندوستان کے مصائب کا مداوا بن سکتی ہے۔ لیکن اُن کے خیال میں اس تجویز پر عملدرآمد کرنے کے لئے۔ پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔

" پنجاب کے بعض مسلمان ابھی سے یہ سوچ رہے ہیں۔ کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک جُداگانہ کانفرنس منعقد ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ کہ ہماری قومی تنظیم ہنوز اس منزل پر نہیں پہونچی۔ اور غالباً ابھی موزوں وقت بھی نہیں آیا۔ کہ اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ہو سکے۔ تاہم میری رائے ہے کہ آپ اپنے خطبۂ صدارت میں اس طرف اشارہ ضرور

کر دیجئے۔ کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان بالآخر اس نوع کا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

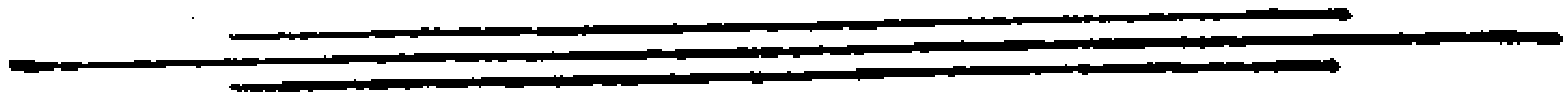
"میں سمجھتا ہوں کہ نیا آئین۔ جس کی رُو سے ہندوستان میں ایک متحدہ فیڈریشن قائم ہوگا۔ بالکل مایوس کن ہے۔ میں نے سطور بالا میں جو خاکہ پیش کیا ہے۔ اُس کے مطابق جب تک اسلامی اکثریت کے صوبوں کا ایک الگ فیڈریشن نہ قائم کیا جائے گا۔ ہندوستان میں امن برقرار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلّط سے نجات ملے گی۔ کیا وجہ ہے۔ کہ شمال مغربی ہندوستان۔ اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تصوّر کر کے۔ اُنھیں حقِ خود ارادی نہ عطا کیا جائے۔ جیسا کہ اندرونِ ہند بیرونِ ہند کی دوسری قوموں کو یہ حق حاصل ہے۔

"ذاتی طور پر۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ بحالاتِ موجودہ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو چاہئیے۔ کہ وہ اقلّیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیں۔ اکثریت اور اقلّیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے باہمی مفاد کے لئے۔ یہ طرزِ عمل بہترین ثابت ہوگا۔"[1]

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

ڈاکٹر صاحب نے یہ خط۔ اپنی وفات سے صرف دس مہینے پہلے لکھا تھا ایسی دوٹوک۔ واضح اور غیر مشتبہ تحریر کے بعد۔ ایڈورڈ ٹامسن کا یہ بیان قطعاً قابلِ التفات قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کہ" اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے۔ جبکہ اُنھیں معلوم ہوگیا تھا۔ کہ وہ اِس دنیا سے رُخصت ہو رہے ہیں۔ مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی۔ اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ پاکستان ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ کیونکہ میں مسلم لیگ کا صدر ہوں۔ اور میرا فرض ہے۔ کہ اِس تجویز کی حمایت کروں"۔



چودھواں باب

مسجد شہید گنج کا قضیہ

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری دو برسوں میں مسلم لیگ کی سیاسیات کے علاوہ۔ مسجد شہید گنج کے قضیئے نے بھی خاصی اہمیت اختیار کر لی تھی اور یہ قضیہ آخر تک ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ لاہور کے ریلوے سٹیشن سے دہلی دروازے کی طرف جائیں۔ تو ٹکنیکل سکول کے عقب میں جہاں لنڈا بازار شروع ہوتا ہے۔ ایک بہت پرانی مسجد کھڑی تھی۔ جسے عام طور پر مسجد شہید گنج کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد شاہجہاں کے عہد میں۔ ایک شخص عبداللہ خاں نے تعمیر کی تھی۔ عبداللہ خاں دارا شکوہ کا خانساماں تھا۔ اور اپنے آقائے نامدار کی مہربانی سے کچھ عرصے کے لئے۔ لاہور کا کوتوال بھی بن گیا تھا۔ جب تک لاہور پر سکھوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اس مسجد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے تھے۔

پنجاب کے مغل صوبیدار نواب معین الدولہ نے۔ جب پنجاب سے

سکھوں کی شورش مٹانے کے لئے ۔ جنگ و جدال کا سلسلہ شروع کیا۔ تو مسجد کے متصل کوتوالی تھی ۔ جہاں مجرموں کو سزادی جاتی تھی ۔ تعزیر و تادیب کے اسی دور میں ۔ ایک شخص بھائی تارو سنگھ بھی اِس مقام پر مارا گیا ۔ بھائی تارو سنگھ سکھوں کی نگاہ میں ایک بڑی متقدس اور برگزیدہ ہستی تھی چنانچہ سکھوں نے اس جگہ کو مسجد شہید گنج کا نام دے دیا ۔ اور وہاں ایک سمادھ بھی تعمیر کر دی ۔ رنجیت سنگھ کے وروود سے پہلے ۔ جب سہ حاکمان لاہور کی حکومت قائم ہوئی ۔ تو سکھوں نے بھائی تارو سنگھ کی سمادھ کے قرب سے فائدہ اُٹھا کر ۔ اِس مسجد پر قبضہ کر لیا ۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ مسجد سکھوں کے قبضے میں چلی آرہی تھی ۔

مولوی نور احمد چشتی نے ۱۸۶۴ء میں ۔ اپنی کتاب ۔ تحقیقاتِ چشتی مکمل کی تھی ۔ اُن کے بیان کے مطابق ۱۸۶۴ء میں ۔ اِس مسجد پر گنڈا سنگھ اور گوردت سنگھ دو بھائی قابض تھے ۔ جو مسجد کی دو کانوں کا کرایہ بھی وصول کرتے تھے ۔ اور مسجد کے صحن اور دالان کو لنگر خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے

لہ گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ بھنگی مثل کے سکھ تھے انھوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۹ء تک پورے چونتیس سال لاہور کو اِس بے دردی سے لوٹا کہ اِس عظیم الشان شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ یہ تینوں لٹیرے تاریخ پنجاب میں سہ حاکمان لاہور کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔

اِس کے علاوہ مسجد کے صحن میں۔ لوہے کی ایک بہت بڑی کڑاہی. ہر وقت بھنگ سے لبالب بھری رہتی تھی۔ جہاں سکھ مسافر بیٹھ کر بھنگ پیتے تھے۔

جون ۱۹۳۵ء میں۔ یکایک پنجاب کے مختلف حقلوں سے سکھوں کے جتھے لاہور آنا شروع ہوئے۔ اور ساتھ ہی شہر میں یہ افواہ اُڑنے لگی۔ کہ سکھ مسجد شہید گنج کو مسمار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ افواہ پایۂ یقین کو پہونچ گئی تو مسلمان لیڈروں کے ایک وفد نے گورنر کی خدمت میں حاضر ہوکر۔ عرض کیا۔ کہ اِس مسجد کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اور جب تک کہ اِس تجویز پر باضابطہ عمل نہ ہو۔ حکومت کو چاہیے کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دے۔ تاکہ مسجد کا فوری انہدام رک جائے۔ سر ہربرٹ ایمرسن پنجاب کے گورنر تھے۔ انہوں نے بات کو ٹال دیا۔ اِس کے بعد مسلمانوں کے وفد نے۔ سکھ لیڈروں سے گفتگو کی۔ تو سکھوں نے کم از کم اِس بارے میں مسلمانوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ جب تک شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی۔ مسلمانوں کی اِس تجویز پر اچھی طرح غور نہیں کر لے گی۔ اُس وقت تک مسجد مسمار نہیں کی جائے گی۔

ابھی یہ گفت و شنید جاری تھی۔ کہ ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب میں سکھوں نے یکایک مسجد کو گرانا شروع کر دیا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی۔ کہ انہدام سے قبل۔ حکومت نے مسجد کے چاروں طرف مسلح فوج اور پولیس متعین کر دی تھی۔ تاکہ مسلمان سکھوں کے اِس فعل میں مداخلت نہ کر سکیں گویا مسجد کا انہدام فوج اور پولیس کی نگرانی میں ہوا۔ جب مسلمانوں نے

یہ نقشہ دیکھا۔ تو وہ بغیر کسی ضبط و نظم اور ترتیب کے۔ مسجد کی طرف جانے لگے فوج نے بار بار گولی چلائی۔ اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

اِس کے ساتھ ہی حکومت نے مولانا ظفر علی خاں۔ ملک لال دین قیصر میاں فیروز الدین احمد۔ ملک لال خاں۔ سید سرور شاہ گیلانی۔ سید حبیب سید محمد شاہ وغیرہ کو گرفتار کر کے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ اِس کے بعد۔ یہ تحریک ذمہ دار لیڈروں کے ہاتھ سے نکل کر۔ بعض من چلے نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی گئی حکومت نے مسلمان اخبارات پر سنسر شپ بھی عائد کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ واقعات کی صحیح اطلاع ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔

جن چند نوجوانوں کے ہاتھ میں۔ یہ تحریک چلی گئی تھی۔ انہوں نے شاہی مسجد کو اپنا صدر مقام قرار دے کر۔ سول نافرمانی شروع کر دی دو دو۔ چار۔ چار کی ٹولیوں میں۔ مسلمان رضا کار شاہی مسجد سے نکل کر۔ شہید گنج کی طرف بڑھتے تھے۔ تو پولیس انھیں گرفتار کر لیتی تھی۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل تک یہی صورتِ حال قائم رہی۔ اور سینکڑوں نہیں ہزاروں رضا کار جیلوں میں چلے گئے۔ اُس وقت پنجاب کی حکومت پر تین بڑے مسلمان قابض تھے۔ ایک ملک فیروز خان نون جو وزیر تعلیم تھے۔ دوسرے نواب مظفر خاں جو سر سکندر کی جگہ ریونیو ممبر بنا دیئے گئے تھے۔ اور تیسرے چودھری شہاب الدین جو مجلس قانون ساز کے صدر تھے۔ اگر ان تینوں میں سے کسی کے اندر بھی قومی حمیت و غیرت کی رمق ہوتی۔ تو وہ اِس حادثہ خونچکاں

سے متاثر ہو کر فوراً اپنے سرکاری منصب پر لات مار دیتا۔ لیکن یہ لوگ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود۔ گورنر کے قابلِ مذمت رویے میں برابر کے شریک رہے۔

اُس زمانے میں پنجاب کے مسلمانوں میں سب سے منظم، ذی اثر اور فعال جماعت مجلسِ احرارِ اسلام تھی۔ جب مسجد کے گرائے جانے پر صوبے کے طول و عرض میں اضطراب کی لہر اٹھی۔ تو خیال تھا۔ کہ احرار حسبِ معمول مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے لیکن خلافِ توقع انہوں نے بالکل چپ سادھ لی۔ اور جنبش تک نہ کی۔ بعد میں احرار لیڈروں نے اپنی اس پراسرار خاموشی کی مختلف توجیہیں کرنے کی کوشش کی کبھی کہا گیا۔ کہ میاں فضلِ حسین کے ایما سے مسجد گرائی گئی ہے۔ تاکہ احرار اس تحریک میں حصّہ لیں۔ تو انھیں گرفتار کر کے۔ جیل میں بند کر دیا جائے کبھی کہا گیا کہ مسجد کا انہدام قادیان کے اشارے سے ہوا ہے۔ تاکہ احرار کے قید دبند کا سامان آسانی سے بنایا جا سکے۔ غرضکہ تاویل و توجیہہ کی مختلف صورتیں پیش کی جاتی رہیں۔ جن پر عوام میں سے۔ مشکل ہی سے کسی کو یقین آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد شہید گنج کا انہدام مجلسِ احرار کے لئے پیامِ مرگ ثابت ہوا۔ اور اِس جماعت نے۔ اگرچہ جولائی ۱۹۳۵ء کے بعد سے اب تک۔ بیسیوں دفعہ سنبھلنے اور اپنا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ لیکن اِن کوششوں میں ایک مرتبہ بھی تو اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۲ر فروری ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح۔ اِس قضیے کا حل تلاش کرنے کے لئے لاہو تشریف لائے۔ اُن کی تشریف آوری کے پس منظر میں یہ بات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے پہلے سے اپنے اِس خیال کا اظہار کر دیا تھا۔

کہ جب تک لاہور کے مسلمان یہ جھگڑا چکانے کے لئے۔ اُنھیں خود دعوتِ نہیں کریں گے۔ اور اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے۔ کہ وہ مسٹر جناح کے فیصلے کے پابند رہیں گے۔ وہ لاہور نہیں جائیں گے۔ مشہور نو مسلم بیرسٹر خالد لطیف گابا۔ اُس زمانے میں مرکزی اسمبلی کے رُکن تھے۔ اُنہی کے توسّل سے لاہور کے مسلمان لیڈروں نے مسٹر جناح کو لاہور آنے کی دعوت ارسال کی تھی۔ مسٹر جناح، اس واقعہ سے قبل، ۱۹۲۹ء میں۔ علم الدین (جس نے راج پال کو قتل کیا تھا) کی اپیل کے سلسلے میں۔ ہائی کورٹ میں بحث کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے تھے۔ گویا اب وہ ۲ ۸ سال کے بعد لاہور آ رہے تھے۔

لاہور پہنچنے کے بعد۔ مسٹر جناح نے تحریک کے لیڈروں۔ اور صوبے کے گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر نے کہا۔ کہ اگر سول نافرمانی بند کر دی جائے۔ اور مسلمان مسجد کی بازیابی کے لئے آئینی طریق سے جدّ و جہد کریں۔ تو وہ تمام قیدی رہا کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ تحریک کے کارکن سول نافرمانی بند کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اور رات بھر میں۔ جیلوں سے تمام قیدی۔ اور دور دراز مقامات سے نظر بند لیڈر رہا ہو کر۔ لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔

ساتھ ہی ساتھ مسٹر جناح نے سکھ لیڈروں سے بھی ملاقاتیں شروع کیں۔ اور اُنھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جذبۂ مصالحت۔ اور ہم وطنی کا خیال کر کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی معقول سمجھوتہ کر لیں۔ مسٹر جناح نے اُنھیں سمجھایا۔ کہ ملکی مفاد کے پیشِ نظر۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نہ سکھوں کے لئے مفید ہے۔ اور نہ مسلمانوں کے لئے۔ چنانچہ سکھ لیڈروں نے، جو کسی

کی بات سُننا گوارا نہیں کرتے تھے مسٹر جناح کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور انہیں اپنے ہمراہ شہید گنج دکھانے کے لئے لے گئے۔ حالانکہ وہ کسی مسلمان کا شہید گنج کے پاس سے گذرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

مسٹر جناح نے کم و بیش دو ہفتے لاہور میں قیام کیا۔ ۵ مارچ ۱۹۳۶ء کو دیال سنگھ کالج کی یونین نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ کالج کا ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یونین کے صدر پروفیسر لاجپت رائے نے۔ مسٹر جناح کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ اُنھیں ہندوستان کے مشہور لیڈر گوکھلے سے تشبیہہ دی۔ اور کہا۔ کہ ہندوستان کی نجات کے لئے۔ مسٹر جناح جیسا راست باز اور دلیر ڈکٹیٹر درکار ہے۔ جواب میں۔ مسٹر جناح نے جو تقریر کی۔ اُس کا کچھ حصّہ یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"میں اِس کالج کی فضا کو اپنے لئے بالکل سازگار پاتا ہوں۔ یہ درس گاہ جیسا کہ فاضل مقرر نے ابھی کہا ہے، فرقہ پرستی کی بنیادوں پر قائم نہیں کی گئی۔ میرا ابتدا سے یہ عقیدہ ہے۔ کہ ہندوستان کی نجات۔ فرقہ پرستی کے ذریعے ہرگز نہیں ہوسکتی۔ میں ماضی میں بھی اِس عقیدے کا حامل رہا ہوں۔ اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے۔ اور آئندہ بھی اِسی عقیدے کا پیرو رہوں گا۔ آپ نے مسولینی اور ہٹلر جیسے ڈکٹیٹروں کا ذکر کرتے ہوئے۔ مجھے اِس ملک کا ڈکٹیٹر بننے کی دعوت دی ہے۔ بحالاتِ موجودہ۔ ہم ہندوستان میں ڈکٹیٹر شپ قائم نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ملک کا حقیقی ڈکٹیٹر وہی

شخص بن سکتا ہے ۔ جس کے پاس ایسی قوت ہو ۔ کہ وہ ہر خطاکار کو سزا دینے پر قادر ہو ۔ اور وطن کی خدمت کرنے والوں کو ۔ انعام و اکرام سے سرفراز کر سکے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوت ہم میں سے کسی شخص کے پاس بھی نہیں ۔

"اس ملک میں ۔ کسی بے اصول / خائن اور بد دیانت لیڈر کے لئے عوام کو اُلو بنا لینا ۔ اور اُن سے حسب منشاء کام لینا چنداں مشکل نہیں ۔ بشرطیکہ وہ اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے فن سے واقف ہو ۔ اس لئے ۔ جب تک ہم عوام کے معتدبہ حصے کی ذہنی اخلاقی اور سیاسی تربیت نہ کریں ۔ اور جب تک عوام کا تربیت یافتہ عنصر ۔ صحیح لیڈر کی پہچان سے بہرہ ور نہ ہو ۔ اور خود غرض رہنماؤں کو قیادت کی گدی سے علیحدہ کرنے کا شعور نہ رکھتا ہو ۔ اُس وقت تک ۔ ہم صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت قائم نہیں کر سکیں گے ۔ آپ نے گوکھلے کا ذکر بھی کیا ہے ۔ کاش اس ملک میں اُس عظیم الشان لیڈر کے پائے کے دو چار انسان اور ہوتے ....

ہندوستان میں ہر چیز کی افراط ہے ۔ خدا نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے ۔ لیکن انسان نے ۔ اس خطۂ ارضی کی نیک نیتی سے خدمت نہیں کی ۔ اب بھی اگر انسان ہندوستان کی بے لوث خدمت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ہمارا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے"[1]

---

[1] سول ملٹری گزٹ ۔ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۳۶ء

۲ مارچ کو باشندگانِ لاہور نے ۔ مسٹر جناح کو خوش آمدید کہنے۔
اور اُن کی مصالحانہ کوششوں پر اظہارِ مسرت کرنے کیلئے ٹاؤن
ہال میں ۔ ایک عظیم الشان جلسہ کیا ۔ جس کے صدر لاہور کے بشپ
تھے ۔ اس اجتماع کو دیکھ کر جس میں ہندو، سکھ اور مسیحی بڑھ چڑھ
کر مسٹر جناح کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے ۔ اس بات کا اندازہ
کرنا کچھ مشکل نہیں تھا ۔ کہ مسٹر جناح کس غیر معمولی شخصیت کے
مالک تھے ۔ ایسی حالت میں ۔ کہ شہید گنج کے حادثۂ فاجعہ کی
وجہ سے ۔ فرقہ وارانہ کشیدگی زوروں پر تھی ۔ اور دلوں پر
کدُورت کی تہہ جمی ہوئی تھی ۔ سکھوں کا مسٹر جناح کی مدح و
ستائش میں رطب اللسان ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی ۔۔
مقررین میں سردار سمپورن سنگھ ۔ سردار اُجل سنگھ ۔ پنڈت نانک
چند اور مسٹر کے ۔ ایل ۔ رلیا رام شامل تھے ۔

پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا تھا ۔ کہ " افسوس ہے ۔
کہ مسٹر جناح کانگرس سے علیحدہ ہو گئے ہیں ۔ اگر وہ کانگرس میں رہتے تو ملک
کی حالت یقیناً آج سے کہیں بہتر ہوتی " جواب میں مسٹر جناح نے تقریر کی ۔
تو پنڈت نانک چند کے اِن الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ۔

" ۔۔۔۔۔۔ جب میں پہلی مرتبہ کانگرس میں شامل ہوا تھا ۔ اس وقت
سے لے کر اب تک میرے خیال میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی ۔ ممکن ہے کہا
گیا ہے ۔ مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں ۔ لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں

کہ میں نے جو کچھ کیا۔ اُس میں فرقہ پرستی کی روح کارفرما نہ تھی۔ میرے پیشِ نظر صرف مادرِ وطن کی بہتری اور فلاح و بہبود تھی یقین جانیئے کہ آئندہ بھی ہندوستان ہی کی خدمت میرا مدعا و مقصود رہے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت۔ مجھ کو اِس معیّن اور واضح راستے سے۔ ایک اِنچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹا سکتی۔" [1]

مسٹر جناح ۷ مارچ کو واپس دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی سے پہلے انہوں نے شہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے۔ ایک کمیٹی بنا دی تھی۔ جس کے ارکان مندرجہ ذیل اصحاب تھے۔

علامہ اقبال۔ مولوی عبدالقادر قصوری۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء۔ راجہ نریندر ناتھ۔ پنڈت نانک چند بیرسٹر ایٹ لاء۔ سردار بوٹا سنگھ ایڈووکیٹ۔ سردار اُجّل سنگھ۔ سردار سمپورن سنگھ میاں احمد یار خاں دولتانہ (کنوینر)

رخصت ہوتے وقت۔ مسٹر جناح نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔

---

[1] سول ملٹری گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء دیال سنگھ کالج اور ٹاؤن ہال کی تقریروں کے اقتباس یہاں درج کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں مسٹر جناح کے سیاسی خیالات و عزائم کیا تھے اور وہ اپنے ملک کی خدمت کن خطوط پر کرنا چاہتے تھے صرف ڈیڑھ سال کے بعد یعنی ۱۹۳۷ء کے وسط میں کانگریس کی غلط اور تباہ کن پالیسی نے اِس کوہ پیکر شخصیت کو اِس قدر مایوس کر دیا کہ اُسے مجبوراً اپنی قوم کے حفظ و بقا کے لئے نئی راہ تلاش کرنا پڑی۔

اور فرقہ وارانہ مصالحت پر زور دیتے ہوئے۔ یہ بھی فرمایا۔ کہ

"۔۔۔۔ یہ جھگڑا دو افراد میں نہیں۔ بلکہ دو بڑے فرقوں کے درمیان ہے
اس لئے دونوں فرقوں کی آراء کی جانچ تول کرنے کے لئے وقت درکار
ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس دوران میں ہمیں اپنی مصالحانہ کوششوں
کو بدستور جاری رکھنا چاہیئے۔ تاکہ باہمی تصفیہ جلد از جلد ہو سکے
میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ اس غرض کے لئے مختلف قوموں
کے ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ جس کا نام
شہید گنج مصالحتی بورڈ ہو۔ اور اس بورڈ کے ذمے یہ کام ہو۔
کہ وہ افہام و تفہیم سے۔ تصفیہ کا کوئی قابل قبول حل تلاش
کرے۔ میری خدمات اس بورڈ کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔ اگر آئندہ
میرا یہاں آنا ضروری ہوا۔ تو میں سو کام چھوڑ کر لاہور پہنچ
جاؤں گا۔"

مسٹر جناح کی کوشش سے۔ پنجاب میں صلح و آشتی کی جو فضا پیدا ہو گئی
تھی۔ اس پر اطمینان کرتے ہوئے۔ لاہور کے اینگلو انڈین اخبار سول ملٹری گزٹ
کے انگریز ایڈیٹر کو بھی یہ لکھنا پڑا۔ کہ پنجاب کے مقامی مسلمان لیڈروں کی ناکامی
اور مسٹر جناح کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے۔ کہ مسٹر جناح کا بڑے سے بڑا
مخالف بھی۔ انہیں "ہمہ کا پرستی" کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ انھیں ہمیشہ "بائیں
بازو" (لفٹسٹ) کا لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے "بائیں بازو" کے سیاسی رجحانات
ہی کی وجہ سے۔ بیک وقت سکھوں اور مسلمانوں نے۔ ان کی بات کو سننا اور

ماننا منظور کرلیا ہے۔[1]

سول نافرمانی ہی کے زمانے میں۔ شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے اہتمام سے۔ لاہور کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر سیل کی عدالت میں۔ دعویٰ دائر کردیا گیا تھا۔ بنائے دعویٰ یہ تھی۔ کہ چونکہ شرع اسلام کی رُو سے مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور کوئی شخص اُس پر قابض ہو کر مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع نہیں کرسکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کو مسجد شہید گنج میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم اِس دعوے کی پیروی کر رہے تھے۔

مسٹر جناح کے قائم کئے ہوئے مصالحتی بورڈ کے دو ایک جلسے تو ضرور ہوئے۔ لیکن چونکہ عدالت میں دعویٰ چل رہا تھا اور لوگ بڑے شوق سے۔ اُس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اِس لئے بورڈ بھی۔ کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی ختم ہوگیا۔ ۲۵ رمئی ۱۹۳۶ء کو۔ مسٹر سیل نے مسلمانوں کا دعویٰ خارج کردیا۔ اور مسجد شہید گنج پر سکھوں کا قبضہ مخالفانہ تسلیم کرتے ہوئے۔ فیصلہ کیا۔ کہ عام جائداد غیر منقولہ کی طرح مسجد بھی۔ فریقِ ثانی کے مخالفانہ قبضے میں جاکر۔ اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔

علّامہ اقبال کے مشورے سے۔ اِس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ لیکن اپیل کی سماعت سے قبل ہی اکتوبر ۱۹۳۷ء میں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ چونکہ شہید گنج کا مسئلہ اب پورے ہندوستان

---

[1] سول ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۳۶ء

کے مسلمانوں کے لئے ۔ بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا ۔ اِس لئے مسلم لیگ کے اِس اجلاس میں بھی ۔ شہید گنج کے متعلق ایک نہایت جامع قرارداد منظور کی گئی اور مسٹر جناح نے ۔ یہاں تک فرمایا ۔ کہ اگر مستقبل قریب میں ۔ شہید گنج کا کوئی حسب خواہش فیصلہ نہ ہوا ۔ تو اِس قضیئے کا حل تلاش کرنے کے لئے ۔ مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا جائے گا ۔

۳۰ رنومبر ۱۹۳۷ء کو ۔ لاہور کی عدالت عالیہ کے فل بنچ کے سامنے جس میں چیف جسٹس ینگ ۔ جسٹس بھڈے اور جسٹس دین محمد شامل تھے ۔ شہید گنج کی اپیل پیش ہوئی ۔ اور کئی روز تک بحث جاری رہی ۔ ۸ ردسمبر ۱۹۳۷ء کو چیف جسٹس نے کہا ۔ کہ بحث کے دوران میں ۔ چند نئے تنقیح طلب امور سامنے آئے ہیں ۔ جن پر عدالت عالیہ فریقین کے مزید دلائل سننا چاہتی ہے ۔

وہ چند امور یہ تھے :

۱ :۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے ۔ کہ اِس دعوے پر قانون میعاد کا اطلاق ہوتا ہے تو کیا اُس تاریخ سے ۔ جب مسجد شہید گنج مسمار کی گئی تھی ۔ نئی میعاد کا آغاز ہونا چاہیئے ؟

۲ :۔ اگر مقولہ بالا شق تسلیم کی جائے ۔ تو کیا مسجد ۔ یا مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو یہ حق ہے کہ وہ مدعا علیہم کے نام عدالت سے ۔ اِس نوع کے حکم امتناعی کے اجراء کی درخواست کریں ۔ کہ مدعا علیہم مسجد کو دوبارہ تعمیر کریں

۳ :۔ اگر ایسا حق موجود ہے ۔ تو کیا عدالت اِس نوع کا حکم امتناعی جاری کرنے کی مجاز ہے ؟

۴:۔ کیا عدالت اِس نوع کا حکم امتناعی جاری کرے گی اور کیا اِس حکم امتناعی پر عملدرآمد ہو سکتا ہے؟۔

ملک برکت علی نے ۲۰ نومبر کے لئے کچھ مہلت طلب کی: تاکہ بیرونِ پنجاب سے کسی اچھے قانون دان کی مدد حاصل کی جا سکے۔ چیف جسٹس نے ملک صاحب سے کہا: "آپ نے اب تک نہایت فاضلانہ بحث کی ہے: تاہم اگر آپ کوئی اور وکیل بلانا چاہتے ہیں۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

اب سوال یہ تھا۔ کہ باہر سے کس کو بلایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ مسٹر جناح کو تکلیف دی جائے۔ کہ وہ لاہور تشریف لا کر بحث کریں۔ چنانچہ اُن کے ایما سے غلام رسول خاں نے ۱۹ ر دسمبر کو ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا۔

"ڈیر مسٹر جناح! شہید گنج کی اپیل۔ اب ایک نہایت اہم منزل پر پہونچ گئی ہے۔ ہائی کورٹ کے سامنے۔ بحث مکمل ہو چکی ہے۔ عدالت عالیہ نے۔ بحث سننے کے بعد۔ چند نئے تنقیح طلب امور مرتب کئے ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا مسجد کے انہدام سے۔ از سرِ نو میعاد شروع ہوتی ہے۔ اور کیا حکمِ امتناعی کے اجراء کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا۔ ایسے حکمِ امتناعی کا اجراء ہو جانا چاہیئے۔

لاہور کے مسلمانوں کی خواہش ہے۔ کہ اب کہ اُمید کی ایک کرن پھوٹتی نظر آتی ہے۔ آپ خود یہاں تشریف لائیں: تاکہ اِس عمارت کی آخری اینٹ۔ آپ کے مضبوط ہاتھوں سے رکھی جائے ہماری اور مسلمانانِ لاہور کی طرف سے۔ ملک برکت علی آپ سے

ملنے کے لئے بمبئی حاضر ہوں گے۔ اور تفصیل سے زبانی سب کچھ عرض کریں گے۔

آپ پہلے بھی۔ اُس وقت لاہور تشریف لائے تھے۔ جب تحریک شہید گنج ایک نہایت نازک مرحلے میں سے گذر رہی تھی۔ اور آپ ہی کی کوشش سے وہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا تھا۔ اب شہید گنج کی بازیابی کا دعوےٰ بھی۔ ایک بہت نازک مرحلے پر پہونچ گیا ہے یقین کیجئے کہ آپ کے یہاں تشریف لانے۔ اور نئے اور پرانے عدالت عالیہ کے روبرو، بحث کرنے سے۔ صرف پنجاب نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان آپ کے احسان مند ہوں گے۔ جو تاریخ آپ پسند فرمائیں گے۔ عدالت کو وہ تاریخ مقرر کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے عدالتِ عالیہ سے یہ درخواست کی تھی۔ کہ مزید بحث کے لئے۔ بیرونِ پنجاب سے کسی قانون دان کو بُلانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو آنریبل چیف جسٹس نے بخوشی اِس امر کی اجازت عطا کر دی تھی۔

میں یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ آپ کی تشریف آوری سے۔ ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک میں نئی جان پڑ جائے گی۔ اِس لئے مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ میری اِس نیاز مندانہ گذارش پر توجہ فرمائینگے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول "

میں یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ابتدا میں جب ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں۔ مسجد کا دعوے دائر کیا گیا تھا۔ تو ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم پیروی کرتے تھے۔ اسی دوران میں۔ ڈاکٹر محمد عالم نے تو مجلس اتحاد ملت کے ٹکٹ۔ اور مسجد شہید گنج کے نام پر۔ اپنی الیکشن بھی جیت لی تھی۔ لیکن جب وہ اسمبلی کے ایوان میں داخل ہوئے۔ تو تمام وعدے وعید فراموش کر کے۔ کانگرس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اُن کے اِس فعل سے۔ مسلمان سخت برافروختہ ہوئے۔ چنانچہ جب مسجد کی اپیل ہائی کورٹ میں پہنچی تو مدعیوں نے ڈاکٹر عالم سے مختار نامہ واپس لے لیا۔ اور اب تنہا ملک برکت علی پیش ہو رہے تھے۔

کرسمس کی تعطیل شروع ہوئی۔ تو ملک برکت علی بمبئی روانہ ہوئے تاکہ مسٹر جناح سے مل کر زبانی گفتگو کریں۔ اُن کے ارشاد کی تعمیل میں راقم التحریر بھی اُن کے ہمراہ بمبئی گیا۔ مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ وہ اِس سے قبل۔ فروری ۱۹۳۶ء میں۔ ایک ثالث بالخیر بن کر لاہور گئے تھے۔ تاکہ سکھوں اور مسلمانوں میں مصالحت کرا سکیں۔ اُن کی اِسی حیثیت کی وجہ سے۔ سکھوں اور ہندوؤں نے بھی۔ بڑی گرم جوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا تھا اب اُسی جھگڑے میں ایک فریق کا وکیل بن کر۔ لاہور جانا۔ اُن کے لئے مناسب نہیں۔

اِس کے بعد اُنہوں نے مشورہ دیا کہ بمبئی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر ایف۔ جے۔ کولٹ مین کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ تو بہتر ہوگا۔ مسٹر

کولٹ میں تعطیل کی وجہ ما تھران گئے ہوئے تھے۔ جو بمبئی سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر۔ ایک خوش گوار اور صحت افزا مقام ہے۔ اس لئے ہمیں اُن کے انتظار میں۔ چند روز ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ بمبئی آئے تو ہم نے اُن سے معاملہ طے کیا۔ اور واپس لاہور آ گئے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۸ء کو شہید گنج کی اپیل پر۔ عدالتِ عالیہ میں مزید بحث ہوئی۔ اور مسٹر کولٹ میں پیش ہوئے۔ ۲۶ر جنوری کو عدالتِ عالیہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اور اپیل خارج کردی۔ چیف جسٹس ینگ اور جسٹس بھڈے نے متفقہ فیصلہ کیا۔ کہ جہاں تک قبضۂ مخالفانہ کا تعلق ہے۔ مسجد کو عام جائداد غیر منقولہ سے الگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کا شہید گنج میں نماز پڑھنے کا حق مدت ہوئی ساقط ہو چکا ہے۔ جسٹس دین محمد نے اس رائے سے اختلاف کیا اور اپنا فیصلہ الگ لکھا۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے بعد۔ لاہور کے مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیل گیا اور جلوس پر جلوس نکلنے لگے۔ سر سکندر کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھر سول نافرمانی شروع نہ ہو جائے۔ اُن میں خود اتنی جرأت نہیں تھی۔ کہ وہ مسلمانوں کے لیڈر بن کر سامنے آتے۔ اور براہِ راست اپنی قوم سے خطاب کرتے۔ انہوں نے کوشش کی۔ کہ کسی طرح علامہ اقبالؔ سے۔ ایک اخباری بیان دلا دیا جائے۔ کہ ابھی پریوی کونسل کا مرحلہ باقی ہے۔ اسلئے مسلمانوں کو پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

اس غرض کے لئے۔ انہوں نے نواب ممدوٹ۔ نواب مظفر خاں اور

(غالباً) میاں امیرالدین کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ کہ تینوں اصحاب کہہ سنکر اِس قسم کا اخباری بیان جاری کرائیں۔ نواب ممدوٹ اور میاں امیرالدین ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہلے پہنچ گئے۔ ابھی وہ کھل کر اپنا مدعا و مقصد زبان پر نہیں لائے تھے۔ صرف تمہید باندھ رہے تھے کہ نواب مظفر خاں کی موٹر کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب انھیں دیکھکر فوراً اٹھے اور اپنی خوابگاہ میں تشریف لے گئے۔

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے اُس وقت سید نذیر نیازی بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اندر جاکر عرض کیا۔ کہ دو تین اصحاب باہر بیٹھے انتظار کررہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نواب مظفر خاں کا نام لے کر فرمایا۔ کہ "یہ شخص بیس سال کے بعد آج میرے مکان پر آیا ہے۔ مسجد اس نے خود گروانی ہے اور اب بیان دلوانا چاہتا ہے"۔ پھر فرمایا۔ کہ "جب تک یہ شخص بیٹھا ہے میں باہر نہیں جاؤں گا"۔

سید نذیر نیازی نے باہر آکر۔ چپکے سے نواب ممدوٹ کے کان میں یہ بات کہدی۔ اِس کے بعد یہ تینوں اصحاب رخصت ہوگئے۔ اور سر سکندر کی یہ تجویز۔ کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے مسلمانوں کا اضطراب رفع کرنیکی صورت پیدا کی جائے بروئے کار نہ آسکی۔

۳۰ر جنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ تاکہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے جو تشویشناک صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اُس پر غور کیا جائے۔ چودہری خلیق الزماں اور راجہ محمود آباد کی رائے تھی۔ کہ سر سکندر

کی وزارت کو بطور احتجاج مستعفی ہو جانا چاہئیے۔ لیکن میاں احمد یار خاں دولتانہ اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے۔ اِس تجویز کی مخالفت کی۔ اِن کا خیال تھا کہ استعفے سے "ڈیڈ لاک" پیدا نہیں ہو گا۔ بلکہ پنجاب اسمبلی کے دوسرے عناصر مل کر متبادل وزارت بنا لیں گے۔ تاہم لیگ کونسل نے اِس بات کا اعلان کیا۔ کہ مسجد شہید گنج کی بازیابی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن چکا ہے۔ اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاس خصوصی عنقریب اِس مسئلہ کا تصفیہ کرنے اور آئندہ کے طرزِ عمل پر غور کرنے کے لئے۔ منعقد کیا جائے گا۔ اِس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ یکم فروری کو ہندوستان بھر میں "یوم شہید گنج" منایا جائے۔ اور مسلمان جگہ جگہ جلسے کر کے مسلم لیگ کی اِس قرار داد کی تائید کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے۔ اِس بارے میں۔ کسی قدر مختلف تھی۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ یہ قانون جس کی رُو سے۔ خانۂ خدا کی تقدیس ضائع ہوتی ہے اور مسجد بھی قبضہ مخالفانہ میں جا کر۔ بارہ سال کے بعد اپنی حرمت کھو بیٹھتی ہے۔ بالکل غلط ہے۔ اِس قانون کو ختم کرنا چاہئیے۔ چنانچہ انہوں نے۔ ملک برکت علی سے کہا کہ وہ پنجاب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش کریں۔ تاکہ مساجد کی حفاظت و حیانت کا کلی بندوبست ہو سکے۔

ملک صاحب نے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت اور مشورے سے ذیل کا مسودۂ قانون مرتب کر کے۔ اسمبلی میں پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔

تحفظِ مساجد کا بِل:۔ "ہرگاہ کہ اِس قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ جن مساجد کو۔

شرعِ محمدیؐ کے تحت باضابطہ وقف قرار دیا جا چکا ہے۔ اُن پر شرعِ مذکور کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اِس ضمن میں۔ دعوٰے کیا گیا ہے۔ کہ بارہ سال کے قبضۂ مخالفانہ کے بعد۔ مساجد بھی اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ اور ہرگاہ کہ یہ ضروری ہے۔ کہ اِس نوع کے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے۔ اور قانون کی وضاحت کی جائے۔ لہٰذا اِس تحریک کے ذریعے سے۔ مندرجۂ ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے

(۱) اِس ایکٹ کا نام تحفظِ مساجدِ اسلامی پنجاب ایکٹ ۱۹۳۸ء ہوگا۔ [۱]

(۲) (ا: یہ ایکٹ صوبۂ پنجاب میں فوراً نافذ کیا جائے گا۔ اور اِس کا اثر راجع بہ ماضی ہوگا [۲]۔ جو تمام قسم کے مقدمات پر حاوی ہوگا۔ مثلاً دعاوی اپیلیں یا دوسری جملہ کارروائیاں۔ خواہ اُن کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یا ہنوز زیرِ تحقیقات ہیں۔

ب: اگر اِس ایکٹ کے وضع ہونے سے پہلے کسی مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور وہ فیصلہ۔ اِس ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو اُس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔ اور وہ فیصلہ اِس ایکٹ کی دفعات کو کسی طرح بھی ساقط یا کمزور نہیں کر سکے گا۔

(۳) قطع نظر اِس سے۔ کہ پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون یا ایکٹ میں کوئی بات اِس امر کے خلاف درج ہے۔ ایک اسلامی مسجد جسے

---

[۱] PUNJAB MUSLIM MOSQUES PROTECTION ACT 1938

[۲] RETROSPECTIVE

شرع محمدیؐ کے تحت. باقاعدہ وقف قرار دیا جا چکا ہے. اپنی حیثیت برقرار رکھے گی. خواہ اُس کا متولی، محافظ یا قابض کوئی شخص کیوں نہ ہو. اور اُس شخص مذکور کا قبضہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو. اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لئے اس مسجد پر، ہر حالت میں، صرف شرع محمدیؐ کا اطلاق ہوگا. بلا لحاظ اس سے. کہ ایسی عدالتی کارروائی ہیں. جہاں مسجد کی حیثیت زیر بحث ہے، فریقین کی نوعیت کیا ہے.

تشریح :- ایک اسلامی مسجد، جسے شرع محمدیؐ کے تحت وقف قرار دیا جائے، عام انسانی ضروریات کے استعمال سے الگ کر دی جاتی ہے. اور اُسے سراسر اور کلیتہً. خدائے ذوالجلال کی عبادت کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے. اُس پر لفظ جائداد. اُن معنوں میں استعمال نہیں ہوتا. جن معنوں میں یہ لفظ. قانون میعاد سندیا پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں مستعمل ہے. بجز اس کے کہ.

ا : حق شفع کی رو سے قانون رائج الوقت کے تحت جائداد حاصل کی جائے.

اور

ب : قانون فوجداری کی غرض کے لئے. جس میں تعزیرات سنا اور ضابطہ فوجداری. دونوں شامل ہیں.

اعراض و اسباب

اپیل اوّل. نمبر ۲۴۴ سال ۱۹۳۶ء بعنوان مسجد شہید گنج و دیگر بنام

شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی وغیرہ"۔ منفصلہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء میں۔ لاہور ہائی کورٹ کے فُل بنچ کی اکثریت نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ اگرچہ شرعِ محمدیؐ کے تحت۔ ایک مسجد، جسے خانۂ خدا کے طور پر وقف کیا جا چکا ہے۔ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے۔ اور اپنی حُرمت و تقدیس تا قیامت برقرار رکھتی ہے۔ خواہ اُس مسجد کا متولی کوئی شخص کیوں نہ ہو۔ اور اُس کا قبضہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ لیکن ازلبکہ قانونِ میعادِ سند بہ شمول پنجاب لاز ایکٹ نے۔ شرعِ محمدیؐ کے اِس حصّے کو۔ ترمیم و تبدیل کر دیا ہے۔ لہٰذا برٹش انڈین قانون، بجانبِ موجودہ کے تحت ایک مسجد بھی۔ بارہ سال کے قبضہ مخالفانہ کے بعد۔ اپنی مقدس حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ اور عام دنیاوی جائداد کی مانند۔ اُس شخص کی ملکیت بن جاتی ہے۔ جو بارہ سال سے اُس پر قابض چلا آ رہا ہے۔ اور وہ شخص۔ اُس مسجد کو۔ ہر غرض کے لئے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ خواہ وہ غرض انتہائی درجہ ناپاک کیوں نہ ہو۔

اگرچہ آنریبل مسٹر جسٹس دین محمّد نے۔ اِس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ اور اپنے فیصلے میں لکھا ہے۔ کہ قانونِ میعادِ سند۔ یا پنجاب لاز ایکٹ نے۔ اِس ضمن میں۔ شرعِ محمدیؐ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اور بدیں وجہ۔ جب مسجد کو۔ عام دنیاوی اغراض سے الگ کر کے۔ محض خدائے واحد کی عبادت کے لئے۔ وقف کر دیا جاتا ہے۔ تو قانون رائج الوقت کے تحت بھی۔ اُس کی حرمت و تقدیس ابدالآباد تک قائم رہتی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود۔ یہ ضروری خیال کیا گیا ہے۔ کہ قانون کو واضح اور مستحکم بنانے کی غرض سے۔ مجلسِ قانون

ساز۔ ایک ایسا توضیحی اعلان کرے۔ جس میں اِس اُمر کو۔ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالکل صاف کر دیا جائے۔ کہ جب مسجد کو شرعِ محمدیؐ کے تحت۔ باقاعدہ وقف قرار دیا جاتا ہے۔ تو وہ مسجد۔ شرعِ مذکور کے مطابق۔ اپنی مقدس حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھتی ہے۔ اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لئے، اُس مسجد پر، ہر حالت میں، صرف شرعِ محمدیؐ کا اِطلاق ہونا چاہئیے۔ بلا لحاظ اِس کے۔ کہ ایسی عدالتی کارروائی میں، جہاں مسجد کی حیثیت زیرِ بحث ہے، فریقین کی نوعیت کیا ہے۔ مزید براں۔ اِس امر کو بالکل واضح کر دینا چاہئیے۔ کہ مسجد پر عام معنوں میں لفظِ جائداد استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں۔ لفظِ جائداد کہیں استعمال ہوا ہے۔ تو مسجد پر وہ لفظ مستعمل نہیں ہوگا۔ ماسوا اِس کے کہ۔

ا۔ حقِ شفع کی رو سے۔ قانون رائج الوقت کے تحت۔ جائداد حاصل کی جائے۔ اور

ب۔ قانونِ فوجداری کی غرض کے لئے۔ جس میں تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری دونوں شامل ہیں۔ تاکہ مسجد کی حرمت و تقدیس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے۔

اِس مسودۂ قانون کو راجع بہ ماضی قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ اُمرِ تسمیع [illegible] اور حق بجانب اضطراب کو رفع کیا جائے۔ جو مسجد شہید گنج کے اِنہدام سے لے کر اب تک۔ بڑی شدت سے جاری ہے۔ اور جسے اگر دانش مندانہ تدبر۔ اور مجلسِ قانون ساز کے دلیرانہ اقدام سے۔ اِس وقت رفع نہ کیا گیا۔ تو نہ صرف

اِس صوبے۔ بلکہ پورے ہندوستان کے امن وامان کو۔ شدید صدمہ پہونچنے کا احتمال ہے۔ اور اندیشہ ہے۔ کہ اِس طرح۔ انجام کار۔ پوری مملکت ایک خطرناک اور غیر مختتم خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ جب اِس نوع کی صورت حال درپیش ہو۔ تو مجلسِ قانون ساز پر فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ آگے بڑھے۔ اور ایک ایسا قانون وضع کرکے۔ ملک کے امن وامان کو محفوظ کرے۔ جس کی رُو سے۔ ملکِ معظّم کی مسلمان رعایا کو۔ واضح ترین الفاظ میں مطمئن کیا جا سکے۔ کہ اِس ضمن میں اُس کے مذہبی عقائد و شعائر کی مکمل حفاظت کی گئی ہے۔ اور یہ کہ ۱۸۵۷ء میں۔ ملکہ وکٹوریہ آں جہانی نے۔ اِسی موضوع پر۔ جن واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں۔ اپنی مسلمان رعایا کو یقین دلایا تھا۔ اور جن الفاظ کا اعادہ۔ ملکۂ آں جہانی کے جانشین۔ تختِ شاہی سے بار بار کرتے رہے ہیں۔ اُن کو عملی جامہ پہنائے ہیں۔ کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا"[1]

فروری کے اوائل میں یہ بل مرتّب کر لیا گیا تھا۔ جس کا پورا خاکہ علّامہ اقبال نے تجویز کیا تھا۔ لیکن عبارت ملک برکت علی کی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں یہ خبر پہونچ چکی تھی۔ کہ اِس نوع کا بل ملک برکت علی تیار کر رہے ہیں۔ اُنہی دنوں۔ ایک روز ملک صاحب نے بل کا ٹائپ کیا ہوا۔ انگریزی مسوّدہ مجھے دیا۔ کہ اُس کا اردو میں ترجمہ کر دوں۔ ملک صاحب کا مکان۔ اور پنجاب مسلم لیگ کا دفتر۔ یعنی غلام رسول خاں کا مکان بالکل

---

[1] اصل مسودۂ قانون انگریزی میں تھا۔

آمنے سامنے تھے ۔ اس لئے ۔ جب میں شام کو دفتر کا کام ختم کرکے اُٹھا۔ تو میں نے انگریزی مسودہ ۔ اور اُس کا ترجمہ ۔ دونوں ملک صاحب کے دفتر میں جاکر اُن کی میز پر رکھ دیئے ۔ خود ملک صاحب اُس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے ۔

رات کو آٹھ نو بجے کے قریب ملک صاحب کا ملازم ۔ میرے مکان پر آیا کہ ترجمہ دے دیجئے ۔ میں نے کہا ۔ کہ انگریزی مسودہ اور ترجمہ دونوں ۔ ملک صاحب کے دفتر کی میز پر رکھ آیا ہوں ۔ وہ کہنے لگا ۔ کہ مجھے تو معلوم نہیں ۔ ملک صاحب نے ترجمہ کے لئے آپ کے پاس بھیجا ہے ۔ میں نے ٹیلیفون پر بات کی ۔ تو ملک صاحب نے جواب دیا ۔ کہ اُن کی میز پر کوئی کاغذ نہیں ہے میں اُسی وقت اُن کے ہاں پہونچا ۔ اور میز کے علاوہ دفتر کا ایک ایک کونہ تلاش کر مارا ۔ لیکن انگریزی مسودہ اور ترجمہ ۔ دونوں غائب تھے ۔ سخت حیرت ہوئی کہ دو ڈھائی گھنٹے کے عرصہ میں یہ چیز کہاں غائب ہو گئی ۔ غنیمت ہے ۔ کہ ملک صاحب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ موجود تھا ۔ اس لئے دوبارہ ٹائپ کرنے اور ترجمہ کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئی ۔

چند روز کے بعد ۔ معلوم ہوا ۔ کہ اصل ٹائپ کیا ہوا مسودہ ۔ اور میرا ترجمہ دونوں یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں پہونچ چکے ہیں یہ راز اب تک نہیں کھل سکا کہ وہ کون پُر اسرار شخص تھا ۔ جس نے دو گھنٹے کے اندر ملک صاحب کے دفتر کی میز پر سے کاغذ اُڑا کر یونینسٹ پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں پہونچا دیئے تھے ۔ واقعہ یہ ہے ۔ کہ اُس زمانے میں ۔ ملک

برکت علی۔ غلام رسول خاں اور علّامہ اقبال کے مکانوں کے اِردگرد یونینسٹ پارٹی کے بعض گماشتے چکّر کاٹتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال کا دولت کدہ تو مرجع خاص و عام تھا۔ اور وہاں کی فضا ہی ایسی تھی۔ کہ کوئی بات۔ ڈھکے چھپے انداز میں۔ نہیں ہو سکتی تھی۔ جو کچھ کہا جاتا۔ بیچ کھیت اور کھلے بندوں کہا جاتا تھا۔ لیکن ملک برکت علی۔ اور غلام رسول خاں کے ہاں بھی۔ کسی قسم کی احتیاط نہیں برتی جاتی تھی۔ ہر قسم کے لوگ آتے۔ اور ہر نوع کی گفتگو ہوتی تھی۔

ملک صاحب نے۔ پنجاب اسمبلی میں تحفّظِ مساجد کا بِل پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔ خانۂ خدا کی بے حُرمتی ایسی چیز تھی۔ جس پر کوئی مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے بہت سے مسلمان ممبر۔ اِس بل کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ سرسکندر ایک مخمصے میں گرفتار تھے۔ اگر بل ایوان میں پیش ہوا اور اُنہوں نے اُس کی مخالفت کی۔ تو خود اُنکی پارٹی کے مسلمان ممبر اُن سے کٹ جائیں گے۔ اور اگر اُنہوں نے بل کی تائید و حمایت کی۔ تو وزارتی پارٹی کے غیر مسلم ممبروں کے علیحدہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں۔ کہ سر سکندر کے کامیاب دَورِ حکومت میں صرف یہی ایک ایسا وقت آیا تھا جب اُن کی وزارت ڈانواں ڈول ہوتی نظر آتی تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل۔ چونکہ فیصلہ کر چکی تھی۔ کہ مسجد شہید گنج کے قضیئے کا حل تلاش کرنے کے لئے مسلم لیگ کا ایک اجلاسِ خصوصی منعقد کیا

جائے گا۔ اس لئے دو مارچ ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے ذیل کا خط علامہ اقبال کو لکھا۔

"ہیسٹنگز روڈ۔

نئی دہلی۔

ڈیئر سر محمد اقبال!

اطلاعاً عرض ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس ماہِ حال کی ۲۰ تاریخ کو۔ دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اُن اہم امور میں سے جن پر اس اجلاس میں غور کیا جائے گا ایک یہ بھی ہے۔ کہ لیگ کے خاص اجلاس کے لئے۔ مناسب مقام کا فیصلہ کیا جائے۔ اس لئے مجھے یہ معلوم کرنے کی بے حد خواہش ہے۔ کہ آیا آپ یہ پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ کہ خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہو۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا پراونشل مسلم لیگ۔ خاص اجلاس کے لئے۔ ضروری انتظامات کر سکے گی؟ بصورتِ اثبات۔ آپ مجھے ایک رسمی دعوت نامہ ارسال فرما دیں۔ تاکہ میں اُسے کونسل کے سامنے پیش کر سکوں۔ مجھے بنگال سے رسمی دعوت نامہ موصول ہو چکا ہے۔ اور اگر اجلاس دہلی میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جائے۔ تو اہلِ دہلی انتظام کرنے کو تیار ہیں۔ پنجاب کی صورتحال کے متعلق بھی مفصل اطلاع دیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ آپکا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام۔

"آپ کا مخلص

ایم۔اے۔ جناح"

مسٹر جناح کے اِس خط کے جواب میں - ڈاکٹر صاحب کے حسبِ ارشاد ذیل کا خط - غلام رسول خاں نے - ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو لکھا -

"ڈیئر مسٹر جناح

مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرف سے ذیل کا خط لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے -

آپ کا خط ڈاکٹر صاحب موصوف کو - ۴ مارچ ۱۹۳۶ء کو ملا - اُن کی صحت کی خرابی - ہم سب نیاز مندوں کے لئے - وجہ اضطراب بنی ہوئی ہے - اور وہ خود آپ کو خط لکھنے سے معذور ہیں - آپکے خط کے جواب میں - اُن کا ارشاد یہ ہے -

کُل پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک عام اجلاس - لاہور میں منعقد ہوا - جس میں صوبے کے تمام اضلاع کے نمائندے شامل ہوئے - اور پراونشل مسلم لیگ کے ارکان کی ایک بڑی تعداد نے اس میں حصہ لیا - آپ نے سر محمد اقبال کو جو خط لکھا تھا - وہ اِس اجلاس میں پڑھا گیا - اور اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی - لاہور ہی میں منعقد ہو - اور اس کے لئے - ایک رسمی دعوت نامہ بھیجدیا جائے - لہٰذا ہماری درخواست ہے - کہ شہید گنج کے متعلق - لیگ کا اجلاس خصوصی ایسٹر کی تعطیلات میں - لاہور میں منعقد کرنے کے لئے اِس خط ہی کو دعوت نامہ تصوّر کیا جائے

جہاں تک پنجاب کی صُورتِ حال کا تعلّق ہے۔ سر محمّد اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ

۱:۔ شہید گنج کے متعلق غالباً پریوی کونسل میں اپیل کیجائے گی۔ لیکن لوگوں کو۔ اِس سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ کیونکہ اِس وقت وہ یہ خیال کر رہے ہیں۔ کہ کسی برطانوی عدالت کی طرف رُجوع بے سُود ہے۔

۲:۔ ملک برکت علی نے تحفّظ مساجد کے متعلّق۔ پنجاب اسمبلی میں جو بِل پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے مسلمانوں میں۔ اُس پر کافی جوش پھیلا ہوا ہے۔ اِس وقت تک یونینیٹ پارٹی کے پچیس ۲۵ ارکان نے۔ سر سکندر کی ہدایات کے برعکس اخبارات میں اپنے اِس عزم کا اعلان کر دیا ہے۔ کہ وہ اِس بِل کی تائید کریں گے۔ اور اِس بِل کو اُنھوں نے اپنا بِل بنا لیا ہے۔ نیز صوبے کے تمام ووٹر۔ مناسب قرار دادیں منظور کر کے۔ اپنے اپنے نمائندوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اِس بِل کی پوری حمایت کی جائے۔ اِس لئے امید کیجاتی ہے کہ جب یہ بِل منظوری کی غرض سے اسمبلی میں پیش ہوگا تو تا لون کی صُورت اختیار کر لے گا۔

۳:۔ شہید گنج کی سول نا فرمانی کی تحریک۔ روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے۔ عوام پُرامن ہیں۔ اور بے تابی سے آل

انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ خصوصی کے اہم فیصلوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو پنجاب کے تقریباً تمام مسلم ادارے۔ لیگ کی رہنمائی میں سرگرمِ عمل نظر آئینگے۔

پنجاب پراونشل مسلم لیگ آپ کو یقین دلاتی ہے۔ کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ خصوصی کے لئے تمام ضروری انتظامات کرنے کی ذمّہ دار ہے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول خاں۔ آنریری سکریٹری

پنجاب پراونشل مسلم لیگ

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)"

اِس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ملک برکت علی کے بِل نے۔ پنجاب بھر میں جوش و خروش کی ایک لہر طاری کر دی تھی۔ اپنے اور بیگانے۔ دونوں بڑے اضطراب سے۔ نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن سر سکندر نے تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اُنہوں نے گورنر کو مشورہ دیا۔ کہ بِل کو اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ گورنر نے۔ اپنے اختیاراتِ خصوصی کو کام میں لا کر۔ اعلان کر دیا۔ کہ بِل اسمبلی میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو سر سکندر نے۔ پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں۔ اپنے اِس رویّے کی حمایت میں۔ ایک زبردست تقریر کی۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر۔ گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر۔ سر سکندر کے ہمنوا بن چکے

تھے۔ یہاں تک کہ۔ اِن تمام ممبروں نے۔ اسمبلی کی رکنیت سے استعفے لکھ کر۔
سر سکندر کے حوالے کر دیئے تھے۔ میں نے سر سکندر حیات کو۔ مختلف جلسوں
میں بولتے ہوئے سنا تھا۔ وہ اُردو اور انگریزی۔ دونوں زبانوں میں۔ بڑی
سلجھی ہوئی تقریر کرتے تھے۔ لیکن جس اعتماد و ثوق اور تیقن سے۔ وہ
۱۶ مارچ کو۔ اسمبلی کے ایوان میں تقریر کر رہے تھے۔ یہ رنگ میں نے اِس
سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اِکیاسی مسلمان ممبروں کے استعفے
اُن کی جیب میں تھے۔ دونوں مسلمان وزیر۔ یعنی میاں عبدالحئی اور ملک
خضر حیات ٹوانہ۔ اُن کے دست و بازو تھے۔ اور قطع نظر سیاسی عقائد کے۔
تمام ہندو اور سکھ ممبر اُن کی پشت پر تھے۔ اِس لئے اگر آج بھی اُن کی تقریر
میں اعتماد اور وثوق پیدا نہ ہوتا۔ تو پھر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

سر سکندر نے اپنی تقریر میں۔ ملک برکت علی کے بل پر سب سے
بڑا اعتراض یہ کیا۔ کہ اگر آج مسلمان اسمبلی میں خاص قانون بنوا کر
شہید گنج پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو کل کو ہندو بھی یہ مطالبہ کریں گے۔
کہ جن مندروں پر مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں قبضہ کر لیا تھا
وہ اُن سے واپس لے کر۔ ہندوؤں کے حوالے کئے جائیں۔ دوسرا اعتراض
یہ تھا کہ ہندوستان کے گیارہ میں سے۔ سات صوبوں میں مسلمانوں کی
اقلیت ہے۔ اگر پنجاب کے مسلمانوں نے۔ اپنے صوبے کی اقلیت سے اچھا
سلوک نہ کیا۔ تو سات صوبوں میں مسلمانوں کی حالت سخت خراب
ہو جائے گی۔ تیسرا اعتراض یہ تھا۔ کہ صوبے کی سب سے بڑی

عدالت جو فیصلہ کر چکی ہے۔ اُس فیصلے کو مجلسِ قانون ساز کے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔

سر سکندر نے۔ اپنی تقریر کے دوران میں۔ کئی دفعہ ملک برکت علی کی طرف دیکھ کر کہا "اگر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی اکثریت کو میرے اِس طرزِ عمل سے اختلاف ہے۔ تو میں اور میرے دونوں مسلمان وزیر ابھی مستعفی ہو جانے کو تیار رہیں..... میں اِس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے اور میرے دونوں مسلمان وزیروں کے مستعفی ہو جانے سے۔ شہید گنج مسلمانوں کو واپس مل سکتی ہے۔ تو ہم ابھی استعفٰے دینے کو تیار ہیں"۔

ملک برکت علی سب کچھ سُن رہے تھے۔ اور بار بار یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کی طرف دیکھتے تھے جنہوں نے ابھی چند روز ہوئے اخبارات میں اعلان کیا تھا کہ وہ تحفظِ مساجد بل کی حمایت میں جانیں لڑا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک برکت علی چاروں طرف سے نرغۂ اعدا میں گھر گئے تھے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سر سکندر کو مبارک باد کے تار بھیجے تھے۔ کانگرسی اور مہا سبھائی ہندو۔ اکالی اور غیر اکالی سکھ۔ نیشنلسٹ اور یونینسٹ مسلمان۔ سبھی سر سکندر کی حمایت میں آوازیں بلند کر رہے تھے۔

اگلے ہی روز۔ ملک برکت علی نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔

انھوں نے سر سکندر کے تینوں اعتراضات پر بحث کی۔ پہلے فرمایا۔ کہ اگر مغلوں نے اپنے دورِ حکومت میں۔ بعض مندروں پر قبضہ کرکے۔ اُن کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ تو اوّل تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُس زمانہ میں۔ قانونِ میعاد یا قبضہ مخالفانہ کی قسم کا کوئی قانون رائج نہیں تھا۔

دوم۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا مغل بادشاہوں نے وہ قبضہ اپنے شہنشاہانہ اختیارات کے ذریعے سے کیا تھا یا ہندوؤں نے خود بخود اپنی رضا سے اُن عبادت گاہوں کو مغل بادشاہوں کے حوالے کر دیا تھا

سوم۔ جب بادشاہتیں اور حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ تو کوئی حکومت اپنے پیش رو حکومت کے اعمال و افعال کا محاسبہ نہیں کیا کرتی۔ ہر حکومت یہ دیکھتی ہے کہ اُن املاک کا حق محفوظ ہونا چاہیئے۔ جو اس حکومت کے آغاز میں موجود تھیں۔ اِسی طرح آج ہندوستان کی برطانوی عدالتوں کو اِس سے قطعاً کوئی غرض نہیں۔ کہ اکبر و جہانگیر کے زمانے میں فلاں فلاں املاک کی کیا حیثیت تھی۔ اِن عدالتوں کو صرف اِس بات سے غرض ہے کہ وہ دیکھیں۔ کہ برطانوی حکومت کے قیام کے وقت کیا صورت حال تھی۔

ظاہر ہے۔ کہ مسجد شہید گنج جولائی ۱۹۳۵ء تک بحیثیت ایک مسجد کے موجود تھی۔ سکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں بھی بہت سی مسجدوں کو

مسمار کر دیا تھا۔ میں نے جو بل پیش کیا ہے۔ اُس کا تعلق اِن مسمار شُدہ مساجد کے ساتھ بالکل نہیں۔ ہاں وہ تمام مسجدیں۔ جن کا انہدام برطانوی حکومت کے زمانے میں ہوا۔ یا جو قانونِ میعادِ ہند کی رُو سے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر اغیار کے قبضے میں چلی گئیں۔ یقیناً میرے بل کے تحت آتی ہیں۔

اگر برطانوی حکومت کے زمانے میں۔ مسلمانوں نے کوئی مندر یا گوردوارا مسمار کر دیا تھا۔ یا کسی مندر یا گوردوارہ کو مسجد میں تبدیل کر لیا تھا۔ تو وہ مندر اور گوردوارہ، اِسی اصول کے تحت یقیناً ہندوؤں اور سکھوں کو واپس مل جانا چاہیئے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں فخر سے اِس بات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے برطانوی حکومت قائم ہوئی ہے۔ ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ جہاں مسلمانوں نے کسی مندر یا گوردوارے کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کی ہو۔ یا اُس مندر اور گوردوارے کو قبضۂ مخالفانہ کے تحت اپنی جائداد میں تبدیل کر لیا ہو۔

باقی رہا یہ اعتراض۔ کہ صوبے کی سب سے بڑی عدالت جو فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ اُس فیصلے کو مجلسِ قانون سازکے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔ سر سکندر حیات کو چاہیئے۔ کہ وہ قانون کے اسرار و رموز کا مطالعہ کریں۔ انھیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ کہ قانون سازی کا یہ ایک مسلمہ اصُول ہے۔ کہ کسی ایکٹ کو راجع بہ ماضی بنا کر

نہ صرف لوگوں کے حقوق و واجبات میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ بلکہ عدالتوں کے فیصلوں پر بھی خطِ تنسیخ کھینچا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ جیسے ملک میں بھی۔ جہاں دستور میں یہ شق درج ہے۔ کہ کوئی ریاست۔ کسی واقعہ کے بعد۔ اُس واقعہ کے متعلق قانون منظور نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ نے۔ ایک اپیل الموسوم بہ " کالڈر بنام بُل"[1] میں۔ فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ ریاست کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ کوئی ایکٹ منظور کر کے۔ عدالت کے فیصلے کو منسوخ کر دے۔ خواہ اِس طرح۔ اُس فریق کو، جس کے حق میں عدالت نے فیصلہ صادر کیا تھا، اپنے حق سے محروم کیوں نہ ہو جانا پڑے۔

جہاں تک برطانوی قانون کی تاریخ کا تعلق ہے۔ ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ کہ دار العوام نے قانون منظور کر کے۔ عدالتوں کے فیصلوں کو منسوخ کر دیا۔ مثال کے طور پر۔ میں صرف ایک واقعہ الموسوم بہ "کوئین بنام ملز"[2] کا حوالہ دیتا ہوں۔ اِس اپیل میں۔ انگلستان کی سب سے بڑی عدالت یعنی دار الامراء نے جو فیصلہ صادر کیا تھا۔ اُسے پارلیمنٹ نے ایک خاص ایکٹ کے ذریعہ سے۔ منسوخ کر دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا اقدام سراسر غیر معمولی حالات میں جائز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا۔ کہ راجع بہ ماضی قانون ہمیشہ اور ہر حال میں۔ غیر منصفانہ ہوتا ہے۔ غلط اور قانون سازی کے رموز سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ شہید گنج کا مسئلہ۔

---

1. CALDER Vs BULL

2. THE QUEEN Vs MILLS

یقیناً غیر معمولی نوعیت کا حادثہ ہے۔ اُس کا تصفیہ جبھی ہو سکے گا۔ کہ مجلس قانون ساز۔ ایک جرأت مندانہ اقدام کرے۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ مسجد شہید گنج کا قضیہ۔ اب آل انڈیا مسلم لیگ کے لئے۔ ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا تھا۔ سر سکندر نے ۱۶ ر مارچ ۱۹۳۸ء کو ثابت کر دیا تھا کہ بلا استثناء، یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلمان ممبر اُن کی پُشت پر تھے۔ اِدھر گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے۔ ۱۱ ر مارچ کو۔ اپنے اجلاس امرتسر میں۔ ایک قرارداد منظور کر کے۔ اعلان کر دیا تھا۔ کہ شہید گنج کے مسئلہ پر مسلمانوں سے کسی قسم کی مفاہمت یا مصالحت نہیں ہو سکتی۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ۔ ہمارے خلاف صادر ہو چکا تھا۔ اندریں حالات کامیابیِ مقصد براری کے تینوں راستے بند ہو جانے کے بعد۔ اب مسلم لیگ یہ سوچ رہی تھی۔ کہ اِس اُلجھن میں سے نکلنے کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

پندرھواں باب

خاتمہ

ملک برکت علی نے۔ جب سے مسجد شہید گنج کے مقدمہ کی پیروی شروع کی تھی پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو روز بروز فروغ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پھر جب انہوں نے۔ تحفظِ مساجد کا بل پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ تو پورے صوبے کے مسلمان عوام میں۔ ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبے میں۔ لوگ رضاکارانہ طور پر مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے لگ گئے تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر دفتر میں روزانہ بیسیوں آدمی آتے تھے۔ بعض اپنے شہر کی مقامی شاخ کے لئے مشورت طلب کرتے تھے۔ بعض لیگ کی پالیسی اور پراپیگنڈے کے طور طریق سمجھنا چاہتے تھے۔ اور بعض ہمیں اپنے ضلع کا دورہ کرنے کی دعوت دینے آتے تھے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ مسلم لیگ کی مالی حالت سخت خراب ہو جانے کی وجہ سے ہم نے بہت سا کام ترک کر رکھا تھا۔ اب کہ تحریک میں خود بخود

ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ ہم نے محسوس کیا۔ کہ اگر حالات کی ساعدت سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ تو یہ ساری بیداری رائیگاں جائے گی۔ لیکن دِقّت یہ تھی۔ کہ اِس کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جس قدر روپیہ درکار تھا۔ وہ ہمارے پاس نہیں تھا۔

ایک روز ملک برکت علی دفتر میں تشریف لائے۔ غلام رسول خاں۔ ملک زمان مہدی۔ خلیفہ شجاع الدین اور راقم التحریر بھی وہاں موجود تھے۔ ملک صاحب نے ایک ایسی عجیب و غریب خبر سنائی۔ کہ ہم سب حیرت سے اُن کا منہ دیکھنے لگے۔ کہنے لگے۔ کہ "مالی مشکلات نے ہمیں سخت پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے اِن پریشانیوں کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ نواب ممدوٹ (نواب شاہنواز خاں مرحوم) کو پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا صدر بنا دیا جائے۔

یہ تجویز۔ حقیقت سے اِس قدر بعید معلوم ہوتی ہے۔ کہ ہم نے اِس کو مذاق تصوّر کیا۔ لیکن جب ملک صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ کہ علامہ اقبال بھی اُن کی اِس تجویز کو منظور فرما چکے ہیں۔ تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا پڑا۔

میں نے اور غلام رسول خاں نے۔ اِس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ نواب ممدوٹ یونینسٹ پارٹی کے زبردست رُکن اور سر سکندر کے خاص الخاص آدمی تھے اُن کا مکان یونینسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر رہ چکا تھا۔ اور ۱۹۳۷ء کی الیکشن میں اُنہوں نے قصور اور فیروز پور میں۔ خود ملک برکت علی کو ناکام بنانے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ اُس وقت سے لے کر اب تک۔ اُن کے رویّے میں۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی عجیب بات یہ تھی کہ پچھلے کئی روز سے میں انھیں ملک برکت علی کے ہاں دیکھ

رہا تھا۔ اور اُن کی اِس آمدورفت کا راز خود میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب ملک صاحب نے یہ تجویز پیش کی۔ تو گویا آنکھوں کے آگے سے پردہ اٹھا۔

زمان مہدی خاں اور خلیفہ شجاع الدین۔ اِس بارے میں۔ غیر جانبدار تھے لیکن میں اور غلام رسول خاں اپنی بات پر اڑے رہے۔ کہ نواب صاحب کو کسی صورت میں لیگ کا صدر نہیں بنایا جائے گا۔ ملک برکت علی اپنی یگانہ روزگار قابلیت کے باوجود بعض باتوں میں بالکل سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ مثلاً مردم شناسی کا انہیں بہت کم ملکہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا۔ کہ ہماری مخالفت کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتی۔ تو کہنے لگے۔ کہ "علامہ اقبال کی رہنمائی۔ اور اُن کے گراں قدر مشوروں سے۔ ہم بدستور مستفید ہوتے رہیں گے۔ نواب صاحب کو تو صرف اِس لئے صدر بنایا جا رہا ہے۔ کہ لیگ کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں۔ یُوں بھی نواب صاحب کے خیالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ اگر وہ لیگ کے صدر بن گئے۔ تو اُن کی کوشش سے اسمبلی کے بہت سے یونینسٹ ممبر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے"۔

جب اُن کا اصرار بڑھا۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا۔ کہ وہ نواب صاحب کو یقین دلا چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص اُن کی مخالفت نہیں کرے گا۔ تو ہم نے بادلِ ناخواستہ۔ یہ تجویز قبول کر لی۔ لیکن ہمیں رہ رہ کر غیر شعوری طور پر یہ احساس ہو رہا تھا۔ کہ نواب ممدوٹ کی صدارت یقیناً کسی نہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ بننے والی ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں۔ اجلاسِ لکھنؤ کے موقع پر۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا

ایک نیا دستورِ اساسی منظور کیا گیا تھا۔ جس کی رو سے ہر پراونشل لیگ کے تحت۔ لیگ کی ضلع اور تحصیل وار شاخیں قائم کی جانی ضروری تھیں۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اعلان کیا تھا۔ کہ ہر صوبے کی لیگ کو چاہیئے۔ کہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء تک۔ اپنے الحاق کی باضابطہ درخواست۔ مرکزی لیگ کے دفتر میں ارسال کردے۔ چنانچہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کو۔ مسٹر جناح نے۔ علامہ اقبال کو ذیل کا گشتی مراسلہ ارسال کیا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ

کوچہ بلیماران۔ دہلی

۱۲ فروری ۱۹۳۸ء

جنابِ مکرم۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے گذشتہ سالانہ اجلاس میں۔ اس امر کا فیصلہ ہوا تھا۔ کہ آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اراکین۔ اور مندوبین کے تمام انتخابات نئے آئین کی دفعات کے مطابق ہوں اور ۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء تک اس کی اطلاع دفتر آل انڈیا مسلم لیگ میں پہنچ جائے۔

کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں۔ مذکورہ بالا میعاد کی توسیع ۳۱ مارچ تک کی گئی تھی۔

میرے خیال میں یہ امر بے حد ضروری ہے۔ کہ یہ تمام انتخابات جس قدر جلد ممکن ہو عمل میں آجانے چاہئیں۔ تاکہ صوبائی لیگیں۔ اس اجلاسِ خصوصی میں شامل ہو سکیں۔ جو آئینِ جدید کے مطابق

فی الفور ہونے والا ہے۔ اور جس میں مسئلہ شہید گنج کے متعلق آخری
طریقِ عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

لہٰذا میری تجویز ہے کہ ۱۵ر مارچ ۱۹۳۸ء سے قبل ہی۔ تمام صوبائی
لیگیں۔ اپنے الحاق کی درخواستیں ارسال کر دیں۔ جن میں صدر۔
سکریٹری اور تمام عہدیداروں کے نام بھی درج ہوں۔ نیز کونسل کے
منتخب شدہ اراکین کے ناموں کی فہرست ۱۵ر مارچ ۱۹۳۸ء۔ اور
مندوبین کی فہرست ۳۱ر مارچ تک پہونچ جانی چاہیئے۔

میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ کی پراونشل مسلم لیگ اِس معاملے کی
اہمیت کا احساس کرتے ہوئے۔ الحاق کی درخواست۔ اور نمائندگان
کے ناموں کی فہرست مقررہ وقت پر لیگ کے مرکزی دفتر کوچہ
بلیماراں دہلی کو بھیج دے گی۔ تاکہ لیگ کے آئندہ اجلاسِ خصوصی
میں جس میں نہایت اہم معاملات پر بحث و تمحیص ہوگی آپ کے صوبے
کی پوری پوری نمائندگی ہو سکے۔

براہِ مہربانی۔ اپنے صوبے کی منظّم شدہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگوں کی فہرستیں
مع اسمائے عہدیداران ارسال فرمایئے۔ نیز اُن اضلاع کے نام بھی تحریر
فرمائیں۔ جن میں ابھی تک لیگ کی شاخیں قائم نہیں ہو سکیں۔ اور
اِس امر کی اطلاع بھی بہم پہونچائیں۔ کہ ایسے اضلاع میں کب تک شاخیں
قائم ہو جانے کا امکان ہے۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح
صدر آل انڈیا مسلم لیگ"

ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق۔ غلام رسول خاں نے۔ اِس خط کا حسب ذیل جواب۔ ۱۷ر فروری ۱۹۳۸ء کو ارسال کیا۔

"ڈیئر مسٹر جناح

آپ کی گشتی چھٹی نمبر ۵۶۶۔ مورخہ ۱۲ر فروری ۱۹۳۸ء کے جواب میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھے یہ تحریر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

(۱) مذکورہ بالا گشتی چھٹی میں آپ نے جو ہدایات دی ہیں۔ انھیں عملی جامہ پہنانے کے لئے۔ مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

(۲) جہاں تک لیگ کے اجلاسِ خصوصی کا سوال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ اجلاس لیگ کے نئے آئین کے مطابق کر رہے ہیں مگر آپ کو۔ اِس امر کا پورا احساس ہوگا۔ کہ اِس خاص جلسے میں۔ جو مسئلہ زیرِ بحث آئے گا۔ وہ بے حد اہم ہے۔ اور تمام مسلمانانِ ہند پر بالعموم۔ اور مسلمانانِ پنجاب پر بالخصوص اثر انداز ہوگا۔

یہ امر اِس بات کا متقاضی ہے۔ کہ کھلے اجلاس میں۔ اہلِ بصیرت مسلمانوں کی بڑی سے بڑی اکثریت اِس پر بحث کرے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کی رُو سے۔ پنجاب سے ۲۶۰ سے زیادہ مسلمان۔ اِس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اور وہ بھی اِس صورت میں۔ کہ یہ تمام ممبر وہاں پہونچ جائیں۔ ہمیں اِس بات کا علم نہیں۔ کہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے احساسات

بھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کے احساسات کی طرح شدت سے مجروح ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر لیگ سول نافرمانی کا فیصلہ کرے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس فیصلہ کا انحصار اُن ہی لوگوں پر رکھا جائے جن پر اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا بوجھ ڈالا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ آئین جدید کی رُو سے یہ امر ممکن نہیں۔ اسلئے ہماری تجویز یہ ہے کہ خاص اجلاس پُرانے آئین ہی کے ماتحت ۳۱ر مارچ ۱۹۳۸ء سے پہلے منعقد کر لیا جائے۔ کیونکہ پُرانے آئین کی رُو سے۔ ہر مسلمان ایک روپیہ ادا کر کے۔ بحث میں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ۳۱ر مارچ بہت قریب ہے تو پھر ہماری یہ تجویز ہے۔ کہ آپ نئے آئین کے نفاذ کو۔ خاص اجلاس تک ملتوی کر دیں۔ اور یہ اجلاس ۳۱ر مارچ کے بعد۔ مناسب تاریخوں میں منعقد کر لیا جائے۔ اگر یہ دونوں تجویزیں آپ کو منظور نہ ہوں۔ تو پھر ہماری درخواست ہے کہ آپ خاص اجلاس کی بجائے، ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس منعقد کریں جس میں ہر بالغ مسلمان کو شامل ہونے کی اجازت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس بھی لیگ کے زیر اہتمام اور آپ ہی کے زیر صدارت منعقد ہوگی۔

آپکا مخلص : غلام رسول

آنریری سکرٹری۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ
(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)

مسٹر جناح کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ انہوں نے ۲ر مارچ ۱۹۳۸ء کو۔ ڈاکٹر صاحب کے نام۔ وہ خط ارسال کیا۔ جو گذشتہ باب میں درج کیا جا چکا ہے۔ اور جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا تھا۔ کہ آیا وہ۔ لیگ کے اجلاسِ خصوصی کا۔ لاہور میں منعقد ہونا پسند کریں گے یا نہیں۔ اور جس کے جواب میں۔ غلام رسول خاں نے۔ ڈاکٹر صاحب کے حسب ہدایت لکھا تھا۔ کہ اجلاسِ خصوصی یقیناً لاہور میں منعقد ہونا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال مدت سے۔ اس بات کے خواہش مند تھے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو۔ اُن کو یقین تھا۔ کہ پنجاب میں لیگ کی تحریک جبھی عوام کے دلوں میں گھر کر سکے گی۔ کہ مسلم لیگ کا ایک عظیم الشان اجلاس۔ لاہور میں منعقد کیا جائے۔ جہاں ہندوستان کے ہر صوبے سے بڑے بڑے مسلمان لیڈر آ کر شرکت کریں۔ عام لوگوں میں کسی سیاسی تحریک کو مقبول بنانے کے لئے۔ اس قسم کے جلسوں جلوسوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

ابھی اکتوبر ۱۹۳۷ء کے اجلاسِ لکھنؤ کی تیاریاں بھی شروع نہیں ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ۱۲ر جون ۱۹۳۷ء کو۔ مسٹر جناح کو لکھا تھا۔ کہ

"۔۔۔۔ میری رائے میں۔ یہ بہتر ہوگا۔ کہ لیگ کا سالانہ اجلاس۔ کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں کرنے کی بجائے۔ پنجاب میں منعقد کیا جائے۔ لاہور میں اگست کے مہینے کا موسم اچھا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں۔ وسط اکتوبر بہتر ہوگا۔ جبکہ یہاں موسم کافی خوشگوار

ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس تجویز کی اہمیت پر اچھی
طرح غور فرمائیں گے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا اثر روز بروز وسیع ہو رہا
ہے۔ اور اگر آپ نے لیگ کا آئندہ اجلاس۔ لاہور میں کیا۔ تو مسلمانان
پنجاب میں سیاسی بیداری پھیلنے کی پختہ توقع ہے" [1]

پونے دو مہینے کے بعد۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو۔ انہوں نے۔ اسی موضوع پر پھر مسٹر جناح کو تحریر فرمایا۔ کہ۔

"۔۔۔۔ لیگ کے مرکزی دفتر دہلی نے۔ مسٹر غلام رسول خاں کو اطلاع دی ہے۔ کہ مسلم لیگ کے آئندہ سالانہ اجلاس کی تاریخوں کا۔ ہنوز تعین نہیں ہوا۔ ان دنیں حالات۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہ یہ اجلاس غالباً اگست یا ستمبر میں منعقد نہیں ہو سکے میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں۔ کہ اکتوبر کے وسط یا آخر میں۔ لیگ کے اس اجلاس کا انعقاد لاہور میں کیجئے۔ اس وقت حالت یہ ہے۔ کہ پنجاب میں مسلم لیگ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ اور مجھے اس امر میں۔ قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ کہ اگر مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس۔ لاہور میں ہوا۔ تو یہ واقعہ۔ لیگ کی تاریخ میں۔ ایک انقلاب آفریں موڑ کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ اور اس طرح ہم عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔" [2]

---

[1]۔ [2] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

بالآخر جب ۱۹۳۷ء اکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ تو وہاں بھی یہ تحریک اٹھی۔ کہ آئندہ اجلاس لاہور میں ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بڑے اصرار سے مسٹر جناح کو لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔ مجھے امید ہے۔ کہ لاہور میں۔ لیگ کا اجلاس منعقد ہونے سے قبل۔ آپ کم از کم دو ہفتے پنجاب کا دورہ ضرور کریں گے"۔ [1]

۱۰ر نومبر ۱۹۳۷ء کو۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں کی شکایت کرتے ہوئے۔ بڑے افسوس سے مسٹر جناح کو تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"۔۔۔۔ یہ لوگ اب چاہتے ہیں۔ کہ لیگ کا آئندہ اجلاس فروری کے بجائے اپریل میں ہونا چاہیئے۔ وجہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے۔ کہ وہ پنجاب میں۔ اپنی زمینداره لیگ کے پاؤں مضبوط کرنے کے درپے ہیں"۔ [2]

یہ تمام باتیں ظاہر کر رہی ہیں۔ کہ ڈاکٹر صاحب شدت سے اِس امر کے خواہش مند تھے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس۔ جلد از جلد لاہور ہی میں ہو تاکہ لیگ کے زیرِ اہتمام۔ رابطۂ عوام کی تحریک پوری سرگرمی سے شروع کی جا سکے۔
اب کہ ۲ر مارچ ۱۹۳۸ء کو۔ مسٹر جناح نے۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ استغنا رکیا کہ آیا وہ لیگ کے سالانہ اجلاس کا انعقاد۔ لاہور میں پسند کریں گے۔ تو ڈاکٹر

---

[1] ۔ [2] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

صاحب نے۔ اِس تجویز کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور فوراً غلام رسول خاں سے جواب لکھوایا۔ کہ یہ اجلاس یقیناً ایسٹر کی تعطیلات کے موقع پر۔ لاہور میں منعقد ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کے اِس جواب کی روشنائی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی۔ کہ نواب ممدوٹ نے، جن کو ہم بدقسمتی سے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا صدر بنا چکے تھے، خفیہ خفیہ اور چپکے چپکے مسٹر جناح کو ذیل کا خط لکھا۔

"ڈیئر مسٹر جناح۔

غالباً آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ مجھے پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اور سر محمد اقبال کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ عہدہ قبول کر لیا ہے۔ ایک جلسے میں، جس میں میں موجود نہ تھا، یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے انعقاد کے لئے۔ لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے۔ میرا یہ فرض ہے۔ کہ میں آپ پر واضح کر دوں۔ کہ مسلم لیگ اور شہید گنج کی تحریک کے بہترین مفاد۔ اِس امر کے متقاضی ہیں کہ لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں نہ ہو۔

مسلم لیگ پنجاب میں۔ ابھی تک ابتدائی منازل میں ہے۔ اور بعض مخالف قوتیں۔ اُس کی روز افزوں ترقی۔ اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہیں۔ اگر لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ تو پنجاب کے مشتعل مسلمانوں

کی طرف سے۔ آپ پر بے حد دباؤ ڈالا جائے گا۔ اور آپ کو ایسا طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ جو غالباً آپ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہوگا۔ اور مجھے ڈر ہے۔ کہ یہ چیز کامیابی کے ساتھ لیگ کے خلاف استعمال کی جائے گی۔

علاوہ ازیں، سکھوں نے بھی۔ لاہور میں۔ اُنہی ایام میں۔ جب لیگ کا خاص اجلاس منعقد کرنے کا خیال ہے۔ ایک بہت بڑا دیوان منعقد کرنے کی تیاریاں۔ ابھی سے شروع کر دی ہیں۔ اور بجا طور پر۔ ایک فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اُمید۔ بلکہ یقین ہے۔ کہ آپ اِس نازک مرحلہ پر۔ اپنی زبردست قابلیت۔ اور بے مثال جرأت سے کام لے کر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے: تاکہ شہید گنج کے اہم مسئلہ پر۔ ایک پُرسکون فضا میں بحث و تمحیص ہو سکے۔ میں اِس خط کی ایک نقل آپ کے بمبئی کے پتہ پر بھی بھیج رہا ہوں۔

آپ کا مخلص

شاہنواز خان"

نواب ممدوٹ نے یہ خط سر سکندر حیات کے ایماء اور تحریک پر لکھا تھا۔ سر سکندر ہرگز اِس بات کے حامی نہ تھے۔ کہ مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو۔ اب قدرت نے خود بخود ایسے سامان مہیا کر دیئے تھے۔ کہ پروانشل مسلم لیگ کا صدر۔ سر سکندر کا ایک ساختہ و پرداختہ آدمی تھا۔ چنانچہ اب اُنھیں اِس بات کی قطعاً

کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے جاوید منزل کا طواف کریں۔ یا مطلب براری کے لئے۔ غلام رسول خاں اور ملک برکت علی کے مکانوں پر جا کر دستک دیں۔ اب تو پنجاب مسلم لیگ کا صدر۔ اُن کے چشم دابرو کے اشارے پر سب کچھ نثار کر دینے کو آمادہ تھا۔

نواب ممدوٹ نے اپنے اس خط کے شروع میں لکھا ہے۔ کہ "ایک جلسے میں۔ جس میں مَیں موجود نہ تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے لئے" لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے"۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ اُس زمانے میں لیگ کے تمام جلسوں کے ایجنڈے مَیں خود تیار کرتا تھا۔ اور پھر میرا ایجنڈا میاں نشل لیگ کے جنرل سکرٹری غلام رسول خاں کے دستخط سے جاری کیا جاتا تھا۔

جب ڈاکٹر صاحب نے۔ غلام رسول خاں کو جلسہ کرنے کا حکم دیا۔ تو میں نے ایجنڈا مرتب کیا تھا۔ اور اُس کی ایک نقل باقاعدہ نواب ممدوٹ کو بھی بھیجی گئی تھی۔ نواب صاحب نے یقیناً سر سکندر سے مشورہ کیا ہوگا۔ اور پھر باہمی طور پر یہ طے ہوا ہوگا۔ کہ وہ اس جلسہ میں شریک نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر نواب ممدوٹ اُس جلسہ میں تشریف لاتے۔ اور لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کی تجویز کے خلاف رائے دیتے۔ تو ایک شخص بھی اُن کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اُنھیں پہلے سے اِس کیفیت اور صورتِ حال کا علم تھا۔ اِسی لئے اُنہوں نے عمداً اور جان بُوجھ کر جلسہ میں شرکت سے گریز کیا۔

ہمیں نواب ممدوٹ کے اس خط کا ہرگز کوئی علم نہیں تھا۔ بلکہ ہم تو اس خیال سے مطمئن تھے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل۔ اپنے ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں۔ ہماری دعوت کو یقیناً قبول کرلے گی۔ اور پھر ہمیں لیگ کے اجلاس کی تیاریوں میں شب و روز منہمک ہو جانا پڑے گا۔ صرف یہی نہیں۔ ہم نے تو ۶ مارچ کے جلسے کے بعد چند سب کمیٹیاں بنا کر کام کی ابتدا بھی کر دی تھی۔

یہ کیفیت تھی۔ جب، نواب ممدوٹ کے خفیہ خط سے قطعاً بے خبر، ہم لوگ ۲۰ مارچ کے اجلاس میں شرکت کے لئے دہلی پہونچے۔ ۱۹ مارچ کی شام کو ملک برکت علی، غلام رسول خاں، ملک زمان مہدی اور راقم السطور مسٹر جناح سے ملے۔ تاکہ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں تفصیلات پر بحث ہو سکے۔ مسٹر جناح نے ہنس کر فرمایا۔ کہ "پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا صدر تو۔ لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کے خلاف ہے آپ کس منہ سے مجھ کو دعوت دیتے ہیں"!

یہ کہہ کر انہوں نے۔ نواب ممدوٹ کا خط ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس وقت ہماری جو کیفیت ہوئی۔ اس کا صرف تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ سب سے زیادہ صدمہ ملک برکت علی کو ہوا۔ جن کے غلط انتخاب کی وجہ سے۔ ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ بہرحال ۲۰ مارچ کو۔ لیگ کونسل نے فیصلہ کر دیا۔ کہ مسجد شہید گنج کے بارے میں مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی کلکتہ میں ہوگا۔ اس خبر سے علامہ اقبال کو سخت رنج ہوا۔

کیونکہ وہ مدت سے یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ کہ اجلاس لاہور میں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ اب اُس امید کے بر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

دہلی جانے سے قبل ۱۱ر مارچ ۱۹۳۸ء کو پنجاب مسلم لیگ کا ایک ضروری اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں ہوا تھا۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے نوّے ۹۰ ممبر منتخب کئے جائیں۔ صوبے کی کم وبیش ہر شاخ کے نمائندے جلسے میں موجود تھے۔ چنانچہ نہایت خوش اسلوبی سے نوّے ۹۰ آدمیوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونینسٹ پارٹی کے کسی آدمی نے اب تک مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے تھے۔ اور نہ اس پارٹی کا کوئی رکن اب تک کسی ضلع کی مسلم لیگ کا ممبر بنا تھا۔ اس لئے اِن نوّے آدمیوں میں ایک بھی یونینسٹ شامل نہیں تھا۔

اسی دوران میں۔ صوبے کی تمام شاخوں کو لکھ دیا گیا تھا۔ کہ وہ مسلم لیگ کے اجلاسِ خصوصی کے لئے مندوبین منتخب کر کے۔ اُن کی فہرستیں پراونشل لیگ کے دفتر میں جلد از جلد بھیج دیں۔ چنانچہ اس ہدایت پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ اور تمام اضلاعی شاخیں۔ اپنے اپنے ہاں مندوبین کے انتخاب میں مصروف ہو چکی تھیں۔

مجھے یہاں ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوسناک بات کا ذکر کرنا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جب تک اُس کا ذکر نہ کر لیا جائے۔ ماضی کی اِس داستان کو آگے بڑھانا۔ میرے لئے بالکل ناممکن ہے۔ جب سے پنجاب میں۔ سر سکندر حیات خاں کی وزارت قائم ہوئی تھی۔ نواب زادہ

لیاقت علی خاں کا ذاتی رُویّہ ہمارے متعلق بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اُن کی امداد و اعانت اور تائید و حمایت۔ کُلّیتہً سر سکندر کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ جہاں تک اُن سے ہو سکتا تھا۔ وہ ہر موقع پہ سر سکندر کی مدد اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ اِس دوران میں کئی بار ایسے مواقع پیش آئے۔ کہ ہم راستی پر تھے۔ اور سر سکندر کا رُویّہ غلط تھا۔ لیکن نواب زادہ صاحب مرحوم نے۔ ہمیشہ سر سکندر کا ساتھ دیا۔ ہم اِس چیز کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ اور بارہا ہم نے بیٹھ کر آپس میں مشورہ کیا تھا۔ کہ یہ تمام باتیں مسٹر جناح کے گوش گذار کر دینی چاہئیں۔ لیکن پھر اس خیال سے خاموش رہے۔ کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ سرِدست مسٹر جناح کے تفکّرات میں اضافہ نہ کیا جائے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کے خاندان کے تمام لوگ۔ اور جملہ اعزّہ و اقارب کرنال میں رہتے تھے۔ جنھیں آئے دن حکومت پنجاب کی امداد و اعانت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ سر سکندر بڑے زیرک اور ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے نواب زادہ مرحوم کے اِس کمزور پہلو کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ خود لیاقت علی خاں کے بڑے بھائی۔ نواب زادہ سجّاد علی خاں پنجاب اسمبلی کے ممبر اور یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ سر سکندر اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے درمیان سرِ تسلیم کا نامہ و پیام اُنہی کے توسّل سے ہوتا تھا۔ ہمیں ایک ایک بات کا علم تھا۔ لیکن مصلحت کی مجبوریوں نے ہماری زبان و قلم پہ پہرے بٹھا رکھے تھے۔

اِسی سلسلہ میں میں یہاں ایک ضروری واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں

جب علامہ اقبال کی مسلسل کوششوں کے باوجود سر سکندر اور اُن کی جماعت نے مسلم لیگ کے فرطاسِ رکنیت پر دستخط نہ کئے۔ تو ڈاکٹر صاحب بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اب یونینسٹ پارٹی سے کسی قسم کے اشتراک و تعاون کی توقع رکھنا خیالِ خام ہے۔ ادھر پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بالکل ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے یہ محسوس کر کے۔ کہ عوام کو حقیقت سے آگاہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ فروری ۱۹۳۸ء میں ذیل کا بیان غلام رسول خاں کو لکھوایا۔ اور حکم دیا۔ کہ اسے فوراً اخبارات کو بغرضِ اشاعت بھیج دیا جائے۔

علامہ اقبال کا بیان:-

"۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آنریبل سر سکندر حیات خاں نے یونینسٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں۔ یہ اعلان کیا تھا۔ کہ واپس پنجاب جانے کے بعد وہ اپنی جماعت کا ایک اجلاس منعقد کریں گے۔ اور اس میں اپنی جماعت کے اُن مسلمان ممبروں کو، جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں۔ لیگ کے دستور پر دستخط کرنے۔ اور اس کا رکن بننے کی تلقین کریں گے۔ یہ ارکان لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے ماتحت رہیں گے۔ اور اسمبلی کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیں گے اسمبلی کے اندر

مسلم لیگ پارٹی متصوّر ہوں گے۔ اور اِس مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی۔ کہ لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔

"نام نہاد سکندر جناح پیکٹ کا اہم حصّہ صرف یہی ہے۔ اور اِس پیکٹ کی باقی شقوں سے ہمیں فی الحال کوئی واسطہ نہیں۔

" جب مذکورہ بالا اعلان اخباروں میں شائع ہوا۔ تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ اب دُور ہو جانے گا۔ اور مسلمان ایک متّحدہ قوم بن جائیں گے۔ لہٰذا میں نے۔ مسٹر غلام رسول خاں سکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو ہدایت کی۔ کہ وہ سر سکندر کے پاس لیگ کی تو منے درخواست ہائے رکنیت بھیج دیں: تاکہ وہ اُن پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے دستخط کرالیں چنانچہ یہ درخواستیں اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں سر سکندر حیات خاں کے پاس بھیج دی گئی تھیں۔ لیکن ہمیں اِن کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اِس لئے یاددہانی کرائی گئی۔ مگر پھر بھی مُہرِ سکوت نہ ٹوٹی۔ اور تا حال سر سکندر نے۔ ایک درخواست بھی دستخط کرواکر۔ واپس نہیں بھیجی۔ مجھے ملک

برکت علی نے اطلاع دی ہے۔ کہ ۳۰ر جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں۔ یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اور وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رکن نے یہ بیان کیا۔ کہ رکنیت کی درخواستوں پر مسلم ارکان کے دستخط حاصل کر لئے گئے ہیں۔ اور دستخط کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے۔ کہ وہ سر سکندر جناح پیکٹ کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔

"اس مقام پر یہ امر اشد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اصل صورتِ حالات کو واضح کر دیا جائے۔ سر سکندر کا دعوٰے ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ جس کا اہم ترین حصّہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے اُن کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی تھی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس پیکٹ کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔ اور اس وجہ سے عوام میں یونینسٹ پارٹی کے رویے کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ پورے چار مہینے گذر چکے ہیں۔ مگر یہ ہیجان و اضطراب کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے۔ کہ مسلمان عوام کو صحیح صورتِ حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔

"میں اعلان کرتا ہوں۔ کہ معاہدۂ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں۔ تاکہ

مسلمانانِ پنجاب کو معلوم ہو جائے۔ کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور اب یہ توقع رکھنا۔ کہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان۔ اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے۔ ایک اُمیدِ موہوم ثابت ہو رہی ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ مسلم لیگ کا دروازہ ہر اُس مسلمان کے لیے کھُلا ہے۔ جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہے۔ اور میں نہایت خوشی سے اعلان کرتا ہوں۔ کہ اِس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلمان ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دیئے ہیں"۔ ؎[1]

یہ بیان بڑا زبردست اور معرکۃ الآرا تھا۔ جس کی زد براہِ راست مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی باہمی چپقلش پر پڑتی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے دو مختلف کشتیوں میں سوار ہونے کے بعد جو منافقت آمیز طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا۔ اِس بیان نے اِس کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی۔ اگر یہ بیان اُس وقت شائع ہو جاتا۔ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اُس کے نتائج کیا ہوتے۔ لیکن یہ بات تو پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ مسٹر جناح نے (چھ سال انتظار کرنے کے بعد) جو قدم ۱۹۴۴ء میں اُٹھایا تھا۔ وہی قدم اقبال نے پوری جرأت و ہمت سے ۱۹۳۸ء ہی میں اٹھا لیا تھا۔

؎[1] اصل بیان انگریزی میں تھا۔

غلام رسول خاں اور ملک برکت علی کی رائے تھی۔ کہ اشاعت سے پہلے اِس بیان کی ایک نقل مسٹر جناح کو بھی بھیج دینی چاہیئے۔ تاکہ انھیں معلوم ہو جائے۔ کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک نقل مسٹر جناح کو دہلی بھیج دی گئی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی وہیں تھے۔ انہوں نے مسٹر جناح کو مشورہ دیا۔ کہ سر سکندر حیات سے یوں بگاڑ پیدا کر لینا اچھا نہیں۔ چنانچہ مسٹر جناح کا جواب آ گیا۔ کہ سر دست یہ بیان شائع نہ کیا جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے۔ اپنے ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں۔ پانچ ممبروں کی ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس کے صدر نواب اسمٰعیل خاں۔ اور سکرٹیری نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ اِس سب کمیٹی کا کام یہ تھا۔ کہ الحاق کی اُن درخواستوں کا فیصلہ کرے۔ جو ہندوستان کے مختلف صوبوں کی مسلم لیگوں کی طرف سے۔ مرکزی دفتر میں موصول ہو رہی تھیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو۔ باضابطہ اپنے الحاق کی درخواست مرکزی دفتر میں ارسال کر دی تھی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ پنجاب کی طرف سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے۔ جو نوّے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اُن میں سر سکندر کی پارٹی کا ایک آدمی بھی شامل نہیں تھا۔ سر سکندر کو اِس واقعہ سے سخت تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ اگر یہ صورتِ حال قائم رہتی۔ تو گویا آل انڈیا مسلم لیگ سے۔ سر سکندر حیات اور اُن کے رفقاء۔ یک قلم خارج کر دیئے جاتے۔ یہ جو کچھ

ہوا تھا۔ بالکل لازمی اور طبعی تھا۔ اس میں بُغض و عناد کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ جب تک سر سکندر اور اُن کی جماعت کے لوگ مسلم لیگ کے ممبر بن جاتے۔ اُنھیں قاعدے اور قانون کی رُو سے لیگ کونسل کے لئے منتخب نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اِدھر آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی یہ حق حاصل نہیں تھا۔ کہ وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے نوّے آدمیوں کی فہرست کو مسترد کر کے۔ خود اپنی مرضی سے اور لوگوں کو نامزد کر دے۔ ہاں ایک طریقہ باقی تھا۔ اور وہ یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی دفتر پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا الحاق منظور کرنے سے انکار کر دے۔ اس صورت میں جبکہ پنجاب اپنی صوبائی لیگ کے وجود ہی سے محروم ہو جاتا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کو اختیار تھا۔ کہ وہ اپنی مرضی سے پنجاب کے نوّے آدمی کونسل کے لئے نامزد کر دے۔

اب سر سکندر اور اُن کے ساتھیوں نے بڑی شدّ و مد سے دوڑ دھوپ شروع کی۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست مسترد کرا دی جائے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں اُن کی اپنی نامزدگی کا دروازہ کھُل سکے۔

نواب ممدوٹ۔ میر مقبول محمود۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور سیّد افضال علی حسنی نے۔ دلی پہونچ کر ڈیرہ لگا دیا۔ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں سے صبح و شام ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آخر کار یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور جس مہم پر وہ نکلے تھے۔ اُسے فتح کر کے واپس آ گئے

لاہور میں کئی روز سے - یہ افواہ پھیل رہی تھی - کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست منظور نہیں ہوئی - یہ افواہ میں نے بھی سنی - غلام رسول خاں - ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدّین وغیرہ نے بھی سنی حتّٰی کہ ڈاکٹر صاحب تک بھی یہ افواہ پہنچ گئی - ہم حیران تھے - کہ اس افواہ کی بنیاد کیا ہے - جب اِدھر اُدھر سے پوچھ گچھ کی - تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر نے یہ بات مشہور کی ہے - سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لیگ کے الحاق یا عدمِ الحاق کی اطلاع - ہم سے بالا بالا - یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں کیونکر پہنچ سکتی ہے -

اُنہی دنوں - ایک روز میں اور غلام رسول خاں ریلوے روڈ پر ایک دوست کے ہاں شادی کی دعوت میں شریک ہوئے - کھانے سے فارغ ہو کر ابھی تمام مہمان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے - کہ ایک صاحب اُٹھ کر میرے پاس آئے - اور پوچھنے لگے - کہ "آپ پنجاب مسلم لیگ کے سکریٹری ہیں؟"

میں نے جواب دیا "نہیں - میں جائنٹ سکرٹری ہوں - سکرٹری وہ سامنے بیٹھے ہیں - غلام رسول خاں - فرمایئے - کیا کام ہے آپ کو؟"

وہ بولے - "میں نے سنا ہے کہ آپ کی لیگ کے الحاق کی درخواست نامنظور ہو گئی ہے"

میں نے عرض کیا کہ "اِس قسم کی افواہ بہت دنوں سے پھیل رہی ہے - لیکن ہمارے پاس تو ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی"

وہ کہنے لگے " آپ میری بات کو بالکل درست سمجھیے۔ میں نے خود میر مقبول محمود سے سنا ہے"۔

میں اُن کو لے کر غلام رسول خاں کے پاس چلا گیا۔ وہ کئی روز سے بھرے بیٹھے تھے۔ فوراً بول اٹھے" یونینیسٹ پارٹی کے لوگ جھوٹ بکتے ہیں۔ ہماری درخواست کا ابھی کوئی جواب نہیں آیا"!

میں نے غلام رسول خاں کو۔ ایک طرف لے جا کر کہا کہ" زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہیئے۔ یہ جو کئی روز سے مشہور ہو رہا ہے۔ اِس میں ضرور کچھ نہ کچھ صداقت ہے"۔

کہنے لگے" پھر میں کیا کروں۔ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا"!

اِسی شام۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری کی طرف سے ہمیں باضابطہ اطلاع موصول ہو گئی کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔

اُس اطلاع کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

" جنابِ عالی!

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی۔ اُس نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی درخواست پر غور کیا ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ سے آپ کی درخواست سے متعلقہ اقتباسات آپ کی خدمت

ہیں بھیج رہا ہوں۔ یہ رپورٹ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۳ اپریل ۱۹۳۸ء میں بمقام دہلی پیش ہو کر منظور ہو چکی ہے۔

آپ کا مخلص

لیاقت علی خاں۔

آنریری سکرٹری۔ آل انڈیا مسلم لیگ

موعودہ اقتباس

"مختلف صوبوں کی الحاق کی درخواستوں پر غور و خوض۔ اور فیصلہ کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے۔

پنجاب کے معاملہ میں کمیٹی کو افسوس ہے کہ وہ الحاق منظور کرنے سے معذور ہے۔ دیگر امور کے علاوہ کمیٹی کی رائے ہے۔ کہ وہ قواعد و ضوابط جن کے ماتحت اس لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے خلاف ہیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے وضع کردہ آئین کی دفعہ ۳۳ میں یہ لکھا گیا ہے۔ کہ لیگ پنجاب کی کسی دوسری مسلم ایسوسی ایشن کا الحاق اپنے ساتھ کر سکتی ہے۔ ہماری رائے میں یہ دفعہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کی روح کے منافی ہے۔ پرانے آئین میں۔ اس قسم کی دفعہ ضرور تھی۔ لیکن نئے آئین میں۔

اِس کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس وقت آل انڈیا مسلم لیگ بذاتِ خود ایک مکمل جماعت ہے۔ جو مسلمانوں کی تمام ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ کسی دوسرے مسلم ادارے کو اپنی شاخ کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتی درحقیقت ملک میں مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیئے۔ اور وہ جماعت مسلم لیگ ہے۔

دوسرے اہم اعتراضات دفعات ۵-۶-۷ سے متعلق ہیں۔ ان دفعات کی رُو سے۔ ہر وہ مسلمان (بشرطیکہ مقررہ فیس ادا کر دے اندر پراونشل کونسل یا پنجاب مسلم لیگ۔ اس کی درخواست منظور کرے) پراونشل مسلم لیگ کا ممبر بن سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں۔ اِن قواعد کی رُو سے۔ پراونشل مسلم لیگ کی رکنیت براہِ راست درخواست کرنے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ امر ہمارے نئے آئین کے بنیادی اصول کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کے ماتحت۔ ہر رُکن کے لئے۔ کسی ابتدائی لیگ کی رکنیت ضروری ہے۔ اور وہ پراونشل مسلم لیگ میں۔ صرف کسی ابتدائی یا ضلع لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہو سکتا ہے۔ فی الواقع پراونشل مسلم لیگ کی بلا واسطہ رکنیت کی اب اجازت نہیں ہے۔ اور ہماری رائے یہ ہے۔ کہ اِس قسم کے آئین و ضوابط کے ماتحت

معرضِ وجود میں آنے والی لیگ کا الحاق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بات آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین و ضوابط کے بالکل منافی ہے"۔ [1]

دستخط

لیاقت علی خاں

آنریری سکریٹری۔ آل انڈیا مسلم لیگ۔

یہ خط ۵ اپریل کو ہمارے دفتر میں پہونچا۔ اور غلام رسول خاں نے اُسی وقت علامہ اقبال۔ ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین وغیرہ کو اطلاع کر دی۔ ہمارا فوری ردِ عمل یہ تھا۔ کہ ہمیں بطور احتجاج مسلم لیگ سے مستعفی ہو جانا چاہیئے: تاکہ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ اپنی پسند کے آدمیوں کی مدد سے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی جیسی شاخ چاہیں قائم کر لیں۔ لیکن کچھ غور کرنے کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ یہ رویّہ قومی مصلحت کے خلاف ہے۔ اِس لئے جملہ نقائص کو رفع کر کے۔ الحاق کی نئی درخواست فی الفور دہلی بھیج دینی چاہیئے۔

جن نقائص کی بنا پر۔ ہماری درخواست مسترد کی گئی تھی۔ وہ محض اصطلاحی تھے۔ اگر نیّت بخیر ہوتی۔ تو ہمیں ہدایت کی جا سکتی تھی۔ کہ ان نقائص کو رفع کر کے۔ نئی درخواست بھیج دو۔ لیکن وہاں تو ارادہ ہی تھا

---

[1] اصل خط انگریزی میں تھا۔

کہ الحاق نہ ہونے پائے تاکہ سرسکندر حیات کے آدمیوں کو لیگ کونسل میں داخل کرنے کا راستہ صاف کیا جا سکے۔

ملک برکت علی نے۔ اِس واقعہ سے متاثر ہو کر ۲ را پریل کو ایک طویل خط مسٹر جناح کو لکھا۔ یہ خط ملک صاحب کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"ڈیئر مسٹر جناح۔

مسٹر غلام رسول خاں۔ بیرسٹرایٹ لا رنے۔ ابھی ابھی مجھے وہ خط دکھایا ہے۔ جو انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے موصول ہوا ہے۔ اِس خط میں اُس سب کمیٹی کی رپورٹ کے اقتباس بھی درج ہیں۔ جو الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اِن اقتباسات میں وہ وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ جن کی بناء پر مذکورہ سب کمیٹی نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا الحاق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

سب کمیٹی نے ہمارے دستور کی دو شقوں پر اعتراض کیا ہے اوّل یہ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کسی دوسری مسلم ایسوسی ایشن کا الحاق بھی اپنے ساتھ کر سکتی ہے۔ دوم یہ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی رکنیت براہِ راست بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ دونوں شقیں۔ چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور کے منافی قرار دی گئی ہیں۔ اِس لئے میری گذارش ہے کہ اُن ہم

نہایت آسانی سے ترمیم و تنسیخ کی جا سکتی ہے تاکہ ہمارا آئین جزواً و کلاً۔ اُن اصولوں پر مرتب ہو جائے۔ جن پر آل انڈیا مسلم لیگ کا دستور وضع کیا گیا ہے۔ مسٹر غلام رسول خاں نے بہت جلد پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں اعتراضات کو رفع کر کے نئی درخواست بھیج دی جائے۔

آپ کی خدمت میں یہ عریضہ لکھنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ میں نہایت ادب سے عرض کروں۔ کہ ان دو معمولی فروگذاشتوں کی آڑ لے کر۔ ہمارے الحاق کی درخواست کو مسترد کر دینا کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہماری صوبائی لیگ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک باقاعدہ اور ملحقہ شاخ ہے اور اس کا یہ الحاق کوئی نیا نہیں۔ بلکہ ۱۹۱۶ء سے چلا آ رہا ہے۔ ایسی پرانی شاخ کے لئے صرف یہی کافی تھا۔ کہ اسے مذکورہ بالا دو قابل اعتراض شقوں کو رفع کر دینے کی ہدایت کر دی جاتی نہ کہ محض ایک اصطلاحی عذر کی بنا پر الحاق ہی سے انکار کر دیا جاتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ کہ الحاق اس شرط پر منظور کر لیا جاتا۔ کہ ہم دونوں شقیں رفع کر کے۔ اپنے آئین کو درست کر دیں۔

ہمیں اور لیگ کے تمام کارکنوں کو سب سے زیادہ تکلیف

جس بات سے ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یونینیسٹ پارٹی کے لوگ کئی روز سے شور مچا رہے تھے۔ کہ ہماری لیگ کا الحاق نہیں ہوگا۔ آخر کار اُن کی بات درست نکلی۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ نے وہی کیا۔ جو یونینیسٹ پارٹی چاہتی تھی۔ ہم نہایت اخلاص اور وفاداری کے ساتھ۔ گذشتہ بائیس سال سے آل انڈیا مسلم لیگ کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی رنج ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ ناروا سلوک۔ صرف اس لئے کیا جا رہا ہے۔ کہ اُن لوگوں کو مطمئن کیا جائے۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے بدترین دشمن ہیں اور جو آج بھی۔ اِس صوبے میں مسلم لیگ کی جڑیں کاٹنے میں صبح و شام مصروف رہتے ہیں۔

ہم نے مخالفت کے بدترین طوفان کے باوجود۔ لیگ کی خدمت سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ اور یہ سب کچھ۔ کسی شخص کو خوش یا ناراض کرنے کے لئے نہیں کیا۔ بلکہ ہمارے پیشِ نظر صرف قومی خدمت کا نصب العین تھا۔ الحمد للہ۔ آج ہم فخر و انبساط سے۔ اپنی شبانہ روز محنت کے نتائج دیکھ رہے ہیں کہ سارا پنجاب یونینیسٹ پارٹی سے متنفر۔ اور مسلم لیگ کا حامی و مددگار ہے۔ اگر گذشتہ انتخاب میں۔ اسمبلی میں منتخب نہیں ہو سکے۔ تو اِس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شہری اور دیہاتی حلقوں کو، نہایت ہوشیاری، بلکہ مکاری سے۔ ایک دوسرے

سے علیحدہ رکھا گیا ہے۔ تاہم ان رکاوٹوں کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے۔ اور انشاءاللہ آئندہ عام انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے رکھ دیا جائے گا۔

ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آپ کو ابھی تک یہ امید ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا لیڈر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ ہم ہر ممکن طریقے سے آپ پر یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ سر سکندر حیات کبھی پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائیں گے۔ ان کی چال صرف یہ ہے کہ ایک طرف تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں کسی نہ کسی طرح اپنا اثر و رسوخ قائم رکھیں۔ اور دوسری طرف پنجاب میں لیگ کا سر کچلتے رہیں۔ ستم ہے کہ ہمارے پیہم انتباہ کے باوجود وہ آپ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل میں گویا ہم لوگوں کو قربانی کا بکرا بننا پڑے گا۔ ہم ہرگز ہرگز اپنے آپ کو قربانی کے بکرے کی حیثیت دینا گوارا نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم تو اس بات پر آمادہ ہیں کہ پنجاب مسلم لیگ کو توڑ کر یہ اعلان کر دیں کہ ہماری جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ شاخ نہیں ہے اگر آپ پسند فرمائیں۔ تو ہم ابھی اس قسم کا اعلان کرنے کو تیار ہیں۔ سر سکندر اور ان کے احباب بڑی خوشی سے

لیگ کو سنبھال لیں۔ ہمیں حاشا وکلّا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔
الحاق کرنے والی سب کمیٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ موصول ہونے کے بعد۔ ہمارا پہلا ردّ عمل یہی تھا۔ کہ ہم فوراً اپنی علیحدگی کا اعلان کرکے۔ لیگ کو سر سکندر اور اُن کے احباب کے حوالے کردیں۔ لیکن پھر سوچ کر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ پہلے آپ کو اپنے خیالات وعزائم سے آگاہ کردینا ضروری ہے۔

اگر آپ کو اب ہماری چنداں ضرورت نہیں رہی۔ تو ہمیں آپ سے قطعاً کوئی شکایت نہیں۔ لیکن ہم یہ تو ہرگز برداشت نہیں کرسکتے۔ کہ ہماری اُس لیگ کا الحاق نامنظور کردیا جائے۔ جو گذشتہ رُبع صدی سے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی۔ ایک ملحقہ شاخ چلی آرہی ہے۔ اور جس کے ممبروں کی فہرست میں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایسے عظیم المرتبت اور ہندوستان گیر شہرت کے آدمی کا نام نامی بھی موجود ہے۔

سب کمیٹی کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ "علاوہ دیگر امور کے۔ پنجاب مسلم لیگ کا آئین۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے خلاف ہے"!

یہ الفاظ یعنی "علاوہ دیگر امور کے" ہمارے لئے بالکل ناقابلِ فہم ہیں۔

میں اِس موقع پر خاموش رہنا بزدلی سمجھتا ہوں۔ کونسل کے ممبروں کی جو فہرست ہم نے بھیجی تھی۔ اُسے نہایت حقارت

سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ اور اُن لوگوں کو لیگ کونسل میں نامزد کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے لیگ کے بدترین دشمن ہیں۔ اور جو آج بھی لیگ کے پروگرام اور اصولوں کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ خوش ہیں کہ معاہدہ کی بنیادی شرط پوری کئے بغیر یعنی اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی قائم کئے بغیر اُنھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی ہے۔ یقین کیجئے کہ آپ اُن لوگوں پر اعتماد کر رہے ہیں۔ جو اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کی رائے پر کوئی اعتبار نہیں ہے۔ آپ بڑی خوشی سے۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن خدارا ہمیں قربانی کا بکرا نہ بنایئے۔ ازراہِ کرم مجھے مطلع فرمایئے گا۔ کہ ہماری موجودہ پوزیشن کیا ہے۔ ہماری لیگ کے الحاق کی درخواست کا استرداد کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ کہ ہم خاموشی سے۔ اِس ذلّت کو برداشت کر لیں۔ ہمارا حق ہے کہ ہم اپنا سینہ چیر کر آپ کو دکھائیں۔ تاکہ آپ ہمارے حقیقی جذبات سے آگاہ ہو سکیں۔ براہِ کرم میرے تلخ و ناملائم الفاظ کو معاف کر دیجئے گا۔ ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے۔ وہ اِس قدر تکلیف دہ ہے کہ معمولی صبر و ضبط سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

آپ کا مخلص

برکت علی"

غلام رسول خاں نے۔ ۱۲ اپریل کو۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل کا جلسہ کر کے سب کمیٹی کے دونوں اعتراض رفع کر دیئے۔ اور اصلاح شدہ آئین کے مسودے کے ساتھ۔ الحاق کی نئی درخواست دہلی بھیج دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سارے ہنگامے کے دوران ہیں۔ نواب ممدوٹ نے اپنی شکل بھی ہمیں نہ دکھائی۔ وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور ان کا فرض تھا کہ وہ اس جدّ و جہد میں۔ ہمارے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوتے۔ لیکن از بسکہ ہماری درخواست کے مسترد کرائے جانے میں سب سے بڑا دخل انہی کا تھا۔ وہ اس موقعہ پر ہمارے قریب تک نہ آئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی $\frac{18}{19}$ اپریل کو کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ ہمارا ارادہ وہاں جانے کا نہیں تھا۔ جب پنجاب پراونشل لیگ کا وجود ہی باقی نہیں رہا تھا۔ تو پھر آل انڈیا لیگ کے جلسے میں شرکت۔ بے معنی سی بات تھی۔ لیکن چونکہ اس اجلاس میں۔ شہید گنج کے مسئلہ کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس لئے پنجاب بھر میں جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت سے لوگ کلکتہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہر ضلع سے مندوبین کی فہرستیں ہمارے دفتر میں پہنچ رہی تھیں۔ اور لوگ بڑے اصرار سے ڈیلی گیٹ کے ٹکٹ طلب کر رہے تھے۔ مجبوراً ان تمام لوگوں کو اطلاع دینی پڑی۔ کہ لیگ کا الحاق چونکہ الحاق منظور نہیں ہوا۔ اس لئے کوئی شخص ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے کلکتہ نہیں جا سکتا۔ اس خبر سے چاروں طرف مایوسی پھیل گئی۔

۱۴ اپریل کو۔ گیارہ بجے کے قریب۔ غلام رسول خاں۔ اور ملک نشان حیدر میرے مکان پر آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ تیار ہو جاؤ۔ آج شام کی گاڑی سے کلکتہ جانا ہے۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ کہ یہ فیصلہ کب ہوا۔ کیونکہ گذشتہ شام تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔

غلام رسول خاں نے بتایا۔ کہ "آج صبح ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا ہے کہ کلکتہ جا کر۔ اپنی جنگ خود لڑو۔ یہاں گھر میں بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اب ڈاکٹر صاحب ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو۔"

پہلے ہم ایک ضروری کام سے۔ روزنامہ احسان کے دفتر میں گئے۔ اور وہاں سے ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ ملک برکت علی بھی اُس وقت وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب۔ آنکھیں بند کئے ہوئے۔ پلنگ پر لیٹے تھے۔ غلام رسول خاں نے عرض کیا۔ کہ "ہم لوگ شام کو کلکتہ جا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "ضرور جاؤ۔ اور اپنے حق کے لئے آخر تک لڑو۔ ہمارے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے"۔

ملک برکت علی نے کہا۔ "اگر ہماری نئی درخواست بھی منظور نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا"؟

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ لیکن انہوں نے کسی قدر جوش سے فرمایا۔ "کچھ فکر نہیں۔ درخواست منظور ہو یا نامنظور۔ جس اصول پر ہم نے

اب تک کام کیا ہے۔ آئندہ بھی جاری رہے گا"

جب ہم رخصت ہونے لگے۔ تو فرمایا "کسی کی پرواہ نہ کرنا"

ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین ملک زمان مہدی اور راقم السطور۔ ۱۴ اپریل کی شام کو کلکتہ روانہ ہوئے۔ راجہ عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری لیگ کا الحاق نامنظور ہو جانے کے باوجود۔ پنجاب سے بہت سے لوگ کلکتہ جارہے تھے۔ سہارنپور کے سٹیشن پر۔ نواب اسمٰعیل خاں بھی۔ ہماری گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ بھی کلکتہ جا رہے تھے۔ نواب صاحب الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے والی سب کمیٹی کے صدر تھے۔ جب اُن سے پنجاب کے بارے میں ہماری مفصّل گفتگو ہوئی۔ تو انھیں تمام حالات سنکر سخت افسوس ہوا۔ غلام رسول خاں کے پاس الحاق کی نئی درخواست موجود تھی۔ نواب صاحب نے۔ اُسی وقت اس پہ بڑے پُرزور الفاظ میں لکھ دیا۔ کہ الحاق فوراً "منظور ہو جانا چاہیئے۔

۱۶ اپریل کی صبح کو۔ ہم کلکتہ پہونچے۔ اور مسلم انسٹی ٹیوٹ کی بالائی منزل میں قیام پذیر ہوئے۔ اُسی روز دوپہر کو ایک بجے۔ الحاق کی نئی درخواست جس پر نواب اسمٰعیل خاں کی سفارش درج تھی۔ ہم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر میں پہونچا دی۔

۱۷ اپریل کو۔ ساڑھے گیارہ بجے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اِس لئے ۱۶ کی شام کو ہم نے اکٹھے بیٹھ کر مشورہ کیا۔ کہ اِس اجلاس میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمیں یقین تھا

کہ ہماری درخواست پھر مسترد کر دی جائے گی۔ غلام رسول خاں تحت یا تختہ کے قائل تھے۔ آخر کسی قدر سوچ بچار کے بعد۔ فیصلہ ہوا کہ اگر درخواست منظور نہ ہو۔ تو راقم التحریر وہیں اجلاس میں کھڑے ہو کر۔ بحث کا آغاز کرے۔ اور اگر بحث طول کھینچ لے۔ تو ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین مدد کریں۔

۱۷ کو وقت مقررہ پر کونسل کا جلسہ شروع ہوا۔ پیر تاج الدین اور راقم التحریر سٹیج کے عین سامنے پہلی بنچ پر بیٹھ گئے۔ باقی چاروں اصحاب پچھلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ سر سکندر حیات تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن اُن کی پارٹی کے کم از کم ایک درجن ممبر ہال میں موجود تھے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پہلے گذشتہ اجلاس کی رپورٹ سُنائی پھر صوبائی لیگوں کے الحاق کی درخواستوں کا معاملہ زیر بحث آیا تو کئی ایسی لیگوں کی درخواستیں منظور کر لی گئیں۔ جن کا وجود محض کاغذی تھا۔ اور جن کا کوئی آئین بھی نہیں تھا۔ صوبہ سرحد کی بھی۔ ایک نام نہاد لیگ کا الحاق منظور کیا گیا۔ حالانکہ خود آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری نے اُس وقت تسلیم کیا۔ کہ اس لیگ کا وجود صرف کاغذی ہے۔ اور اُس کا کوئی دستور بھی تا حال وضع نہیں کیا گیا۔ لیکن جب پنجاب کی طرف سے الحاق کی نئی درخواست پیش ہوئی۔ تو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مخالفت کی۔ اور کہا کہ یہ درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔

میں اِس موقع کا منتظر بیٹھا تھا۔ میں نے اُسی وقت کھڑے ہو کر۔

سوال کیا۔ کہ" ہماری درخواست کے نامنظور کئے جانے کی وجہ کیا ہے"؟

نواب زادہ صاحب نے، کسی قدر تحکمانہ انداز میں فرمایا "بیٹھ جاؤ"۔

میں نے عرض کیا" میں سکول کا طالب علم نہیں ہوں۔ اور نہ آپ سکول ماسٹر ہیں۔ کہ مجھے یوں بیٹھ جانے کا حکم دیں"

اس پر وہ بگڑ کر بولے :" کیا لاہور سے ہماری بے عزتی کرنے یہاں آئے ہو"؟

میں نے جواب دیا" میں آپ کی بے عزتی کرنے تو نہیں آیا۔ لیکن اپنی بے عزتی کرانے بھی نہیں آیا"

میرے پاس الہ آباد کے بیرسٹر سید ظہور احمد بیٹھے تھے۔ وہ میرا کوٹ کھینچ کر کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ لیکن خلیفہ شجاع الدین پیچھے بیٹھے کہہ رہے تھے۔ نہیں بولنے دو۔ انہیں۔

مسٹر جناح یہ سب کچھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر پوچھا "چاہتے کیا ہو؟"

میں نے عرض کیا" پنجاب مسلم لیگ کا الحاق۔

فرمایا" تم میں سے ایک آدمی یہاں آکر اپنا معاملہ پیش کرے"۔

چنانچہ ملک برکت علی نے۔ پلیٹ فارم پر جا کر تقریر شروع کی۔ ان کی تقریر ختم ہوئی۔ تو پورا ایوان ہمارا ہم خیال اور معاون بن گیا تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے چوبیس گھنٹے کی مہلت طلب کی۔ اور فرمایا کہ سر سکندر آج شام کی گاڑی سے کلکتہ آرہے ہیں۔ کل صبح اس بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

شام کو ہمیں پیغام ملا - کہ دوسرے روز - صبح آٹھ بجے - مسٹر اصفہانی کے مکان پر - جہاں مسٹر جناح مقیم تھے - ہم حاضر ہوں - تاکہ سر سکندر کی موجودگی میں معاملات طے کئے جائیں - سر سکندر کے ساتھ - اُن کے دونوں مسلمان وزیر اور تمام پارلیمنٹری سکرٹری اور پرائیویٹ سکرٹری آئے تھے - اس کے علاوہ نواب ممدوٹ بھی اُن کے ہمرکاب تھے -

مسٹر جناح نے فرمایا - کہ پنجاب میں ایک نئی پراونشل مسلم لیگ قائم کی جائے گی - جسے مرتب و منظم کرنے کے لئے - ایک ۳۵ - آدمیوں کی آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کی جاتی ہے - اور اس آرگنائزنگ کمیٹی میں - دونوں فریقوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی -

غلام رسول خاں نے - یہ پوچھنے کی کوشش کی - کہ ہمارے الحاق کی درخواست کا کیا حشر ہوا - لیکن مسٹر جناح نے جواب دیا - گڑے مُردے اُکھاڑنے کا کچھ فائدہ نہیں - پھر انہوں نے ملک برکت علی سے کہا - کہ آرگنائزنگ کمیٹی کے لئے اپنے آدمیوں کی ایک فہرست تیار کریں - ملک صاحب نے ایک کاغذ پر اٹھارہ آدمیوں کے نام لکھ دیئے -

یہ مجلس مشاورت (کم و بیش) دو گھنٹے جاری رہی - اور بعض معاملات پر سر سکندر سے ہماری تیز و تند گفتگو بھی ہوئی -

اُسی شام آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری نے آرگنائزنگ کمیٹی کی مکمل اور باضابطہ فہرست ہمارے پاس بھیجی - تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی - کہ اس میں ہماری پارٹی کے صرف دس آدمیوں کے نام درج تھے - پچیس ۲۵ آدمی سر

سکندر حیات کے تھے۔ غلام رسول خاں غصّے سے بے تاب ہو گئے۔ لیکن میں نے انھیں سمجھایا۔ کہ اب چاہے ہمارا ایک بھی آدمی شامل نہ کیا جائے۔ کم از کم مجھے نہ تعجّب ہو گا نہ افسوس۔

آرگنائزنگ کمیٹی مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی۔

۱۔ سر سکندر حیات خاں ۔ صدر

۲۔ نواب ممدوٹ (نواب سر شاہنواز خاں)

۳۔ خان بہادر نواب سعادت علی خاں۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۴۔ ملک خضر حیات ٹوانہ۔ وزیر بلدیات

۵۔ میاں عبدالحیٔ۔ وزیر تعلیم

۶۔ خان بہادر میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ چیف پارلیمنٹری سکرٹری۔

۷۔ سیّد افضال علی حسنی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۸۔ خان بہادر میاں مشتاق احمد گورمانی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سکرٹری۔

۹۔ میر مقبول محمود۔ پارلیمنٹری سکرٹری۔

۱۰۔ سیّد امجد علی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سکرٹری۔

۱۱۔ میاں غیاث الدین ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)

۱۲۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔

۱۳۔ نواب سر محمد حیات خاں نون یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۴۔ راجہ فتح خاں یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۵۔ خان بہادر نواب مظفر خاں یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۶۔ خان بہادر نواب فضل علی۔ یونینیسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۷۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ پارلیمنٹری سکریٹری

۱۸۔ کیپٹن سر شبیر محمد خاں۔ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)

۱۹۔ خان بہادر شیخ کرامت علی یونینیسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۰۔ چودھری محمد یٰسین یونینیسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۱۔ شیخ صادق حسن۔ امرتسر

۲۲۔ مولانا غلام رسول مہر۔ ایڈیٹر روزنامہ انقلاب

۲۳۔ شیخ فیض محمد۔ پارلیمنٹری سکریٹری۔

۲۴۔ خان بہادر مولوی غلام محی الدین قصوری۔ یونینیسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۵۔ خان بہادر چودھری ریاست علی۔ یونینیسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۶۔ علامہ اقبال

۲۷۔ ملک زمان مہدی خاں

۲۸۔ خلیفہ شجاع الدین

۲۹۔ غلام رسول خاں

۳۰۔ ملک برکت علی

۳۱۔ پیر تاج الدین

۳۲۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش۔ ایڈیٹر روزنامہ احسان۔

۳۳۔ مولانا ظفر علی خاں

۳۴۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا۔

۳۵۔ عاشق حسین بٹالوی۔

اب کلکتہ میں مزید قیام بے سُود تھا۔ چنانچہ ۱۹ راپریل کی شام کو ہم واپس روانہ ہوئے۔ کلکتہ سے لاہور تک کا طویل اور صبر آزما سفر۔ اچھی خاصی کوفت میں کٹا۔ غلام رسول خاں کے مزاج میں غصّہ زیادہ تھا۔ وہ راستے میں بار بار کہتے تھے۔ کہ اب پنجاب میں مسلم لیگ کو ختم سمجھو۔ کبھی کہتے۔ افسوس ہماری ڈو سال کی محنت رائیگاں گئی۔ کبھی کہتے۔ کہ ہم لاہور جاکر ڈاکٹر صاحب کو کیا منہ دکھائیں گے۔

ملک زمان مہدی کو بظاہر مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ کہتے تھے۔ کہ میں تو لاہور پہنچ کر سیدھا اپنے گاؤں چلا جاؤں گا میری زمینداری کے بہت سے کام رُکے پڑے ہیں۔

خلیفہ شجاع الدین اور ملک برکت علی غالبًا یہ سوچ رہے تھے۔ کہ ہائی کورٹ کھلنے پر اُنھیں کون کون سی اپیلوں میں پیش ہونا پڑے گا۔

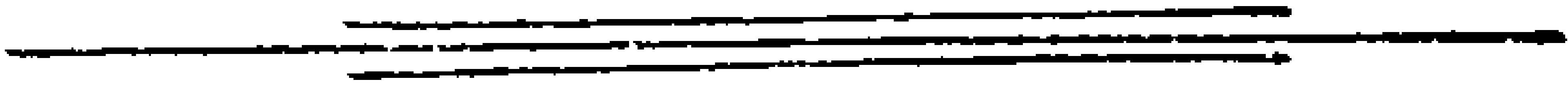
میں اس خیال سے خوش تھا۔ کہ چلو ہر روز کی دانتا کلکل ختم ہوئی۔ اب اطمینان سے بیٹھ کر کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کروں گا۔

۲۱ راپریل کو صبح ۹ بجے ہم لاہور پہنچے۔ ابھی گاڑی پلیٹ فارم پر اچھی طرح رُکنے بھی نہ پائی۔ کہ ہم نے اخبار فروش لڑکے کو چلّاتے ہوئے سُنا۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال فوت ہو گئے۔

اس خبر سے ہم پر ایک بجلی سی گر گئی۔ اور تمام ساتھی۔ دم بخود و پریشان ہو کر۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سٹیشن سے باہر آکر۔ اپنے گھروں کو واپس جانے کی بجائے ہم سیدھے جاوید منزل گئے۔ اور اس شخص کے جسدِ خاکی کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو آخری مرتبہ روشن کیا۔ جس کے ساتھ اس کے نیاز مندوں نے علم وادب کی نہضتِ ثانیہ۔ اور ملک وملت کی حیاتِ تازہ کی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ؂



ضمیمہ ۱

آل انڈیا مسلم لیگ کا مینی فسٹو

جو

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت شائع کیا گیا تھا

(اصل مینی فسٹو انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اسکا ترجمہ درج کیا جاتا ہے)

جب منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان ہوا۔ تو مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا۔ کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن کا وجود ضروری ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے ۱۹۰۶ء میں۔ بمقام ڈھاکہ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

لیگ نے حتمی طور پر ۱۹۱۲ء میں اپنا نصب العین اور دستور العمل وضع کیا۔ اور اپنے دستور اساسی میں تبدیلی کر کے۔ مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کو اس میں شامل کیا۔

ا۔ ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت کا قیام۔ جس میں مسلمانوں کے لئے ضروری اور موثر تحفظات موجود ہوں۔

ب۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور دیگر حقوق و مفاد کی نگہداشت کرنا۔ اور انھیں فروغ دینا۔

ج - مسلمانوں اور ہندوستان کے دیگر فرقوں کے درمیان اتفاق و اتحاد اور دوستانہ تعلقات کو ترقی دینا -

د - ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات کو قائم رکھنا - اور اُستوار کرنا -

میثاقِ لکھنو ابتدا سے لے کر اب تک - لیگ نے نہایت خلوص و صداقت سے - اِن بنیادی اصولوں کی پیروی کی ہے - جب تک منٹو مارلے اصلاحات نافذ رہیں - لیگ نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا قدم آگے بڑھایا - اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کا فرض ادا کیا ہے -

ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کے تعاون و اعانت - بالخصوص اُس عظیم المرتبت انسان، مہاراجہ محمود آباد مرحوم، کی بے لوث خدمات - پُرجوش حُبِّ وطن اور عزم بالجزم نے - لیگ کو ایسی قوت و توانائی اور اقتدار بخشا - جس سے وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئی - اور اُس نے ۱۹۱۶ء میں "کانگرس - لیگ پیکٹ" جسے عرفِ عام میں میثاقِ لکھنو کہا جاتا ہے مرتب کیا - یہ میثاق ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ میں ایک بہت بڑی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے -

سنگِ میل ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں - اِس میثاق کو ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے - یہ میثاق ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے باہمی اشتراک و تعاون کے جذبے -

اُن کے فکر و عمل کی وحدت اور جدّ و جہد کی یگانگت کا ایسا بیّن ثبوت ہے۔ جس سے یہ دونوں قومیں۔ اِس ملک میں ایک ذمّہ دارانہ حکومت کے حصُول کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن اِس میثاق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے تصفیئے کا حرفِ آخر سمجھ لینا صحیح نہیں۔ اور نہ اِس میثاق کے بانیوں نے۔ اِس کو حرفِ آخر سمجھ کر وضع کیا تھا۔ لکھنؤ پیکٹ کے بعد۔ ملک کو جن نئے حالات و کوائف سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے۔ اِس میثاق کو حرفِ آخر تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

قومی مُطالبہ

۱۹۲۰ء میں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اِصلاحات کا نفاذ ہوا تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک۔ یہ قومی مطالبہ روز بروز تقویت اختیار کرتا رہا ہے۔ کہ ملک میں مکمّل ذمّہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ اِس مطالبے میں مسلمان بھی پوری طرح برادرانِ وطن کے ہم نوا رہے ہیں۔ اور اُنہوں نے ہمیشہ محبِّ وطن ہندوستانیوں کی حیثیت سے۔ ہندوؤں کا ساتھ دیا ہے۔ لیکن اقلّیت ہونے کی وجہ سے۔ وہ اِس اصُول کے حامی ہیں۔ کہ آئندہ جو سیاسی اور دستوری نظام یہاں رائج کیا جائے گا۔ اُس میں اُن کے حقوق کی حفاظت کے لئے۔ ضروری تحفّظات موجود ہونا چاہئیں۔

تحفّظات کی ضرورت

ممکن ہے۔ ایک نو آموز۔ اور حقائق سے بے خبر سیاست دان۔ مسلمانوں کے اِس مطالبے کو فرقہ داری سے تعبیر کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ

جو لوگ دنیا کی آئینی اور دستوری تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ اِس نکتہ سے یقیناً واقف ہوں گے۔ کہ ہر ملک میں۔ قومی حکومت کی پائداری اور استحکام کی اوّلین شرط یہ ہے۔ کہ اقلیتوں کی خیرسگالی اور اُن کا دلی تعاون حاصل کیا جائے۔ جب تک حکومت کو یہ خیرسگالی اور دلی تعاون حاصل نہیں ہوگا۔ اقلیتیں بخوشی اور برضا و رغبت اکثریت پر اعتماد نہیں کرسکتیں۔

نصبُ العین

ملک میں وقتاً فوقتاً جو سیاسی مذاکرے، مشورے اور مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ اُن میں لیگ نے ہمیشہ اِس نصب العین کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ کہ ہندوستان میں جلد از جلد ایک ذمّہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ لیگ آج بھی پورے استقلال کے ساتھ اِس نصب العین کی حامی اور مؤید ہے۔

نیا دستور

لیگ اِس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ کہ گول میز کانفرنس کے نتیجے کے طور پر۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے باشندوں پر۔ وہ دستور ٹھونس دیا ہے۔ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے وضع کیا گیا ہے۔ لیگ نے اِس دستور کے متعلق۔ جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اُس کی وضاحت۔ اُس قرارداد میں کردی گئی ہے۔ جو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۱/۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں منظور ہوئی تھی۔ اور جس کے الفاظ یہ ہیں:

"درحالیکہ مسلم لیگ۔ فرقہ دارانہ فیصلے (کمیونل اوارڈ) کو اُس وقت تک کے لئے قبول کرتی ہے۔ جب تک کہ متعلقہ فرقوں کے

درمیان۔ اِس فیصلے کا کوئی بدل منظور نہیں کیا جاتا۔ لیگ پوری شدت سے۔ اِس آئین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں۔ باشندگانِ ہند کی مرضی کے خلاف۔ اور اِس امر کے علی الرغم کہ ملک کی متفرق جماعتیں اور انجمنیں۔ اِس ایکٹ کے خلاف ناراضی کا اظہار کر چکی ہیں۔ ہندوستان پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

" لیگ کا خیال ہے۔ کہ اُس صورتِ حال کو مدِّنظر رکھتے ہوئے۔ جو اِس وقت ہندوستان میں قائم ہے۔ آئین کے اُس جزو پر جس کا تعلق صوبائی نظم و نسق کے ساتھ ہے، عملدرآمد کرنا مفید ہوگا۔ ہر چند کہ اس جزو میں۔ بعض ایسے حد درجہ قابلِ اعتراض پہلو موجود ہیں۔ جنہوں نے وزارت اور مجلس قانون ساز کو حکومت اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں کے حقیقی اختیارات سے محروم کر دیا ہے۔

" لیگ کی یہ حتمی رائے ہے۔ کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے مرکز میں جس قسم کی رجعت پسندانہ حکومت قائم کرنے کے لئے۔ ایک آل انڈیا فیڈریشن کا خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ناقص ہے۔ یہ مجوّزہ فیڈریشن۔ برطانوی ہند کے مفاد کے لئے حد درجہ مہلک۔ نقصان دہ اور رجعت پسندانہ ہے۔ اور اِس فیڈریشن کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ ہندوستان جس دیرینہ اور عزیز نصب العین یعنی مکمل ذمہ دارانہ حکومت کے لئے کوشاں ہے، اُس کے راستے

میں روڑے اٹکا کر۔ اُس کے حصول کو غیر معین عرصے کے لئے معرضِ التواء میں ڈال دیا جائے۔ لہٰذا لیگ اِس فیڈریشن کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔

"لیگ کی رائے میں برطانوی حکومت کا فرض ہے۔ کہ فیڈریشن کی سکیم کو نافذ کرنے سے پہلے۔ اپنی اوّلین فرصت میں۔ اِس سکیم کے تمام پہلوؤں پر نظرِ ثانی کرے۔ ورنہ لیگ کو یقین ہے۔ کہ یہ سکیم ملک کے باشندوں کو امن و اطمینان سے بہرہ ور نہ کر سکے گی۔ اور اگر اس کے برعکس حکومت نے اِس سکیم کو زبردستی لوگوں پر مسلّط کرنے کی کوشش کی۔ تو اِس کے نتائج بڑے خطرناک ثابت ہوں گے کیونکہ یہ سکیم ہر اعتبار سے۔ ہندوستان اور اُس کے باشندوں کے مفاد کے لئے ناقابلِ عمل ہے۔"

صوبائی خود مختاری

لیکن اب کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا وہ جزو، جس کا تعلق صوبائی خود مختاری سے ہے، آئندہ سال کے دوران میں نافذ کیا جانے والا ہے۔ لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ۔ اِس جزو سے، جیسا کچھ بھی وہ ہے، فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

الیکشن بورڈ

اپنے اِس فیصلے کے پیشِ نظر۔ لیگ نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کر کے۔ ایک مرکزی الیکشن بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جسے اِس بات کا اختیار ہو گا۔ کہ مختلف صوبوں میں۔ پارلیمنٹری بورڈ قائم کرے۔ اور اُن کا اِلحاق اپنے ساتھ کرے۔

"ہرگاہ کہ آئینِ جدید کے نفاذ کے ساتھ۔ اِس ملک میں جو پارلیمنٹری نظامِ حکومت رائج ہوگا۔ اُس میں ایسی پارٹیوں کا قیام ضروری فرض کرلیا گیا ہے۔ جو اِس قسم کی واضح حکمتِ عملی اور ایسے لائحہ عمل پر کاربند ہوں۔ کہ اپنے دہندوں کی سیاسی تربیت کرسکیں اور اِسی نوع کے عزائم و مقاصد رکھنے والی دیگر جماعتوں سے تعاون میں۔ سہولت بہم پہونچا سکیں۔ اور آئینِ نو سے امکانی حدتک۔ زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کا اہتمام کرسکیں۔

"ہرگاہ کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کو تقویّت پہونچانے۔ اور صوبائی حکومتوں میں۔ اُن کے لئے مناسب اور مؤثر حصّہ حاصل کرنے کے لئے۔ یہ امر ضروری ہے۔ کہ مسلمان ایک ایسی جماعت کی صورت میں منظّم ہوجائیں۔ جو ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہو۔

"لہٰذا قرار دیا جاتا ہے۔ کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں حصّہ لینے کے لئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ مناسب تدابیر اختیار کرے۔ نیز مسٹر جنّاح کو اختیار دیا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی صدارت میں۔ ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اِس بورڈ کے ارکان کی کم از کم تعداد ۳۵ ہو۔ اور اُسے اِختیار حاصل ہو۔ کہ ہر صوبے کے مقامی حالات کے پیشِ نظر۔ مختلف صوبوں میں۔ صوبائی الیکشن بورڈ قائم کرکے۔ مرکزی بورڈ سے اُن کا اِلحاق کرے۔ اور اِس مقصد کے حصول کے لئے۔ مناسب تدابیر و ذرائع اختیار کرے۔"

اِس قرارداد کی رُو سے۔ مجوزہ مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اب اِس مرکزی بورڈ کی پالیسی اور پروگرام کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

خود غرض جتھے

جب سے مانٹیگو چیمسفورڈ اِصلاحات کا اجراء اور اُن پر عملدرآمد شروع ہوا ہے۔ متعدد طاقتوں نے زور پکڑ کر۔ اُبھرنا شروع کر دیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِن اصلاحات کے تحت جس قدر اقتدار و اختیار ہیئہ آ سکتا تھا۔ اُس پر، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں، دو قسم کے لوگوں نے۔ باہمی اشتراک و تعاون سے۔ قابو پا لیا ہے۔ اِن میں سے ایک تو رجعت پسند اور قدامت پرست لوگوں کا عنصر ہے۔ اور دوسرا عنصر ایسے خود غرض افراد پر مشتمل ہے۔ جن کا تنہا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بن پڑے۔ اور جہاں بن پڑے۔ ہر حیلے بہانے سے۔ اپنے لئے اعزاز و مناصب حاصل کئے جائیں۔

چونکہ یہ طرزِ عمل۔ خود حکومت کے لئے مفید تھا۔ اِس لئے حکومت نے ہمیشہ اِن افراد کی سرپرستی کی۔ اور اُنھیں امداد و اعانت سے تقویت پہنچائی نتیجہ یہ ہوا کہ اِن خود غرض جتھوں نے۔ نہ صرف تعلیم یافتہ۔ ترقی پسند اور آزاد خیال لوگوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلکہ عوام کو بھی بے دردی سے لوٹا۔ اِس طرح۔ رُجعت پسند عناصر اور شہنشاہیت پسند طاقتوں کے اِمتزاج سے۔ عوام دُوہرے غلبے کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اِس غلبہ کو پاش پاش کیا جائے۔

صدر کا انتباہ

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر نے

نہایت مناسب طریقے سے۔ مندرجۂ ذیل الفاظ میں۔ موجودہ سیاسی صورتِ حال پر تبصرہ کیا ہے۔

"آج ہمیں نئے مسائل درپیش ہیں۔ اِس وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں۔ کہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کو مغربی تعلیم سے آراستہ کر کے۔ اُسے سرکاری ملازمتوں کے حصول کے قابل بنا یا جائے اور نہ یہ سوال درپیش ہے۔ کہ تعلیم یافتہ افراد میں۔ عہدِ وکٹوریہ کی روشن خیالی کیونکر پیدا کی جائے۔ اِس کے برعکس۔ دورِ حاضر کے واقعات۔ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے معاشرتی حالات میں۔ بنیادی انقلاب پیدا کرنے کی بہترین تدابیر کیا ہیں۔ تاکہ اِن لوگوں کو اُس خوفناک تنگدستی۔ افلاس اور پس ماندگی کے گڑھے سے نکالا جا سکے۔ جس میں یہ گر چکے ہیں۔ اور اِس طرح انہیں مہذب معاشرے کے ابتدائی رموز سے آشنا کر کے۔ آزاد ملک کے آزاد شہری بننے میں مدد دی جاسکے۔

"ہمارا فرض ہے۔ کہ حالات میں تبدیلی پیدا کریں۔ دنیا کے دیگر ممالک اپنے ہاں۔ اِس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے احساس سے، مدت ہوئی، آگاہ ہو چکے ہیں۔ اور اگر یہ تبدیلی جلد از جلد رونما نہ ہوئی۔ تو یقین کیجئے کہ ہمارا معاشرتی نظام۔ ایک کرم خوردہ ستون کی طرح دھم سے نیچے آگرے گا۔ اور اس کے گرتے ہی ایک ایسی

تباہی آئے گی ۔جس سے صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں۔ بلکہ وہ تمام طبقے بھی مٹ جائیں گے۔ جنہیں آج دولت، ذات پات اور جاگیرداری نے۔ سماج میں نمایاں حیثیت عطا کر رکھی ہے ۔

"جس معاشرتی نظام کے تحت ۔ہم اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں ۔اُس کی بنیادیں ۔آج سے صدیوں پیشتر رکھی گئی تھیں ۔اور آئینِ فطرت کے مطابق ۔یہ بنیادیں آج بالکل کمزور ہو چکی ہیں — ہماری ذاتی غرض مندی ۔اس امر کی مقتضی ہو یا نہ ہو ۔لیکن ہمارا فرض ضرور ہے ۔کہ اب ایک نئی عمارت کو نئی بنیادوں پر کھڑا کیا جائے ۔اس فرض کی بجا آوری ۔تمام طبقوں پر یکساں عائد ہوتی ہے جن میں تعلیم یافتہ افراد ۔سرمایہ دار اور زمیندار ۔برابر کے شریک ہیں ہماری یہ کوشش جبھی بار آور ہو سکتی ہے ۔کہ ہم میں سے ہر شخص ایثار اور قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائے ۔

" میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ۔کہ ایسے معاشرتی نظام کی عمارت ۔کسی سلطنت کی تعمیر سے زیادہ شاندار ، زیادہ باوقار اور زیادہ منصفانہ ہو گی ۔"

بہ ایں ہمہ ۔ ہمارا فرض ہے ۔کہ اس امر کو بالکل واضح کر دیا جائے ۔کہ مسلم لیگ ایسی ہر تحریک کی مخالف ہے ۔جس کا مقصد یہ ہو کہ ذاتی اور شخصی جائداد کو ضبط کر لیا جائے

نمائندوں کا فرض

ہم توقع کرتے ہیں ۔کہ جو لوگ مختلف مجالس قانون ساز میں ہمارے نمائندے بن کر جائیں گے

وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے۔

اوّل یہ۔کہ موجودہ صوبائی نظام حکومت اور مجوّزہ مرکزی آئین کو جلد از جلد ختم کرکے۔ اُس کی بجائے۔ ایک جمہوری اور مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

دوم یہ۔ کہ اِس درمیانی وقفے میں۔ مسلم لیگ کے نمائندے۔ اپنی اپنی مجلسِ قانون ساز میں اِس امر کی انتہائی کوشش کریں۔ کہ قومی زندگی کے جملہ شعبوں میں۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے۔ موجودہ آئین سے۔ جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اُس سے حتی الامکان دریغ نہ کیا جائے۔

پارٹی کا جواز

جب تک ملک میں۔ جداگانہ انتخاب کا اصول رائج ہے۔ مجلسِ قانون ساز میں۔ مسلم لیگ پارٹی بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن اِس پارٹی کو اِس امر کا اختیار ہوگا۔ کہ وہ کسی ایسے فریق۔ یا متعدد فریقوں کے ساتھ تعاون کرے۔ جن کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

مسلمانوں سے درخواست

لیگ مسلمانوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنی قومی یگانگت کو برقرار رکھیں۔ اور اس قومی یگانگت کو کسی اقتصادی پروگرام کے نعرے یا کسی اور قسم کے نعرے سے متاثر ہو کر کمزور نہ کریں۔

پروگرام کا خاکہ

آئندہ انتخابات کے لئے مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے۔ جو پروگرام وضع کیا ہے۔ اُس

کی چند بڑی بڑی شقیں درج ذیل ہیں -

۱:- جہاں تک اُن اُمور کا سوال ہے - جن کا تعلق مذہب سے ہے مسلمانوں کے تمام مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائے گی - اور اِس ضمن میں جمعیت العلماء ہند اور مجتہدوں کے مشورے کو اہمیت دی جائے گی -

۲:- جابرانہ اور تشدد آمیز قوانین کو منسوخ کرانے کی ہرممکن کوشش کیجائے گی -

۳:- ایسے تمام احکامات و اقدامات کی مخالفت کی جائے گی - جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں - اور جو اِس ملک کے باشندوں کی بنیادی آزادی کو سلب کرنے کا موجب ہیں - اور جن سے - اِس ملک کی اقتصادی لُوٹ کھسوٹ کا دروازہ کھلنے کا احتمال ہے -

۴:- مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے گراں بار اخراجات میں کمی کی جائے گی - اور قومی ترقی کے مختلف شعبوں کے لئے معتدبہ رقوم مہیا کی جائیں گی -

۵:- ہندوستان کی فوج کو قومی فوج بنایا جائے گا - اور موجودہ فوجی مصارف میں تخفیف کی جائے گی -

۶:- ملکی صنعت و حرفت کو ، جس میں گھریلو صنعتیں بھی شامل ہیں فروغ دیا جائے گا -

۷:- ہندوستان کی اقتصادی خوش حالی کے لئے شرح سکہ ، شرح مبادلہ اور قیمتوں میں ضروری ترمیم کی جائے گی -

۸:- دیہاتی آبادی کی معاشرتی ، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح کی جائے گی -

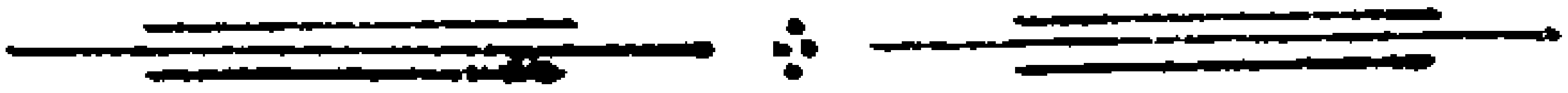
۹:- دیہاتی آبادی کے زرعی قرضے کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی -

۱۰ :- ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا جائے گا۔

۱۱ :- اُردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی۔

۱۲ :- مسلمانوں کی مجموعی حالت کو بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

۱۳ :- ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔



ضمیمہ ۲

مسٹر جناح کی وہ تقریر۔ جو انہوں نے ۔ پنجاب اسمبلی کے انتخابات کی مہم کا آغاز کرتے وقت ۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو۔ لاہور کے ایک جلسۂ عام میں ۔ زیرِ صدارت ملک زمان مہدی خاں مرحوم کی تھی [1]

جنابِ صدر اور حضرات! گذشتہ چند مہینوں میں۔ مجھے کئی مرتبہ لاہور آنے کا موقع ملا ہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اِس صوبے کے مسلمان۔ سیاسی۔ تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے۔ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں۔ بہت پس ماندہ ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ۔ آپ کا صوبہ افسری صوبہ ہے۔ جس سے میری یہ مراد ہے کہ آپ کی زندگی کے تمام شعبوں پر۔ دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے ۔ آپ کے صوبے کے رہنما جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں۔ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ۔ کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اور اُن کے پیشِ نظر۔ خود پرستی کے علاوہ اور کوئی مطمحِ نظر نہیں ۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے رہنماؤں کا لائحہ عمل

---

[1] اصل تقریر انگریزی میں تھی۔

اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کہ وہ عوام الناس کی جہالت اور بے خبری کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور جہاں دوسرے تعلیم یافتہ اور اہل الرائے مسلمانوں سے تعاون کا مسئلہ درپیش ہو۔ وہاں خاموشی سے کنی کاٹ کر الگ ہو جائیں۔

حضرات! آپ اِس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ کہ آپ کو چند رجعت پسند رہناؤں کی ایک ایسی ٹولی کو زیر و زبر کرنا ہے۔ جس کی لپشت پر ضمیر فروش پریس کا پرا پیگنڈہ، حکومت کی چشم التفات اور لا علم رائے دہندوں کے ووٹ ہیں۔

پریس کا ایک حصّہ۔ ہمارے لائحہ عمل اور مطمح نظر کو۔ پبلک کے سامنے ہمیشہ غلط نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ وہ دبی زبان سے۔ یہ امر بھی تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ انھیں مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود وہ ہم پر ڈھٹائی سے یہ الزام لگاتے ہیں۔ کہ ہم مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی غرض سے۔ فرقہ وارانہ پارٹیوں کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اور اُن کا اپنا ادّعا یہ ہے۔ کہ وہ بذاتِ خود بڑے ہی قوم پرست اور فرقہ داری کی لعنت سے کوسوں دُور ہیں۔ لیکن کیا میں اِن حضرات سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ اور کیا وہ ایمان داری سے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھکر۔ کہہ سکتے ہیں کہ یونینیٹ پارٹی۔ اِس لئے غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ کہ اِس کے ارکان کی فہرست میں۔ دو ہندوؤں کے نام بھی ہیں۔ جو موقع بے موقع۔ اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں؟ کیا کوئی شخص ایمان داری سے۔ اِس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ "غیر فرقہ وارانہ جماعت" کی موجودگی میں بھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی علیحدہ علیحدہ

پارٹیاں موجود ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہ غیر مسلم پارٹیاں کیوں یونینیٹ پارٹی ایسی غیر فرقہ وارانہ جماعت میں مدغم نہیں ہوئیں؟ میں یونینیٹ پارٹی کے ارکان کو چیلنج کرتا ہوں۔ کہ وہ ایمان داری سے اُن ہندو اور سکھ ارکان کے نام شائع کریں۔ جن کی امداد اُنھیں حاصل ہے۔ تاکہ پنجاب کے لوگ اُن کی اِس تعلّی کو یاد رکھ لیں کہ اُن کے زُمرے میں غیر مسلم ارکان کا مضبوط عنصر شامل ہے۔

حضرات! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص اِس چیز کا متمنّی نہیں۔ کہ ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے ساتھ۔ باہمی تعاون کی ایک ہی لڑی میں پرویا جاسکے۔ میں اِس بات کے لئے بھی تیار ہوں۔ کہ انتخابات کی کشمکش سے پہلے ہی۔ ہم اُن ہندوؤں اور سکھوں۔ نیز دوسری جماعتوں سے۔ جن کے مفاد ہمارے ساتھ مشترکہ ہیں۔ جداگانہ انتخاب کے باوجود۔ تعاون کرسکیں۔ لیکن آپ یاد رکھیں۔ کہ جب تک جداگانہ انتخاب کی شق موجود ہے۔ اِن پارٹیوں کی تشکیل فرقہ وارانہ اصولوں ہی پر ہوسکتی ہے۔ اور ہمیں ووٹ حاصل کرنے کے لئے۔ اپنی اپنی قوم ہی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا ہوگا۔ خدارا ہمیں ایسی "غیر فرقہ وارانہ" پارٹیوں کی ضرورت نہیں۔ جن کے عناصر رجعت پسند ہندو اور رجعت پسند مسلمان ہوں۔ اس کے برعکس۔ ہمیں ایسی غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں کی ضرورت ہے۔ جو آزاد خیال۔ ترقی پسند اور محبِ وطن قومی خادموں پر مشتمل ہوں۔ جو وطنِ عزیز کی خدمت اور اپنے بھائیوں کی بہبود کے لئے۔ ہر قسم کے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرسکیں۔

میرے دل میں۔ بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یونینیٹ پارٹی اپنے

بلند بانگ دعادی کے باوصف۔ کس قماش کی غیر فرقہ دارانہ جماعت ہے؟ آپ میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس پارٹی کی "غیر فرقہ وارانہ" نقلی کو۔ ایک لمحہ کے لئے بھی۔ باور کرنے کو تیار ہیں؟ عوام کا اعتماد حاصل کرنے۔ اور اُن کی خدمت میں۔ سردھڑ کی بازی لگانے کے لئے۔ اس پارٹی نے کون سا عملی اقدام کیا ہے؟ آیئے۔ اب میں آپ کو۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی اُس قرارداد سے۔ متعارف کراؤں۔ جس کے تحت۔ صوبوں میں پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ پارلیمنٹری بورڈ کا مطمحِ نظر۔ سیدھے سادے الفاظ میں یہ ہے کہ۔

نئی اصلاحات کے تحت۔ جس نوع کے پارلیمنٹری نظام کا آغاز ہونے والا ہے۔ اُس کے مطابق یہ نہایت ضروری ہے کہ ملک میں۔ ایسی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ جن کا پروگرام اور پالیسی بالکل بیّن اور واضح ہو۔ اور جو

(۱) اپنے رائے دہندوں کو سیاسی آراء و افکار سے مطّلع کر سکیں۔

(۲) یک جہت اور ہم خیال پارٹیوں سے تعاون کر سکیں۔ اور

(۳) نئے آئین سے کما حقّہٗ فائدہ اٹھا سکیں۔

اِس کے علاوہ۔ مرکزی الیکشن بورڈ کی تشکیل کا محرک۔ ایک یہ جذبہ بھی تھا۔ کہ نئے آئین کے تحت۔ صوبائی حکومتوں سے۔ پورے طور پر متمتع ہونے کے لئے۔ مسلمانانِ ہند کو وحدت کی لڑی میں منسلک کیا جائے۔ اِس لئے اِن تمام امور کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے۔ یہ لابدی تھا۔ کہ مسلمانانِ ہند۔ ایک مرکزی جماعت سے وابستہ ہو کر۔ اپنی تنظیم کریں۔ لہٰذا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے۔

مجھے اِس امر کا اختیار دے دیا ہے۔ کہ میں صوبائی انتخابات لڑنے کے لئے۔ ایک مرکزی الیکشن بورڈ کی تشکیل عمل میں لاؤں۔ جس کے کم سے کم ۳۵۔ ارکان ہوں۔ اور جو مقامی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر صوبے میں ایک پارلیمنٹری الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لانے کے مجاز ہوں گے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مجوّزہ مرکزی بورڈ کا پہلا اجلاس ۸ رجون ۱۹۳۶ء کو آپ کے شہر لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اور اِس لحاظ سے۔ آپ کا شہر آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت کا مالک رہے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام "چٹ منگنی پٹ بیاہ" کا مصداق نہیں۔ بلکہ آپ کی قوم کے بہترین دماغوں نے۔ اِس پر مدتوں غور و خوض کیا۔ اور بالآخر اِس نتیجے پر پہنچے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنا مقصود ہے۔ تو اُنھیں ایک ہی پرچم کے نیچے اور ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنا اشد ضروری ہے اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر۔ ہم نے مسلمانانِ ہند کی ایک مرکزی جماعت کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس کی شاخیں مختلف صوبوں میں۔ مضبوط بنیادوں پر قائم کی جارہی ہیں۔ مرکزی جماعت کے بنیادی اصولوں کا صوبائی بورڈوں پر پورا تصرف ہوگا۔ اور جو ارکان لیگ ٹکٹ پر۔ صوبائی اسمبلیوں میں داخل ہوں گے اُن کے لئے۔ اُن مواعید کا احترام لازم ہوگا۔ جو لیگ سے پیمانِ وفا باندھنے سے اُن پر عائد ہوں گے۔ اِس طرح۔ ہم اسمبلیوں میں۔ ایسے کھرے آدمی بھیجنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ جو ذاتی اغراض سے بالا، رائے دہندوں کے صحیح نمائندے

اور مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے سامنے۔ اپنے تمام افعال کے لئے جواب دہ ہوں گے مجھے معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ بلکہ جُوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن یقین کیجئے۔ کہ اگر ہم اس مہم میں کامیاب ہو گئے۔ تو صرف پنجاب ہی کے مسلمان نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو۔ بحیثیت مجموعی۔ اس سے زبردست فائدہ پہونچنے کی توقع ہے۔

اب آپ ذرا اپنے صوبے کی کیفیت سُن لیجئے۔ کیا کبھی آپ نے غور فرمایا کہ آپ کے رہنما۔ اس تنظیم بین المسلمین کی کڑی بننے سے کیوں گریز کر رہے ہیں سچی بات اگرچہ کڑوی ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اگر وہ لیگ کی ممبرشپ قبول کرلیں۔ تو اس صورت میں انھیں لیگ کی پالیسی اور پروگرام کا زہر بھرا جام۔ جو بدقسمتی سے حکومت کی چشم التفات کی چاشنی سے محروم ہے نوش کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے سے۔ اُن کی من مانی کارروائیوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کابینہ کی تشکیل کے قصر رفیع کا انہدام بھی ہوتا ہے۔ جس کی دیواریں قریبی رشتہ داروں اور اپنے سیاسی حلیفوں کو وزارتیں دینے پر مشتمل ہوں گی۔ اور جس کی بنیادیں گورنر کے اشارۂ چشم وابرو کے گچ اور گارے سے تعمیر ہوں گی۔ اس کے برعکس۔ ہمارے پیش نظر ایسی کابینہ کی تشکیل ہے۔ جس کی قوت کا راز رائے عامہ کے احترام اور فرائض کو ایمان داری سے ادا کرنے میں پنہاں ہوگا۔

میں نے چند اخبارون میں یہ بیان، جو یونینسٹ پارٹی کے چند ارکان نے دیا تھا، پڑھا ہے۔ کہ میں ان لوگوں کو۔ جو لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے

ہونا نہیں چاہتے۔ رجعت پسندوں، کاسہ لیسوں اور خواجہ تاشوں کے ٹولے سے تعبیر کرتا ہوں۔ اِس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ نواب چھتاری اور سر محمد یوسف جب تک لیگ کے رُکن رہے۔ میں نے اُن کی رجعت پسندی اور ٹوڈیت سے کبھی تعرّض نہیں کیا۔ لیکن جونہی اُنہوں نے لیگ کی غلامی کا جُوا گلے سے اُتار پھینکا۔ میں نے فوراً اُن کے گلے میں رجعت پسندی اور کاسہ لیسی کا پٹّہ ڈال دیا۔

حضرات! میں اِس الزام کی صحت سے اِنکار کرتا ہوں۔ اور اِس قسم کے لغو اور لچر بیانات کو درخورِ اعتنا قرار نہیں دیتا۔ میں رجعت پسند عناصر کے خلاف نہیں۔ اور نہ اُن لوگوں سے کوئی خاص پُرخاش رکھتا ہوں۔ جن کی کتابِ زندگی کا عنوان رجعتِ قہقہری اور کاسہ لیسی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے نواب چھتاری کا، جنہوں نے اپنی مرضی سے بعد میں استعفٰی دے دیا، بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میں آج پھر سر سکندر حیات خاں کو بورڈ کے حلقہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اِس صورت میں وہ پارٹی کی اجازت کے بغیر۔ من مانی وزارتوں کے ڈھکوسلے کھڑے کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ اور اُنھیں مرکزی بورڈ کے اصولوں کا احترام کرنا ہوگا۔

میں بیانگِ دُہل کہتا ہوں کہ میں اِس مجوّزہ وزارت کے خوشگوار خوابوں کو درہم برہم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی بنیاد۔ آج ہی سے۔ یعنی انتخابات کی کامیابی اور رائے دہندگان کی متفقہ آواز سے قبل ہی رکھ لی گئی ہے۔ میں ہندو اور سکھ حضرات کو بھی اِس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو اُنھیں اپنے اُن

ارکان سے لاحق ہے۔ جو یونینسٹ پارٹی کے اغراضِ مشئومہ کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر اور اپنی قوم کی شائستگی کو بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔

میں اس حقیقت کو پھر ایک بار آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میرے پیشِ نظر۔ ایسی مسلم حکومت کا قیام نہیں۔ جو ہندوؤں اور سکھوں کو کچل دینا چاہتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے۔ کہ دنیا کی کوئی حکومت جس کی بنیاد ظلم اور ناانصافی پر رکھی گئی ہو۔ ہرگز ہرگز پائیدار نہیں ہو سکتی۔ آئندہ پنجاب کی حکومت میں۔ مسلمانوں کو ایک کثیر اور فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہونیوالی ہے۔ تو یقین کیجئے۔ کہ یہ عنصر ہمیشہ حق و انصاف اور مروت و شفقت کے اصولوں پر عمل پیرا رہے گا۔ مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ مسلمان حق و صداقت کے راستے سے۔ ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں بھٹکنے پائیں گے۔ پنجاب کے بہادر مسلمانوں کا خطاب ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن ہے اور وہ بلا شبہ مسلمانانِ ہند کا دایاں بازو کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ہر محرکے میں۔ ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر۔ جدوجہد میں شرکت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انہی روایات کے پابند رہیں گے۔ اور آج جبکہ ہمیں ایک نیا معرکہ درپیش ہے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس نہیں کریں گے۔

خدارا اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے۔ کہ ابھی ایسے بہت سے مرحلے باقی ہیں۔ جن کی اہمیت ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے یکساں ہو گی۔ اسلامیانِ ہند کا بدن ابھی بہت سے ناسوروں سے رس رہا ہے اور اُن کے اندمال کے

لئے ہر صوبے کے مسلمانوں کو حتی المقدور مرہم کا سامان بہم پہونچانا ہو گا۔ مجھے بتایئے کہ آل انڈیا اہمیت کے مسائل، جن سے مسلمانوں کی قومی و سیاسی بقا وابستہ ہے، آپ ایک مرکزی جماعت کی مدد کے بغیر کس طرح نپٹا سکتے ہیں؟ کیا اسلام کا جمہوری نظام آپ کو اِس امر کی دعوت نہیں دے رہا۔ کہ مسلمانانِ ہند کی ایک مرکزی نمائندہ جماعت ہو۔ جس کی صدا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی متفقہ آواز کہی جا سکے؟۔

حضرات! ہمارے پیشِ نظر۔ اِس قسم کی ایک نمائندہ جماعت کا بلند تصوّر ہے جو آزاد خیال۔ ترقی پسند اور ایثار پیشہ افراد پر مشتمل ہو۔ اور جو آزادیٔ وطن کی مساعی میں ہمسایہ اقوام کا ہاتھ بٹا سکے۔ تاکہ ہندوستان کے ماتھے پر غلامی کا جو سیاہ ٹیکہ لگا ہوا ہے۔ وہ دُھل جائے۔

میں ہندوؤں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ تمھیں بھی اپنی جماعتوں کا جائزہ لینا ہو گا۔ تاکہ اُن کی جماعتوں کے خود غرض اور خود ساختہ رہنماؤں کا وجودِ نامسعود باقی نہ رہے۔ اور وہ سچے اور دِلی جوش سے۔ مسلمانوں سے تعاون کر سکیں۔ اِس صورت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جو نمائندے صوبائی اسمبلیوں میں جائیں گے۔ وہ خلوصِ قلب اور پُوری ایمان داری سے۔ ایک ایسے معاہدے پر پہونچنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جو ہندوستان کی تمام قوموں کو متفق کر دے اور اِس طرح آئے دن کی باہمی سر پھٹول اور ہندو مسلم جھگڑوں کے شاخسانوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

میں سر سکندر حیات خاں سے پوچھتا ہوں۔ کہ اگر وہ اہلِ پنجاب کی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لئے۔ اِس قدر ہی بے تاب تھے۔ تو آج

سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کیا انہوں نے ریزرو بنک کی ملازمت اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے قبول کی تھی؟ اس بلند مقصد کے لئے ۔ انہوں نے اس سے پہلے کیوں استعفےٰ نہ دیا؟ ۔ میں پوچھتا ہوں کہ نواب مظفر خاں کی جگہ سر سکندر حیات کو ۔ قلم دان وزارت سنبھالنے کی کیوں ضرورت لاحق ہوئی؟

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے ۔ کہ ان تمام سوالوں کا جواب صرف اس قدر ہے ۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے خود غرض ارکان جن کے سامنے سوائے جاہ و منصب کے حصول کے اور کوئی مقصد نہیں، وزارت کی پڑی کو سینے سے لگائے رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں ۔ اور حیرت ہے ۔ کہ اس جاہ پرست ٹولے کو ۔ حکومت پنجاب کی کھلے بندوں امداد حاصل ہے ۔

اس ضمن میں میں ہز ایکسیلینسی گورنر پنجاب کی خدمت میں بھی جو یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں رہتے، اپنی آواز پہونچانا چاہتا ہوں ۔ کہ وہ اور اُن کی حکومت پنجاب کے لوگوں پر ۔ اس امر کو واضح کر دیتے ہیں تساہل سے کام نہ لیں ۔ کہ جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے ۔ حکومت مکمل طور پر غیر جانبدار رہے گی ۔ اور انہیں اُس عہد کا پورا پورا پاس ہے ۔ جو مرکزی حکومت نے ابھی چند ہی روز ہوئے اسمبلی کے ارکان کو دیا تھا ۔

حضرات! سب سے آخر میں میں آپ سے پُرزور درخواست کرتا ہوں ۔ کہ اپنے ووٹوں کی قدر و قیمت پہچانیئے ۔ اور اس بات کو یاد رکھیئے ۔ کہ آپ کے ووٹوں کی دوسری قیمت ہے ۔ پہلے تو آپ کے ووٹوں سے صوبائی اسمبلیوں کے ارکان منتخب ہوں گے ۔ پھر آپ کے منتخب کردہ نمائندوں کے ووٹوں سے

فیڈرل اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عمل آئے گا۔

اِس لئے میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں۔ کہ سچے مسلمان کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے۔ کہ ذاتوں۔ بہا دریوں اور قرابت داریوں کے پُیت تصور سے بلند رہ کر۔ صرف اُن لوگوں کو ووٹ دیجئے۔ جو ایک واضح، بیّن اور روزِ رُوشن کی طرح نمایاں پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ اِس کے بعد میں آپ سے درخواست کروں گا۔ کہ اگر آپ مسلمانوں کو۔ باہمی تنظیم کی لڑی میں منسلک دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ تو مسلم لیگ کی رُکنیت قبول کیجئے۔ اور صرف اُن اُمیدواروں کو ووٹ دیجئے۔ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جو اسمبلی کے اندر۔ اپنے اعمال کے لئے۔ مرکزی جماعت کے سامنے جواب دِہ ہوں گے۔ اِسی کے علاوہ باقی جس قدر اُمیدوار ہیں وہ بھیڑوں کے اُس گلّے کی مانند ہیں۔ جس کا کوئی نگہبان اور رکھوالا نہ ہو۔ یہ لوگ اپنے اعمال و افعال کے لئے۔ کسی کے سامنے جواب دِہ نہیں۔ اور اُنکے روبرو جلبِ منفعت اور ہوسِ جاہ کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

میری آخری اور پُر زور درخواست یہ ہے۔ کہ آپ مسلم لیگ میں۔ جوق در جوق شامل ہوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ہر ممکن مدد کریں۔ کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی سب سے پرانی، سب سے بڑی اور سب سے خدمت گذار جماعت ہے ۰

ضمیمہ ۳

سکندر جناح پیکٹ کے متعلق پروفیسر گلشن رائے کا بیان۔

مطبوعہ سول اینڈ ملٹری گزٹ - لاہور -

مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء

سکندر جناح پیکٹ نے پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ایک اوّل درجے کا ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ یونینسٹ پارٹی نے، سر سکندر حیات خاں کی زیر قیادت گذشتہ انتخابات میں مسلم لیگ کا مقابلہ کیا تھا۔ جب اپریل ۱۹۳۶ء میں سر فضل حسین نے۔ یونینسٹ پارٹی کی۔ نئے سرے سے تشکیل کی تھی۔ تو یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ اس پارٹی کا پروگرام۔ عوام کی اقتصادی اصلاح پر مبنی ہے۔ اسی اعلان کی رُو سے۔ پارٹی نے۔ ایک ایسے پروگرام کو۔ اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ جو سراسر غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس کا تقاضا یہ تھا کہ تمام فرقہ وارانہ معاملات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

سر فضل حسین مرحوم نے۔ محسوس کر لیا تھا۔ کہ جدید اصلاحات نے۔ ماحول کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اور اس تبدیل شدہ ماحول میں۔ اگر خالص فرقہ وارانہ پالیسی پر عمل کیا گیا۔ تو گورنر کو آئے دن مداخلت کا موقع ملتا رہے گا۔ اور اس

طرح گویا صوبائی خودمختاری ایک سراسر مذاق بنکررہ جائے گی۔ سر فضل حسین مرحوم کی خواہش تھی۔ کہ وہ خود پنجاب پر حکومت کریں۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ اُنھیں صوبے کے تمام فرقوں کی تائید و حمایت حاصل ہو۔ تاکہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر گورنر کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوسکیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت سر فضل حسین کی پُشت پر تھی۔ زراعت پیشہ ہندوؤں کی حمایت بھی انھیں حاصل تھی۔ اِس کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں سکھوں کے ایک طبقے کو بھی۔ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع کردی تھی۔

سر فضلِ حسین اور مسٹر جناح کا جھگڑا :-

شہری ہندو سر فضلِ حسین کے مخالف تھے۔ لیکن اِس کے باوجود۔ مرحوم اِس کوشش میں مصروف تھے۔ کہ کسی طرح راجہ نریندرناتھ اور اُن کے شہری رفقاء کو اپنے ساتھ شامل کرسکیں۔ مرحوم کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں میں سے احرار اور سکھوں میں سے اکالی۔ اُن کے خلاف ہیں یا با ایں ہمہ انھیں اُمید تھی کہ وہ غیر اکالی سکھوں اور شہری ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اِس مقصد کے لئے۔ وہ یہاں تک آمادہ تھے۔ کہ فرقہ وارانہ پروگرام کو نظر انداز کرکے صرف اقتصادی پروگرام کو اپنا مطمحِ نظر بنایا جائے۔ اِدھر مسٹر جناح کا اصرار تھا۔ کہ مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے انتخابات کی جنگ لڑی جائے۔ لیکن سر فضلِ حسین نے یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وہ اِس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ کہ اگر اُنہوں نے مسلم لیگ سے، جو ہندو سبھا کی طرح ایک خالص فرقہ وارانہ جماعت ہے۔

تعاون کیا۔ تو شہری ہندو اور سکھ۔ اُن کے قریب بھی نہیں آئیں گے۔ اس کے علاوہ بہت ممکن تھا۔ کہ زراعت پیشہ ہندو بھی اُن سے کنارہ کشی اختیار کرلیں اندریں حالات۔ انہوں نے کسی قدر درشت لہجہ اختیار کرکے۔ مسٹر جناح سے۔ صاف صاف کہدیا۔ کہ وہ پنجاب سے تشریف لے جائیں۔ اِس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے۔ کہ تمام فرقوں پر مشتمل۔ ایک اکثریت رکھنے والی۔ غیر فرقہ وارانہ پارٹی قائم کرنی چاہیئے۔ انہوں نے مسٹر جناح کی ناراضی مول لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

وزارتی پارٹی کی مضبوط پوزیشن:- اگرچہ اس واقعہ کے چند ماہ بعد سر فضل حسین کا انتقال ہوگیا۔ لیکن اُن کے پیروؤں نے۔ گذشتہ انتخابات میں۔ اُن کی پالیسی پر پوری طرح عمل کیا۔ اور مسلم لیگی امیدواروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہو سکے۔ جن میں سے۔ ایک تو انتخابات کے نتیجہ کا اعلان ہوتے ہی۔ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اِس وقت پنجاب اسمبلی میں۔ تنہا ملک برکت علی۔ مسلم لیگ کی نمائندگی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

موجودہ صورت حال یہ ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی میں بیاسی [۸۲] مسلمان اور سات ہندو ہیں۔ اِن لوگوں کے ساتھ سات اچھوت۔ سات شہری ہندو۔ چھ انڈی پینڈنٹ ہندو۔ سترہ سکھ اور چار مسیحی۔ اینگلو انڈین اور یورپین ممبر شامل ہیں۔ اِس طرح گویا مشترکہ وزارتی پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۳۲۔ اور حزب مخالف کے ارکان کی تعداد ۴۳ ہے۔ موجودہ وزارت کی پشت پر

مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کے علاوہ۔ ہندو اور سکھ ممبروں کی اکثریت بھی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ اس وقت یونینسٹ پارٹی کی پوزیشن بے حد مضبوط ہے۔ اور اس مضبوط پوزیشن ہی کا نتیجہ ہے کہ گورنر، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی آڑ لے کر، وزارت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ وزراء اپنی صوابدید کے مطابق، اپنی پالیسی پر عمل کرنے کے مجاز ہیں اور اس طرح۔ ہم پنجاب میں۔ حقیقی صوبائی خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک غیر کانگرسی حکومت بھی۔ خود مختاری سے متمتع ہو سکتی ہے۔

جدید پیکٹ کا اثر:۔ یونینسٹ پارٹی کو اس وقت جو اطمینان بخش پوزیشن حاصل ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ سکھوں اور شہری ہندوؤں کی اکثریت۔ اس پارٹی کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ بظاہر۔ ایک غیر جانبدار شخص کو۔ یہی توقع رکھنا چاہیئے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر سکندر حیات خاں۔ اپنی پارٹی کے استحکام کی خاطر سے۔ اور گورنر کی مداخلت کے امکان کو کم سے کم کرنے کے لئے۔ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ جس سے اُن کے غیر مسلم شرکاء دیگر کام اُن سے علیحدہ ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ موصوف نے۔ مسٹر جناح سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی رُو سے وہ پارٹی کے تمام مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ مسلم لیگ کے قرطاس رکنیت پر دستخط کر کے۔ لیگ میں شامل ہو جائیں۔ سر سکندر نے۔ اس بات کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی یا بالفاظ دیگر۔ موجودہ یونینسٹ پارٹی

کے مسلمان ممبر۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے تحت کام کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی اِس بات کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینیسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کا قبضہ ہو جائے گا

لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ:۔

مجھے اِس بات کا اعتراف ہے کہ موجودہ معاہدے کی شرائط کی رُو سے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو اپنے دائرۂ عمل میں ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو گی۔ لیکن، با ایں ہمہ اِس امر سے بھی انکار محال ہے۔ کہ یہ پراونشل بورڈ، بہت بڑی حد تک، مرکزی بورڈ کے تابع فرمان ہو گا۔ سوال یہ ہے۔ کہ آئندہ اِس مرکزی بورڈ کا آئین کس قسم کا ہو گا؟۔ کیا موجودہ بورڈ کی طرح۔ آئندہ بھی۔ لیگ کا صدر ہی۔ اِس بورڈ کے ممبروں کو نامزد کیا کرے گا یا اِن ممبروں کا انتخاب۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجموعی رائے سے ہو گا؟ ہمیں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ مستقبل میں۔ جو نظام رائج کیا جانے والا ہے۔ اُس میں آل انڈیا مسلم لیگ۔ ہندوستان کی تمام صوبائی لیگوں کے ایک مرکزی نمائندہ ادارے کی صورت اختیار کرے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس مجوزہ آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل میں۔ ہندوستان کے ہر صوبے کے ممبروں کا انتخاب کس اصول کے مطابق کیا جائے گا۔ کیا ہر چھوٹا یا بڑا صوبہ مساوی تعداد میں ممبر بھیج سکے گا۔ یا ہر صوبے کی مسلم آبادی کے تناسب سے۔ ممبروں کی تعداد مقرر ہو گی۔ یا یہ اصول مدِّ نظر رکھا جائے گا۔ کہ جس صوبے میں۔ مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد زیادہ ہے

وہ صوبہ زیادہ نمائندے بھیجنے کا مجاز ہوگا۔ اور جہاں ممبروں کی تعداد کم ہے وہ قطع نظر مسلم آبادی کے تناسب کے۔ نمائندے بھی کم تعداد میں بھیج سکے گا؟

فرقہ وارانہ قراردادیں :-

یہ تمام سوالات بے حد اہم اور غور طلب ہیں بہرحال کچھ بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ میں۔ پنجاب کے مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا پنجاب کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ اُن قراردادوں کو اپنے صوبے میں عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ جن کو مرکزی لیگ نے منظور کیا ہے؟ کیا پنجاب کے مسلمان اِن قراردادوں کو جامۂ عمل پہناتے وقت۔ اپنے غیر مسلم رفیقوں کا تعاون حاصل کر سکیں گے؟ میں ایک مثال دے کر۔ اپنے نقطۂ نگاہ کو واضح کرتا ہوں۔ امسال آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں۔ ایک قرارداد منظور کی گئی ہے جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ "برطانوی حکومت کو چاہئیے کہ مسجد شہید گنج کو از سرِ نو تعمیر کر کے۔ مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ ورنہ مسلمانانِ ہند اور برطانوی حکومت کے درمیان تصادم ناگزیر ہو جائے گا"!

میں پوچھتا ہوں۔ کہ مسلم لیگ کی اِس قرارداد پر۔ برطانوی حکومت کیونکر عمل کر سکتی ہے؟ کیا سر سکندر حیات خاں۔ اِس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے۔ سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور اُن کی خالصہ نیشنل پارٹی کے سکھ ممبروں کو۔ اپنے ساتھ ملا سکیں گے؟ اگر سر سکندر اور پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی (یعنی یونینسٹ پارٹی کا مسلمان عنصر) نے اِس قرارداد پر عمل نہ کیا۔ تو کیا اِس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمنٹری بورڈ۔ اُن کے خلاف۔ ضابطے کی

کارروائی کرنے پر مجبور نہیں ہوگا؟ میں نے محض ایک مثال پیش کی ہے۔ ورنہ اِس بات کا قوی اِمکان ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ اِس نوع کی متعدد قراردادیں منظور کرے گی۔ جن سے پنجاب کے ہندو اور سکھ متفق نہیں ہونگے؟

مذہبی امور میں اٹانومی:-

عملی نقطۂ نگاہ سے اگر غور کیا جائے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ مستقبل کی یونینسٹ پارٹی کے مسلم لیگی ممبر۔ صرف وہی کام کرسکیں گے۔ جن کے لئے۔ اُن کو پارٹی کے غیرمسلم گروہوں کا تعاون حاصل ہوگا۔ اندریں حالات۔ اگر آل انڈیا مسلم لیگ یہ چاہتی ہے۔ کہ موجودہ یونینسٹ پارٹی، جس کا جزوِ اعظم مسلمانوں پر مشتمل ہے پنجاب پر حکومت کرے۔ تو اُس کا واحد طریقہ یہ ہے۔ کہ مذہبی معاملات میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو مکمل اٹانومی عطا کردی جائے۔ لیکن بایں ہمہ۔ یہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک مرکزی جماعت کی حیثیت سے۔ صرف اِس لئے منظم کیا جائے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی امور کی نگہداشت کی جائے۔

مسلم لیگ کے ممبر۔ ہرگز توقع نہیں کرسکتے۔ کہ انھیں پنجاب یا بنگال کی مجلسِ قانون ساز میں۔ کبھی قطعی اکثریت بھی حاصل ہوگی۔ مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی عنصر۔ ہمیشہ مسلم لیگ کا مخالف رہے گا۔ صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کو۔ اگر انتخابات میں کامیابی ہو بھی گئی۔ تو بھی صوبے پر حکومت کرنے کے لئے۔ اُسے غیرمسلموں کا دلی تعاون حاصل کئے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ اور اِس تعاون کی۔ اُسے خاص قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ وہ قیمت یہ ہے۔ کہ مسلم لیگ

پارٹی کو وعدہ کرنا ہو گا۔ کہ وہ ایک سراسر غیر فرقہ وارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہو گی۔

اُلجھنیں :۔ غیر فرقہ وارانہ پالیسی پر۔ عمل پیرا ہونے کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا۔ اپنی صوبائی شاخوں پر کوئی ضابطہ اور اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اگر ایک آل انڈیا جماعت اپنی صوبائی شاخوں پر ضابطہ و اختیار قائم نہیں رکھ سکتی۔ تو پھر ایسی آل انڈیا جماعت کا فائدہ ہی کیا ہے؟ بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ اِن صوبوں کی مجالسِ قانون سازمیں۔ لیگ کو قطعی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ تو بھی مسلم لیگ اقلیتوں کی مرضی کے بغیر۔ یا اُن کے علی الرغم۔ کسی فرقہ وارانہ پالیسی کو نافذ کرنے کے قابل نہیں ہو گی۔ اور اگر اُس نے ایسا کیا۔ تو گورنر اپنے اختیاراتِ خصوصی کے استعمال پر مجبور ہو گا۔ اور اِسی طرح صوبائی خود مختاری کے اندر جگہ جگہ دراڑیں پڑ جائیں گی۔

جدید آئین کی رُو سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اقلیتوں کی رضامندی اور گورنر کے تعاون کے بغیر کسی نوع کی فرقہ وارانہ پالیسی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اندریں حالات۔ بہترین طریق کار یہ ہے۔ کہ ایک غیر فرقہ دارانہ پالیسی وضع کی جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ پارلیمنٹری امور کی انجام دہی کے لئے۔ ملک میں فرقہ وارانہ جماعتوں کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

یونینسٹ پارٹی کے سندھ ممبروں پر اثر :۔ اب ایک اور نقطۂ نگاہ سے غور فرمایئے سر سکندر کو

پنجاب اسمبلی میں ۔ بہت بڑی اکثریت کی امداد حاصل ہے کیونکہ سر چھوٹو رام ۔ سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور راجہ نریندر ناتھ کے گروہ اُن کی پشت پر ہیں ۔ ہمارے مسلمان دوست بار بار یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے ۔ کہ ہندوؤں کو چاہیئے کہ ہندو سبھا سے کنارہ کش ہو جائیں ۔ اب کہ سر سکندر حیات خاں اور اُن کی پارٹی کے مسلم ارکان ۔ لیگ میں شامل ہو گئے ہیں ۔ ہندوؤں کو ہندو سبھا میں شریک ہونے سے یہ ہمارے دوست کیونکر منع کر سکتے ہیں ؟ کیا سکندر جناح پیکٹ نے ، جس کی رُو سے یونینسٹ مسلمانوں کو لیگ میں شامل ہونا پڑے گا ، سر چھوٹو رام اور یونینسٹ پارٹی کے ہندو ممبروں کی پوزیشن کو بہت بڑی حد تک کمزور نہیں کر دیا ؟ آئندہ صورتِ حال یہ ہو گی ۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر ۔ ایک بیرونی جماعت کے احکام کی پابندی کرنے پر مجبور رہیں گے ۔ سر چھوٹو رام اگر چاہیں گے بھی ۔ تو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو ۔ اپنا نقطۂ نگاہ تسلیم کرنے پر ۔ آمادہ نہیں کر سکیں گے ۔ تاوقتیکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے ۔ اِس قسم کی ہدایات صادر نہ ہوں ۔ اندریں حالات خود اپنی پارٹی میں سر چھوٹو رام اور اُن کے ساتھیوں کی پوزیشن اِس قدر کمزور ہو جائے گی ۔ کہ اُنھیں امداد و اعانت کے لئے لامحالہ یونینسٹ پارٹی سے باہر کسی اور جانب دیکھنا پڑے گا ۔
